بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذہب شیعہ

از

حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین صاحب قدس سرہ العزیز

مع

تحفہ حسینیہ

علامہ ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ○ پاکستان

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ
زمر ۱۷-۱۸

کتابخانه عقیده
www.aqeedeh.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝١

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٢ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٣
مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٤ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝٥
اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝٦ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ
عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝٧

یہ کتاب، عقیدہ لائبریری

(www.aqeedeh.com)

سے ڈانلوڈ کی گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ؂

جن لوگوں نے دین میں تفرقہ پیدا کیا اور ہو گئے مختلف گروہ۔ آپ کا ان سے ذرہ بھی تعلق نہیں ہے

مذہبِ شیعہ

از

حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین صاحب قدس سرہٗ العزیز

مع

تحفہ حسینیہ

حصہ دوم

علامہ ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور ۔ کراچی ۞ پاکستان

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۝

جن لوگوں نے دین میں تفرقہ پیدا کیا اور ہو گئے مختلف گروہ۔ آپ کا ان سے ذرہ بھی تعلق نہیں ہے

مذہبِ شیعہ

از

حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین صاحب قدس سرہٗ العزیز

مع

تحفہ حسینیہ

حصہ دوم

علامہ ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور ۔ کراچی ۝ پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب — تحفہ حسینیہ حصہ دوم
مصنف — علامہ ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی
تعداد — ایک ہزار
تاریخ اشاعت — فروری 2001ء
ناشر — ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
قیمت — -/150 روپے
پرنٹرز — LGP لائف گارڈ پرنٹرز، 4۔ ٹیپ روڈ، لاہور
ملنے کا پتہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953
9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085
فیکس:۔ 042-7238010
14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی۔ فون:۔ 021-2630411
e-mail:- zquran@brain.net.pk

حرفِ آغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط
نحمدہٗ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہٖ و صحبہٖ اجمعین ○ اما بعد!

بحمدہٖ تعالیٰ کتاب مستطاب "تحفہ حسینیہ" کا حصہ اوّل طبع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ چکا، جس میں تقیہ اور تحریفِ قرآن کے متعلق شیعی مسلک اور اُس کا ردِ بلیغ، فضائلِ صحابہ کرام از رُوئے قرآن اور احادیثِ خیرالانام اور اقوال ائمہ کرام علیہم الرضوان اور شیعی تاویلات کا ردّ و ابطال کیا گیا اور اس کے علاوہ بہت سے ضمنی ابحاث بھی ہدیۂ ناظرین ہو چکے۔

اب بفضلہٖ تعالیٰ دوسری جلد پیشِ خدمت ہے، جس میں خلافت و وصیت کے موضوع پر مفصّل گفتگو کی گئی ہے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی زبانی چوتھا خلیفہ ہونے کا اقرار اور خلفاء سابقین کی خلافت کے خلافتِ موعودہ ہونے کا اقرار و اعتراف حضرت اُمِ کلثوم بنتِ علی رضی اللہ عنہ کا حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں دینا، مدلّل انداز میں بیان کیا گیا ہے اور شیعی تاویلات و تسویلات کا ردِ بلیغ کیا گیا ہے۔ نیز حدیثِ قرطاس کی حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں حدیثِ غدیر سے اہلِ تشیع کے استدلال کا بطلان واضح کیا گیا ہے اور ان موضوعات کے علاوہ بھی بہت سے ابحاث ہیں جو مطالعہ اور گہرے غور و خوض کے متقاضی ہیں اور ان نزاعی و اختلافی امور میں ہدایت و ارشاد کے موجب ہیں اور بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ حصہ تحفہ حسینیہ کے قلب و جگر کی مانند ہے۔

اس کے بعد تیسرے حصہ میں حدیثِ منزلت اور فدک پر مفصّل بحث کی جائے گی نیز مذہبِ شیعہ کا بانی کون تھا؟ شیعہ کی مذمت بزبانِ ائمہ کرام، قاتلانِ امام حسین

رضی اللہ عنہ کون تھے ؟ ائمہ کرام کا بروزِ قیامت شیعہ سے اظہارِ برأت اور بیزاری، جنازہ کی تکبیراتِ اربعہ ، ائمہ کرام کا اپنی اولاد امجاد کے نام خلفاء ثلاثہ کے ناموں پر رکھنا اور خلفاء ثلاثہ کے اسماء گرامی کے ساتھ موسوم لوگوں کے ساتھ اہلِ تشیع کا سلوک بیان کیا جائے گا۔

استاذ العلماء حضرت شیخ القرآن والحدیث علامہ محمد اشرف صاحب سیالوی مدظلہ ایک سلجھے ہوئے خطیب، منجھے ہوئے ادیب ہیں۔ تعلیم و تدریس کا شعبہ ہو، یا مناظرے کا میدان، غرضیکہ ہر مرحلے پر سنجیدگی، متانت، تحمّل مزاجی، بُردباری اور وسیع القلبی کی کیفیات غالب رہتی ہیں۔ ہر موضوع پر پوری ذمّہ داری سے دلائل و براہین کی بھرمار، اِن کا قرینہ ہے۔ کھُلے دل سے بات سننا اور کھُلے دل سے عقدہ کشائی فرمانا، اِن کا طریقہ ہے۔ نچی تلی، عالمانہ، محققانہ، منصفانہ اور مدبرانہ گفتگو، ان کا وطیرہ ہے۔ کئی کتابیں تالیف و تصنیف فرما چکے ہیں۔ کئی کتابوں کے تراجم سے عہدہ برآ ہو چکے ہیں۔ تحفہ حُسینیہ کا دوسرا حِصّہ ہدیۂ ناظرین ہے تیسرا حصّہ بھی جلد ہی منصّۂ شہود پر آجائے گا (انشاء اللہ تعالیٰ العزیز) قارئین کرام خود ہی یہ اندازہ فرمالیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے علامہ موصوف مدظلہ کو کِن کِن خوبیوں سے سرفراز فرمایا ہے۔ ذالك فضل الله يوتيه من يشاء۔

اللہ کریم، حضرتِ علامہ صاحب مدظلہ کے علم و فضل اور اخلاص و عمل میں مزید برکتیں عطا فرمائے۔ آپ کا سایہ ملّتِ اسلامیہ پر تادیر قائم رکھے۔ آپ کی تصنیفات و تالیفات کو اپنی بارگاہِ مقدّس میں شرفِ قبولیت سے نواز کر حضور نبیٔ مکرّم، سیّدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وصحبہ وبارک وسلم اور آل واصحابِ رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین کی رضامندی و خوشنودی اور نگاہِ کرم کا موجب بنائے۔ آمین ثم آمین بجاہِ طٰہٰ و یٰسین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم!

غلام رسول سیالوی عفا اللہ عنہ

۲۰ صفر المظفر ۱۴۱۱ھ

غازی غلام رسول سیالوی

مرکزی ناظمِ اعلیٰ ؛ مجلسِ الدعوۃ الاسلامیہ ، پاکستان۔

فہرست حِصّہ دوم تحفہ حُسینیہ

مبحث امامت و خلافت	۱۵
تمہیدی امور؛ امرِ اوّل، نصبِ خلیفہ کا ذمّہ دار کون ہے ؟	۱۵
امرِ ثانی ؛ عندالشیعہ امامت کا عقیدہ قطعی عقیدہ ہے	۱۶
امرِ ثالث ؛ تقررِ امام میں مذہبِ اہلِ تشیع کا بیان	۱۷
امرِ رابع ؛ محلِ نزاع امامت کی تعریف	۱۸
ابطال عقیدۂ شیعہ	۱۹
فرمانِ مُرتضیٰ؛ جو مجھے چوتھا خلیفہ نہ مانے، وہ لعنتی ہے	۲۲
علماء شیعہ کی تحریف اور اس کا ردِّ بلیغ	۲۳
سوادِ اعظم کا مذہب ہی مذہبِ مرتضیٰ ہے	۳۱
اہلِ تشیع اور شورائی حکومت	۳۲
رسالہ مذہبِ شیعہ ؛ شوریٰ ذریعۂ انعقادِ خلافت	۳۳
تحفہ حسینیہ ؛ تتمۂ استدلالِ اوّل	۳۴
مذہبِ شیعہ ؛ دلیل دوم بر صحتِ شوریٰ	۳۹
تحفہ حُسینیہ ؛ فوائد و نکات کا بیان	۴۰
حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور شوریٰ و انتخاب	۴۵
ابنِ میثم کا اختلاف و نزاعِ اصحاب کے بیان سے تنفّر	۴۶
اسلاف پر تنقید سے اجتناب کا لزوم از رُوئے قرآن	۴۷
رسالہ مذہبِ شیعہ ؛ دلیل سوم بر صحتِ شوریٰ	۴۸
تحفہ حُسینیہ ؛ تتمۂ استدلال مذکور	۴۸

حضرتِ امیر رضی اللہ عنہ کی مجبوری و مقہوری کے دعویٰ کی لغویت ۵۱

بیعتِ مرتضوی اور جمہورِ اہلِ اسلام کا مذہب ۵۵

حضرتِ امیر رضی اللہ عنہ کی تگ و دو برائے خلافت عند الشیعہ ۵۵

لمحۂ فکریہ اور عمل و قول میں تضاد ۵۶

طلبِ خلافت میں عذرِ تاخیر اور اس کا بطلان ۵۸

لائقِ توجہ امر: اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومتوں کا فرق ۵۹

رسالہ مذہبِ شیعہ: وصیتِ خلافت کی نفی و انکار ۶۰

تحفۂ حسینیہ: تتمۂ دلیلِ چہارم ۶۱

علامہ ڈھکو صاحب کا دلائل کے جواب سے عجز اور کھوکھلے دعووں پر اکتفا ۶۴

تحفۂ حسینیہ: امام کا انتخاب کون کرتا ہے؟ ۶۵

قولِ باری تعالیٰ: ما کان لھم الخیرۃ کا صحیح مفہوم ۶۷

خطیبِ خوارزم ابو المؤید کا مذہب ۷۲

خلفاءِ ثلاثہ کی بیعت کرنے والے کون تھے اور کتنے افراد تھے؟ ۷۳

رسالہ مذہبِ شیعہ: خلافتِ فاروقی کی حقانیت اور مشورہ ہائے مرتضیٰ ۷۶

تحفۂ حسینیہ، تتمۂ دلیلِ اوّل و بیان فوائد و نکات ۷۷

مذہبِ شیعہ: دلیلِ دوم، ۸۴

" " دلیلِ سوم، امامِ ناحق کے تحت جہاد حرام ہے۔ ۸۵

" " تعاملِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ۸۶

" " دلیلِ چہارم، خلافتِ موعودہ خلافتِ صدیق و فاروق ہے ۸۷

تحفۂ حسینیہ، تقریرِ استدلال اور کلامِ امیر کے فوائد و قرائن ۹۰

بادشاہِ روم کا اعترافِ مغلوبیت اور غلبۂ اسلام کی شہادت ۱۰۱

علامہ ڈھکو صاحب کا جواب سے عجز اور بے بسی ۱۰۴

تعاملِ مرتضوی کے بیان میں غلط بیانی کا دعویٰ ۱۰۵

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشوروں اور تعامل کی توجیہ ۱۰۶

تحفۂ حسینیہ، شیعی توجیہات کا ردّ و ابطال ۱۰۷

ابن ابی الحدید کا منصفانہ فیصلہ ۱۱۵

خلفاءِ ثلاثہ کے دور میں حضرتِ امیر رضی اللہ عنہ کے جنگوں میں شامل نہ ہونے کی وجہ ۱۱۷

رسالہ مذہبِ شیعہ، حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی دعوائے خلافت سے دستبرداری ۱۲۰

شیعی تاویلات - رسالہ تنزیہ الامامیہ ۱۲۲

شیعی تاویلات کا بطلان - تحفۂ حسینیہ ۱۲۳

خلافت سے دستبرداری اور بے رغبتی کے مزید دلائل ۱۲۳

کیا از روئے عقل و درایت خلافت سے دستبرداری ممکن ہے؟ ۱۳۰

نگاہِ مرتضوی میں خلافت مثلِ سراب ۱۳۳

" " "خلافت جوتے سے بھی کم قیمت ۱۳۴

" " "خلافت بکری کے ناک کی ریزش سے بھی حقیر ۱۳۴

" " "خلافت خنزیر کی ہڈی سے بھی حقیر ۱۳۵

حضرتِ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف سے منصبِ امامت کی تحقیر کا لزوم ۱۳۷

ضرورتِ امیر اور امام ۱۳۸

منصبِ امامت ناقابلِ انتقال ہے تو غصب کیسے ہو گیا؟ ۱۳۹

حضرتِ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پیدائشی مظلوم ۱۴۰

رسالہ مذہبِ شیعہ، حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے وصیِّ رسول ہونے کی حقیقت ۱۴۱

تحفۂ حسینیہ، تتمۂ مبحث وصیت ۱۴۳

حضرتِ امیر رضی اللہ عنہ کے شوریٰ میں شامل ہونے کی شیعی تاویل اور اس کا ردِّ بلیغ ۱۴۷
وصیت و وراثت کے الفاظ پر مشتمل روایات کا صحیح مفہوم و معنیٰ ۱۴۸
وصیّت و خلافت پر صریح اور قطعی نص کا انکار ۱۴۹
وصیّتِ خلافت کے متعلق ابو جعفر نقیب بصرہ کا نظریہ ۱۵۱
اذنِ وصیّت نہ ملنے کی حکمت و مصلحت ۱۵۳
خلافت میں اختلاف و نزاع سے دور رہنے کی وصیت ۱۵۴
انوکھی وصیّت ۱۵۵
رسالہ تنزیہ الامامیہ ؛ وصیت کے تحقق و ثبوت کا دعوٰی ۱۵۶
تحفہ حُسینیہ ؛ ثبوت وصیت کے دعوٰی میں اپنی کتبِ صحیحہ کا رد ۱۵۷
روایاتِ وصیّت میں موجود تعارض دُور کیجیے ۱۵۸
متفق علیہ پر عمل اور مختلف فیہ کا رد کوئی صحیح قاعدہ نہیں ہے ۱۵۹
علامہ ڈھکو صاحب کا جھوٹا دعوٰی ۱۶۲
انکارِ وصیّت کے معارض روایات کی حقیقت اور سیّد مرتضیٰ و طوسی کا رد ۱۶۴
وصیتِ خلافت کے راویوں کا حال ۱۶۸
رسالہ مذہبِ شیعہ ؛ وصیِّ رسول ہونے کی حقیقت ۱۷۱
حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کا خلیفہ کے متعلّق سوال سے اجتناب ۱۷۱
تتمہ مبحث وصیّت ۱۷۲
انکارِ وصیّت کی روایات اور طوسی کے جوابات ۱۷۶
ابو جعفر طوسی کی مغالطہ آفرینی اور دھوکہ دہی ۱۷۸
رسالہ مذہبِ شیعہ ؛ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا بیعت کی پیش کش کو ٹھکرانا اور خلافت میں نزاع سے روکنا ! ۱۸۲

تحفہ حُسینیہ ؛ حضرت عباس اور ابو سفیان کی پیشکش کے مزید ثبوت ۱۸۳
تنقیحِ خطبہ اور وجہِ استدلال ۱۸۷
از روئے تقیہ بیعت و اطاعتِ ابو بکر کا رد بزبانِ مُرتضےٰ رضی اللہ عنہ ۱۸۹
شیعی شارحین نہج البلاغہ کا اضطراب ۱۹۲
طوسی کا اعتذار اور اس کا ردِّ بلیغ ۱۹۳
حضرتِ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے خوارج، باغیوں اور خارجیوں سے قتال کا عہد ۱۹۶
تحفہ حُسینیہ ؛ تتمہ مبحث مذکور ۱۹۷
حضرتِ امیر کی بیعتِ ابو بکر پر رضا و تسلیم ۱۹۸
خطبہ مذکورہ کے فوائد کا بیان اور اثباتِ مذہبِ اہلِ سنت ۲۰۱
حضرتِ امیر رضی اللہ عنہ اور دیگر اہلِ بیت پر تشدّد کا ابطال ۲۰۳
حضرتِ امیر کا تعامل خلفاء ثلاثہ کے ساتھ بزبانِ ابنِ ابی الحدید ۲۰۵
ابن ابی الحدید کا عقیدہ اور علماء شیعہ کی دھاندلی ۲۰۸
رسالہ مذہبِ شیعہ ؛ ظاہری بیعت ہی حقیقی بیعت ہوتی ہے ۲۱۰
بیعتِ مرتضوی کے لیے مالکِ اشتر وغیرہ کا تشدّد و جبر ۲۱۳
بارگاہِ نبوی میں خلفاء ثلاثہ کا مقام اور شانِ تقرّب ۲۱۸
ارشادِ نبوی میں تحریف کی ناکام سعی ۲۱۹
عظمتِ صدّیق رضی اللہ عنہ کا بیان بزبانِ رسالت بموقعہ ہجرت ۲۲۵
شیعی تشکیکات، روایتِ مذکورہ کے متعلق ـ رسالہ تنزیہ الامامیہ ۲۲۷
شیعی تشکیکات و تلبیسات کا ردِّ بلیغ ـ تحفہ حُسینیہ ۲۲۸
صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ اور رسولِ معظّم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اعتماد اور آپ کا اس اعتماد پر پورا اُترنا ـ نفیس بحث ـ ۲۲۹

علامہ طبرسی کا شیعی افسانہ نگاری سے گریز ۲۳
اس شبہ کا ازالہ کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر سکینہ کا نزول کیوں نہ ہوا؟ ۲۲۹
حرفِ شرط لانے کی حکمت اور ایثارِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا تقابلی جائزہ ۱۴۰
اہم نکتہ؛ حدیثِ ہجرت سے خلافتِ صدیق کا اثبات ۱۴۷
حضرتِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی افضلیت سلمان و ابوذر رضی اللہ عنہما پر ۲۴۸
شیعہ کا پیچ وتاب اور فرمانِ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی تحریف ۲۴۹
گروہِ اصفیاء بنو امیہ کا نہیں، بلکہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا تیار کردہ ہے ۲۵۱
شیعی تاویلات کا ردِ بلیغ ۲۵۱
کتبِ شیعہ میں سُنی راوی کیوں اور کیسے؟ ۲۵۶
مبحثِ دامادیٔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ برائے مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ۲۵۹
سینہ کوبی کا موجبِ اصلی ۲۶۱
تتمہ مبحثِ نکاح حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا ۲۶۲
تزویجِ اُمِ کلثوم کی وجہ سے حضرتِ امیر کی حضرت عباس پر ناراضگی ۲۶۵
بیوہ کی عدت اور تزویجِ امِ کلثوم رضی اللہ عنہا کا ثبوت ۲۶۸
نکاحِ اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا کے متعلق شیعی تاویلات اور ثبوتِ نکاح ۲۷۰
عقدِ امِ کلثوم رضی اللہ عنہا کا اعتراف از سید مرتضیٰ علم الہدیٰ ۲۷۳
عقدِ امِ کلثوم رضی اللہ عنہا کا اعتراف، از ابوجعفر طوسی شیخ الطائفہ ۲۷۴
سحیفہ جنیہ کا ام کلثوم کی صورت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نکاح و زفاف ۲۸۳
اس تاویل کا بطلان اور شیعہ کو درپیش الجھنیں ۲۸۴
کیا حضرتِ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عقدِ تزویج کے قائل جھوٹے ہیں؟ ۲۸۸
صاحبِ ناسخ التواریخ کا اعترافِ حقیقت اور اقرارِ تزویج ۲۸۷

شرم تم کو مگر نہیں آتی! ۲۸۸
عقدِ اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا میں تاویلات کی ضرورت کیوں؟ ۲۸۹
عقدِ نکاح کی روایات کو موضوع کہنے کی لغویت ۲۹۰
علامہ ڈھکو صاحب کی توجیہات - رسالہ تنزیہ الامامیہ ۲۹۱
علامہ صاحب کی جملہ توجیہات کا ردِ بلیغ - تحفہ حسینیہ ۲۹۲
از روئے درایت و روایت بنتِ علی رضی اللہ عنہ کے نکاح کا ثبوت ۳۰۲
اسلام میں رشتہ داری کا دارومدار ایمان داری پر ہے ۳۰۴
پیر صاحب کے اوّل فرج غصبناہ پر غصّہ کی وجہ ۳۰۵
علامہ مجلسی کا مذہب اور ڈھکو صاحب کی غلط بیانی ۳۰۷
علامہ ڈھکو صاحب کی تلبیس ہی تلبیس ۳۱۰
شیعی مؤرخ کی طرف سے ڈھکو صاحب کی تکذیب ۳۱۱
رسالہ مذہبِ شیعہ: بحثِ حدیثِ قرطاس ۳۱۶
تتمہ مبحثِ قرطاس - تحفۂ حسینیہ ۳۱۸
علامہ ڈھکو صاحب کی جوابی کارروائی ۳۲۶
علامہ صاحب کے جوابات کا مکمل رد - تحفہ حسینیہ ۳۳۰
سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھنے کے محال ہونے کا مطلب؟ ۳۳۱
کیا سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم صرف تہتر زبانیں جانتے تھے؟ ۳۳۴
کتب اہل السنت سے لکھنے کے متعلق ثبوت اور اس کا جواب ۳۳۵
نبی اُمّی کے نہ لکھنے کے بارے علمائے شیعہ کے اقوال ۳۳۶
ستر علوم پر دسترس اور ان میں لکھنے کی حقیقت ۳۳۹
آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اُمّی ہونے کا مطلب ۳۴۰

حدیثِ قرطاس کی دوسری توجیہ کے جواب میں فریب کاری — ۳۴۱

حضرتِ امام غزالی علیہ الرحمہ پر بہتان — ۳۴۲

کتاب سرّ العالمین شاہ عبدالعزیز کی نظر میں — ۳۴۵

امام غزالی علیہ الرحمہ نعمت اللہ جزائری شیعی کی نظر میں — ۳۴۶

حدیث قرطاس کی تیسری توجیہ کے جواب میں مکاری — ۳۴۹

شیعہ کا دعوٰی ہذیان دراصل ہذیان ہی ہے — ۳۵۳

حدیثِ قرطاس کی چوتھی توجیہ کے جواب میں حقائق پر پردہ پوشی — ۳۵۶

کیا صدیق وفاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی غیبی خبر خروجِ دجال کی پیشین گوئی کی مانند ہے؟ } اس شیعی توہم کا ردِ بلیغ — ״

کیا صدیق وفاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اظہارِ خلافت کی وجہ سے دِل ٹیڑھے ہو رہے تھے؟ — ۳۶۵

علماء شیعہ کی عداوتِ شیخین میں ہوش وخرد سے بیگانگی — ۳۶۹

ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی عداوت میں بے حیائی کی انتہا — ۳۷۱

علامہ ڈھکو صاحب کی جاہلانہ اور بے محل تنقید — ۳۷۳

رسالہ مذہبِ شیعہ: مبحث حدیث غدیر اور شیعی استدلال کا ابطال — ۳۷۴

تتمہ حدیثِ غدیر - تحفہ حسینیہ — ۳۷۵

خلافتِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور شیعہ وسُنّی محل نزاع — ۳۷۶

شیعی استدلال کی مدارِ صحت — ۳۷۷

امرِ اوّل کی تحقیق کہ حدیثِ غدیر متواتر اور قطعی الثبوت نہیں — ۳۷۸

امرِ ثانی کی تحقیق کہ مولیٰ کی دلالتِ خلافت بلافصل پر قطعی نہیں — ۳۷۹

مولیٰ بمعنیٰ خلیفہ بلافصل کے قرائن کی حیثیت — ۳۸۰

علامہ ڈھکو صاحب کی جوابی کارروائی — ۳۸۲

تحفہ حسینیہ: علامہ موصوف کے جوابات کا ردِ بلیغ — ۳۸۲

ڈھکو صاحب کا دعوٰی کہ مولیٰ بمعنیٰ اولیٰ بالتصرف ہے اور اس کا رد — ۳۸۴

علامہ ڈھکو صاحب کے قائم کردہ قرائنِ عشرہ اور ان کا ابطال — ۳۸۶

پہلا قرینہ: اَلستُ اولیٰ بالمؤمنین من انفسہم اور اس کا صحیح مفہوم — ۳۸۷

مولیٰ بمعنی محبوب پر قائم قرائن کا بیان — ۳۹۱

شیعی علماء کا منشار غلط — ۳۹۴

دوسرا اور تیسرا قرینہ مولیٰ بمعنیٰ اولیٰ بالتصرف، اہتمام اور فرمانِ نبوی — ۳۹۵

فرمانِ نبوی اور اہتمام کا پس منظر اور شیعی دعوٰی کا رد — ۳۹۶

تکرار اور تحصیل حاصل کے لزوم سے مغالطہ دینے کی کوشش — ۴۰۳

کیا اعلانِ خلافتِ امیر کے بغیر کارِ نبوت اکارت ہو رہا تھا؟ — ۴۰۵

کیا قولِ باری تعالیٰ، یاایھا الرسول بلّغ الآیہ غدیرِ خم پر نازل ہوا — ۴۱۰

بقولِ علماء شیعہ خلافتِ امیر کے اعلان میں نبوی پس وپیش — ۴۱۲

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خوفزدہ ہونے والے توہم کا بطلان — ۴۱۴

قولِ باری تعالیٰ، یا ایھا الرسول الآیہ کا شانِ نزول اور خارجی قرائن کا بیان — ۴۱۷

شانِ نزول میں غلط فہمی کی وجہ — ۴۲۱

چوتھا قرینہ، حارث فہری کا واقعہ — ۴۲۴

شیعہ وسُنّی علماء مفسرین کے نزدیک سَاَلَ سائل کا مصداق کون ہے؟ اور حارث فہری کب اور کہاں ہلاک ہوا؟ — ۴۲۷

شیعی استدلال کی مدارِ تفسیر ثعلبی اور واحدی کی حیثیت — ۴۲۹

پانچواں قرینہ، صحابہ کرام کی حضرتِ امیر رضی اللہ عنہ کو مبارکبادی — ۴۳۱

مبارک بادی وغیرہ والی روایت کی حقیقت ۴۳۲
اولیٰ اور مولیٰ ہونا حاکم وخلیفہ ہونے کو مستلزم نہیں ۴۳۳
مولیٰ بمعنیٰ اولیٰ سے کیا ثابت ہوا؟ ۴۳۶
چھٹا قرینہ: صحابہ کرام کو حکم دیا گیا کہ مرتضیٰ کو امیر المومنین (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے لقب سے سلام دیں!! ۴۳۷
امیر المومنین کے لقب سے سلام دینے والی روایت کی حیثیت ۴۳۸
ساتواں قرینہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی منقبت اور اس کا صحیح مفہوم ۴۴۵
آٹھواں قرینہ: حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے دوستوں کے لیے دعائے خیر اور دشمنوں کے لیے دعائے ہلاکت، اور اس قرینہ کی عدم مناسبت ۴۴۸
نانواں قرینہ: اعلانِ ولایت کے بعد تکمیلِ دین کی بشارت اس قرینہ میں اہلِ تشیع کی مغالطہ دہی اور خود فریبی ۴۴۹
قرآن مجید ایسے اہم فریضہ اور مدارِ اسلام کے بیان سے خاموش کیوں؟ ۴۵۲
دسواں قرینہ: حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا اس حدیث کو استحقاقِ خلافت میں بطورِ دلیل پیش کرنا اور اس کا ردِّ بلیغ۔ ۴۵۵
بیعتِ خلافت کے لیے ابوسفیان کا اصرار اور حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا انکار ۴۶۰
معیارِ صحت برائے روایات ۴۶۱
مولیٰ بمعنیٰ اولیٰ میں منشاء غلط - فائدہ ۱ ۴۶۳
مولیٰ کے معانی میں علماء شیعہ کا باہمی اختلاف - فائدہ ۲ ۴۶۵
ابوجعفر قمی کا بے بنیاد دعویٰ ۴۶۷
حدیث غدیر کی حقیقت حال اور صحیح مفہوم ۴۶۸

مبحث امامت وخلافت وفضائل خلفاء راشدین

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کا اس رسالہ کی تالیف سے بنیادی مقصد خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کے باہمی خوشگوار تعلقات کا بیان تھا اور اہل بیت کرام کی زبانی ان کے فضائل ومناقب کا بیان، اسی مناسبت سے آپ نے حضرات ائمہ اہل بیت کی زبانی عمومی فضائل کے اثبات کے ساتھ ساتھ اصحاب ثلاثہ کی خلافت کا برحق ہونا بھی ثابت فرمایا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حق میں کسی نص کے ورود یا وصیت وغیرہ کی بھی حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات سے نفی اور انکار ثابت فرمایا تاکہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم پر اہل تشیع کی طرف سے طعن وتشنیع اور ان کے ایمان واخلاص پر اعتراض وتنقید کی بنیاد ہی ختم ہو کر رہ جائے اور یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے کہ جو ترتیب خلفاء میں عملاً پائی گئی ہے وہی برحق ہے اور وہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہے جو انشاء اللہ العزیز آئندہ صفحات کے مطالعہ سے بالکل واضح ہو جائے گی لیکن یہاں پر چند امور بطور تمہید ذکر کرنے ضروری ہیں تاکہ اس مسئلہ میں اختلاف کی بنیاد اور اس کا دار ومدار واضح ہو جائے اور اس بنیاد واساس کو ملحوظ رکھ کر اس موضوع پر قائم کردہ دلائل کا مفید مدعا اور مثبت مطلب ہونا یا نہ ہونا قارئین کو معلوم ہو سکے اور اس مسئلہ میں دونوں فریق یعنی اہل السنت والجماعت اور اہل تشیع کے موقف کی صحت ودرستگی یا اس کا فساد وبطلان واضح ہو سکے، فاقول وعلی توفیقہ أعول۔

امر اول

اہل سنت کے نزدیک خلیفہ وامام کا تقرر اہل اسلام کی ذمہ داری ہے اور ان پر واجب ولازم افعال میں سے ایک اہم واجب اور لازم فعل ہے۔ اگر صحیح انتخاب کریں گے تو مستحق اجر وثواب ہوں گے ورنہ مستحق عتاب وعقاب جبکہ اہل تشیع کے نزدیک خلیفہ وامام کا انتصاب وتقرر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور بندوں کا قطعاً

اس میں کوئی دخل نہیں۔ پوری کائنات کے افراد مل کر بھی ایک شخص کو امام اور خلیفہ نہیں بنا سکتے اور از روئے عقل اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ امام و خلیفہ مقرر کرے کیونکہ اس میں مخلوق کی بالعموم اور نسل انسانی کی بالخصوص بھلائی اور بہتری ہے اور ہر ایسا کام جو عباد و بلاد کے لیے خیر اور بہتر ہو وہ اللہ تعالیٰ پر واجب و لازم ہوتا ہے، ملاحظہ ہو تجرید الطوسی و شرح تجرید للقوشجی وغیرہ۔

علامہ طوسی نے کہا: الامام لطف فیجب نصبہ علی اللہ تعالی تحصیلا للغرض" امام کا نصب کرنا لطف اور عنائت ہے لہذا اس کا مقرر کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے تاکہ غرض مطلوبہ حاصل ہو سکے۔ علامہ قوشجی نے اس کی شرح میں فرمایا: ذهب اهل السنة الی انه واجب علینا سمعا (الی) وذهبت الامامية الی انه واجب علی الله عقلاً و اختاره المصنف۔ اہل السنت اس طرف مائل ہیں کہ امام کا تعین ہم پر لازم ہے دلائل سمعیہ کی وجہ سے، جبکہ امامیہ کا مذہب و عقیدہ یہ ہے کہ دلائل عقلیہ کی رو سے امام کا نصب کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور یہی مضمون کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد للعلامہ الحلی ص۳۸۸ پر موجود ہے۔

لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ بعثت انبیاء علیہم السلام سے یہ مقصد پورا ہوا یا نہ؟ پہلی صورت میں ائمہ میں لطف کا انحصار باطل ہو گیا اور دوسری صورت میں بعثت انبیاء عبث ہو گئی نعوذ باللہ اور انبیاء و رسل کی بعثت تحصیل غرض کے لیے ناکافی ٹھہری۔ لہذا اہل تشیع کا بعثت انبیاء کو عبث بھی نہ ماننا اور لطف باری تعالیٰ کا ائمہ کے تقرر میں منحصر ماننا لغو و باطل ہو گیا۔ کما قال الطوسی فی التجرید: وانحصار اللطف فیه معلوم للعقلاء (تجرید مع الکشف ص۳۸۸)

امرِ ثانی

شیعہ کے نزدیک امامت کا عقیدہ قطعی عقاید میں داخل ہے اور اس پر ایمان و کفر اور نجات و ہلاکت کا دار و مدار ہے حتی کہ جو شخص بارہ ائمہ میں سے کسی کی امامت کا منکر

ہو وہ مؤمن نہیں ہو سکتا اور نہ ہی مستحق ثواب بلکہ اس کی نماز اور زنا برابر ہیں (کما ذکرہ القاضی فی المجالس جلد اول ص۴۸۲ و سیاتی ذکرہ) اور وہ انکار امامت کے بعد مرتدین کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے اس لیے انہوں نے تمام مہاجرین و انصار کو العیاذ باللہ تعالیٰ مرتد قرار دے دیا۔ کما قالوا: ارتد الناس إلا ثلاثه أو اربعة، تین یا چار افراد کے علاوہ سبھی مرتد ہو گئے ملاحظہ ہو: رجال کشی ص۱۲۔ انوار نعمانیہ ص۸۱ ج۱، روضہ کافی للکلینی ص۲۹۶، ۲۵۳، ۲۵۴، اس مبحث کو مستقل باب قائم کر کے اصول کافی جلد اول ص۳۷۲ تا ص۳۷۸ بیان کیا ہے اور امام حق کے ساتھ امام جائر کو ملانے والوں کو مشرک اور کافر کہا گیا اور ان کے لیے عذاب الیم ثابت کیا گیا ہے۔

امرِ ثالث

شیعہ کے نزدیک امام و خلیفہ کا منصوص ہونا لازمی ہے جبکہ عباسیہ کے نزدیک امام کا تعین نص سے بھی ہو سکتا ہے اور وراثت کے طریقہ پر بھی۔ زیدیہ نے کہا ہے کہ نص موجود ہونی ضروری ہے یا امام کا لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینا جب کہ دوسرے فرق اسلامیہ کے نزدیک تنصیص یا اہل حل وعقد کے انتخاب و اختیار سے اس کا تقرر ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو کشف المراد ص۳۹۲: المسألة الرابعة فی وجوب النص علی الامام اقول ذهبت الامامية خاصة الی ان الامام يجب ان يكون منصوصا عليه الخ لہذا جب تک خصوصی نص امام کے نام اور اس کے منصب امامت پر دلالت کرنے والی موجود نہ ہو گی اور اس کا ثبوت اور دلالت بھی قطعی نہیں ہو گی۔ اس وقت تک کسی امام کی امامت ثابت نہیں ہو سکے گی کیونکہ قطعی عقیدہ قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت دلیل سے ہی ثابت ہو سکتا ہے یعنی غیر مؤول آیت یا متواتر حدیث سے، جس طرح کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اقدس کی تصریح کے ساتھ ہی منصب رسالت کا ذکر صریحۃ الدلالہ آیت میں موجود ہے اور متواتر روایات و احادیث سے بھی آپ کا دعویٰ نبوت و رسالت اور اظہار معجزات

ثابت ہے۔ اسی طرح ائمہ کے حق میں بھی نام کی صراحت اور منصب امامت کی وضاحت ضروری ہے۔

امرِ رابع

جس امامت میں یہاں بحث اور کلام ہے اس سے مراد فقط روحانی مرتبہ اور اللہ تعالیٰ کا قرب نہیں ہے جو ہر ولی کو حاصل ہوتا ہے نہ محض تبلیغ احکام جو ہر عالم کر سکتا ہے بلکہ اس سے مراد ہے نیابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طور پہ دینی اور دنیوی امور میں سیادت و قیادت کما قال فی شرح التجرید: هي رياسة عامة فی امور الدين والدنيا خلافة عن النبي اس اجمال کی تفصیل حضرت امام رضا رضی اللہ عنہ کی زبانی سماعت فرمائیں تاکہ اس معاملہ میں اہل السنہ اور اہل التشیع کا اجماع و اتفاق واضح ہو جائے۔

ان الامامة زمام الدين و نظام المسلمين و صلاح الدنيا و عز المؤمنين، ان الامامة رأس الاسلام النامي و فرعه السامي، بالامام تمام الصلوٰة والزكوٰة والصيام والحج والجهاد و توفير الفيئ و الصدقات و امضاء الحدود والأحكام و منع الثغور والأطراف. الامام يحل حلال الله و يحرم حرام الله و يقيم حدود الله و يذب عن دين الله و يدعو الى سبيل ربه بالحكمة والموعظة الحسنة والحجة البالغة الخ

(احتجاج للطبرسی مطبوعہ مشہد ص۲۳۲)

بے شک امامت دین کے لیے زمام ہے اور لوگوں کو دین پر برقرار رکھنے کا موجب ہے اور اہل اسلام کے لیے ذریعہ نظم و ضبط ہے۔ دنیا کی اصلاح اور بہتری ہے اور اہل ایمان کے لیے عز و افتخار امامت اسلام کے لیے بمنزلہ سر کے ہے جو بلند و بالا ہے اور اس کی بلند مرتبت فرع ہے۔ امام کے ذریعے ہی نماز، زکوٰۃ، روزہ، اور حج کی تتمیم و تکمیل ہے اور اس کے ذریعے جہاد، اور اموال فئی اور غنائم و صدقات کی فراوانی ہے اور حدود و احکام کا نفاذ و اجراء اور دار اسلام کی سرحدات اور اطراف کا

تحفظ۔ امام ہی اللہ تعالیٰ کے حلال کو حلال ٹھہراتا ہے اور اس کے حرام کو حرام قرار دیتا ہے وہی اللہ تعالیٰ کے حدود کو قائم کرتا ہے اور اس کے دین کا دفاع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف اور راہ ہدایت کی جانب حکمت بالغہ، موعظت حسنہ اور حجت غالبہ کے ساتھ دعوت دیتا ہے۔

علامہ حلی نے محقق طوسی کے اس دعویٰ پر کہ امام کا نصب کرنا لطف محض ہے دلیل قائم کرتے ہوئے کہا: اذ العلم الضروري حاصل بأن العقلاء متى كان لهم رئيس يمنعهم عن التغالب والتهاوش و يصدهم عن المعاصي و يعدهم و يحثهم على فعل الطاعات و يبعثهم على التناصف والتعادل كانوا الى الصلاح اقرب و من الفساد أبعد وهذا أمر ضروري لا يشك فيه عاقل۔ (کشف المراد ص۳۸۸)

یعنی اس امر کا علم بدیہی ہر ایک کو حاصل ہے کہ جب اہل عقول کے لیے ایک رئیس اور امیر ہو جو ان کو ایک دوسرے پر غلبے اور تسلط سے منع کرے اور معاصی و ذنوب سے منع کرے۔ طاعات و عبادات کے لیے آمادہ اور تیار کرے اور باہمی عدالت و انصاف پر برانگیختہ کرے تو وہ صلاح اور بہتری کے قریب تر ہوں گے اور فساد اور برائی سے بعید تر اور یہ واضح حقیقت ہے جس میں کوئی عقلمند شک و شبہ نہیں کر سکتا۔

ابطال عقیدہ شیعہ

ان معروضہ امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور عدل و انصاف کا دامن تھامتے ہوئے بتلائیں کہ کہیں کلام مجید میں اللہ تعالیٰ نے بارہ ائمہ میں سے کسی ایک کا نام تک بھی ذکر فرمایا ہے۔ جب نہیں اور یقیناً نہیں تو اس عقیدہ کو قرآن مجید سے ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے خلفاء اور ائمہ کے متعلق کوئی ابہام نہ چھوڑا بلکہ تصریح سے کام لیتے ہوئے خلافت و امامت ان کے لیے ثابت فرمائی اور مخلوق خدا کے لیے

لطف وعنایت کا اظہار فرمایا مگر ائمہ اہل بیت کی باری آئی تو یہ لطف الٹا موجب افتراق و انتشار اور نزاع وجدال بن گیا اور خود شیعہ دو درجن فرقوں میں بٹ گئے" اور بقیہ ملوائسٹ اسلام چہ اسماء اور بارہ میں سے جو گزر چکے ان کی اکثریت دنیوی حکومت سے محروم رہی اور جن کو یہ حکومت ملی، تو وہ صحیح عقائد اور اعمال جاری نہ کر سکے کیونکہ عساکر اور رعایا کے الگ ہو جانے کا اندیشہ تھا تو ایسی صورت میں ان میں سے کسی کے حق میں امامت وخلافت کا وہ مفہوم ومعنی اور تعریف سچی نہیں آتی جو شیعی علماء نے ذکر کی ہے بلکہ امام رضا رضی اللہ عنہ نے ذکر کی ہے۔ رہا احادیث کا معاملہ تو ان میں تواتر ثابت کرنا ناممکن ہے بلکہ اکثر احادیث اور روایات کا از روئے اصطلاح صحیح ہونا بھی محل نظر ہے چہ جائیکہ ان کا اختصاص ثابت ہو، مثلاً قول باری تعالیٰ: وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض الآیۃ میں زمین کے اندر حکومت اور اقتدار وتصرف، دین کا استحکام اور خوف کو امن میں بدلنے کا وعدہ ہے جبکہ ان حضرات کو حکومت ہی نہ ملی اور ملی بھی تو اپنے دین کو نافذ نہ کر سکے اور ہر وقت رعایا اور لشکریوں سے ڈرتے رہتے اور ان کی مرضی کے مطابق چلتے رہے اور تقیہ سے کام لیتے رہے۔ اسی لیے شیعہ علماء کی عظیم اکثریت نے اس کو صرف اور صرف حضرت مہدی علیہ السلام پر منطبق کیا ہے جبکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبات سے اس کا مصداق حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ہیں جیسے کہ آیندہ اوراق میں ارشادات مرتضویہ سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا۔ بھی ائمہ کے اسماء مبارکہ کی تصریح سے خالی ہے اور والذین آمنوا تمام مہاجرین وانصار کو شامل ہے اور اگر روایت ساتھ ملائیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حالت رکوع میں زکوٰۃ دی تھی وہی اس کا مصداق ہیں تو بھی قطعیت ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ روایت اخبار آحاد کے قبیل سے ہے اور استدلال کا دارومدار اس پر ٹھہرا جب وہ قطعی الثبوت نہیں ہے تو اس سے یہ قطعی عقیدہ کیونکر ثابت ہو سکتا ہے؟ علاوہ ازیں اگر یہ قید یعنی یؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون اتفاقی ہے تو جنہوں نے زکوٰۃ حالت رکوع میں

نہیں دی ان کی امامت کی نفی نہیں ہو سکتی لہٰذا دعوٰی اختصاص باطل ہو گیا اور اگر احترازی ہے تو جس طرح خلفاء ثلاثہ کی خلافت وامامت کی نفی ہو گی دیگر ائمہ کرام کی امامت کی بھی نفی لازم آئے گی کیونکہ حالتِ رکوع میں صدقہ دینا صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں ثابت کیا جاتا ہے لہٰذا یہ دلیل بجائے بارہ ائمہ کی امامت کو ثابت کرنے کے الٹا ان میں سے گیارہ کی نفی کر دے گی۔ کیونکہ دس حضرات کے حق میں تو حالت رکوع میں صدقہ کرنا ثابت نہیں ہے اور گیارہویں گو مخفی ہیں اور احتمال ہے کہ حالت رکوع میں انہوں نے صدقہ دیا ہو لیکن یہ احتمال مقام استدلال اور محل یقین میں کارآمد نہیں علی الخصوص جبکہ اس علامت کو امتیاز امام کے لیے بیان کیا گیا ہو تو جب ہمیں معلوم ہی نہ ہو کہ امام صاحب ہیں کہاں اور نماز کس طرح ادا فرمائی اور جب دوسرا شخص پاس نہیں ہے تو صدقہ کس کو دیا تو کس طرح یقین حاصل ہو گیا کہ وہ اس آیت کے مصداق ہیں اور اس امتیازی صفت کے ساتھ موصوف

علاوہ ازیں جس طرح شان نزول میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صدقہ کرنے کو بیان کیا جاتا ہے اسی طرح یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اہل کتاب میں سے ایمان لانے والے حضرات کے ساتھ اہل کتاب یہود کے بائیکاٹ کرنے پر ان کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر وہ تم سے الگ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور ایمان والے تمہارے معاون و مددگار ہیں لہٰذا تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اس صورت میں اس کا محل نزاع سے ذرہ بھر تعلق ہی نہ رہا کیونکہ یہاں پر نہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خلافت بلا فصل ثابت کرنی مقصود ہے بلکہ ان حضرات کی معاونت اور نصرت اسی طرح دیگر اہل ایمان کی طرف سے بھی خلافت بلا فصل کا اثبات مقصود نہیں ہے بلکہ ان کے بھائی چارے برادرانہ روابط اور امداد واعانت کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس آیت کریمہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت وخلافت کا اعلان ہو چکا تھا تو غزوہ تبوک اور حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان خلافت تکرار محض ہے اور علی الخصوص حجۃ الوداع کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خطرات اور اندیشوں کا اظہار اور عصمت وحفاظت کی ضمانت کا مطالبہ کرنا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جیسے کہ ناظرین اس مبحث کا " من کنت مولاہ فعلی مولاہ"

کے ضمن میں مطالعہ کریں گے۔ اسی لیے شیعہ صاحبان کو اس اشکال سے جان چھڑانے کے لیے کہنا پڑا کہ گو خلافت امیر کا تذکرہ تو اس آیت میں تھا لیکن لوگ اس کو سمجھتے نہیں تھے۔ اس لیے حجۃ الوداع میں یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ کہہ کر اس کا اعلان کرانا پڑا۔ ملاحظہ ہو شیعی ترجمہ مقبول کا حاشیہ ص۱۸۵ لیکن یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ اہل زبان جن کے محاورات کے مطابق قرآن نازل ہوا اور جن کو تعلیم اور تربیت دینے کے لیے رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا تو وہ ولایت کا معنی کیوں نہ سمجھے اور انہیں اس طویل عرصہ میں سمجھایا کیوں نہ گیا اور ان سے رکوع میں زکوٰۃ دینے والی شخصیت مخفی کیسے رہ گئی۔ چنانچہ واضح ہو گیا کہ اس میں بھی کوئی تنصیص اور تخصیص ائمہ اور خلفاء کی موجود نہیں ہے۔

الغرض یہاں ان آیات پر تفصیلی بحث کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ناظرین وقارئین کو بطور اجمال اور اختصار یہ بتلانا مقصود ہے کہ اہل تشیع کے پاس کوئی صریح اور قطعی دلیل اس دعویٰ پر نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر واجب اور فرض امر کو ان ائمہ کا تقرر کر کے ادا فرمایا اور اس طرح ہدایت خلق اور ان کی سیاست کا اہتمام فرمایا اور منصب امامت و خلافت کو صرف خاندانِ نبوت بالعموم اور خاندان امام حسین کے ساتھ بالخصوص مختص فرما دیا ہے۔ لہٰذا یہ عقیدہ عقیدہ نہیں ہے بلکہ سراسر وہم و وسوسہ ہے اور علی الخصوص جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سب سے پہلے خلافت بلافصل اور وصیت کا راز کھلا تو ۳۵ھ ہجری میں اور وہ بھی ایک یہودی نو مسلم پر تو اس کے سراسر سازش ہونے کا یقین ہو جاتا ہے اور اہل اسلام کے اندر نظریاتی آویزش پیدا کرنے کا خطرناک منصوبہ ہونے کا جزم واذعان۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا چوتھا خلیفہ ہونا

لہٰذا صحیح عقیدہ و نظریہ یہی ہے کہ خلیفہ کا تقرر اہل اسلام کے فرائض میں سے ہے کما قال المرتضیٰ رضی اللہ عنہ لابد للناس من امام بر او فاجر الخ

کہ لوگوں کے لیے اچھے یا برے امام کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر صحیح امام کو مقرر کریں گے تو مستحق اجر و ثواب ورنہ مستحق عذاب و عقاب، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی حقیقت کو اپنے خطبات میں واضح کیا اور خود اسی طریق کار کے مطابق منتخب ہوئے اور اسی انتخاب کو اپنی حقانیت خلافت کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا بلکہ یہاں تک تصریح فرما دی کہ میں چوتھا خلیفہ ہوں اور جو مجھے چوتھا خلیفہ تسلیم نہ کرے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ کما فی مناقب ابن شہر آشوب: قال امیر المومنین من لم یقل انی رابع الخلفاء فعلیہ لعنۃ اللہ۔ جلد ثالث ص۲۵۵

علماء شیعہ کی تحریف اور اس کا رد بلیغ

علماء شیعہ نے اس فرمان مرتضوی کو دیکھا تو سارے عقیدہ پہ پانی پھرتا نظر آیا لہٰذا لنگر لنگوٹ کس کر تاویلات و تسویلات کے در پے ہو گئے اور بڑی عجیب و غریب تعبیرات شروع کر لیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ یہاں پر حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہم کے بعد چوتھا خلیفہ مراد نہیں ہے بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد چوتھے خلیفہ مراد ہیں کیونکہ پہلے خلیفہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں قال اللہ تعالیٰ: انی جاعل فی الارض خلیفۃ۔ دوسرے حضرت ہارون علیہ السلام قال اللہ حکایۃ عن موسیٰ علیہ السلام: واذ قال موسیٰ لاخیہ "ھارون اخلفنی فی قومی" اور تیسرے خلیفہ حضرت داؤد علیہ السلام ہیں "قال اللہ تعالیٰ: یا داود انا جعلناک خلیفۃ فی الارض" اور چوتھے خلیفہ آپ ہو گئے۔ کما قال تعالیٰ۔

"وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات یعنی علیاً لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم آدم وداؤد وھارون ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم یعنی الاسلام الخ۔

(مناقب جلد سوم ص۶۳)

لیکن یہ توجیہ وتاویل سراسر لغو اور باطل ہے کیونکہ بحث لفظ خلیفہ اور خلافت میں نہیں بلکہ اس معنی ومفہوم میں ہے جس کا ذکر قبل ازیں امام رضا رضی اللہ عنہ کی زبانی اور دیگر علماء شیعہ کی زبانی ہوچکا اور اس معنی ومفہوم کا انبیاء کرام علیہم السلام میں سے صرف تین میں منحصر کرنا اور غیر انبیاء علیہم السلام میں سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ میں منحصر کرنا یا ان کی اولاد میں بالکل باطل اور خلاف واقعہ ہے۔

اوّلاً

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امام ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے اور بقول شیعہ وہ نبی ورسول پہلے تھے اور خلیل بھی بعد ازاں تکمیل مراتب کے طور پر ان کو امامت کا منصب عطا کیا گیا، کما قال تعالیٰ: إنی جاعلك للناس اماماً " اور اپنی اولاد کے لیے انہوں نے یہ منصب اللہ تعالیٰ سے طلب کیا۔ تب ان کو امامت وخلافت نصیب ہوئی تو کون سا عقلمند ہوگا جو پہلے ثابت اور متحقق امامت وخلافت کا انکار کردے اور ازراہ لطف اس میں دوسرے شریک کیے جانے والوں کی امامت وخلافت کا اقرار واعتراف کرے " قال ومن ذریتی قال لا ینال عهدی الظالمین" اور امام رضا رضی اللہ عنہ کی تصریح کے مطابق ان کی اولاد میں حضرت اسحاق، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب بھی منصب امامت پر فائز ہوئے کما قال تعالیٰ:

وجعلناهم ائمة یهدون بأمرنا وأوحینا الیهم فعل الخیرات واقام الصلوٰة الایۃ (احتجاج ص ۲۳۳)

ثانیاً

حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کو تو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ تسلیم نہ کیا جائے اور جس ہستی کو وہ عارضی طور پر اپنا خلیفہ بنائیں اس کو خلیفۃ اللہ تسلیم کر لیا جائے، کیا اس سے بڑی حماقت کا مظاہرہ بھی ہوسکتا ہے؟ حالانکہ وقتی طور پر روانگی سے قبل یا واپسی کے

بعد حضرت ہارون علیہ السلام وزارت کلیم کے منصب پر فائز تھے کما قال تعالیٰ۔ "واجعل لی وزیراً من اهلی هارون اخی اشدد به ازری" اگر موسیٰ علیہ السلام کے وزیر خلیفۃ اللہ ہیں تو وہ خود کیوں اس منصب سے محروم ہیں۔

ثالثاً

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ تسلیم کیا گیا لیکن ان کے فرزند ارجمند جو منصب نبوت پر بھی فائز اور حضرت داؤد علیہ السلام کی نسبت عظیم ترین سلطنت کے مالک، جن کے زیر تصرف شرق تا غرب تھا اور جن وانس اور چرند پرند اور درند بھی بلکہ ہوا بھی اور ایسی حکومت وسلطنت اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی جو بعد میں بھی بظاہر کسی کو حاصل نہ ہوئی کما قال تعالیٰ: رب هب لی ملکا لا ینبغی لأحد من بعدی" نیز اولاد علی رضی اللہ عنہم میں بطور وراثت امامت وخلافت کو تسلیم کیا گیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام از روئے نص قرآن حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث ہیں کما قال تعالیٰ: وورث سلیمان داؤد " لہٰذا ان میں یہ امامت اور خلافت کیوں تسلیم نہ کی گئی۔

رابعاً

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سید الانبیاء والمرسلین اور شہنشاہ عرب ہونے کے باوجود خلیفہ اللہ تسلیم نہیں کیا گیا حالانکہ آپ نے تبلیغ احکام اور تنفیذ حدود کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا اور اس عظیم مقصد کے لیے ہر قسم کی تکلیف برداشت فرمائی تو آپ نے جس کے متعلق "انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ" فرمادیا یا " من کنت مولاه فعلی مولاه " تو اس کا خلیفۃ اللہ ہونا کیسے ثابت ہوگیا۔ آپ مولیٰ پہلے ہوں گے تب حضرت علی مولیٰ ہوں گے اور آپ پہلے خلیفۃ اللہ ہوں گے تب آپ کا نائب خلیفۃ اللہ ہوگا اور جب آپ ہی خلفاء کی فہرست سے خارج ہو گئے نعوذ باللہ

توآپ کا وارث اور جانشین خلیفۃ اللہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

خامسًا

حضرت طالوت کے لیے اس وقت کے پیغمبر حضرت شموئیل نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے حضرت طالوت کو بنی اسرائیل کی سیاست اور نگرانی کے لیے احکام شرع کے نفاذ اور جہاد و قتال کے لیے مبعوث فرمایا کما قال تعالیٰ: ان اللہ بعث لکم طالوت ملکا (الی) ان اللہ اصطفاہ علیکم وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم واللہ یؤتی ملکہ من یشاء واللہ واسع علیم"

"اور حضرت امام رضا رضی اللہ عنہ نے خود انہیں ائمہ میں شمار فرمایا۔ ملاحظہ ہو احتجاج طبرسی ص۲۳۶ لہذا انہیں ائمہ اور خلفاء میں شمار نہ کرنا سراسر دھاندلی ہے اور تحکم و سینہ زوری۔

سادسًا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حقیقی خلیفے اور جانشین حضرت یوشع علیہ السلام تھے حتیٰ کہ بقول شیعہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "انت منی بمنزلۃ یوشع بن نون من موسیٰ"، تمہارا اور میرا وہ تعلق اور نسبت ہے جو یوشع علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تعلق اور ربط و مناسبت تھی، ملاحظہ ہو مناقب ابن شہر آشوب جلد ۳ ص ۲۵۲ جب طور پر جاتے ہوئے عارضی خلافت حضرت ہارون علیہ السلام کو ملی اور وہ خلیفۃ اللہ بن گئے تو جو آپ کے وصال کے بعد تا زیست خلیفہ رہے اور جنہوں نے ملک فلسطین فتح کر کے بنو اسرائیل کی حکومت و سلطنت قائم کی اور جہاد و قتال کے ذریعے اموال غنیمت جمع کئے اور احکام شرع کو نافذ کیا وہ کیونکر خلیفۃ اللہ تسلیم نہ کئے جائیں۔

سابعًا

حضرت آدم علیہ السلام کی حیات طیبہ میں صرف ان کی اولاد بلاواسطہ یا بالواسطہ ہی موجود تھی اور اولاد کے لیے خیر و شر اور حق و باطل کی توضیح و تشریح اگر خلافت قرار پا سکتی ہے تو کفار و مشرکین اور اقربا و اعداء کی طرف مبعوث ہونے والے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والے کیوں خلفاء اللہ تسلیم نہیں کئے جا سکتے جنہوں نے ایذائیں برداشت کیں اور شہید بھی کر دیئے گئے مگر اس فرض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی روا نہ رکھی اور تقیہ وغیرہ سے کام نہ لیا لہذا ہر نبی کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ تسلیم کرنا ضروری ہے نہ کہ صرف حضرت آدم علیہ السلام کو کیونکہ جو معنی خلافت کا ان میں موجود ہے وہ تمام انبیاء علیہم السلام میں موجود ہے۔ اسی لیے خود شیعی روایات کے مطابق ان کو بادشاہ انبیاء میں شمار نہیں کیا گیا عن ابی جعفر قال ان اللہ لم یبعث الانبیاء ملوکا فی الأرض إلا اربعۃ بعد نوح ذوالقرنین وداؤد وسلیمان ویوسف علیهم السلام۔ اور عنوان بھی خصال شیخ صدوق جلد اول ص۲۲۸ میں یہی قائم کیا گیا ہے "ملوک الانبیاء فی الأرض اربعۃ" یعنی انبیاء علیہم السلام میں سے زمین کے بادشاہ صرف چار ہوئے ہیں جبکہ شیخ صدوق نے ذوالقرنین کو انبیاء سے خارج کر دیا ہے تو صرف تین رہ گئے جن میں آدم علیہ السلام کا نام شمار ہی نہیں کیا گیا۔ لہذا ان میں ریاستہ عامہ موجود ہی نہیں تھی تو محل نزاع میں اس خلافت کا ذکر درست ہی نہیں ہو سکتا۔

عجیبہ

امام پنجم نے خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی ملوک الانبیاء سے نکال دیا ہے تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کس طرح ثابت کی جا سکتی ہے؟

ثامناً

جو خلافت و امامت حضرت آدم، حضرت ہارون، حضرت داؤد علیہم السلام میں ثابت ہے وہ حکومت و سلطنت کے علاوہ نبوت و رسالت کے معنی میں ہے جبکہ حضرات اہل بیت میں نبوت تسلیم کرنا کفر ہے۔ اسی لیے حضرت امام ابو عبداللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

عن ابی بصیر قال لی ابو عبد اللہ علیہ السلام یا ابا محمد ابرأ ممن یزعم انا ارباب قلت برئ اللہ منہ فقال ابرأ ممن زعم انا انبیاء قلت برئ اللہ منہ (رجال الکشی ص۲۵۲)

اے ابو محمد میں اس شخص سے براءت کا اظہار کرتا ہوں جو کہے کہ ہم ارباب یعنی آلہ ہیں (ابو بصیر کہتے ہے) میں نے کہا اللہ تعالےٰ اس سے بری ہو۔ پھر آپ نے فرمایا میں ان سے بری ہوں جو کہتے ہیں کہ ہم انبیاء ہیں میں نے کہا اللہ تعالیٰ ان سے بری ہے۔

لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ان حضرات کی خلافت کے ساتھ جوڑنا آپ کو بھی نبی و رسول تسلیم کرنے کے مترادف ہے اور صرف لفظی تبدیلی کی آڑ میں اس غلو کا مظاہرہ کیا گیا ہے جس سے امام صادق نے براءت کا اظہار کیا ہے نعوذ باللہ منہ۔

تاسعاً

علاوہ ازیں آپ کا انبیاء سابقین علیہم السلام کے ساتھ خلافت میں مرتبہ و مقام کون سا ہے اس میں نہ امت کو بحث و نزاع تھی اور نہ اس میں کلام و سخن تو اس ضمن میں اس قدر وعید و تشدید کا کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتا تھا بلکہ یہ سراسر محل حیرت اور تعجب ہے کہ بحث تو ہے وصال مصطفوی کے بعد خلافت میں کہ اصل اور اول خلیفہ کون ہے؟ اور فتویٰ لگایا جا رہا ہے ان پہ جو آپ کو انبیاء سابقین کے ساتھ ملا کر چوتھا خلیفہ تسلیم نہ کریں۔ آخر حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب۔

حضرت یوسف، حضرت سلیمان اور حضرت یوشع علیہم السلام کے بعد آپ کو کیوں خلیفہ تسلیم نہ کیا جائے؟

عاشراً

مرتبہ و مقام کے لحاظ سے عند الشیعہ آپ ان تین خلفاء سے بھی افضل ہیں اور دوسروں سے بھی سوائے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اور زمانی ترتیب کے لحاظ سے جس طرح تین سے مؤخر ہونا درست ہے دس گیارہ سے مؤخر ہونا بھی درست ہے بلکہ ہزاروں سے مؤخر ہونا بھی درست اور صحیح ہے لہٰذا چوتھے درجہ میں تسلیم نہ کرنے والا لعنت کا حقدار کیونکر ہو سکتا ہے؟

الغرض یہ تاویل و توجیہ سراسر لغو اور باطل ہے اور نا قابل قبول و التفات بلکہ اس فرمان کا صحیح اور صریح واضح اور بے غبار معنی و مفہوم یہی ہے کہ میں امت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء میں سے چوتھا برحق خلیفہ ہوں اور مجھے بلا فصل خلیفہ ماننے والا اور خلفاء ثلاثہ کی خلافت کا انکار کرنے والا اللہ تعالیٰ کی لعنت کا حقدار ہے۔ اگر شیعہ صاحبان کو اس ظاہری معنی پر ایمان لانے کی توفیق نہ ہو تو کم از کم اس قدر تسلیم کر لینے میں تو ان کے مذہب پہ کوئی اثر نہیں پڑتا کہ رعایا اور لشکریوں کی ہمنوائی اور خوشنودی کے لیے جس طرح آپ ان کو اس امت میں سب سے افضل قرار دیتے تھے، "خیر هذه الأمة بعد نبيها ابو بكر وعمر" اسی طرح انہیں کی دلجوئی اور تسکین کے لیے ان کو خلفاء تسلیم کر لیا اور اپنے آپ کو چوتھا خلیفہ کہہ دیا۔ تاکہ امیر معاویہ کو آپ کی رعایا اور لشکریوں کو بدظن کرنے اور آپ سے برگشتہ کرنے کا موقعہ ہاتھ نہ آ سکے، اور ہمارا مدعا اس سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ آپ کا ظاہر مذہب جس کی ترویج و اشاعت اور تعلیم و تبلیغ آپ نے فرمائی وہ یہی تھا کہ میں خلیفہ بلا فصل نہیں ہوں بلکہ چوتھا خلیفہ ہوں اور پہلے تینوں برحق خلفاء ہیں اور جو طریقہ انتخاب ان کا ہے وہی طریقہ انتخاب میرا ہے اور جن اہل حل و عقد نے ان کو اس منصب کے لیے اہل قرار دیا انہوں نے مجھے اس منصب کا

اہل قرار دیا ہے اور ان کا انتخاب اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے اور ان کی رضا اللہ کی رضا لہٰذا وہ بھی میری طرح اللہ تعالےٰ کے مقرر کردہ خلفاء ہیں۔

اگر باطنی نظریہ بھی یہی تھا تو چشم ما روشن دل ماشاد اور اگر در پردہ کسی دوسرے نظریہ کی تبلیغ فرماتے تھے تو اس کا جواب شیعہ برادری کی ذمہ داری ہے کہ آپ نے دوسرا اسلام کیوں جاری کیا اور ملت اسلامیہ کو افتراق و انتشار سے دوچار کیوں کیا، جو ذلت و ابتری اس افتراق و انتشار کی وجہ سے ملت اسلامیہ کو درپیش ہے اس کی ذمہ داری سے ابو الائمہ کی ذات کو بری کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور کیا ائمہ اور قائدین اسلام کا رویہ یہی ہونا چاہیے جو ان لوگوں نے شیر خدا رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ علاوہ ازیں ہم تو ظاہر کو دیکھ سکتے ہیں اور اسی کا اعتبار کر سکتے ہیں آپ کے دل اقدس میں کیا تھا وہ اللہ تعالیٰ جانے یا آپ جانیں۔ ظاہر کے لحاظ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک وہ برحق خلفاء تھے اور مہاجرین و انصار کا یہ انتخاب اللہ تعالیٰ کا ہی انتخاب تھا۔ کما قال رضا المخلوق عنوان رضا الخالق جل و علی۔

اور یہی امر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی ظاہر ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

"ھوالذی جعلکم خلائف الأرض ورفع بعضکم فوق بعض درجات لیبلوکم فیما آتاکم ان ربك سریع العقاب وانه لغفور رحیم"

"اور وہ خدا وہی تو ہے جس نے تم کو زمین کا متصرف بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں فوقیت دی تاکہ جو نعمت تم کو دی ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بیشک تمہارا پروردگار جلد عذاب دینے والا ہے اور بے شک وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنیوالا ہے (ترجمہ مقبول) اور حاشیہ میں اسی مترجم نے یوں صراحت کی ہے: "خلائف الأرض کے معنی ہیں وہ گروہ جو پہلے گروہ کا قائم مقام ہو اور زمین میں تصرف کرے جیسے کہ اہل اسلام جو یہود و نصاریٰ کی اور مجوس کی سلطنتوں کے فاتح اور ان کے تصرف و تسلط کے قائم مقام بنے (مقبول ترجمہ ص۲۳۶ سورہ انعام)

اور یہی معنی ہوں گے اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد گرامی کے "وعد اللہ

الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات یستخلفنھم فی الارض (الآیہ) البتہ واقع میں چونکہ یہ تصرف و تسلط مستقبل میں حاصل ہونے والا تھا تو اس حقیقت کے پیش نظر مضارع مؤکد کے ساتھ اس کو تعبیر فرمایا اور چونکہ یہ حتمی اور قطعی فیصلہ تھا اور اس کا وقوع یقینی تھا لہٰذا اس کو ماضی سے تعبیر کرتے ہوئے جعلکم خلائف الأرض فرمایا جیسے کہیں نفخ فی الصور فرمایا اور کہیں یوم ینفخ فی الصور کہا۔ لہٰذا اس آیت مبارکہ کی تخصیص یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کرنا غلط ہے اور خلاف واقعہ اور اسی طرح حضرت مہدی علیہ السلام کے ساتھ اس کو مخصوص ٹھہرانا بھی غلط ہے اور خلاف واقعہ بلکہ وہ تمام امراء اسلام و خلفاء و سلاطین اس کا مصداق ہیں جنہوں نے دین اسلام کو مستحکم اور مضبوط کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور جن کے دور میں اہل اسلام کا خوف امن سے بدل گیا اور مجوس و یہود اور نصاریٰ کی حکومتوں سے کسی قسم کا اندیشہ و فکر ان کو دامن گیر نہ رہا۔

سواد اعظم کا مذہب ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے

نیز علامہ حلی کی کشف المراد سے یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی کہ صرف شیعہ امامیہ ہی اس کے قائل ہیں کہ ائمہ اور خلفاء کا منصوص من اللہ ہونا لازم اور ضروری ہے جبکہ دیگر تمام فرق اسلامیہ اس کو لازمی شرط قرار نہیں دیتے بلکہ دیگر ذرائع مثلاً وراثت یا دعویٰ امامت اور خروج بالسیف کو بھی امامت کی دلیل قرار دیتے ہیں جس طرح کہ عباسیہ اور زیدیہ کا نظریہ ہے یا شوریٰ اور انتخاب کو انعقاد امامت و خلافت کا ذریعہ بھی قرار دیتے ہیں جس میں ان دین کے علاوہ تمام فرق اسلامیہ متفق ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات سے یہ حقیقت واضح کی جا چکی ہے کہ اختلاف و نزاع کی صورت میں سواد اعظم کا ساتھ دو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا دست حفظ و امان جماعت پر ہے اور اس سے علیحدہ ہونے والا جہنم کی راہ پر چلنے والا ہے اور شیطان کے راستہ پر گامزن ہے، ملاحظہ ہو۔ نہج البلاغہ مصری جلد اول ص۲۹۸۔

الزموا السواد الاعظم فان ید اللہ علی الجماعة وایاکم والفرقة فان الشاذ من الناس للشیطان کما أن الشاذ من الغنم للذئب۔ لہذا صحیح اور صواب مذہب اور نظریہ یہی ہے کہ امت کے اہل حل وعقد ہی نصب امام اور تعیین خلیفہ کے حقدار ہیں اور یہی حقیقت حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ارشادات مرتضویہ اور شیعی کتب کے حوالہ سے ثابت کی ہے لہذا اب بغور ان ارشادات کا مطالعہ کریں اور اس نظریہ کی حقانیت وصداقت کا مشاہدہ کریں۔ واللہ الموفق للهداية الی سبیل الرشاد۔

اہل تشیع اور شوریٰ

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اب اس مسئلہ پر دلائل وشواہد پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی اور اہل تشیع خود عملی طور پر اس حقیقت کے معترف ہو چکے ہیں اسی لیے اب اس انتظار کو ترک کر دیا گیا ہے کہ کب اللہ تعالیٰ بندوں پر لطف وعنائت فرماتا ہے اور اپنے واجب اور فرض کو ادا کرتے ہوئے امام منصوص کو مبعوث فرماتا ہے اور یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی پڑی کہ پوشیدہ اور مخفی امام موجود ہونا نہ ہونا برابر ہے اور اس سے مقاصد مطلوبہ حاصل نہیں ہو سکتے اس لیے خود ہی شوریٰ اور انتخاب کے ذریعے ملکی اور دینی امور کی حفاظت ونگرانی اور سیاست کے لیے اور اجراء احکام اسلام اور نفاذ حدود وتعزیرات کے لیے اپنے قائدین اور امراء کا تعین اور تقرر شروع کر دیا ہے اور چودہ سو سال بعد وہ نظریہ عملاً متروک ہوگیا جس کی بنا پر خلفاء راشدین کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے انتخاب اور تقرر کو غیر اسلامی اقدام ٹھہرایا گیا اور ان صادقین ومصدقین اور مخلصین وفائزین کے ایمان واخلاص پر اعتراض کیا گیا جنہوں نے ان خلفاء کرام کا انتخاب کیا۔

والحمد للہ علی وضوح الحق وبطلان الباطل

شوریٰ اور انتخاب کا ذریعۂ انعقاد خلافت ہونا

دلیل اول

حضرت امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے ایک گرامی نامہ میں تصریح فرماتے ہیں جو آپ نے اپنے زمانہ خلافت میں امیر معاویہ کی طرف تحریر فرمایا:

انه بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر وعمر وعثمان علی ما بایعوهم علیه فلم یکن للشاهد ان یختار ولا للغائب أن یرد وإنما الشوریٰ للمهاجرین والانصار فإن اجتمعوا علی رجل وسموه اماما کان ذلك للہ رضیً فان خرج من امرهم خارج بطعن او بدعة ردوه إلی ماخرج منه فان ابی قاتلوه علی اتباعه غیر سبیل المؤمنین وولاه اللہ ماتولّی۔ (نہج البلاغہ کتاب ع ۶)

یعنی میرے ساتھ انہی لوگوں نے بیعت کی ہے جن لوگوں نے ابوبکر (صدیق رضی اللہ عنہ) اور عمر (فاروق رضی اللہ عنہ) اور عثمان (غنی رضی اللہ عنہ) کے ساتھ بیعت کی تھی۔ پس کسی حاضر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ میرے بغیر کسی دوسرے شخص کو خلیفہ بنائے اور نہ ہی کسی غائب کو یہ حق پہنچتا ہے کہ (ایسی خلافت کو) رد کرے اور (انعقاد خلافت میں) مشورہ کا حق اور انتخاب کا اختیار صرف مہاجرین وانصار ہی کو ہے پس جس آدمی پر ان کا اجماع اور اتفاق ہو جائے اور اس کو امام وامیر کے نام سے موسوم کریں تو انہیں کا اجماع اور امیر بنانا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے پس جو شخص بھی ان کے اجماعی فیصلہ پر طعن کرتے ہوئے یا نیا راستہ اختیار کرتے ہوئے اس سے الگ ہونا چاہے تو اس کو اسی اجماعی فیصلہ کی طرف لوٹانے کی کوشش کرو اور اگر واپس آنے اور موافقت کرنے سے انکار کرے تو اس کے خلاف جنگ کرو

اس بنیاد پہ کہ اس نے مسلمانوں کے راستہ کے علاوہ دوسرا راستہ اختیار کر لیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو ادھر ہی پھیر دیا ہے جس طرف وہ اپنی مرضی سے پھرا ہے یعنی یہ نہ سمجھو کہ وہ کسی صحیح نظریہ کے تحت مسلمانوں سے الگ ہوا ہے۔

تحفہ حسینیہ تتمہ استدلال

۱۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس تحریری بیان سے صاف ظاہر ہے کہ آپ مہاجرین و انصار کے انتخاب اور کسی بھی شخص کو خلافت کے لیے نامزد کرنے کو نہ صرف درست اور صحیح سمجھتے ہیں بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور اس کی رضامندی قرار دیتے ہیں۔

۲۔ آپ ان کے اجماع و اتفاق سے طے ہونے والے معاملہ کو راہ ہدایت اور راہ حق سمجھتے ہیں اور اس کی مخالفت کو گمراہی و ضلالت سمجھتے ہیں اسی لیے الگ ہونے والے کو طاعن اور بدعتی فرمایا اور اس کو ہر قیمت پہ مہاجرین و انصار کے اختیار کردہ راستہ کی طرف لوٹانے کا حکم دیا۔ اگر دوسری طرف بھی ہدایت اور حقانیت کا امکان ہوتا تو اس سے پھیرنا کیونکر واجب و لازم ہو سکتا تھا۔

۳۔ واپس نہ آنے والے کو آپ نے واجب القتال قرار دیا اور اہل حق کے خلاف جہاد واجب تو کجا جائز بھی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا قتال و جہاد کو واجب قرار دینا بھی اس حقیقت کی بین دلیل ہے کہ ان کی مخالفت کرنا صرف غلط ہی نہیں بلکہ ناقابل برداشت اور ناقابل عفو جرم ہے اور اس کو کیفر کردار تک پہنچانے کا موجب و باعث۔

۴۔ ان کے خلاف چلنے والے کو ولاہ اللہ ما تولیٰ کہہ کر یہ بھی واضح کر دیا کہ جب جد و جہد اور سعی و کوشش کے باوجود وہ واپس نہیں آتا تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت قاہرہ غالبہ سے اسے گمراہی کے راستہ پہ ڈال دیا، اس لیے راہ راست پہ چلنے کی صلاحیت اور لیاقت بھی اس سے چھن گئی ہے، جس سے واضح ہوا

کہ مہاجرین و انصار کی مخالفت صرف غلط نہیں بلکہ ضلالت ہے اور ایسی ضلالت کہ اس پہ اصرار کرنے والے سے ہدایت پانے کی صلاحیتیں بھی سلب کر لی جاتی ہیں۔

اس قدر سخت موکد اور محقق ارشاد کے بعد بھی خلافت کے بذریعہ شوریٰ اور انتخاب منعقد ہونے کی صحت اور درستگی میں بحث و نزاع کی اور اختلاف و مجادلہ کی کوئی گنجائش ہو سکتی ہے؟ نیز آپ نے صرف اپنا نظریہ بیان نہیں فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو بیان فرمایا قال اللہ تعالیٰ: "ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدی ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولی و نصله جهنم وساءت مصیرا" جو شخص بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے بعد اس کے کہ اس پہ ہدایت واضح ہو گئی اور مؤمنین کی راہ کے علاوہ کسی راہ پہ چل پڑے تو ہم اسے ادھر ہی پھیریں گے جدھر وہ پھرا۔ پھر اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔ اس آیت مقدسہ میں مخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مؤمنین کے راستہ کے ترک کرنے کو ایک ہی سطح پہ رکھا گیا ہے اور دونوں کو موجب ضلالت اور جہنمی ہونے کا سبب قرار دیا گیا اور اسی آیت مبارکہ کے مضمون کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے "قاتلوہ علی اتباعه غیر سبیل المؤمنین وولاہ الله ما تولّی" سے تعبیر فرمایا ہے۔ بقول علامہ ابن میثم بحرانی، مؤلف نہج البلاغہ نے ابتدائی حصہ حذف کر دیا ہے جو حضرت امیر المؤمنین کا دعویٰ ہے یعنی اما بعد فان بیعتی لزمتك یامعاویة وانت بالشام "میری بیعت تجھ پہ لازم ہو چکی ہے باوجودیکہ تو شام میں ہے" اور اس دعویٰ پہ آپ نے منطق کی شکل اول کے ساتھ استدلال کرتے ہوئے فرمایا "انه بایعنی القوم الذین الخ" جس میں صغریٰ شکل اول قیاس حملی کا یہ ہے "میرے ساتھ ان لوگوں نے بیعت کی ہے جنہوں نے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیعت کی ہے"، اور کبریٰ اس کا یہ ہے کہ جس شخص کے ساتھ یہ لوگ بیعت کر لیں دوسرے کسی شخص کو حاضر ہو یا غائب اس کے علاوہ دوسرے شخص کو امام منتخب کرنے یا خود امامت کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں رہتا

اور ان کے فیصلہ کو رد کرنے کا اختیار نہیں رہتا اور صغریٰ تو واضح ہے دلیل اس پر قائم کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ رہا کبریٰ تو اس پر دلیل دیتے ہوئے فرمایا "انما الشوریٰ للمهاجرين والانصار فان اجتمعوا۔ الخ جس کا خلاصہ بزبان ابن میثم یہ ہے۔

لانهم اهل حل وعقد من امة محمد صلى الله عليه وسلم فاذا اتفقت كلمتهم على حكم من الاحكام كاجتماعهم على بيعته وتسميته اماما كان ذلك اجماعا حقا هو رضى الله اى مرضى له وسبيل المؤمنين الذى يجب اتباعه۔ الخ

(شرح ابن میثم جلد رابع ص ٣٥٣، ٣٥٤)

کیونکہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اہل حل وعقد وہی (مہاجرین وانصار) ہیں ان میں کسی بھی امر اور حکم پر اتفاق ہوجائے جیسے کہ آپ کی بیعت پر اور آپ کو امام کے اسم کے ساتھ موسوم کرنے پر تو وہ اجماع برحق ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ اور مؤمنین کا ایسا راستہ جس کی اتباع واجب و لازم ہے۔ لہٰذا اب ہر شخص پر بمع تیرے اے معاویہ! یہ بیعت لازم ہے۔

٢ـ اور شارح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید نے بھی یہی بتلایا کہ اس کلام کا آغاز یوں ہے اما بعد! فان بيعتى بالمدينة لزمتك وانت بالشام لانه بايعنى القوم الخ اور آخر میں اس اضافہ کا بھی ذکر کیا ہے والمروى بعد قوله "ولاه الله ما تولى واصلاه جهنم وساءت مصيرا" تو اس طرح آیت کریمہ کے معنی کو مکمل طور پر آپ نے اپنے کلام میں سمو دیا یعنی مؤمنین کی مخالفت کو موجب قتال و جہاد قرار دیا اور اس کے بھٹکنے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت قاہرہ کے تصرف کا نتیجہ قرار دیا اور پھر جہنم میں داخل کئے جانے کا ذکر فرمایا جو بہت برا ٹھکانا ہے (شرح حدیدی جلد ١٤، ص ٣٥/٣٦)

فائدہ

اس آیت کریمہ سے استشہاد و استدلال نے واضح کر دیا کہ مولائے مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا کلام سابق محض الزام و جدل نہیں تھا بلکہ عقلی اور نقلی برہان کے ذریعے اپنے مدعا کو ثابت کرنا مقصود تھا ورنہ لازم آئے گا کہ اس آیت کریمہ کے بھی صرف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ قائل تھے نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ العیاذ باللہ۔ علاوہ ازیں اگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ الزامی کارروائی ہوتی تو دوسرے صوبہ جات میں گورنر اور عامل مقرر کرتے وقت ان لوگوں پر اس حجت کو قائم نہ فرماتے حالانکہ جس وقت آپ نے مصر میں قیس بن سعد کو اپنا گورنر بنا کر بھیجا جب کہ یہی اہل مصر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ہوگئے تھے اور آپ کو شہید کرنے والوں میں پیش پیش تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عامل کو آپ کی شہادت سے بھی پہلے انہوں نے برطرف کر دیا تھا تو قیس بن سعد کو جو خلافتی آرڈر اور حکمنامہ اہل مصر کے نام لکھ کر دیا تھا اس میں بھی یہی دلیل مرقوم تھی۔

ثم ان المسلمين من بعده استخلفوا اميرين منهم صالحين فعملا بالكتاب والسنة واحييا السيرة ولم يعدوا السنة ثم توفيا رحمهما الله فولى بعدهما وال احدث احداثا فوجدت الامة عليه مقالا فقالوا ثم نقموا فغيروا ثم جاءونى فبايعونى وانا استهدى الله الهدى واستعينه على التقوى الخ

(کتاب الغارات لابراہیم الثقفی شرح حدیدی ص ٥٨ جلد ٦)

پھر اہل اسلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے بعد دو صالح امیر یکے بعد دیگرے خلیفہ بنائے جنہوں نے کتاب و سنت کے مطابق عمل کیا اور سیرت نبویہ کو زندہ کیا اور سنت سے تجاوز نہ کیا پھر ان کا وصال ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں پر رحمت فرمائے۔ پھر ان کے بعد ایک والی بنایا گیا جس نے بعض نئے امور ایجاد کئے جن کی وجہ سے امت

اس پر معترض ہوئی اور ناراضگی کا اظہار کیا اور بالآخر اس خلافت کو بدلا دیا پھر میرے پاس آئے اور مجھ سے بیعت کی اور میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت کا طلب گار ہوں اور اس سے تقولی پر اعانت کی توفیق طلب کرتا ہوں اور اس کے علاوہ دوسرے خطبے اور خطوط جو اس معنی پر مشتمل ہیں بکثرت آپ سے منقول ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ابھی آتا ہے لہذا اس کو الزامی کاروائی قرار دینا قطعًا درست نہیں ہے۔

توجیہ الامامیہ

شارح ابن الحدید کہتا ہے کہ شیعہ نے اس کو تقیہ پر محمول کیا ہے۔ اور اس کی بنیاد اس امر کو بنایا ہے کہ آپ اگر امیر معاویہ رض کی طرف حقیقت حال لکھتے اور کہتے کہ میں خلیفہ بلافصل تھا اور ہوں تو اس میں خلفاء سابقین پر طعن ہوتا اور جن اہل مدینہ نے ان کی بیعت کی تھی اس صورت میں ان کے بگڑنے اور ناراض ہونے کا خطرہ درپیش تھا۔

وهذا القول من الامامية دعوى لوعضدها دليل لوجب ان يقال بها ويصار اليها ولكن لا دليل لهم على ما يذهبون اليه من الاصول التي تسوقهم إلى حمل هذا الكلام على التقية۔

(شرح حدیدی ص ۳۷، جلد ۱۴)

امامیہ کا یہ قول محض دعویٰ ہے اگر کوئی دلیل اس کی تائید کرتی تو اس کے مطابق قول کرنا اور اس کی طرف رجوع کرنا لازم ہوتا لیکن ان کے لیے ان اصول وقواعد میں سے جو انہیں اس کلام کو تقیہ پر محمول کرنے پر مجبور کریں کوئی دلیل اور سند موجود نہیں ہے (اور کلام کو بلا دلیل صارف اور احتمال ناشی عن دلیل کے بغیر ظاہری معنی سے پھیرنا اس کو باطل قرار دینے کے مترادف ہے اس لیے شیعہ صاحبان کی یہ توجیہ ناقابل قبول ہے۔ محمد اشرف)

فائدہ ۲

حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے کہ میرے ساتھ انہیں

لوگوں نے بیعت کی ہے جنہوں نے خلفاء ثلاثہ کے ساتھ بیعت کی تھی ظاہر ہے کہ آپ کے نزدیک ان کا ایمان اور ان کی امانت و دیانت محل کلام نہیں تھی ورنہ بیعت سابقہ سے اگر نعوذ باللہ وہ مرتد ہو چکے ہوتے اور انہیں پتہ بھی ہوتا کہ ہم ان کے نزدیک مرتد ہیں تو وہ یا بیعت نہ کرتے اور یا از سر نو اسلام میں داخل ہوتے جب توبہ کئے بغیر حضرت علی کی بیعت کی اور وہ بیعت دلیل شرعی بن گئی تو ان کا کامل الایمان ہونا اور خلفاء ثلاثہ کی بیعت کا صحیح ہونا واضح ہو گیا۔ اور حضرت امیر کا ان کے ساتھ مذہب وعقیدہ میں متفق ہونا بھی ورنہ آپؓ یہ نہ فرماتے:۔ "علی ما بایعوهم علیه" یعنی اس امر پر انہوں نے میری بیعت کی ہے جس پر ان کی بیعت کی تھی اگر مذہب مختلف ہو تو بنیاد بیعت یکساں کیوں کر ہو سکتی ہے۔

دلیل دوم

مذہب شیعہ

از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ العزیز

خلافت کے انعقاد کے بارے میں حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ، کا دوسرا بیان بھی ملاحظہ فرمائیں اور چونکہ آپ کا یہ بیان حلفی ہے اور موکد بالقسم ہے۔ اس لیے اس کو بالکل نظر انداز نہ فرمائیں۔

ولعمری لئن كانت الخلافة لا تنعقد حتى تحضرها عامة الناس ما إلى ذلك سبيل ولكن اهلها يحكمون على من غاب عنها..... ثمّ ليس للشاهد ان يرجع ولا للغائب ان يختار الا وإني اقاتل رجلين رجلاً ادّعى ما ليس له وآخر منع الذى عليه۔ الخ

(نہج البلاغة، مطبوعہ ایران خطبہ نمبر ۱۷۲)

یعنی مجھے میری زندگی کی قسم کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ جب تک سب لوگ جمع ہو کر خلیفہ اور امام مقرر نہ کریں اتنے تک وہ شخص امام نہ بن سکے بلکہ صرف اہل رائے لوگ ہی اس کا فیصلہ کرنے کے اہل ہیں جو دوسرے لوگوں پر اس حکم کو نافذ کرتے ہیں۔ ان کے فیصلہ

کے بعد نہ موقعہ پر موجود شخص کو رجوع کا حق ہے اور نہ غائب کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق عمل کرے اور اس فیصلہ کا خلاف کرے۔ خبردار میں دو قسم کے لوگوں سے خلاف قطعی طور پر جنگ کروں گا ایک تو وہ لوگ جنھوں نے ایسی چیز کا دعویٰ کیا جس کے وہ مستحق نہیں تھے دوسرے وہ لوگ جنہوں نے کسی کا حق روک رکھا ہو۔ کوئی بھی سمجھدار انسان مولیٰ مشکل کشاء کے اس حلفی بیان کے بعد خلفاء راشدین کے خلافت کے مستحق نہ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف جنگ نہیں لڑی بلکہ ان کی اعانت فرمائی اور نصرت و امداد فرمائی ان کے ہاتھ پر بیعت فرمائی بلکہ بطیب خاطر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رشتہ دیا اور اپنا شرف دامادی بخشا ان کو امیر المؤمنین تسلیم فرمایا۔ ان کی شان ارفع میں سب بکنے والوں کو قتل کیا بلکہ ان کو آگ میں جلایا یعنی سبائی غالیوں کو (ناسخ التواریخ) اس طرح ان کی اس سنت پر ان کی اولاد اطہار نے بھی عمل فرمایا جن کے حوالے گزر چکے ہیں۔

نیز یہ بھی واضح ہو گیا کہ خلافت کے متعلق آپ کے حق میں کوئی وصیت نہیں تھی بلکہ اس کا انعقاد صرف اہل الرائے اور ارباب حل و عقد کے مشورے سے ہی ہو سکتا ہے (اسی لیے آپ نے انما الشوریٰ للمهاجرين والانصار الخ کہہ کر اس حق کو تسلیم فرمایا اور لکن اهلها يحكمون على مَن غاب عنها کہہ کر بھی اور انّهٗ بايعني القوم الّذين بايعوا ابابكر وعمر وعثمان۔ کہہ کر اپنے حق میں ان کا فیصلہ صادر ہونا تسلیم فرمایا لہٰذا یہ طرز استدلال وصیت کے نہ ہونے پر بین دلیل ہے اور واضح برہان

تحفہ حسینیہ — از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی عفی عنہ

فوائد و نکات

ان دونوں عبارتوں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت پر قطعاً اعتراض اور انکار نہیں تھا ورنہ آپ کا یہ استدلال اور اعلان مذاق بن کر رہ جائے گا کہ جب خود تم نے مہاجرین و انصار کے فیصلہ کو تسلیم

نہ کیا اور ان کے انتخاب کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور رضاء المخلوق عنوان رضا الخالق یعنی مخلوق کی رضامندی خالق کائنات کی رضامندی کا عنوان ہے، تسلیم نہ کیا تو دوسروں کو اس دلیل سے کیونکر پابند کر سکتے ہو؟ لِمَ تقولون مالا تفعلون ۔ لہٰذا امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کی ذات مقدسہ ایسے واضح اور لاجواب اعتراض سے اس صورت میں بچ سکتی ہے جب اس کے مطابق آپ کا اپنا عمل بھی تسلیم کیا جائے۔ اگر اس کا صرف یہ مقصد بیان کیا جائے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو الزام دینا چاہتے تھے تو یہ خلاف واقعہ ہے۔ کیونکہ انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس انتخاب پر ہی اعتراض تھا اور اس دعویٰ میں ہی کلام تھا جیسا کہ ابھی ذکر کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں وہ کہہ سکتے تھے کہ میرا اب وہی نظریہ ہے جو اس وقت آپ کا تھا اگر آپ ان کی خلافت کا انکار کر کے اور مہاجرین و انصار کے فیصلہ کو ٹھکرا کر گنہگار نہیں ہوئے تو ہم پر کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا؟

اب اس عبارت کا پس منظر شیعی شارحین کی زبانی سماعت فرما کر ذرا حقیقت حال کا جائزہ لیں شرح حدیدی میں ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خط لکھا جس میں یہ اعتراض کیا گیا تھا۔ فان كنتَ ابا حسن انّما تحاربُ على الإمارة والخلافة فلعمري لو صحّتْ خلافتك لكنت قريباً مِنْ ان تُعْذَرَ فى حرب المسلمين ولكنّها ما صحّتْ لكَ وأنّى بصحّتها واهل الشام لم يَدْخلُوا فيها ولم يَرْتضُوا بها فخف الله وسطواته واتق بأسه ونكاله واغمد سيفك عن الناس - ج $\frac{۴۲}{۱۴}$ -

اے ابوالحسن (علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ) اگر تم امارت اور خلافت پر لوگوں کے خلاف جنگ لڑ رہے ہو تو مجھے اپنی زندگانی کی قسم اگر تمہاری خلافت درست ہوتی تو تم اہل اسلام کے خلاف جنگ لڑنے میں معذور سمجھے جانے کے قریب ہوتے لیکن خود وہ بھی درست اور صحیح نہیں ہے اور کیونکر صحیح ہو سکتی ہے جب کہ اہل شام اس میں شامل ہی نہیں ہوئے تو اجماع کہاں منعقد ہو گیا اور بغیر اجماع کے اس کا انعقاد کیسے

کے لیے کیونکر ہو سکتا ہے؟ اور نہ ہی وہ اس پر رضامند ہوتے ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کی گرفت سے اور اس کی سخت گیری سے اور عذاب سے ڈرو اور اپنی تلوار کو میان میں کر لو اور لوگوں سے اس کو دور کر لو۔

جب انہوں نے اجماع کا یہ مطلب لیا کہ تمام تر لوگ حاضر ہوں اور عملی طور پر بیعت کریں تو اس کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر خلافت کا انعقاد اس وقت تک ممکن نہ ہو جب تک عام لوگ اس میں حاضر نہ ہوں تو اس طرح کے اجماع و اتفاق کا تو امکان ہی نہیں بلکہ یہ اہل حل و عقد کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہیں منصب خلافت کے لیے منتخب کریں اور انہیں کا فیصلہ تمام اہل اسلام اور عالم اسلام پر نافذ ہو گا۔

"بل المعتبر فی الاجماع اتفاق أهل الحل والعقد من أمة محمد صلی اللہ علیه وسلم علی بعض الامور وهم العلماء" ابن میثم؛ ص۳۴۱ ج ۳۔

لہٰذا واضح ہو گیا کہ اس عبارت اور سابقہ عبارات میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو الزام دینا مقصود نہیں وہ تو انعقادِ اجماع میں بھی اختلاف رکھتے ہیں بلکہ آپ کے پیش نظر واقعہ اور حقیقت کا بیان ہے اور اس مسئلہ میں اپنے نظریہ کا بیان مقصود ہے والحمد للہ۔

اور دوسرے مقام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ کو جو جواب لکھا اس کا خلاصہ یوں مرقوم ہے شرح حدیدی میں ہے۔ ص۴۳ جلد ۱۴:۔

"لان بیعتی بالمدینة لزمتك وانتَ بالشام کما لزمتك بیعة عثمان بالمدینة وانتَ امیر لعمر علی الشام وکما لزمت یزید اخاك بیعة عمر وهو امیر لابی بکر علی الشام (الخ) واما قولك ان بیعتی لم تصح لان اهل الشام لم یدخلوا فیها کیف وانما هی بیعة واحدة تلزم الحاضر والغائب لا یثنی فیها النظر ولا یُستأنف فیها الخیار الخارج منها طاعن والمروی فیها مداهن"

یعنی میرے مدینہ میں ہوتے کے باوجود میری بیعت تجھ پر واجب و لازم ہو چکی

باوجود اس کے کہ تو شام میں ہے جیسے کہ تجھ پر حضرت عثمان کی بیعت لازم ہو گئی جو مدینہ میں پائی گئی۔ جبکہ تو شام میں امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے امیر تھا اور جیسے تیرے بھائی یزید کو امیر عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنا لازم ہو گیا حالانکہ وہ شام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے امیر تھے (تا) رہا، تیرا یہ قول کہ میری بیعت اور خلافت درست ہی نہیں کیونکہ اہل شام اس میں داخل نہیں ہوئے تو یہ تعلّل اور بہانہ غلط ہے کیونکہ بیعتِ خلافت ایک ہی ہے (یہ نہیں ہو سکتا کہ بعض اہل اسلام ایک کو خلیفہ منتخب کریں اور دوسرے کسی اور کو بلکہ جب بعض نے ایک کو خلافت کیلئے چن لیا) تو دوسروں پر بھی اس کی بیعت کرنا لازم ہے۔ اور حاضر و غائب سبھی اس کے پابند ہیں نہ اس میں دوبارہ غور و فکر ہو سکتا ہے اور نہ اس میں نئے سرے سے چناؤ اور انتخاب کا اختیار دیا جا سکتا ہے جو اس سے خروج کرے وہ اسلام کے فیصلہ پر طعن کرنے والا ہے۔ اور جو اس میں سوچ بچار کرنے لگے وہ مداہنت اور دین میں تساہل و تغافل کا مرتکب ہے۔ اور یہی عبارت نہج البلاغۃ مصری جلد ثانی ص۹ پر موجود ہے۔

"لانها بیعة واحدة لا یثنی فیها النظر ولا یستانف فیها الخیار الخارج منها طاعن والمروی فیها مداهن" لہٰذا روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا عقیدہ و نظریہ یہی ہے کہ خلافت و امامت کے لیے انتخاب اور شوریٰ ہی واحد راستہ ہے اور اس حقیقت کو ابن ابی حدید نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے شرح حدیدی ص۳۶ جلد ۱۴۔

"وَاعْلَمْ انّ هٰذا الفصل دال بصریحه علی کون الاختیار طریقاً إلی الامامةِ کما یذکرهٔ اصحابنا المتکلمون لِأنّهٗ احْتَجَّ علی بیعة معاویة ببیعة اهل الحلّ والعقد له ولم یراع فی ذٰلك اجماع المسلمین کلهم وقیاسه علی بیعة اهل الحل والعقد لابی بکر فانه ما روُعِیَ فیها اجماع المسلمین لِانّ سعد بن عبادة لم یُبایع ولا احدٌ

مِنْ أهل بيتہٖ و دارہٖ وکان عليا وبنی ھاشم ومن انضوی اليهم لم يبايعُوا فی اوّل الامرِ وامتنعوا ولم يتوقف المسلمون فی تصحيح امامتہٖ ابی بکر وتنفيذ احکامہٖ علی بيعتهم وھذا دليل علی صحة الاختيار وکونہٖ طريقاً الی الامامة لا يقدح فی امامتہٖ عليه السلام امتناع معاوية من البيعة و أهل الشام ۔

یہ امر اچھی طرح ذہن نشین رہے کہ یہ فصل اور خط اپنے صریح معنی و مفہوم کے لحاظ سے اس امر کی دلیل بیّن ہے کہ اختیار اور انتخاب انعقادِ امامت و خلافت کا ذریعہ ہے جیسے کہ ہمارے علماء متکلمین ذکر کرتے ہیں کیونکہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہٗ نے اپنی خلافت و امامت پر اہلِ حلّ و عقد کی بیعت سے امیر معاویہ رضؓ کے خلاف استدلال پیش کیا ہے اور اس میں تمام اہل اسلام کے اجماع کا لحاظ اور رعایت کو امر لازم نہیں سمجھا اور اس کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ کے حق میں اہل حلّ و عقد کی بیعت پر قیاس کیا کیونکہ اس میں بھی تمام تر افراد مؤمنین اور اہل اسلام کی بیعت پر انعقاد خلافت کو موقوف نہیں کیا گیا تھا کیونکہ حضرت سعد بن عبادہ، اِن کی اولاد اور افرادِ خاندان نے بیعت نہیں کی تھی اور حضرت علی مرتضیٰ، بنو ہاشم اور اِن کے ساتھ منسلک ہونے والوں نے بھی ابتدائی طور پر بیعت سے گریز کیا لیکن اس کے باوجود اہل اسلام نے حضرت ابوبکرؓ کی صحت امامت اور ان کے احکام کے نفاذ کو ان حضرات کی بیعت پر موقوف نہ سمجھا اور اِس میں کسی تردّد اور تذبذب کا اظہار نہ کیا۔ اور یہ امر صحت اختیار و انتخاب کی دلیل ہے اور اِس کے ذریعے امامت و خلافت منعقد ہونے کا بیان ہے اور اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا اور اہل شام کا توقف آپ کی امامت و خلافت میں خلل انداز نہیں ہو سکتا جس طرح حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت و خلافت میں کوئی خلل واقع نہ ہوا۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور شوریٰ کی صحت اور اس کا ذریعہ خلافت ہونا

جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے امتِ مسلمہ کی خیر خواہی اور بھلائی کے لیے اور باہمی کشت و خون اور حرب و قتال کو ختم کرنے کے لیے خلافت و امامت امیر معاویہ رضی اللہ عنہٗ کے سپرد کر دی تو اِس وقت جو عہد پیمان ہوا اور جن شرائط پر یہ مصالحت انجام پذیر ہوئی۔ ان کا مطالعہ کر لو تاکہ واضح ہو جائے کہ شوریٰ اور انتخاب کا مطالبہ امام حسن رضی اللہ عنہٗ نے فرمایا۔ اگر اہل بیتِ کرام کے نزدیک اس کا اعتبار نہ ہوتا تو اِس کا مطالبہ کیوں کرتے عبارت ملاحظہ ہو کشف الغمہ جلد اوّل صنہ ۵۷۰ مطبع جدید۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ ھٰذا ما صالح عليه الحسن بن علی بن ابی طالب معاوية بن ابی سفيان صالحه علی ان يسلم عليه ولاية امر المسلمين علی ان يعمل فيهم بكتاب اللّٰه وسنةِ رسول اللّٰه وسيرةِ الخلفاء الراشدين وليس لمعاوية بن ابو سفيان ان يعهد الی احدٍ من بعدہٖ عهداً بل يكون الامر من بعدہٖ شوریٰ بين المسلمين الخ

یہ وہ معاہدہ اور پیمان ہے جس پر حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے معاویہ بن سفیان کے ساتھ مصالحت کی ہے۔ انہوں نے معاویہ بن ابی سفیان کے ساتھ مصالحت کی کہ ان کو ولایت اہلِ اسلام اور ان کی خلافت اس شرط پر سونپی جاتی ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کی سیرت کے مطابق عمل کرے۔ اور امیر معاویہ کو یہ حق نہیں ہو گا کہ وہ اپنے بعد کسی کے لیے وصیت کرے اور عہد و پیماں، بلکہ امر خلافت ان کے بعد اہل اسلام کے درمیان شوریٰ اور انتخاب کے ساتھ طے ہو گا۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے بھی شوریٰ پر اعتماد کیا اور اس کو انعقاد امامت و خلافت کا ذریعہ قرار دیا اور الولد سر لابیہ کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔

فائدہ: نیز اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ امام حسن رضی اللہ عنہ خلفاء ثلاثہ

رضی اللہ عنہم کو خلفاء راشدین سمجھتے تھے ورنہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر فرماتے بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ کا چونکہ اختلاف رہا لہذا یہ شرط تو قرین قیاس ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اگر ہو سکتی ہے تو صرف خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم والی اور صاحب کشف الغمہ نے اس کو نقل کر کے اس پر سکوت اور خاموشی اختیار کی ہے جس سے صاف ظاہر کہ وہ اس کے معتقد اور قائل ہیں اور انہوں نے ابتداء کتاب میں تصریح کی ہے کہ میں ایسی روایات نقل کرتا ہوں جو سب کے نزدیک قابل قبول ہوں اور سنی شیعہ کے نظریہ وعقیدہ کے موافق، لہذا شیعہ صاحبان کو بھی اس پر ایمان لانا چاہیے اور اہل سنت کے ساتھ موافقت کرنی چاہیے تاکہ باہم اختلاف و نزاع کم ہو کر بلکہ ختم ہو کر ملکی سلامتی کا ضامن بن سکے اور آخرت میں بھی سب کا بھلا ہو سکے اور اسی قسم کا ایک استحسان اور پسندیدہ نظریہ ابن میثم بحرانی کا بھی ملاحظہ فرماتے چلیں

علامہ ابن میثم بحرانی اور بیان نزاع و خلاف سے تنفر

خطبہ شقشقیہ جس میں حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے متعلق بعض سخت الفاظ منسوب کئے ہیں، اہل السنت نے سرے سے اس خطبہ کی صحت اور درستگی کا ہی انکار کر دیا جیسے کہ اس کی بحث گزر چکی ہے۔ علامہ ابن میثم فرماتے ہیں کہ اگر انکار کرنے والوں کے انکار کا یہ مقصد ہے کہ عوام کو مطمئن کیا جائے اور ان کے اندر خیالات فاسدہ اور تعصبات ردیہ کے بھڑک اٹھنے سے ان کو بچایا جائے تاکہ امر دین میں استقامت اور استواری پیدا ہو جائے اور سب اہل اسلام ایک شاہراہ پر گامزن ہو جائیں اس لئے ان کے سامنے اس طرح ظاہر کریں کہ سرے سے صحابہ کرام علیہم الرضوان میں جو اشرف المسلمین اور سادات اہل اسلام ہیں کوئی اختلاف اور نزاع تھا ہی نہیں اور وہ باہم شیر و شکر تھے تاکہ دوسرے لوگ بھی ان کی اقتداء و اتباع کریں اور باہم متحد و متفق ہو کر رہیں تو یہ مقصد بہت اچھا ہے اور بہت ہی گہری اور باریک نظر ہے۔ اے کاش ایسے مقاصد سامنے رکھے جاتے۔

أما المنكرون لوقوع هذا الكلام منه فيحتمل انكارهم وجهين

احدهما أن يقصد وابذلك توطية العوام وتسكين خواطرهم عن اثارة الفتن والتعصبات الفاسدة ليستقيم امرالدين ويكون الكل على نهج واحد فيظهروا لهم انه لم يكن بين الصحابة الذين هم أشراف المسلمين وساداتهم خلاف ولا نزاع ليقتدي بحالهم من سمع ذلك وهذا مقصد حسن ونظر لطيف لو قصدا۔

(شرح ابن میثم جلد اول ص۲۵۱، وکذا فی الدرۃ النجفیۃ جلد اول ص۶)

گزر جانے والوں پر اعتراض وتنقید سے اجتناب کا لزوم از روئے قرآن

یہی حکم قرآن مجید نے دیا ہے کہ پہلی امتوں یا اس امت کے پہلے ادوار میں گزرنے والے لوگوں پر تنقید اور اعتراض سے دور رہو اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑو اور تم اپنے اعمال کی اصلاح اور درستگی کی سعی مسلسل کرو کیونکہ تم ان کی طرف سے جواب دہ نہیں ہو بلکہ اپنے اعمال کی طرف سے۔

قال عزوجل: تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا يعملون ۔

وہ امت ہے جو گزر چکی ہے اس کو وہ اعمال نفع دینے والے ہیں جو اس نے کمائے اور تمہیں وہ اعمال جو تم نے کمائے اور تم سے سوال نہیں کیا جائے گا اس کے متعلق جو وہ کرتے تھے، اور یہی حکم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی ثابت ہے قال تعالیٰ:

والذين جاؤا من بعدهم يقولون ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذين سبقونا بالايمان ولاتجعل في قلوبنا غلا للذين آمنوا ربنا انك رؤف رحيم ۔

جس کا ترجمہ اور تشریح حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے فرمان سے واضح کی جا چکی ہے۔

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ خود شیعی اکابر کے اس طرز عمل اور نصیحت و وصیت کے برعکس بعض پیٹ کے دوزخ کو پر کرنے کے درپے ذاکر صاحبان اور مبلغ صاحبان شرف صحابہ کرام اور خلفاء راشدین اور اشراف و سادات امت کو ہی ہر وقت اپنے اعتراضات کا نشانہ بنائے رکھتے ہیں اور نفرت پھیلانے اور اہل اسلام کو ایک دوسرے سے دور کرنے

کے علاوہ ان کا کوئی پیشہ ہی نہیں ہے حالانکہ انہیں نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کی عظمت اور عزت سے کوئی غرض ہے نہ صحابہ کرام علیہم الرضوان سے کوئی ذاتی تکلیف ہے اگر روزی کا یہ ذریعہ بند ہو جائے اور اس بہانے لاکھوں روپے کے ٹھیکے چکنے بند ہو جائیں تو ان کے یہ سب جذبات حب علی اور بغض معاویہ والے ختم ہو کر رہ جائیں گے ۔

مقام تعجب ہے کہ جو پیشگی رقم کا ٹھیکہ چکائے بغیر ان مقدس ہستیوں کا نام ہی نہ لے سکیں وہ محب ہیں اور جنہوں نے اپنا سب کچھ اور خود کو اسلام اور بانی اسلام کے لیے قربان کر دیا وہ دشمن ہیں؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔

رسالہ مذہب شیعہ از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

دلیل سوم بر صحت شورای

ناسخ التواریخ جلد ۳ حصہ ۲ کی عبارت بھی ملاحظہ کریں جو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا خطبہ ہے:

انکم بایعتمونی علی ما بویع علیه من قبلی وإنما الخیار للناس قبل أن یبایعوا فإذا بایعوا فلاخیار لهم ـ الخ

یعنی تم لوگوں نے میرے ساتھ اسی بنیاد اور شرط پر بیعت کی ہے جس بنا پر مجھ سے پہلے خلفاء کے ساتھ بیعت کی تھی اور جز این نیست کہ لوگوں کو کوئی خلیفہ منتخب کرنے کا اختیار اس وقت تک ہوتا ہے جب تک کسی ایک کی بیعت نہ کریں جب کر لیں تو پھر ان کے لیے کوئی اختیار باقی نہیں کہ وہ دوسرا راستہ اختیار کریں ۔

تحفہ حسینیہ : از ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی عفی عنہ

تتمہ استدلال : اگر شوریٰ اور انتخاب ذریعہ انعقاد خلافت ہی نہ ہوتے تو بیعت کرنے کے باوجود اختیار باقی رہتا کیونکہ بیعت کرنا نہ کرنا اور کسی کو اپنے طور پر امام اور خلیفہ نامزد کرنا نہ کرنا جب دونوں برابر ہوں اور انعقاد خلافت کا دارومدار ہی نص اور وصیت پر ہو تو پھر جس کے حق میں نص اور وصیت ہو گی دوسرے کی بیعت کر کے بھی اس کی طرف میلان اور رجوع درست ہو گا اور جس کے حق میں نص اور وصیت نہیں ہو گی اس سے انحراف اور اعراض واجب و لازم ہو گا لہذا

واضح ہو گیا کہ انعقاد امامت و خلافت کا ذریعہ شوریٰ اور انتخاب و بیعت ہے اور ایک مرتبہ بیعت کرنے کے بعد اختیار ختم ہو جاتا ہے ۔

اسی مضمون کو حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ خط و کتابت میں آپ نے بار بار دہرایا ہے۔

أما بعد: فقد علمتما وان کتمتما انی لم ارد الناس حتی ارادونی ولم ابایعهم حتی بایعونی وانکما ممن ارادنی وبایعنی وان العامة لم تبایعنی لسلطان غالب ولا لعرض حاضر فان کنتما بایعتمانی طائعین فارجعا وتوبا إلی الله من قریب وان کنتما بایعتمانی کارهین فقد جعلتما لی علیکما السبیل باظهارکما الطاعة واسرارکما المعصیة ولعمری ما کنتما بأحق المهاجرین بالتقیة والکتمان وان دفعکما هذا الامر من قبل ان تدخلا فیه کان أوسع علیکما من خروجکما منه بعد اقرارکما به ۔ (نہج البلاغہ مصری ۲/۱۲۳)

اما بعد۔ تم دونوں یقیناً اس حقیقت سے باخبر ہو اگرچہ اس کو چھپاؤ اور اس کا اظہار نہ کرو۔ کہ میں نے لوگوں کی اپنے ساتھ بیعت کرانے کا ارادہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے خود میری بیعت کا ارادہ کیا۔ اور نہ میں نے ان سے بیعت لی جب تک انہوں نے اپنے طور پر بیعت نہ کی۔ اور تم بھی انہیں لوگوں میں سے ہو۔ جنہوں نے میرے ساتھ ارادت کا اظہار کیا اور بیعت کی۔ علاوہ ازیں عام لوگوں نے میرے ساتھ کسی جبر و قہر اور تسلط و غلبہ کی وجہ سے بیعت نہیں کی اور نہ کسی حاضر و موجود ساماں لالچ کی وجہ سے لہذا اگر تم نے بھی خوشی اور ذاتی رغبت سے بیعت کی ہے تو واپس آ جائیے اور فوری طور پر اللہ تعالیٰ کے حضور اس خروج سے توبہ کیجئے اور اگر تم نے بوجہ مجبوری اور ناچاری بیعت کی ہے تو بھی تم نے میرے لیے اپنے اوپر مواخذہ اور گرفت کی راہ پیدا کر دی کہ اطاعت ظاہر کی اور دل میں عصیان اور بغاوت کو چھپائے ہوئے تھے ۔

مجھے اپنی زندگانی کی قسم تم دوسرے مہاجرین کی نسبت تقیہ و کتمان کے زیادہ

لائق اور حقدار نہیں تھے (کہ ان میں سے کسی کو اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی صرف تم دونوں کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی) اور اس امر خلافت و بیعت کو اس میں داخل ہونے سے پہلے دور کرنا تمہارے لیے زیادہ وسعت اور گنجائش رکھتا تھا بنسبت تمہارے اس میں داخل ہو کر اور اقرار و بیعت کر کے پھر اس سے خارج ہونے کے۔

الغرض اس خط سے بھی یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ بیعت کرنے اور حلقہ ارادت میں داخل ہونے کے بعد اس کا توڑنا جائز نہیں ہے۔ اور پہلے تو اختیار اور حق خود ارادیت استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن بعد میں اس حق کو استعمال نہیں کیا جا سکتا جیسے کہ پہلے بھی یہی مضمون گزر چکا

یعنی اس میں دوبارہ نہ اختیار دیا جا سکتا ہے اور نہ از سر نو غور و فکر کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ مقصد بھی نہیں کہ تم بیعت نہ کرتے خواہ دوسرے اہل اسلام کر لیتے تو تمہیں اختیار تھا کیونکہ اس کے متعلق بھی واضح ارشاد آ چکا کہ بیعت ایک ہی ہوتی ہے جو حاضر و غائب سبھی پر لازم ہو جاتی ہے۔ لہذا مقصد صرف یہ ہے کہ میرے علاوہ کسی دوسرے کو منتخب کر لیتے تو وہ تمہارا حق تھا مجھے اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا تھا لیکن دیگر اہل حل و عقد اور اصحاب رائے کے ساتھ شامل ہو کر مجھے خلیفہ نامزد کر کے اور بیعت کر کے اب تم اپنی مرضی کرنا چاہو اور نظام خلافت کو درہم برہم کرنا چاہو تو اس کی اجازت قطعاً نہیں دی جا سکتی اور یہی ہمارا اس مقام پر مقصد تھا جو بحمد اللہ واضح ہو گیا۔

فائدہ اس عبارت سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بیعت کر لی جائے خواہ دل سے نہ بھی ہو۔ لیکن نہ تسلط اور غلبہ کے تحت کی جائے نہ کسی کے لالچ دلانے کی وجہ سے تو وہ دل و جان سے ہی بیعت سمجھی جائے گی اس میں یہ عذر قابل قبول نہیں کہ میں نے اوپرا دپرے سے بیعت لی تھی۔ دل اور باطن سے نہیں کی تھی۔ کما قال: فقد جعلتما لی علیکما السبیل کیونکہ احکام شرع کا دارومدار ظاہر پر ہے باطن پر نہیں ہے۔ ورنہ نظام کی درستگی اور اصلاح احوال کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ سکتی۔

علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حق میں جبر و اکراہ کے دعویٰ کی لغویت اور برضا و رغبت بیعت کا ثبوت

اسی پس منظر میں یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے خواہ چھ ماہ کے بعد بھی بیعت کی ہو لیکن وہ جبر و اکراہ والی بیعت نہیں ہو سکتی اول تو اس لیے کہ اس شیر خدا کو کوئی مجبور اور بے بس کرنے والا ہو سکتا ہی نہیں تھا۔ دوسرا اگر مجبور کر کے بیعت لینی ہوتی تو ہفتہ بھی نہیں گزرنا چاہیے تھا۔ چہ جائیکہ چھ ماہ گزر جاتے اور قبل ازیں آپ کا اس مضمون پر مشتمل خطبہ نقل کیا جا چکا ہے۔ کہ میں نے بیعت سے ہاتھ روک لیا لیکن جب بعض لوگوں کو مرتد ہوتے دیکھا تو کہا کہ اگر اہل اسلام اور اسلام کی مدد نہ کروں تو یہ میرے لیے بہت پریشانی کا موجب ہو گا لہذا خلافت کی خاطر اہل اسلام اور اسلام کو نظر انداز کرنا اور اپنی نصرت و اعانت سے ان کو محروم کرنا بہت زیادہ نقصان دہ ہے۔ تو میں نے ابو بکر صدیق کی بیعت کی اور پھر ان حوادث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تعاون کیا۔

اور یہی مضمون احتجاج طبرسی میں بھی موجود ہے " فقال ابو بکر مهلا یا ابا الحسن ما نشدد فیك ولا نكرهك ۔ ص۴۶ مطبوعہ ایران طبعہ قدیم۔

اے ابو الحسن آہستگی اور نرم روی سے کام لو ہم آپ پر بیعت کے معاملہ میں نہ تشدد کرتے ہیں۔ اور نہ جبر و اکراہ۔ اور اس مضمون کو شرح حدیدی میں با حوالہ بیان کیا گیا ہے عبارات ملاحظہ ہوں۔

(۱) لا والله لا اقبل قولك ولا ابايعه فقال له ابو بكر فان لم تبايعني لم اكرهك فقال له ابو عبيدة يا ابا الحسن انك حديث السن وهؤلاء مشيخة قريش قومك، ليس لك مثل تجربتهم ومعرفتهم بالامور ولا ارى ابا بكر الا اقوى على هذا الامر منك واشد احتمالا له واضطلاعا به الخ۔

غور سے سنو (اے عمر) بخدا نہ میں ابو بکر کی بیعت کے متعلق تیرے قول کو قبول کرتا ہوں

اور نہ اس کی بیعت کرتا ہوں تو حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر آپ میری بیعت نہ کرو تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ تو حضرت ابوعبیدہ نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا اے ابوالحسن آپ نوعمر ہو اور یہ تمہاری قوم قریش کے بزرگ ہیں، آپ کو نہ ان جیسا تجربہ ہے اور نہ ان کی مانند امور خلافت و حکومت کی معرفت۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ابوبکر صدیق آپ سے اس امر میں زیادہ قوی ہیں اور اس کے زیادہ متحمل اور حوصلہ رکھنے والے۔ فسلم له هذا الأمر وارض به. لہذا امر خلافت انہیں کو سونپئے۔ اور اس پر راضی ہو جائیے۔ فإنك ان تعش وتطل عمرك فانت لهذا الامر خليق وبه حقيق فى فضلك وقرابتك وسابقتك وجهادك اگر آپ زندہ رہے اور عمر شریف لمبی ہوئی تو تم بھی اس امر کے حقدار اور اہل ہو گے اپنی فضیلت کی وجہ سے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرب کی وجہ سے اور اسلام و جہاد میں سبقت کی وجہ سے۔

شرح حدیدی بحوالہ ابوبکر احمد بن عبدالعزیز جوہری ج ۶ ص ۱۳

(۲) روى احمد بن عبد العزيز: جاء ابو سفيان إلى على عليه السلام فقال وليتم على هذا الأمر اذل بيت فى قريش. اما والله لئن شئت لاملأنها على ابى فصيل خيلا ورجلا. فقال على عليه السلام طالما غششت الاسلام وأهله فما ضررتهم شيئا لا حاجة لنا الى خيلك ورجلك لولا انا رأينا ابا بكر لها أهلا لما تركناه.

احمد بن عبدالعزیز جوہری نے روایت کی ہے کہ ابوسفیان حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا تم نے خلافت و امامت کا معاملہ قریش میں کمزور ادنیٰ ضعیف گھرانے کے حوالے کر دیا ہے۔ غور سے سنو اگر آپ چاہو تو میں مدینہ منورہ کے علاقہ کو ابوبکر کے خلاف اور تمہاری اعانت میں پیدلوں اور سواروں سے بھر دوں تو آپ نے فرمایا تو نے بہت دفعہ اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ دھوکہ کیا مگر ان کو ذرہ بھر نقصان نہ پہنچا سکا۔ ہمیں تیرے گھڑ سوار دستوں کی

ضرورت ہے اور نہ پیادوں کی اگر ہم حضرت ابوبکر کو خلافت کے قابل نہ سمجھتے تو ہم خود ہی اس سے نمٹ لیتے۔ اور اس کو یہ موقعہ ہی نہ دیتے۔

نوٹ) اس روایت سے ظاہر ہے کہ ابوسفیان کا خلافت صدیقی کے خلاف یہ اقدام بھی نگاہ مرتضوی میں انہیں سابقہ اسلام کے خلاف سازشوں اور نقصان پہنچانے کی کوششوں میں سے ایک کوشش تھی اگر آپ اس خلافت کو اسلام کے نقصان دہ سمجھتے تو ابوسفیان سے امداد لے کر اس خلافت کو بدل دیتے اور پھر موقعہ پا کر ابوسفیان سے بھی نمٹ لیتے۔ جس طرح بقول شیعہ خلفاء ثلاثہ کے پیروکاروں کو تقیہ کے بل بوتے پر اپنے ساتھ ملائے رکھا اور اس انتظار میں رہے کہ جب میری حکومت و امارت اور خلافت و امامت مستحکم ہو جائے گی تو پھر تقیہ کا نقاب اتار کر ان کو درست کر دوں گا اور جب اس طرح کا موقعہ میسر ہونے کے باوجود اس سے فائدہ اٹھانے کا تصور تک نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ آپ خلافت صدیقیہ کو اسلام کے لیے نقصان دہ اور خطرناک نہیں سمجھتے تھے۔ الغرض اس روایت سے بھی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا نگاہ مرتضوی میں امامت و خلافت کے اہل اور شایان ہونا اور ان کی خلافت پر مطمئن ہونا ظاہر ہے۔

(۳) قال ابوبكر: كان سعيد بن خالد بن العاص من عمال رسول الله صلى الله عليه وسلم على اليمن فلما قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم جاء المدينة وقد بايع الناس ابا بكر فاحتبس عن ابى بكر فلم يبايعه اياما وقد بايع الناس وأتى بنى هاشم فقال انتم الظهر والبطن والشعار دون الدثار والعصا دون اللحا فاذا رضيتم رضينا واذا سخطتم سخطنا حدثونى ان كنتم بايعتم هذا الرجل؟ قالوا نعم قال على برد ورضاء من جماعتكم؟ قالوا نعم قال فأنا ارضى وابايع اذا بايعتم. ص ۵۸ ج ۶

ابوبکر جوہری نے کہا۔ خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ یمن پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عامل اور گورنر تھے جب آپ کا وصال ہو گیا تو وہ مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کر چکے تھے۔ تو انہوں

چند دن تک آپ کی بیعت نہ کی پھر بنو ہاشم کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ تم ہی ہمارا سہارا ہو اور پناہ ہو بلا واسطہ قریبی اور عصائے قوت و توانائی ہو نہ کہ چھلکے اور ناقابلِ اعتماد اگر تم راضی ہو تو ہم بھی راضی ہو جاتے ہیں اور اگر تم اس خلافت و امامت پہ راضی نہیں تو ہم بھی اس پہ ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ مجھے بتلاؤ کیا تم نے بیعت کر لی ہے اس شخص کے ساتھ؟ تو انہوں نے کہا ہاں تو حضرت خالد نے کہا ٹھنڈے دل سے ضامندی کے ساتھ تم تمام کی طرف سے؟ تو انہوں نے کہا ہاں تو حضرت خالد نے کہا تو اب میں بھی راضی ہوں اور بیعت کرتا ہوں جبکہ تم نے بیعت کر لی ہے۔

(۲) قال ابوبکر: لما جلس ابوبکر علی المنبر کان علی علیه السلام والزبیر وناس من بنی هاشم فی بیت فاطمة رضی الله عنها فجاء عمر الیهم فقال والذی نفسی بیده لتخرجن الی البیعة أو لأحرقن علیکم البیت فخرج الزبیر مصلتا سیفه فاعتنقه رجل من الأنصار و زیاد بن لبید فبدر السیف فصاح به ابوبکر وهو علی المنبر اضرب به الحجر، ثم قال ابوبکر دعوهم فسیأتی الله بهم قال فخرجوا الیه بعد ذلك فبایعوه۔ ص۔ ۵۶۔ ج۔ ۲۔

جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ منبر شریف پہ بیٹھے یعنی بیعت لینے کے لیے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور بنو ہاشم کے چند افراد بھی حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے گھر میں موجود تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے کہ مجھے اس ذات اقدس کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ یا تو بیعت کے لیے نکلو گے یا پھر میں تم پہ گھر کو جلا دوں گا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ تلوار سونتے ہوئے نکلے تو ایک انصاری آدمی نے ان کو سینے سے لگا لیا اور زیاد بن لبید نے ان کے ہاتھ سے تلوار کھینچ لی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کو پتھر پہ مار کر توڑ دو پھر فرمایا انکو اپنے حال پہ رہنے دو اللہ تعالیٰ عنقریب انہیں میرے پاس لائے گا۔ جوہری کہتے ہیں مسلمہ بن عبدالرحمٰن نے کہا کہ ان سب نے اس کے بعد بیعت کر لی۔ الغرض جمہور محدثین اور ان کے اعیان و اکابر کا مذہب یہی ہے۔ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گو تاخیر سے بیعت کی لیکن اپنی رضا و رغبت سے کی اور جبر و اکراہ اور تہدید و تشدید

کے قصے شیعہ صاحبان کا انفرادی کارنامہ ہے۔ اور جمہور کے نزدیک ناقابلِ اعتماد و اعتبار ملاحظہ ہو شرح حدیدی۔ ص۔ ۲۲۔ ج۔ ۲۔

اما الذی یقوله جمهور المحدثین واعیانهم فانه علیه السلام امتنع من البیعة ستة اشهر ولزم بیته فلم یبایع حتی ماتت فاطمة علیها السلام فلما ماتت بایع طوعًا۔

جو کچھ جمہور اور اکابر محدثین نے کہا وہ یہی ہے کہ آپ نے چھ ماہ تک بیعت نہیں کی تھی اور گھر پہ ہی مقیم رہے۔ یہاں تک کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا وصال ہو گیا تو ان کے وصال کے بعد برضا و رغبت بیعت کر لی۔ جب جمہور محدثین اور اعیان و اکابر کی تحقیق یہی ہے اور شان مرتضوی کے شایاں اور لائق بھی یہی ہے اور آپ کے خطبات سے بھی یہی حقیقت نمایاں اور واضح ہے کہ ایک مرتبہ جس کے ساتھ اہل حل و عقد اور اہل الرائے بیعت کریں پھر حاضر و غائب کو وہ بیعت لازم ہو جاتی ہے اور اس میں نظر ثانی کی گنجائش نہیں رہتی اور انصار میں سے مختلف حضرات نے بھی آپ کو بقول ابوبکر جوہری یہی جواب دیا کہ اب بیعت کر کے توڑی نہیں جا سکتی۔

ابوبکر جوہری کی پہلی روایت جو ہم نے نقل کی ہے اس کے آخر میں ہے۔

فقال بشیر بن سعد لو کان هذا الکلام سمعته الانصار منك یا علی قبل بیعتهم لأبی بکر ما اختلف علیك اثنان ولکنهم قد بایعوا وانصرف علی إلی منزله ولم یبایع ولزم بیته حتی ماتت فاطمة فبایعه۔ ص۔ ۱۲۔ ج۔ ۶۔

بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر انصار تمہارا یہ کلام ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کرنے سے پہلے سن لیتے تو ان میں سے دو شخص بھی تمہارے حق میں اختلاف نہ کرتے لیکن وہ بیعت کر چکے ہیں لہٰذا اس کو توڑا نہیں جا سکتا، اور اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر کی طرف لوٹے اور بیعت نہ کی اور گھر میں ہی موجود رہے حتیٰ کہ جب حضرت زہرا رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا تو آپ نے بیعت کی۔

۲۔ ابوبکر احمد بن عبدالعزیز الجوہری نے یہی نقل کیا ہے۔

عن ابی جعفر محمد بن علی علیهما السلام ان علیا حمل فاطمة علی حمار

وصار بها ليلا الی بیوت الانصار۔ یسألهم النصرة وتسالهم فاطمة الانتصار له۔ فکانوا یقولون یا بنت رسول الله قد مضت بیعتنا لهذا الرجل لو کان ابن عمك سبق إلینا ابا بکر ما عدلنا به فقال علی أکنت اترك رسول الله صلی الله علیه وسلم میتا فی بیته لا اجهزه واخرج إلی الناس انازعهم فی سلطانه۔ شرح حدیدی۔ ج ۶ ص ۱۳۔

حضرت امام باقر کی طرف منسوب کر کے، روایت کی گئی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو گدھے پر سوار کیا اور رات کے وقت ان کو انصار کے گھروں کی طرف لے گئے ان سے امداد و نصرت کا مطالبہ کرتے تھے اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا بھی آپ کے لیے ان سے امداد و تعاون کا مطالبہ کرتی تھیں تو انصار کہتے تھے، اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر اور نور نظر ہم اس شخص یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر چکے ہیں اگر آپ کا چچا زاد بھائی ابوبکر سے پہلے ہمارے پاس پہنچ جاتا تو ہم کسی کو ان کے برابر نہ ٹھہراتے اور انہیں کو مقدم رکھتے تو حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا کیا میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر میں وصال کے بعد پڑے رہنے دیتا اور آپ کی تجہیز و تکفین نہ کرتا اور لوگوں کے پاس جا کر آپکی سلطنت کے متعلق ان سے نزاع و اختلاف کرتا۔

الغرض یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ بیعت کے بعد وہ حضرات اس کو کسی قیمت پر توڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اور اس بیعت پر اس قدر مضبوطی سے قائم تھے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی سفارش کے باوجود اور ان کے ہاں چل کر جانے کے باوجود انہوں نے اس سے عدول و انحراف کو جائز نہ سمجھا۔

لمحۂ فکریہ اور فوائد روایت (۱) ان دونوں روایات سے بیعت کو توڑنے کا عدم جواز تو واضح ہے ہی لیکن مقام غور ہے کہ اگر حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ خود لوگوں کو بیعت توڑنے پر مجبور کرتے رہے ہوں اور ہر قسم کا اخلاقی دباؤ ان پر ڈالتے رہے ہوں تو حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف بیعت توڑنے کی وجہ سے ناراضگی اور خروج و بغاوت کا الزام اور پھر ان کے خلاف جہاد و قتال کا

کیا جواز رہ جاتا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ روایات یار لوگوں کی تیار کردہ ہیں۔ احتجاج طبرسی کی روایت میں اور جوہری کی اس روایت میں صرف اتنا فرق ہے کہ جوہری نے انصار کی طرف سے اس مطالبہ کے قابل قبول نہ ہونے کی وجہ بھی نقل کی۔ یعنی بیعت کر کے توڑ نہیں سکتے لیکن طبرسی صاحب نے اس پر قینچی چلا دی۔ باقی مضمون اور الفاظ بالکل ایک ہیں۔ بلکہ طبرسی نے اس میں مزید رنگ یہ بھرا کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا ساتھ لے جانا بھی ذکر کیا۔ اور مہاجرین کے گھروں پہ جانے کا بھی ذکر کر دیا۔

(۲) انصار کا بالاتفاق یہ عزم ظاہر کرنا کہ اگر پہلے ہمارے پاس آجاتے تو ہم آپ کی بیعت کر لیتے لیکن بیعت کرنے کے بعد معذور ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی تصریح اور تنصیص اور نامزدگی حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کی امر خلافت و امامت کے لیے نہیں پائی گئی تھی۔ ورنہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کرتے ہی کیوں۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صرف قرابت اور خدمات اسلام کی وجہ سے عرض کر رہے ہیں۔ کہ پہلے تشریف لاتے تو تمہارے ساتھ کوئی دوسرا شخص ہماری نظروں میں برابر نہیں ہو سکتا تھا۔ تو حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کیونکر نظر انداز کر سکتے تھے۔ اور اپنے عہد و پیمان کو رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے کیونکر مقدم سمجھ سکتے تھے۔ جبکہ اندریں صورت بیعت ابوبکر میں دنیوی خسارہ کے ساتھ ساتھ دینی خسارہ بھی تھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کرنے میں دین اور آخرت کا نفع اور بھلا وابستہ تھا۔

اسی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے ابن ابی الحدید نے کہا۔ قلت هذا الحدیث یدل علی بطلان ما یدعی من النص علی امیر المؤمنین وغیره۔ ج ۶ ص ۱۲!

یعنی اگر کسی بھی شخصیت کے حق میں نص وارد ہوتی تو اس کو مقام احتجاج و استدلال میں پیش کرتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوئی نص انصار یا ابوبکر صدیق اور ان کے معاونین اور ہمنواؤں کے سامنے بیان نہیں فرمائی۔ لہذا دعویٰ تنصیص و وصیت بھی

قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ورنہ کون عقلمند ہے جو کسی کی دنیا کے لیے اپنی عاقبت اور آخرت کو تباہ کرے۔

عذر تاخیر: ۔ رہا یہ عذر کہ ہیں تجہیز و تکفین کو چھوڑ کر پہلے اس مسئلہ کی طرف کیونکر متوجہ ہوتا تو حقیقت حال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قطعاً ایسا نہیں فرمایا کیونکہ کون نہیں جانتا کہ یہ صرف مسجد نبوی کے امام اور خطیب کا وصال نہ تھا بلکہ شہنشاہ عرب کا وصال تھا۔ اور حکومت کے معاملات کو ایک لمحہ کے لیے بھی التوا میں رکھنا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی حملہ آور ہو جائے۔ باغی اٹھ کھڑے ہوں وغیرہ وغیرہ تو آخر اس کا بندوبست کون کرے گا۔ اس لیے آج کی ترقی یافتہ دنیا میں باپ کی وفات ہو چکی ہوتی ہے پھر بھی پہلے بیٹے کو مسند پر بٹھاتے ہیں۔ بعد میں اسی کی زیر نگرانی اس کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مکمل انتظامی مشینری موجود ہوتی ہے۔ اور جس دور میں سوائے ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے باہم ربط و ضبط کی اہل اسلام کے لیے کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ اس دور میں اس مسند کو خالی کیوں کر رکھا جا سکتا تھا۔ لہٰذا عقل سلیم اور فکر صائب کا تقاضا یہی تھا کہ پہلے جانشین کا انتخاب عمل میں آتا۔

نیز سب سے پہلے یہ مسئلہ کھڑا ہی انصار کی طرف سے ہوا تھا نہ کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی طرف سے اور یہ حضرات تو اس انتشار و افتراق کو دور کرنے کے لیے تشریف لے گئے لیکن حالات کا تقاضا یہ ہو گیا کہ فوری طور پر خلیفہ کا چناؤ عمل میں نہ آتا تو دوبارہ فتنہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ اور کچھ بھی ہو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انصار پر یہی حجت قائم کرنی چاہیے تھی۔ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پہلے نہیں فرما چکے تھے میرے آنے اور نہیں کہنے کی ضرورت کیا تھی۔ تم نے آپ کے فرمان کو کیوں پس پشت ڈالا اور وہی فرمان ہر اجماع سے مقدم ہے۔

قابل غور: ۔ دنیا میں بے شمار بادشاہتیں قبل از اسلام بھی گزریں اور اسلام کے ظہور کے بعد بھی کیا اس کی مثال کوئی مل سکتی ہے۔ کہ پہلا بادشاہ دوسرے کو

نامزد کرے۔ اور ولی عہد بنائے وصیت اس کے حق میں کرے۔ مگر لوگوں کو پتہ نہ چل سکے کہ کوئی ولی عہد ہے بھی یا نہیں۔ اور کسی کو نامزد کیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر دنیوی بادشاہوں کے اعلان کے بعد ایسا نہیں ہوا کہ رعیت نے دوسروں کو خود ہی نامزد کر لیا ہو تو بادشاہ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رعایا نے ایسا کیوں کر کیا۔ اور یہ عذر اور بہانہ انہیں کیسے ہاتھ آ گیا کہ تم نے خود ہی تاخیر کر دی تھی ورنہ ہم سب پر آپ کو ہی ترجیح دیتے اور تمہیں مسند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بٹھاتے۔ لہٰذا مہر نیمروز کی طرح عیاں ہو گیا کہ کوئی وصیت اور نص آپ کے متعلق موجود نہیں تھی۔

لائق توجہ: ۔ اسلام سے پہلے بھی شخصی حکومتیں قائم تھیں اور لوگوں کو حق خود ارادیت حاصل نہیں تھا اور اگر اسلام نے بھی یہی طریقہ جاری کرنا تھا اور شخصی حکومت کی بنیاد رکھنی تھی۔ تو پھر لوگوں کے لیے اسلام میں کون سی رغبت ہو سکتی تھی۔ اس لیے یہ چیز مزاج اسلام کے ہی خلاف تھی۔ اور جس انقلاب کے لیے اس پسندیدہ دین کو آخری نبی کے ہاتھ میں دے کر بھیجا گیا تھا یہ اس کی روح کے بھی سراسر خلاف تھا اس لیے کسی ایسی شخصی حکومت کی بنیاد رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ ورنہ دشمنوں کو یہ شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موقعہ مل سکتا کہ نبوت و رسالت کا اعلان محض ڈھونگ تھا۔ دراصل حکومت و سلطنت کا حصول اور اسے اپنی اولاد اور خویش و اقربار کے لیے مختص کرنا مقصود تھا۔ پھر آپ کا رسالت و نبوت کی تبلیغ پر اجر بھی بایں معنی ثابت ہو جاتا کہ حکومت خود بھی کی اور اولاد و اقربا کے لیے قیامت تک اس کا بندوبست ہو گیا۔ حالانکہ آپ نے صرف اور صرف یہ مطالبہ فرمایا۔ کما قال تعالیٰ قل لا اسألکم علیہ اجرا إلا المودة فی القربی۔ کہ میں تبلیغ احکام رسالت پر کسی اجرت کا طلبگار نہیں۔ اگر کوئی چیز تم پر لازم ہے تو وہ یہ کہ میرے قریبیوں کے ساتھ محبت کرنا اور مودت و الفت رکھنا۔ اگر خلافت و امامت ہی لازمی تھی تو "الا الخلافة والامامة فی القربی۔" بھی کہا جا سکتا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ فتح ہونے پر جلدی وصال پانے کی خبر دے دی۔ اور اخروی

تیاری کی۔ کما قال تعالیٰ۔ اذا جاء نصر اللہ والفتح ورأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا فسبح بحمد ربك واستغفرہ انہ کان توابا۔

کیونکہ مقصد بعثت حکومت وسلطنت نہیں تھا بلکہ محض تبلیغ احکام رسالت اور اللہ تعالیٰ کی راہ پر لوگوں کو گامزن کرنا تھا۔ جب وہ پورا ہوا تو فوراً اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو پاس بلا لیا تاکہ دامن نبوت ورسالت پر اس اعتراض اور وہم ووسوسہ کی غبار بھی نہ پڑنے پائے۔ کہ حکومت وسلطنت کے لیے ہی سبھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اور دعویٰ نبوت کو ذریعہ حصول بنایا گیا۔

رسالہ مذہب شیعہ: از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

وصیت خلافت کی نفی پر دلائل

دلیل چہارم

ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا۔ میں آپ کے ساتھ بیعت کرتا ہوں۔ جواباً شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

لیس ذلك الیکم انما ذلك لأهل بدر فمن رضوا به فهو خلیفة

کشف الغمہ۔ ص۔ ۲۳۔ سطر۔ ۲۶۔ مطبوعہ ایران۔

یہ تمہاری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ یہ اہل بدر مہاجرین وانصار کا حق ہے۔ پس جس پر وہ راضی ہو جائیں وہی خلیفہ ہے۔

اس روایت نے بھی کئی مشکلیں حل کر دیں جو کسی صاحب بصیرت پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

اول یہ کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں وصیت ہوتی تو شیر خدا نہ خود وصیت کے خلاف عمل فرماتے اور نہ ہی دوسروں کو اس وصیت کی مخالفت

پر مجبور کرتے۔

دوسرا خلافت کے انعقاد کے لیے اہل بدر کی رائے پر انحصار نہ فرماتے اور خلافت کا انعقاد اس میں منحصر قرار نہ دیتے۔ بلکہ وصیت کا ذکر فرماتے۔ اور اسی کے مطابق عمل ضروری اور لازمی یقین فرماتے۔

تحفہ حسینیہ: از ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی عفی لہٗ۔

یہی مضمون دوسرے طرق سے بھی منقول ہے۔ جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپ کا اختلاف ونزاع ہوا۔ تو آپ نے ان کی طرف سے مصالحت کی گفتگو اور بات چیت کے لیے آنے والوں کو فرمایا۔ "أن الناس تبع المهاجرين والانصار وهم شهود المسلمين فی البلاد علی ولاتهم وأمراء دينهم فرضوا بي وبايعوني ولست استحل ان ادع ضرب معاوية يحكم بيده علی الأمة ويركبهم ويشق عصاهم۔" یعنی لوگ مہاجرین وانصار کے تابع ہیں۔ اور وہی مسلمانوں کے لیے ان کے امراء اور والیان امر پر شہود وگواہ ہیں۔ اور وہ سب مجھ پر راضی ہوئے اور انہوں نے میرے ساتھ بیعت کی۔ اور میں یہ حلال نہیں سمجھتا کہ معاویہ جیسے آدمیوں کو چھوڑ دوں۔ اور وہ امت پر حکم چلائیں اور ان کے سروں پر مسلط ہوں۔ اور ان کے اتحاد واتفاق کو پراگندہ کریں۔

وہ حضرات یعنی عبیدہ سمانی، علقمہ بن قیس نخعی، عبد اللہ بن عتبہ اور عامر بن عبد القیس امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد سن کر امیر معاویہ کے پاس گئے اور آپ کا جواب ذکر کیا تو انہوں نے کہا حقیقت حال اس طرح نہیں ہے۔ آخر ہمارے ساتھ بھی مہاجرین وانصار ہیں۔ وہ کیوں ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئے اور ان سے کیوں مشورہ اور رائے طلب نہیں کی گئی۔ فما بال من ههنا من المهاجرين والانصار لم يدخلوا في هذا الأمر ويؤامروا فيه۔

وہ حضرات پھر امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اہل شام کا جواب آپ کو عرض کیا تو آپ نے فرمایا:۔

ویحکم انما ذلک للبدریین دون الصحابة، لیس فی الأرض بدری الا وقد بایعنی وھو معی أو قد قام ورضی فلا یغرنکم معاویة من انفسکم و دینکم شرح حدیدی ج ۱۰ ص۱ انقلاً عن تصرین مزاحم من کتاب الصفین
افسوس ہے تم پر خلیفہ بنانے کا حق بدری مہاجرینؓ انصار کو ہے۔ نہ کہ تمام مہاجرین و انصار اور دیگر صحابہ کو اور روئے زمین پر کوئی بدری صحابی نہیں مگر اس نے میری بیعت کی ہے۔ اور وہ میرے ساتھ ہے۔ یا میری مجلس سے اس وقت اٹھا جب کہ مجھ سے راضی تھا۔ لہٰذا تمہیں معاویہ اپنے نفوس اور دین میں دھوکہ نہ دے۔ اور اس کے بہکاوے میں نہ آؤ۔

الغرض آپ کا امامت وخلافت کے انعقاد کے لیے اصحاب بدر اور بدری مہاجرین و انصار کے اجتماع واتفاق کو اور ان کے شوری اور انتخاب کو معیار حق قرار دینا ظاہر اور واضح ہے۔ اور مسلم حقیقت جس میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے کہیں اس حقیقت کو عمومی الفاظ میں بیان فرمایا اور کہیں تخصیص کے ساتھ بیان فرمایا رضا صحابہ رضا خداوند تعالیٰ ہے۔ اور نہج البلاغۃ کے حوالے سے گزر چکا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ان کے اجتماع کو اور کسی شخص کو خلیفہ نامزد کرنے کو اللہ تعالیٰ کا فعل اور اس کی رضا قرار دیا گویا جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا مارنا خدا تعالیٰ کا مارنا "وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ" آپ کا بیعت لینا اللہ تعالیٰ کا بیعت لینا "ان الذین یبایعونك انما یبایعون اللہ" اسی طرح آپ کے صدقہ میں صحابہ کرام علیہم الرضوان کے لیے یہی اعزاز حاصل ہے۔ کہ ان کا مارنا اور قتل کرنا اللہ تعالیٰ کا مارنا اور قتل کرنا ہے "فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم" ان کا بنو النضیر کی کھجوروں میں سے بعض کو کاٹنا اور بعض کو برقرار رکھنا اللہ تعالےٰ کا امر اور اس کی رضا قرار پایا۔ "وما قطعتم من لینة أو ترکتموھا قائمة علی أصولھا فباذن اللہ" کیونکہ منصب محبوبیت پر فائز ہونے کے بعد بندہ کے افعال انوار محبوبیت کی بدولت سرزد ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کا فعل قرار پاتے ہیں۔ "کما فی الحدیث

القدسی "کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بھا ولسانه الذی یتکلم به وفؤاده الذی یعقل به" یعنی میں ہی اس بندۂ محبوب کے کان ہوتا ہوں جن سے سنتا ہے۔ اور آنکھ ہوتا ہوں جس سے دیکھتا ہے۔ اور ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے پکڑتا ہے۔ اور زبان جس کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ اور دل ودماغ جس کے ساتھ سوچتا ہے علی الخصوص جبکہ صرف ایک شخص کا فیصلہ بھی نہ ہو بلکہ اخص الخواص صحابہ کرام اس میں شامل ہوں۔ تو پھر وہ انتخاب یقیناً اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہوگا۔ اور ان کی رضا لازماً اللہ تعالیٰ کی رضا ہوگی۔ کیونکہ یہی وہ امت ہے جس کا طرۂ امتیاز اور وجہ انفراد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ لہٰذا ان کا غیر شرعی امر پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے برعکس اور مخالف امر پر اجماع کیوں کر ہو سکتا ہے؟ "کنتم خیر أمة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ اور یہی وہ امت ہے جس کی شہادت اور گواہی پر قیامت کے دن انبیاء ورسل علیہم السلام کے حق میں اور ان کی امم واقوام کے خلاف اللہ تعالےٰ فیصلہ فرمائے گا" کما قال تعالیٰ: کذلك جعلناکم امة وسطا لتکونوا شھداء علی الناس (الآیة) اگر دنیا میں اور اپنی امت میں ایک منتظم کے انتخاب میں ان سراپا تقویٰ اور کامل الایمان حضرات کا قول قابلِ قبول نہیں اور ان کی شہادت مردود ہے۔ تو قیامت میں انبیاء وامم کے معاملہ میں اس کی قبولیت کا تصور کیونکر کیا جا سکتا ہے۔
اور قرآن مجید نے ہی ان کی راہ کو راہِ ہدایت قرار دیا اور اس کی خلاف ورزی کو جہنم کا راستہ۔ اور اسی کا حوالہ حضرت امیر المؤمنین نے بھی دیا۔ "قاتلوہ علی اتباعه غیر سبیل المؤمنین وولاہ اللہ ما تولی واصلاہ جہنم وساءت مصیراً" لہٰذا ثقلین کی شہادت اور ان کے اتحاد واتفاق نے واضح کر دیا کہ ان کا انتخاب اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے۔ اور ان کی رضامندی اور خوشنودی اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذلك

مذہبِ شیعہ: از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

الغرض ان ارشادات عالیہ پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے اور ان کی تفسیر وتشریح لکھنے اور پڑھنے کی ضرورت نہیں، خلافت کا انعقاد اور خلفاء راشدین کی خلافت اور اس کا مدلل ثبوت اور مہاجرین وانصار کے متفقہ فیصلے سے خلفاء راشدین

علیہم الرضوان کی خلافت کا ثبوت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنی خلافت کی حقانیت پہ خلفاء سابقین کی حقانیت خلافت کو بطور دلیل پیش کرنا اور مہاجرین وانصار جس شخص کو امام اور امیر بنائیں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے مطابق اس کا امام اور امیر ہونا اور حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا یہ حکم دینا کہ جو ایسے امیر کی خلافت کا انکار کرے وہ واجب القتل ہے۔ یہ تصریحات اظہر من الشمس ہیں۔

اب ان تصریحات اور واضح ارشادات کو غلط اور غیر ناشئی عن دلیل احتمالات اور نامعقول توجیہوں کے ساتھ بگاڑنے کی کوشش نہ فرمائی جائے ورنہ حسب تصریح صاحب کشف الغمہ حق سے ردگردانی ہی ہوگی۔ اور آفتاب کو مکڑی کے جالے سے روپوش کرنے کی مثال زندہ ہوگی۔

علامہ ڈھکو صاحب کا عجز۔ اور جواب دلائل سے گریز اور فرار

(نوٹ) علامہ ڈھکو صاحب نے اس فصل میں قائم کردہ دلائل میں سے صرف اس آخری عبارت کے متعلق جواب کی ناکام کوشش کی ہے۔ اور پہلی عبارات کو بالکل ہضم کر گئے اور ڈکار تک نہیں لیا۔ گویا کہ مذہب شیعہ میں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ان کو ذکر ہی نہیں کیا۔ حالانکہ کون نہیں جانتا کہ اصل حامل اہمیت عبارات وہی تھیں۔ اور دوسری عبارات ان کی تائید مزید کے طور پر پیش کی گئی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈھکو صاحب نے عملی طور پر اپنے عجز کا اعتراف کر لیا اور اپنی مجبوری و بے بسی کو تسلیم کر لیا۔ بھلا جوابی کارروائی کا یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ کہ اصل اور اہم دلائل کو نظر انداز کر دیا جائے اور تبعاً اور ضمناً ذکر کئے گئے دلائل کا جواب شروع کر لیا جائے بہرکیف اب وہ جواب ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ اور پھر اس کی لغویت اور بیہودگی واضح کرتے ہیں۔

تنزیہہ الامامیہ۔ از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

۱۔ شیعیان حیدر کرار کا یہ عقیدہ ہے کہ نبی کی طرح امام کا مقرر کرنا بھی خداوند تعالیٰ

کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ جس طرح تمام دنیا مل کر نبی منتخب نہیں کر سکتی اسی طرح ساری کائنات مل کر امام بھی نہیں بنا سکتی۔ وربك يخلق ما يشاء ويختار ما كان لهم الخيرة۔ اس عقیدہ کی صحت پر بیسیوں عقلی و سمعی ادلہ و براہین قائم ہیں۔ لیکن ہم نے یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ مؤلف نے کشف الغمہ کی جو عبارت نقل کر کے ہمارے عقیدہ کی تردید کرنا چاہی ہے وہ درست نہیں کیونکہ یہ واقعہ اہل سنت کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ کشف الغمہ صـ۲۳ پر عنوان قائم ہے۔ (قال الخطیب ابو المؤید الخوارزمی الخ۔

۲۔ نیز پیر صاحب کو اس قصہ پر اتنا خوش نہیں ہونا چاہیے کہ اس نے کئی مشکلیں حل کر دیں بلکہ اس نے تو نئی مشکلات کا دروازہ کھول دیا ہے۔ کیونکہ وہ اگر تسلیم کرتے ہیں کہ خلیفہ سازی کا حق تمام اہل بدر کو ہے تو انہیں خلفاء ثلاثہ کی خلافت سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا۔ کیونکہ ابوبکر صاحب کی بیعت صرف عمر صاحب کے بیعت کرنے سے اور بعض لوگوں کے بیعت کرنے سے عمل میں آئی۔ اور دوسرے صاحب کی بیعت پہلے صاحب کی وصیت سے اور تیسرے صاحب کی دوسرے صاحب کی مقرر کردہ کمیٹی کے رکن اعظم عبدالرحمٰن بن عوف کے بیعت کرنے سے وجود میں آئی۔ بنابریں جب پہلی خلافت ہی غلط ثابت ہوئی تو اس سے دوسری خلافتوں کا بطلان روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا صـ۹۹، ۱۰۰

تحفہ حسنیہ: از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

الجواب وهو الموفق للصدق والصواب ورفع ريب المرتاب

امام کا انتخاب کون کرتا ہے

امر اول (۱) ڈھکو صاحب کا دعویٰ ہے کہ خلیفہ کا انتخاب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ساری کائنات مل کر بھی کسی شخص کو امام اور خلیفہ نہیں بنا سکتی مگر یہ صرف دعویٰ ہی رہا اور اسی کو حضرت شیخ الاسلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات سے باطل فرمایا اور بنیادی مقصد بھی یہی تھا۔ لہٰذا اس سے پہلو بچانا اور نہج البلاغۃ جیسے قرآن ثانی

کی عبارات کو نظر انداز کرنا اور مقام رد و قدح میں ان دلائل کے جواب سے پہلو تہی کرنا بالکل بے جواز ہے اور اعتراف عجز و قصور کے مترادف ۔

۲ ۔ شیعانِ حیدر کرار کے عقیدہ کا بیان ہمیں مطلوب نہیں اسے دلیل کی کسوٹی پر پرکھ کر یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ نظریہ غلط ہے۔ اگر محض کسی کا عقیدہ سن کر خاموش رہنا لازم ہے تو ہمارا بھی عقیدہ ہے کہ ان بندگان خدا رسیدہ کا انتخاب اللہ تعالٰے کا انتخاب ہے ۔ لہٰذا اس پر کسی کو اعتراض کا کیا حق ہے؟ اور ہماری تردید کا کیا جواز ہے ۔

۳ ۔ ڈھکو صاحب اور اس کی برادری جو دلائل پیش کرتی ہے ۔ اس میں ہی خود کائنات کے افراد خاصہ کا انتخاب ہی پیش کرتی ہے ۔ مثلاً حضرت موسٰی علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو فرمایا "اخلفنی فی قومی" تم قوم بنی اسرائیل میں میرے نائب اور خلیفہ ہو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "أنت منی بمنزلة هارون من موسٰی" کہ تم میرے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہو جو حضرت موسی علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے درمیان تھی ۔ لہٰذا دونوں خلفاء کا انتخاب بقول شیعہ برادری کائنات میں سے دو افراد کے ذریعے ہی ثابت ہوا تو اس طرز انتخاب کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے ۔

۴ ۔ نبی کا انتخاب بجا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مگر اس میں تو اختلاف نہیں ۔ اختلاف ہے امام کے نصب کرنے میں لہٰذا مختلف فیہ میں متفق علیہ کا حوالہ دے دینا کونسی علمیت کا مظاہرہ ہے ۔ مثلاً اگر کہا جائے شیعہ اور اہل سنت اللہ تعالیٰ کو ایک مانتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول برحق لہٰذا خلافت میں بھی کوئی اختلاف نہیں تو کیا یہ طرز استدلال درست ہے ۔

۵ ۔ ڈھکو صاحب نے دبے انداز میں ایک دلیل کی طرف اشارہ کر ہی دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے ۔ اور اختیار فرماتا ہے اور ان کے لیے اختیار نہیں ہے اس میں خلافت و امامت کے اختیار کی تو بات ہی نہیں ہے ۔

یہاں تو تخلیق باری تعالیٰ کے انفراد اور کیفیت خلق اور کمیت و احوال و اطوار و اوصاف میں اس کے استقلال کا بیان ہے اور ان امور میں مخلوق کے اختیار کی نفی نہ کہ مطلق اختیار کی نفی ۔ ورنہ بندوں میں اختیار ہی نہ ہو تو ان کو ایمان اور اعمال صالحہ کا پابند کیسے کیا جا سکتا ہے ۔ اور اعمال سیئہ سے دور رہنے کا پابند کیونکر کیا جا سکتا ہے ۔ کیا اللہ تعالیٰ کو پیدا کرنے کے بعد صرف امام منتخب کرنے کا اختیار رہتا ہے دوسرا کوئی اختیار نہیں؟ اور مخلوق میں صرف امام منتخب کرنے کا اختیار نہیں باقی سب اختیار ہیں ۔ اگر ذرہ بھر عقل اور دیانت کسی میں ہو تو وہ اپنی اس دلیل پہ ہزار بار روئے کہ ہماری برادری کیسے لغو اور بیہودہ استدلال پیش کرتی ہے ۔ تمام عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ثبوت اعم سے ثبوتِ اخص لازم نہیں آتا ۔ جس طرح کسی شے کے انسان ثابت ہو جانے سے اس کا عقلمند ہونا ثابت نہیں ہو جاتا چہ جائیکہ مؤمن ہونا اسی طرح اللہ تعالٰے کے با اختیار ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خلیفہ کا انتخاب کرنے میں ہی با اختیار ہے ۔ اور مخلوق سے صرف اس انتخاب کی ہی نفی ہے ۔ دوسرے جملہ اور تمامی اختیارات ان کے لیے ثابت ہیں اور مسلم ۔

حضرت موسی علیہ السلام کا نیابت کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام کو منتخب فرمانا قرآن مجید سے ثابت سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا غزوۂ تبوک کے موقعہ پر خلفاء ثلاثہ کو ساتھ لے جانے کا اختیار اور خلیفہ رابع کو مدینہ منورہ میں نائب بنانے کا اختیار کہاں سے آ گیا اور موسٰی علیہ السلام جن ستر افراد کو اپنے ہمراہ طور کی طرف لے گئے تھے ۔ ان کا اختیار اور ان کا انتخاب کس نے کیا تھا ، قال تعالیٰ : وَاخْتَارَ مُوسٰى قَوْمَهُ سَبْعِيْنَ رَجُلًا موسٰی علیہ السلام ہی تھے جنہوں نے ان کا انتخاب فرمایا ۔ پھر قرآن مجید نے مطلقاً اہل ایمان سے اختیار کی نفی نہیں فرمائی بلکہ اس کو مقید اور مخصوص ٹھہرایا ہے ۔ کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول حکم دے تو پھر وہ اپنے اختیار کو بروئے عمل نہیں لا سکتے نہ کہ مطلق ارشاد باری تعالیٰ ہے "ما كان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضى الله ورسوله امرا ان يكون لهم الخيرة من امرهم" لہٰذا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا جہاں حکم اور قضا وارد

نہ ہو تو وہاں اختیار کی بالکل نفی نہیں ہے بلکہ اسلوب کلام اور انداز بیان سے اس مورد اور محل ومقام کے ماسوا میں اسی آیت کریمہ سے اختیار ثابت ہوگیا اور چونکہ حاکم کا منتخب کرنا افعال مکلفین سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں اشخاص کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں اور نہ رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لہذا اس میں اس آیت سے معلوم ہوگیا کہ بندوں کو اختیار حاصل ہے گویا یہ ہماری دلیل بن گئی برعکس زعم شیعہ کے۔

٦۔ حضرت امام حسن عسکری کے بعد اللہ تعالیٰ کا منتخب تو دنیا پہ نہ ظاہر ہوا نہ اس نے امت کے امور کی دیکھ بھال کی اور مخلوق کو حق اختیار و انتخاب ہے نہیں تو اس عرصہ میں نظامِ امت ظہورِ مہدی علیہ السلام تک کس طرح برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ شہنشاہیت کی صورت میں یا حق خودارادی کی صورت میں شہنشاہ کا تقرر کون کرے گا یا حاکم وقت کا انتخاب کون کر سکتا ہے اور اب تیرھویں امام یعنی خمینی صاحب کے دور میں انتخاب اور طریق اختیار اپنانے کا کیا جواز ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کا ارشاد "ما کان لهم الخیرة" اہل ایران کے لیے نہیں ہے صرف صدرِ اول اور صحابہ کرام علیہم الرضوان کے لیے تھا۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

٧۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ہر وقت ہر جگہ اور ہر ایک کے سامنے اپنی حقانیت خلافت کی یہی دلیل دہرائی کہ میں مہاجرین و انصار کا منتخب ہوں۔ اور جن حضرات نے خلفاء ثلاثہ کا انتخاب کیا تھا میرا انتخاب کرنے والے بھی وہی ہیں اور جن انصار نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ہر اخلاقی دباؤ کے باوجود تعاون سے معذوری ظاہر کی اور صاف جواب دیا تو ان کا مؤقف بھی یہی تھا کہ وہ ہمارے ہی منتخب ہیں۔ اور ہم نے ان کے ساتھ بیعت کر لی ہے۔ کیا اس دور میں یہ آیت نازل نہیں ہوئی تھی۔ یا جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا ان کو اس کا ترجمہ نہیں آتا تھا۔ یا جس معلم کتاب کو تعلیم کتاب و حکمت کے لیے مبعوث فرمایا گیا تھا انہوں نے اس آیت کی تشریح نہیں کی تھی۔ اور

اپنے فرضِ منصبی کے ادا کرنے میں کوئی کسر چھوڑ دی تھی۔ العیاذ باللہ

ڈھکو صاحب صحابہ کرام علیہم الرضوان کے ساتھ بغض یہود و مجوس کو ہونا چاہیے ان کو جتنی تکلیف ان سے پہنچی اس کا واقعی تقاضا یہی ہے۔ لیکن مسلمان کہلانے والوں کو اور محب اہل بیت ہونے کے مدعیوں کو اتنا بغض کیوں ہے کہ قرآن میں تحریف سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ اور حقائق و واقعات کو بھی ایک نظر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی۔ جس طرح بھو کے آدمی کو سورج بھی روٹی معلوم ہوتا ہے ڈھکو صاحب کو بھی جہاں اختیار کی نفی نظر آئے وہیں انتخاب خلیفہ کے اختیار کی نفی ہی معلوم ہوتی ہے۔

اگر یہاں افراد کا مخلوق میں سے انتخاب بھی مراد لیا جائے تو اس سے مراد رسل کرام علیہم السلام کا انتخاب اور منصب نبوت کے لیے نامزد کرنا مراد ہے یعنی یہ انتخاب لوگوں کے بس میں نہیں جیسا کہ تفسیر مجمع البیان میں شیعہ کے مستند مفسر طبرسی نے ذکر کیا ہے ملاحظہ ہو ص ٢٦٢ جلد ۴۔ لہذا محل نزاع میں اس کو پیش کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ نیز جن کو اللہ تعالیٰ اختیار فرماتا ہے وہ خود ہی اعلان کرتے ہیں۔ اور ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پھر کیوں اعلان نہ فرمایا اور کیوں نہ اپنے مؤقف پہ قائم رہے۔ دوسرے خلفاء کے ساتھ موافقت اور سازگاری کا پھر کیا مطلب تھا؟ کسی پیغمبر خدا نے بھی اس طرح مخالف قوتوں کے ساتھ ہمنوائی فرمائی اور اپنے دعویٰ کو ترک کر کے ان کا ساتھ دیا۔ جب نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر اس استدلال کی لغویت اور بیہودگی روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی۔

٨۔ علاوہ ازیں حضرت امام رضا رضی اللہ عنہ کو مامون الرشید نے خلافت دینا چاہی تو لینے سے انکار کر دیا۔ بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور فتویٰ و قضاء کا منصب سنبھالنے سے بھی انکار کر دیا۔ البتہ اس کا ولی عہد بننا قبول فرما لیا تو ذرا اس راز سے بھی پردہ اٹھا دو کہ اللہ تعالیٰ امامت و خلافت کے منصب کے لیے منتخب کرے مگر اللہ کا منتخب امام و خلیفہ خود بھی دعویٰ نہ کرے اور لوگوں کو اپنی طرف نہ بلائے۔ اور صاحب اختیار اور حاکم وقت تفویض کرے

تو بھی قبول نہ کرے یہ کیسی امامت و خلافت ہے؟ پھر نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا جو ہر عالم بلکہ مسلمان کا فریضہ ہے اس سے بھی معذرت کر دیں۔ آخر ایسا امام مقرر کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ جو صرف امتی ہونے کے تقاضوں پر بھی پورا نہ اتر سکے پھر اسی مامون کی ولی عہدی کو قبول کر لیا۔ آخر اللہ تعالیٰ کے علاوہ جب کوئی انتخاب اور اختیار و پسند کا حق نہیں رکھتا تھا تو مامون کو یہ حق کیونکر مل گیا امام رضا نے اس کا یہ اختیار کیونکر تسلیم کر لیا۔

۹۔ ہر پچھلا امام پہلے امام کی وصیت سے امام بنا اگر مخلوق کا یہ معاملہ ہی نہیں اور نہ ان کے ہاتھ میں اس طرح کا اختیار ہے تو سابقہ اماموں کو وصیت کرنے کی ضرورت کیوں پڑی۔

۱۰۔ نیز ہر امام کے دور امامت میں ان کے اہل بیت ہی مقابلہ میں دعویٰ امامت کرتے رہے ہیں کیا ائمہ کرام نے خود اپنے فرزندوں اور اقرباء کو بھی یہ مسئلہ نہیں سمجھایا تھا حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت محمد بن حنفیہ نے امامت کا دعویٰ کیا۔ حضرت امام باقر اور امام جعفر صادق کے دور میں حضرت زید، حضرت ابراہیم اور حضرت محمد نفس زکیہ نے امامت کے دعوے کئے وعلیٰ ہذا القیاس کیا اہل بیت کو بھی اس آیت کی تشریح معلوم نہیں تھی۔ یا وہ بھی العیاذ باللہ مرتد ہو گئے تھے۔

۱۱۔ امام حسین رضی اللہ عنہ بذاتِ خود خاموش تھے اور کوئی دعوی امامت کا نہ فرمایا۔ کوفیوں نے خط و کتابت شروع کی تو آپ وہاں جانے اور امامت و خلافت سنبھالنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ کیا اس کی بھی کوئی نظیر مل سکتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ خاموش رہے۔ اور نہ دعویٰ کرے نہ منصب کے تقاضے پورے کرے۔ اور لوگ دعوت دیں تو منصب کا اظہار بھی کرے اور امور مملکت سنبھالنے کے لیے تیار بھی ہو جائے۔ کیا پیغمبران کرام کا بھی یہی دستور رہا ہے؟

۱۲۔ امام حسن رضی اللہ عنہ نے امور سلطنت اور انتظامی معاملات امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیئے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ امور سنبھالنے کے لیے منتخب فرمایا تھا اور پابند کیا تھا۔ تو انہوں نے اس کا خلاف کیوں کیا اور اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ امور اپنے تصرف میں رکھنے کا پابند نہیں فرمایا تھا تو پھر اختیار کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ٹھہرانا باطل ہو گیا۔ اور خلیفہ و امام کا انتخاب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں منحصر کرنا درست نہ رہا۔ اور اگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اذن سے امیر معاویہ کو یہ امور سونپے تو پھر وہ عنداللہ امام کیوں نہ قرار پائے اور العیاذ باللہ ان کا ایمان بھی مشکوک کیونکر رہا۔

۱۳۔ حضرت مہدی علیہ السلام کو امامت دے کر اللہ تعالیٰ نے چھپ جانے کا حکم دیا۔ تو مخلوق کی بھلائی اور بہتری جو بقول شیعہ اللہ تعالیٰ پر فرض اور واجب ہے اس کی ادائیگی نہ پائی گئی اور اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا تو امام کا فرض منصبی کی ادائیگی سے گریز لازم آگیا۔ اگر نبی و رسول فرض منصبی ادا نہ کرے تو نبی و رسول نہیں رہ سکتا۔ کما قال تعالیٰ "یایھا الرسول بلغ ما انزل الیك فان لم تفعل فما بلغت رسالته"۔ اے رسول جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اس کی تبلیغ کرو۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی رسالت کو ادا نہیں کیا۔ جو امام اپنا منصبی فرض ادا نہ کرے وہ امام کیونکر رہ سکتا ہے اور پھر وہ غار میں بیٹھ کر انتظار کس کا کر رہے ہیں مرید بڑھنے کا تو کیا پیغمبر بھی اس طرح کرتے تھے یا کفر اور گمراہی کے بڑھنے کا تو ماشاء اللہ اب تو شیعہ صاحبان زیادہ ہو رہے ہیں۔ اور خمینی صاحب نے ہدایت خلق کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔ پھر امید ہی ختم کر دینی چاہیئے۔

۱۴۔ جسے اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا وہ لوگوں سے ڈر کر خاموش ہو گیا اور روپوش اور جسے لوگوں نے امام مانا وہ ڈنکے کی چوٹ روس اور امریکہ جیسی سپر طاقتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ اور کسی مخالف قوت کو خاطر میں

نہیں لاتا۔ اندریں حالات اللہ تعالےٰ کے انتخاب کا مخلوق کے حق میں مفید ہونے کے بجائے مخلوق کا اپنا انتخاب ہی مفید رہا۔ ورنہ کہو کہ اب اسلام نہیں کفر پھیل رہا ہے۔ اور خمینی صاحب کی امامت تسلیم کرنا کفر اور گمراہی ہے۔

۱۵۔ اگر اس وقت روحانی امامت حضرت مہدی کے پاس اور ظاہری حکومت خمینی کے پاس ہو تو کوئی حرج نہیں تو صدر اول اور دور صحابہ میں اس کو کفر و اسلام کا معاملہ قرار دینا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ بس روحانی امام کا تقرر اللہ تعالیٰ کرے اور حاکم کا بندے کریں تو اس میں نزاع و اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔

الغرض شیعہ صاحبان کے پاس اس پر قطعاً کوئی دلیل نہیں کہ نظام ملک اور امور سلطنت سنبھالنے کے لیے خلیفہ اور حاکم کا تقرر صرف اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے اور مخلوق اس میں دخل دینے کی مجاز نہیں ہے اور یہ ڈھکو صاحب اور ان کی برادری کا خالی دعویٰ ہے جس کو واقعہ اور حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اور اس کے چناؤ اور انتخاب کا اہل حل وعقد اور اصحاب رائے کے سپرد ہونا حضرت مولائے مرتضیٰ اور ابو الائمہ رضی اللہ عنہ کے واضح اور صریح ارشادات سے ثابت ہو چکا جس کے بعد چون وچرا کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی لیے ڈھکو صاحب نے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے پیش کردہ دلائل کا جواب نہ دیا اور نہ ہی ان کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

خطیب خوارزم کون ہے

۱۔ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کشف الغمہ کی روایت چونکہ خطیب ابو المؤید خوارزمی سے منقول ہے اور وہ سنی ہے۔ لہذا شیعہ کے خلاف حجت نہیں تو آپ اپنے وزیر باتدبیر اربلی صاحب سے پوچھیں کہ انہوں نے یہ لکھی کیوں ہے؟ شیعوں کو سنی بنانے کے لیے یا سنیوں کو شیعہ بنانے کے لیے بیان حقیقت کے لیے یا اہل سنت کو الزام دینے کے لیے آخر کوئی فائدہ اس کے لکھنے کا ہے بھی۔ وہ جو کہتے ہیں میں نے سب کے ہاں مقبول بنانے کے لیے اور سب کی رائے کے موافق بنانے کے لیے یہ روایات

درج کئے ہیں تو پھر اس کو قبول کرو اور اس کے مطابق عقیدہ رکھو یا پھر کہو کہ وزیر صاحب بد تدبیر تھے۔ اور یخ مارتے رہے ہیں۔ اور فضول وقت اور روپیہ برباد کرتے رہے ہیں۔

۲۔ ہم نے قبل ازیں بھی ذکر کیا ہے اور پھر عرض کئے دیتے ہیں کہ یہ خطیب صاحب دراصل آپ کے ہیں اور تم نے دھوکہ یہ دیا ہوا ہے کہ شیعہ امامیہ کے علاوہ شیعہ فرقوں کے مصنفین کی کتابوں کو سنیوں کے کھاتے میں ڈال کر حوالے دے دیتے ہو۔ حالانکہ تمہارا ہی آدمی ہوتا ہے۔ مگر بارہ امامی نہیں ہوتا تو از راہ تقیہ اس کو سنی کہہ دیا کرتے ہو۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے تحفہ اثنا عشریہ ص۱۴۲ پر فرمایا کید بست وسوم۔ آنکہ شخصے از علماء زیدیہ و بعضے فرق شیعہ غیر امامیہ اثنا عشریہ نام برند اول درحال او مبالغہ نمایند کہ وے از متعصبان اہل سنت است بلکہ بعضے از یشان گویند کہ او از اشد نواصب بود بعد ازاں از وے نقل کنند کہ دلالت بر بطلان مذہب سنیاں یا تائید مذہب امامیہ اثنا عشریہ نماید (تا) امام اخطب خوارزم کہ زیدی غالی است۔ خلاصہ مقصود یہی ہے کہ خطیب خوارزم زیدی اور غالی شیعہ ہے۔ لہذا اس سے انکار کرنا اور اسے اہل سنت کے کھاتے میں ڈالنا ہی غلط ہے۔ لہذا ڈھکو صاحب کا یہ جواب بھی اپنی مجبوری اور بے بسی کا عملی اعتراف ہے؟ نیز صاحب کشف الغمہ کا طریقہ کار قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے اس سے بھی ڈھکو صاحب کی راہ فرار مسدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

امر ثانی ــــ خلفاء ثلاثہ کی بیعت کرنے والے کون تھے

ڈھکو صاحب نے خلیفہ ثانی کو ایک فرد کا انتخاب اور خلیفہ ثالث کو شورائے کمیٹی کے افراد میں سے صرف عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا انتخاب قرار دے کر اس روایت کی رو سے ان کی خلافت کالعدم قرار دینے کی سعی فرمائی ہے۔ اور حضرت صدیق کی خلافت کو صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور معدودے چند آدمیوں کا

انتخاب قرار دے کر اسے بھی کالعدم کرنا چاہا ہے؟ مگر ڈھکو صاحب یہ تو حضرت مولائے مرتضیٰ سے دریافت کرنے والی بات تھی کہ جب مہاجرین و انصار نے تینوں خلفاء کی بیعت کی تھی تو تم نے کیوں فرمادیا کہ میرے ساتھ انہوں نے بیعت کی ہے جنہوں نے ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیعت کی تھی۔ اسی لیے نہج البلاغہ کی وہ عبارت بغیر جواب دیئے چھوڑ دی تھی کہ وہ سانپ کے مُنہ میں چھچھوندر بن کر نہ رہ جائے۔ لہٰذا آنکھیں بند کر کے نکل جاؤ گویا اس کتاب میں اس کا ذکر ہی نہیں تھا۔

علامہ صاحب اس کو پھر ذرا غور سے پڑھو اور عینک لگا کر پڑھو یا لگی ہو تو شیشہ بدلوا کر پڑھو وہاں لکھا ہے" انه بایعنی القوم الذی بایعوا ابابکر وعمر وعثمان علی ما بایعوهم علیه " میرے ساتھ اسی قوم نے بیعت کی ہے جس قوم نے ابوبکر، عمر اور عثمان کے ساتھ بیعت کی تھی۔ آپ کی لغت میں قوم کس کو کہتے ہیں؟ نیز بقول صاحب احتجاج طبرسی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ حضرات مہاجرین و انصار کے گھروں پر خود رات کو چکر لگاتے رہے اور نعیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ حضرت زہراء کو بھی گدھے پر سوار کر کے اور حسنین کو بھی ساتھ لے کر امداد کا مطالبہ کرتے رہے۔ وہ کس کے ساتھ تھے اور انہوں نے کیوں آپ کے سامنے معذوری ظاہر کی۔ آخر ایمان و امانت نام کی کوئی شے آپ کے ہاں نہیں رہ گئی اور دین و دیانت بالکل رخصت ہو چکے ہیں۔ کہ اس طرح دھاندلیوں پر اتر آئے ہو۔

حقیقت حال۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کا آغاز کیا نہ کہ صرف وہی بیعت کرنے والے تھے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام خلافت کے لیے تجویز فرمایا اور بیعت سب مہاجرین و انصار نے کی تھی۔ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام تجویز فرمایا اور بیعت کا آغاز کیا۔ ورنہ بیعت کرنے والے سبھی مہاجرین و انصار تھے حتیٰ کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی ان میں شامل تھے جیسے تصریحات گذر چکی ہیں لہٰذا آغاز کو انجام قرار دیدینا اور بیعت کرنے والوں کو

ایک ایک فرد میں منحصر کر دینا دن دھاڑے چوری کرنے کی ناکام کوشش ہے اور دیانت و امانت کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دینے کا بین ثبوت۔

نیز حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ خود شوریٰ کمیٹی میں شامل ہوئے جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا عملی اقرار اور اعتراف واضح ہو گیا۔ کیونکہ جب وہ بھی امام اور خلیفہ نہیں تھے تو ان کو بالواسطہ یا بلاواسطہ بعد والے خلیفہ کے انتخاب کا بھی کوئی حق نہیں تھا۔ لہٰذا آپ کا اس میں شامل ہونا ہی غلط تھا۔ اور اپنی خلافت کے دعویٰ سے دست برداری کے مترادف اور اگر وہ شمولیت صحیح تھی اور یقیناً صحیح تھی تو آپ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم کرنا بھی ثابت ہو گیا۔ بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت و خلافت کو بھی تسلیم کرنا کیونکہ آپ کو حضرت صدیق نے ہی نامزد فرمایا تھا لہٰذا آپ کی خلافت کا صحیح ہونا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے صحیح ہونے کے مترادف ہے۔

اور اسی سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا آپ کے نزدیک درست ہونا بھی واضح ہو گیا کیونکہ اکثریت کا فیصلہ تسلیم کرنا واجب و لازم تھا۔ ورنہ کمیٹی کے منشور کی خلاف ورزی لازم آجاتی اور جب اس میں شمولیت کر ہی لی تو پھر مخالفت کا حق ہی ختم ہو گیا۔ لہٰذا یہ حقیقت تسلیم کرنی فرض و لازم ہے کہ آپ نے اکثریتی فیصلہ کو تسلیم کیا اور یہی عثمان ذی النورین کی صحت خلافت کی ضمانت ہے۔ لہٰذا حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا عمل ہی تینوں حضرات کی خلافت کی صحت اور حقانیت کی ضمانت مہیا کرتا ہے۔ جب امام اول کا عمل اور کردار اور ان کا نظریہ ان کی خلافت کے متعلق یہ ہے تو پھر چیخنے چلانے اور ان حضرات کی خلافت کو دوسروں کی طرف منسوب کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی خلافت ان کی خلافت کی فرع ہے۔ وہ صحیح تو یہ صحیح اور وہ العیاذ باللہ غلط ہے تو یہ بھی غلط ہے اور یہی حقیقت حضرت مرتضیٰ کے ان ارشادات اور مشوروں سے ظاہر ہے۔ جو ابھی حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے قلم سے ذکر کیے جا رہے ہیں۔

رسالہ مذہب شیعہ — از شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

حقانیتِ خلافتِ فاروق اور مشورہ ہائے مرتضیٰ رضی اللہ عنہما

دلیل اوّل:۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا عقیدہ اور نظریہ جو خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق تھا بہت کچھ واضح ہو چکا ہے تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مزید ارشادات اِس ضمن میں ملاحظہ فرمائیں اور مزید اطمینانِ قلب حاصل کر لیں۔

نہج البلاغہ میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے غزوۂ روم کے موقعہ پر مشورہ طلب کرنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ دینے کا جن الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے اِس کا مطالعہ فرمائیں نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۸ نہج البلاغہ مصری جلد اوّل ص۳۱۱۔

قَدْ توکل اللّٰہ لاھل ھٰذا الدین باعزاز الحوزہ و ستر العورۃ والذی نصرھم وھم قلیل لا ینتصرون ومنعھم وھم قلیلٌ لا یمتنعون حیٌّ لا یموت انک متی تسر الی ھذا العدو بنفسک وتلقھم بشخصک فتنکب لا تکن للمسلمین کانفۃ دون اقصی بلادھم ولیس بعدک مرجع یرجعون الیہ فابعث الیھم رجلاً مجربا واحضر معہ اھل البلاء والنصیحۃ فان اظھر اللّٰہ فذلک ما تحب وان تکن الاخریٰ کنت ردءً للناس ومثابۃ للمسلمین۔

اللہ تعالیٰ نے اِس دین والوں یعنی مسلمانوں کو غلبہ دینے اور ان کی عزت کی حفاظت فرمانے کا کفیل اور ذمہ دار ہے۔ وہ ذات جل وعلا جس نے مسلمانوں کو ایسی حالت میں فتح و نصرت عطا فرمائی کہ مسلمان قلیل تعداد میں تھے اور قلت تعداد کی وجہ سے بظاہر فتح نہیں حاصل کر سکتے تھے اور اِن کے دشمنوں کو ایسی حالت میں اِن سے دور فرمایا کہ اہل اسلام بوجہ قلت تعداد اِن کو دور نہیں کر سکتے تھے وہ ذاتِ اقدس زندہ ہے نہ فوت ہوئی ہے نہ ہوگی آپ اگر بذاتِ خود دشمن کی طرف جائیں اور اس کے خلاف جنگ میں شرکت کریں اور ایسی حالت میں آپ شہید ہو جائیں تو پھر روئے زمین پر مسلمانوں کا کوئی آسرا اور اِن کی کوئی جائے پناہ نہ ہوگی آپ کے بعد اِن کے لیے کوئی ملجا، و ماویٰ باقی نہیں رہے گا جس کی طرف مسلمان رجوع کر سکیں اور اس کے ساتھ

پناہ لے سکیں۔ آپ کوئی تجربہ کار آدمی دشمن کی طرف روانہ فرما دیں اور اِس کے ساتھ جنگ آزمودہ لشکر بھیجیں پس اگر اللہ تعالیٰ نے فتح نصیب فرما دی تو آپ کا عین منشا یہی ہے۔ اور اگر خدا نخواستہ دوسری بات ہوگئی تو آپ کی ذات تو مسلمانوں کی ملجأ و ماویٰ اور اِن کے لیے آسرا اور جائے پناہ موجود ہوگی۔

ہے کوئی اہل تشیع کے مذہب میں نہج البلاغہ سے زیادہ معتبر کتاب؟ جس کی تصریحات پر اہلِ تشیع کا اطمینان ہو سکے۔ برادرانِ وطن اچھی طرح حضرت مولائے مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ارشادات کا مطالعہ فرمائیں اور اس کے بعد اگر یہی ثابت ہو کہ جن ہستیوں کی خیر مولیٰ علی منا رہے ہیں جن کو مسلمانوں کا ماویٰ وملجا قرار دے رہے ہیں۔ جن کو اہل اسلام کا آسرا اور جائے پناہ بیان فرما رہے ہیں، جن کے بعد مسلمانوں کو بے آسرا اور بے یار و مددگار یقین فرما رہے ہیں ان کی خلافت راشدہ سے پھر انکار کیوں! ان کی شانِ اقدس میں سب و شتم کا کیا معنی؟

ہاں اگر یہود و نصاریٰ اور مجوسی ان کی شانِ اقدس میں سب و شتم کریں تو ان کا حق تھا کیونکہ وہ دشمنانِ اسلام ہیں ان کی سلطنتوں کو دولت فاروقی نے تباہ و برباد کر دیا ان کے گرجوں کو مسجدوں میں تبدیل فرمایا۔ ان کے آتش کدوں کو ٹھنڈا کیا، ان کے تمام تر دبدبے اور ہیبت کو اسلام کی چوکھٹ کے آگے سرنگوں فرمایا لیکن مسلمان زادوں کو یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ شیرِ خدا کے نظریہ کے برعکس، تاریخ عالم کی شہادت کے برخلاف صرف چند روزہ آزادی اور عشرت سے مست ہو کر اپنے بزرگوں اور پیشواؤں کا مذہب چھوڑ کر مقتدایانِ اسلام کے حق میں سب و شتم شروع کر دیں۔

(رسالہ مذہب شیعہ ص۵۳ تا ص۵۵)

تحفہ حسینیہ

ازابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

بقول مؤرخ طبری وغیرہ یہ صلاح و مشورہ اس وقت کیا گیا جبکہ مسلمان لشکر کے کمانڈروں یعنی حضرت ابو عبیدہ بن الجراح اور حضرت شرجیل بن حسنہ وغیرہما رضی اللہ عنہما بیت المقدس کی فتح میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔ اور انہوں نے

امیرالمؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے استمداد اور استعانت کی تھی اس موقعہ پر خود آپ نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں اپنا نائب اور خلیفہ بنایا۔ اس وقت انہوں نے کہا "لا تخرج بنفسك انك تزيد عدواً كلباً" آپ خود تشریف نہ لے جائیں آپ عداوت میں حد سے متجاوز اور حیلہ ساز دشمن کی طرف جارہے ہو (خدانخواستہ اس کی عداوت سے اہل اسلام آپ جیسے امیر اور امام سے محروم نہ ہو جائیں) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "انی ابادر بجهاد العدو موت عباس بن عبدالمطلب انكم لو فقدتم العباس لانتقض بكم الشر كما ينتقض الحبل شرح حدیدی جلد ۸ صفحہ ۲۹۸ میں حضرت عباس بن عبدالمطلب کے وصال سے پہلے پہل دشمن کے ساتھ جہاد کرنا چاہتا ہوں کیونکہ جب تم ان کو نہ پاؤ گے شر و فساد تمہارے اندر ٹوٹ پڑے گا جیسے کہ رسی ٹوٹ کر ہر دھاگہ علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اور آپ کا وصال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کے چھٹے سال ہوا اور اس کے بعد اہل اسلام میں شر و فساد اور بے سکونی و بے اطمینانی کا آغاز ہو گیا۔

الغرض حضرت فاروق رضی اللہ عنہ خود تشریف لے گئے اور بغیر جنگ کے اللہ تعالیٰ نے فتح دے دی کیونکہ عیسائی علماء و رہبان اور قسیسین کو معلوم تھا کہ اہل اسلام کا ایک خلیفہ جس کا نام تین حروف پر مشتمل ہو گا وہ بیت المقدس کو فتح کرے گا۔ چنانچہ اس علاقہ میں موجود امراء اسلام کے نام دریافت کرتے تو کہتے یہ اس علاقہ و شہر کو فتح نہیں کرسکتے بالآخر جب آپ تشریف لے گئے تو انہوں نے خود بخود شہر کے دروازے کھول دیئے اور جزیہ دے کر رعایا میں داخل ہو گئے۔

فوائد (۱) اس خطبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "قد توكل الله لاهل هذا الدين باعزاز الحوزة وستر العورة" اور بعض روایات میں۔ قد تكفل۔ بھی وارد ہے پہلی صورت میں وکیل اور کارساز ہونا مراد ہوا اور دوسری صورت میں کفیل اور کفایت کرنا مراد ہوا۔ ہر دو صورت میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی نظر میں ان اہل اسلام اور رعایا کہ اسلام کی عزت و آبرو اور ان کی فتح و نصرت

اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لے رکھی تھی اور جس طرح پہلے وہ ان کی قلت اور بے سروسامانی کے باوجود اہل اسلام کی مدد کرتا رہا ہے آج بھی لشکر روم کے مقابلہ میں قلت تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود مدد فرمائے گا کیونکہ وہ زندہ ہے اس پر موت نہیں آتی۔ اس لیے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ آپ ان اہل ایمان واسلام میں اور ان کے امیر و خلیفہ میں غزوہ بدر و حنین کے وقت سے اب تک کوئی تغیر و تبدل محسوس نہیں فرماتے تھے ورنہ اس وقت کی نصرت خداوندی اور فتح و کامرانی کا حوالہ دینے کا کیا مطلب جب کہ وہ اسلام اور ایمان بھی العیاذ باللہ باقی نہیں رہا تھا۔ اور بقول شیعہ سارے صحابہ کرام علیہم الرضوان مرتد ہو گئے تھے۔ اور صرف تین حالت ایمان پر برقرار تھے۔ جس سے دوپہر کے سورج کی طرح روشن کہ شیعہ کا مذہب باطل محض ہے۔ اور ان کا یہ قول سراسر غلط اور خلاف حقیقت ہے۔

(۲) وہ ضمانت اور کفالت جس کا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ذکر فرمایا وہ کہاں ہے اور کس آیت سے ثابت ہے؟ تو اس کے لیے ہم آپ کو شیعہ شارح نہج البلاغہ علامہ ابن میثم بحرانی کے پاس لے چلتے ہیں دیکھو وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کا مقصد یہ ہے کہ آیت استخلاف میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو بالعموم اور صحابہ کرام علیہم الرضوان کو بالخصوص یہ وعدہ دیا اور فرمایا۔

خلاصة النصيحة انه ضمن اقامة هذا الدين واعزاز حوزة اهله وهذا الحكم من قوله وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصالحات ليستخلفنهم في الارض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذي ارتضى لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم امنا الآية"

(شرح ابن میثم جلد ۳ صفحہ ۱۶۱)

خلاصہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نصیحت اور مشورہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کے قائم اور برقرار رکھنے کا اور اہل دین کی جمعیت اور ان کی حکومت کو عزت و غلبہ دینے کا ضامن ہو چکا ہے۔ اور یہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے مستفاد ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے تم سے اہل ایمان اور اعمال صالحہ والوں کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور بالضرور زمین میں خلافت عطا فرمائے گا۔ جیسے کہ پہلے لوگوں کو خلافت اور حکومت عطا فرمائی اور ان کے لیے ان کے دین کو ہر حال میں مضبوط اور راسخ کرے گا جو دین ان کے لیے پسند فرمایا اور ضرور بالضرور ان کے خوف و ہراس کے بعد انہیں امن و سکون بطورِ بدل عطا فرمائے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نگاہِ ولایت میں حضرت عمر بن الخطاب کی خلافت و حکومت اللہ تعالیٰ کی موعود خلافت ہے۔ اور جو دین اس دور میں ترقی پا رہا ہے وہی اللہ تعالیٰ کا ان کے لیے پسند کیا ہوا دین ہے۔

کما قال: ورضیت لکم الاسلام دینا۔ کہ میں نے تمہارے لیے اسلام کو بطور دین و مذہب پسند کیا ہے" اور انہیں فارس و روم اور کسریٰ و قیصر سے کسی قسم کا خوف و خطر باقی نہیں رہ سکتا۔ جس سے صاف ظاہر کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حکومت خلافت الٰہیہ ہے اور وہ دین جس کی ترویج و اشاعت اور تقویت و ترقی کے آپ درپے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ اور چونکہ وعدہ اہل ایمان اور اعمال صالحہ والوں کے ساتھ ہے لہذا اس سے آپ کے ایمان اور تقویٰ و پرہیزگاری کی بھی ضمانت حاصل ہو گئی۔ جب قرآن مجید اور اہل بیت نے اور ثقلین نے مل کر یہ شہادت دے دی تو اس کے بعد بھی ان کی خلافت کی حقانیت و صداقت میں کسی مسلمان کے لیے شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہو سکتی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

(۳) حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم شہید ہو گئے تو اہل اسلام کے لیے دور دراز علاقوں کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں ہو گی اور ان کے لیے تمہارے بعد کوئی ملجا و ماویٰ نہیں رہے گا۔ حالانکہ خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس قیصر روم کے خلاف جنگ کے لیے تبوک تشریف لے گئے۔ اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ و زبیر اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کے خلاف کاروائی کے لیے بنفسِ نفیس تشریف لے گئے اگر رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور ولایت مآب رضی اللہ عنہ کے نائب مقرر کئے جانے کے بعد اہل اسلام کا مرکز اور ان کی جمعیت اور حکومت برقرار رہ سکتی تھی تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی تو اس شخصیت کو نائب مقرر فرما رہے تھے۔ جن کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک کی طرف جاتے وقت نائب اور خلیفہ مقرر کیا تھا۔ پھر اس پریشانی اور اضطراب کے اظہار کا کیا مطلب کہ تمہارے بعد اہل اسلام کا ملجا و ماویٰ اور ان کی جائے پناہ کون ہو گا جس سے صاف ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو حسب وعدۂ الٰہی: "واللہ یعصمک من الناس" لوگوں کے ہاتھوں شہید نہیں ہو سکتے تھے اور حضرت امیر اپنے آپ کو عام اہل اسلام میں سے ایک فرد سمجھتے تھے۔ جیسے کہ فرمایا: "ماکنت الا رجلا من المهاجرين" وردت کما وردوا وصدرت کما صدروا" الخ شرح نہج البلاغۃ لعلامۃ ابن میثم بحرانی جلد ۴ صفحہ ۳۵۵ یعنی میں مہاجرین میں سے ایک فرد ہوں جہاں وہ وارد ہوئے ہیں میں وارد ہوا اور جہاں سے وہ لوٹے ہیں لوٹا۔ لہذا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے وجود مسعود کو اہل اسلام کے لیے نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہوئے اور ان کی ذات ستودہ صفات کو اسلام کی ترویج و ترقی اور اہل اسلام کی جمعیت و اتحاد کا ضامن سمجھتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ آپ خود اس جنگ میں حصہ نہ لیں جس سے نگاہِ ولایت میں فاروق اعظم کی عظمت اور افادیت مہر نیمروز کی طرح عیاں ہے۔

(۴) آپ نے فرمایا اگر فتح ہو گئی تو وہی تمہارا مقصود ہے۔ اور اگر خدانخواستہ شکست ہو گئی تو "کنت ردءً للناس ومثابة للمسلمين" آپ لوگوں کے لیے معاون و مددگار اور اہل اسلام کے لیے ملجا و ماویٰ اور جائے پناہ ہوں گے جس سے صاف ظاہر ہے کہ نگاہِ ولایت میں مقام فاروق یہ ہے کہ شکست خوردہ لشکر اسلام دوبارہ قوت و توانائی اور عزم جدید اور نئے حوصلے کہیں سے پا کر دوبارہ دشمن کو عبرتناک شکست دے سکتا ہے۔ تو وہ صرف آپ کی ذات ہی ہے۔ جو شکست کو فتح اور ضعف و ناتوانی کو قوت و توانائی اور بزدلی اور کم حوصلگی کو شجاعت و بسالت اور عزم و حوصلہ کے ساتھ تبدیل کرنے کی ضامن ہے اس کے بعد بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ

محبت اور عقیدت کا مدعی ان کے محمود و ممدوح کی شان میں طعن و تشنیع کے لیے کوئی راہ پا سکتا ہے۔ لا واللہ ہرگز نہیں ورگرنہ وہ دعوٰی محبت و عقیدت میں سراسر کذاب ہے۔ اور اندر سے یہودی یا مجوسی ہے جن کو عساکر اسلام اور ان کے امیر کی طرف سے پہنچنے والے زخم نہ مندمل ہوئے اور نہ ہو سکتے ہیں اور نہ وہ اس کا بدلہ ان سے عملی طور پر لے سکتے ہیں اور قانون بھی ہے:۔

"اذا یئس الانسان طال لسانہ" جب آدمی ہاتھ کے ساتھ بدلہ لینے سے قاصر ہو تو اس کی زبان دراز ہو جاتی ہے۔ اور وہ گالی گلوچ پر اُتر آتا ہے۔ الحاصل یہ محض ایک مشورہ نہیں بلکہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی بارگاہِ رفعت پناہ میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف سے گلدستۂ عقیدت و محبت ہے اور ان کے وجود مسعود کو اسلام کی سربلندی اور ترقی کا ضامن و کفیل قرار دینا ہے۔ اور صرف اسی دور میں نہیں بلکہ اپنے دورِ خلافت میں بھی ان کی خدمت میں گل ہائے عقیدت و محبت پیش فرماتے رہے۔ اور ان کی جدائی اور وفات و شہادت کو اسلام کے لیے عظیم خسارہ ناقابلِ تلافی نقصان اور نہ مندمل ہونے والا زخم قرار دیتے رہے۔ جیسے کہ فرمایا: "لعمری ان مکانہما فی الاسلام لعظیم وان المصاب بہما لجرح فی الاسلام شدید"۔

اس لیے صرف یہ کہہ کر اس ارشادِ مرتضوی کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ دشمن بھی مشورہ طلب کرے تو وسیع الظرف اور عالی حوصلہ آدمی مشورہ صحیح دیتا ہے۔ لہذا آپ نے صحیح مشورہ دے دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو عساکر اسلام اور جنود عمر فاروق کی فتح و نصرت کا ضامن قرار دینا، تو مشورہ کے لیے ضروری نہیں تھا اور نہ فردِ واحد کے وجود کو تمام اہل اسلام کی جمعیت و اتحاد کا ضامن اور اہل اسلام کا مرجع اور ماوی قرار دینا ضروری تھا۔ بلکہ صحیح جانشین اور آزمودہ کار خلیفہ کا تقرر اور مسلّم شخصیت کی ولی عہدی کا اعلان ان خطرات کو دور کرنے میں کارآمد ہو سکتا تھا۔ لیکن بشرطیکہ نگاہ ولایت اور مرتضوی حقیقت بین نظر میں کوئی ایسا بدل اور قائم مقام ہوتا تو! لہذا اگر تعصب کے کالے موتیے نے نظر و نگاہ کو بالکل معدوم نہ کر دیا ہو اور اس کی درستگی کی صلاحیتوں کو بھی سلب

نہ کر لیا ہو تو اس ارشادِ ولایت کی حقانیت پر تاریخ عالم کے اوراق کی ہر سطر اور ہر لفظ شاہد صادق اور برہان ناطق ہے ؎

آنکھ والا ترے جوبن کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے؟

تنبیہ:۔ حضرت فاروق اعظم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہما کے خلیفہ ہیں جب ان کی خلافت نگاہِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں خلافت الٰہیہ ہے اور ان کے اور ان کے عساکر کے ایمان و اخلاص اور اصلاح و تقوٰی پر اللہ تعالیٰ گواہ ہے اور قرآن شاہد ہے تو حضرت صدیق کی خلافت کے برحق ہونے اور ان کے ایمان و اخلاص میں شک کرنے کی کسی مؤمن کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

نیز تاریخی شہادت سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ صرف بوقت ضرورت مشورہ ہی دینے پر اکتفا نہیں فرماتے تھے بلکہ عملی تعاون بھی فرماتے تھے۔ اور شریک کار بھی تھے۔ اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی نظر میں انتہائی معتمد علیہ بھی تھے کہ ایسے مواقع پر ان کو اپنا نائب اور قائم مقام بنایا اور آپ نے اس ذمہ داری کو قبول فرمایا جس سے باہمی اور دو طرفہ محبت و مودت اور اخلاص و اعتماد کا بھرپور مظاہرہ ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق حسن اعتقاد بھی یہاں سے ظاہر اور واضح ہے۔ کہ ان کا وجود مسعود اہل اسلام کے باہمی ربط و ضبط اور اتحاد و یگانگت کا ضامن ہے۔ اور شر و فساد سے تحفظ کا۔ لہذا میرا دار الحکومت سے چلے جانا ان کی برکت سے کسی نقصان کا موجب نہیں ہو سکتا اور ان حقائق کا مشاہدہ اور واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی کوئی کم بخت بلکہ بدبخت ان میں باہم عداوت و کینہ اور دشمنی کا دعوٰی کر سکتا ہے قطعاً نہیں۔

رسالہ "مذہب شیعہ" ص۵۵ تا ۶۰ از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ العزیز

دلیل دوم:۔ اب اہل عقل و دانش کے لیے اِس کتاب میں سے حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ایک اور ارشاد بھی مطالعہ کے لیے پیش کرتا ہوں (جو اسی نہج البلاغۃ خطبہ نمبر ۱۴۶ میں مذکور ہے اور جس کا عنوان ہے)

قد استشارہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فی الشخوص لقتال الفرس بِنفسِہٖ یعنی جب امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہٗ سے فارس کے خلاف جنگ میں بذاتِ خود شریک ہونے کا مشورہ طلب فرمایا تو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہٗ نے یہ مشورہ دیا۔

انّ ھذا الامر لم یکن نصرہٗ ولا خذ لانہٗ بکثرۃ ولا بقِلّۃٍ و ھُوَ دین اللہ الّذی اظھرہ وجندہ الذی اعدہ وامدہ ... حتی بَلَغَ ما بَلَغَ وطَلَعَ حیثما طَلَعَ ونحنُ علیٰ موعود من اللہ سبحانہٗ واللہ منجز وعدہ وناصر جندہ ومکان القیّم بالامر مکان النظام من الخرز یجمعہ ویضمہ...... فانْ انْقَطَعَ النظام تفرّق وذھَبَ ثمّ لم یجتمع بحذافیرہ ابدًا۔ والعرب الیوم وان کانوا قلیلاً فھم کثیرون بالاسلام عزیزون بالاجتماع فکن قطباً واستدر الرحیٰ بالعرب واصلھم دونک نارًا للحرب فانک ان شَخَصْتَ من ھٰذا الارض انقطعتْ علیک العرب من اطرافھا واقطارھا، حتی یکون ما تَدَعُ وراءک من العوراتِ اھمّ الیک ممّا بَیْنَ یدیک انّ الاعاجم ان ینظروا الیک یقولوا ھٰذا اصل العرب فاذا اقتطعتموہ استرحتم فیکون ذلک اشدّ لکلبھم علیک وطمعھم فیک۔

ترجمہ:۔ بے شک اہل اسلام کی فتح و شکست کثرت و قلت افراد کی وجہ سے کبھی نہیں ہوئی یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے۔ اِس کو اللہ ہی نے غالب کیا ہے اور تیار فرمایا ہے۔ اور اس کو امداد دی ہے۔ یہاں تک کہ جہاں اس دین نے پہنچنا تھا پہنچا۔ اور جہاں تک اِس نے چمکنا تھا چمکا۔ اور ہم اللہ سبحانہٗ کے وعدے کے مطابق ہیں اور اسی پر برقرار ہیں اور اللہ سبحانہٗ اپنے وعدے کو پورا کرنے والا ہے۔ اور اپنے لشکر کو فتح دینے والا ہے۔ اور مسلمانوں کے امیر کا مرتبہ ایسا ہے جیسے کہ تسبیح کے دانوں کا رشتہ اور دھاگہ جو اِس کے دانوں کو اکٹھا اور اپنے اپنے مرتبہ و مقام پر رکھتا ہے۔ پس اگر وہ رشتہ ٹوٹ جائے تو پھر تمام دانے بکھر جاتے ہیں۔ پھر وہ اکٹھے نہیں ہو سکتے اور اہل اسلام اگرچہ بنسبت دشمن کے تعداد میں کم ہیں مگر دولتِ اسلام کی وجہ سے زیادہ ہیں اور اپنے اجتماع کی وجہ سے غالب ہیں آپ قطب بن کر ایک ہی جگہ رہیں اور لشکر اسلام کی چکّی کو گھمائیں اور جنگ کی آگ کو اپنے ملک سے دور رکھ کر دشمن تک پہنچائیں۔ اگر آپ بذاتِ خود اِس ملک عرب سے چلے گئے تو قبائل عرب آپ پر ہر طرف سے ٹوٹ پڑیں گے پھر مسلمانوں کی عزت و ناموس کی حفاظت آپ کو فارس کے خلاف جہاد کرنے سے زیادہ اہم محسوس ہوگی، عجمی لوگ جب آپ کو کل میدانِ جنگ میں دیکھیں گے تو یہی کہیں گے کہ عرب کا سردار یہی ہے۔ اِس کو ختم کر دو تو پھر خیر ہی خیر ہے۔ پھر یہ بات دشمن کو آپ کے خلاف جنگ کرنے میں سخت حریص کر دے گی۔ اور آپ کے خلاف لڑنے میں اِن کے طمع کو بڑھائے گی۔

دلیل سوم:۔ فروعِ کافی کتاب الجہاد مطبوعہ لکھنؤ ص۶۱۳ و ۶۱۴ و ص۶۱۷ پر امام جعفر صادق رضی اللہ عنہٗ کا عقیدہ اور آپ کا فتویٰ ملاحظہ ہو:۔

"القتال مع غیر الامام المفروض طاعتہٗ حرام قطعاً ولا غزو الّا مَعَ امام عادل۔"

یعنی امام برحق جس کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ اِس کے بغیر کسی کے ساتھ مل کر جہاد کرنا

قطعاً حرام ہے۔ اور امام عادل کے سوا کسی کی اطاعت میں جہاد کرنا ہرگز جائز نہیں۔
(اس فتوے کو ذہن میں رکھ کر اور ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تعامل کو ملحوظ رکھ کر آپ کو فیصلہ کرنا ہوگا۔)

اب سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا تعامل ملاحظہ ہو کتاب ناسخ التواریخ جلد دوم، حصہ دوم ص۳۹۴:۔

"در کارہا، ولشکر کشی ہا، اورا اعانت مے فرمود ورائے نیکو مے داد۔"

یعنی امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں آپ کے ہر کام میں اور فوج کشی میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان کی امداد و اعانت فرماتے تھے۔ اور نیک مشورے دیتے تھے۔

(اگر یہ معاونت درست ہے تو آپ کی خلافت برحق ہے۔ اور خلافت برحق نہیں تو معاونت صحیح نہیں ہوسکتی)

اب منطق کی جس شکل سے بھی نتیجہ نکالا جائے۔ یہی ثابت ہے۔ کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مقدس نظریہ اور مذہب میں امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ برحق خلیفہ تھے مسلمان بھائیو!
اور نہیں تو کم از کم اتنا تو سوچو کہ اس قسم کے مشورے دوست اور خیر خواہ دیا کرتے ہیں یا دشمن اور لفظ قیّم بالامر پر غور کرو تو اس کا صاف معنی امیر المؤمنین ہے۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حق میں استعمال فرما رہے ہیں اب یہ شور کہ مستحق خلافت نہیں تھے وغیرہ وغیرہ تو اس بات کا قطعی علم آجکل کے ذاکرین شیعہ کو زیادہ ہوسکتا ہے یا جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو کم از کم یہ خیال کرنا چاہیئے کہ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان کے حالات کو بچشم خود ملاحظہ فرمانے والے تھے۔ اور ان کے طرزِ عمل کو ہر وقت محسوس کرتے تھے۔ اور یہ زمانہ کتنا بعید تر ہے تو بہر صورت علیٰ شاھد کا بیان ہی قابلِ قبول ہوسکتا ہے؟

دلیل چہارم:۔ اہل تشیع کی معتبر ترین کتاب ناسخ التواریخ جلد دوم ص۲۹۵ میں بھی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد موجود ہے تو حضور کے یہ جملے کہ نحن علیٰ موعود من اللہ سبحانہٗ .... الخ کے معنی اور تفسیر میں صاحب ناسخ التواریخ لکھتا ہے:۔

وانیک ما بر وعدۂ خداوند ایستادہ ایم چہ مومناں را وعدہ نہاد کہ در ارض خلیفتی دہد چنانچہ پیشینیاں را۔ و دین ایشاں را استوار دارد و خوفِ ایشاں را مبدل بایمنی فرماید تا بر ہمہ ادیان غلبہ جویند و خداوند بوعدۂ وفا کند و لشکر خود را نصرت دہد و ہما نا فرمان گزار امور رشتہ را مانند کہ مہرہا، بدو پیوستہ شوند۔

یعنی اِس وقت ہم اللہ تعالیٰ کے وعدہ پہ کھڑے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ زمین میں اِن کو اپنے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلیفے بنائے گا۔ اس طرح جیسا کہ پہلے پیغمبروں کے خلیفے بنائے تھے۔ اور اِن کے دین کو تمکنت اور پختگی بخشے گا اِن کے خوف کے بعد اِس کے بدلے میں اِن کے لیے امن دے گا۔ تاکہ مذاہب عالم پر غلبہ حاصل کریں۔ اور اللہ تعالیٰ وعدہ کو وفا کرتا ہے۔ اور اپنے لشکر کو فتح و نصرت دیتا ہے جب کہ امر کرنے والے (امیر المومنین) ایسے رشتہ (دھاگہ) کی مانند اور مثل ہیں جس کے ساتھ دانے پیوستہ ہیں (تو جس طرح تسبیح کے دانوں میں انتظام اور انضباط اِن کے درمیانی دھاگہ پر موقوف ہے۔ اِسی طرح اہل اسلام کا باہمی ربط اِن کے امیر حضرت عمر سے وابستہ ہے۔ سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر برقرار اور قائم ہیں، صاحب ناسخ التواریخ اور اسی طرح باقی شراح نہج البلاغۃ حضور کے اِن جملوں کی تفسیر میں تصریح کرتے ہیں کہ حضور نے اِس آیت کریمہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:۔

وعد اللہ الّذین آمنُوا منکم و عملوا الصالحات لیَستخلفنّھُمْ فی الارض کما استخلف الّذین من قبلھم ولیمکننّ لھُمْ دینھُمُ

الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امناً یعبدوننی لایشرکون بی شیئاً ومن کفر بعد ذٰلک فاولئک ھم الفاسقون۔

یعنی تم میں سے مومنین اور صالحین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان کو زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح پہلے پیغمبروں کے صحابہ کو خلیفہ بنایا تھا۔ اور اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ ان کے لیے اُن کے اس دین کو استحکام اور تمکنت بخشے گا جس کو اللہ تعالےٰ نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے۔ اور ان کے خوف کو امن وسلامتی کے ساتھ بدلے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔ اور ان تمام باتوں کے بعد جو انکار اور کفر کریں گے تو وہی ناسق ہوں گے۔

حضرت شیر خدا رضی اللہ عنہ، کے ان جملوں کا مطلب کہ ہم اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر قائم ہوئے ہیں اسی آیتِ وعدہ کے ترجمہ کو پیش کرتے ہیں چنانچہ اہل تشیع کا مجتہد اعظم علامہ ابن میثم شرح کبیر نہج البلاغۃ ص۲۰۱ مطبوعہ ایران۔ میں انہی ارشادات مرتضوی کی شرح اور تفسیر میں تصریح کرتا ہے:۔

"بوعد اللہ تعالیٰ: المسلمین الاستخلاف فی الارض وتمکین دینھم الذی ارتضیٰ لھم وتبدیلھم بخوفھم امنا کما ھو مقتضی الآیۃ۔"

یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، کا ارشاد کہ۔ نحن علیٰ موعود من اللہ (ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ پر ہیں) دینِ مقدس اور لشکر اسلام کی فتح مندی کے اسباب اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت اور اعانت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئے گئے وعدہ کو بیان فرما رہے ہیں۔ جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زمین پر خلیفہ بنانے اور ان کے اس دین کو جس پر وہ راضی ہوا تمکنت اور استقلال بخشنے اور ان کے خوف کو امن کے ساتھ بدلنے کے متعلق

فرمایا ہے جیسے کہ وہ اس آیت کا مقتضیٰ ہے۔

بہر صورت تمام شراحِ نہج البلاغۃ یہی تصریح کرتے ہیں کہ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ نے امیر عمر رضی اللہ عنہ، کی خلافت کو اسی آیت استخلاف کے ساتھ برحق ثابت کیا ہے۔ اور ان کے زمانۂ خلافت اور ان کے دین کو اسی آیت کریمہ کے مقتضیٰ سے بیان فرمایا کہ وہ برحق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہے۔ واقعات بھی اُسی امر کے مؤید ہیں کہ وہ زمانہ جو جزیرۂ عرب میں بھی مخالف قبائل کی آئے دن فتنہ پردازیوں اور خطرناک سازشوں سے سخت پریشانی اور بے چینی کا زمانہ یقین کیا جاتا تھا اور ہر وقت ان کی طرف سے خوف وخطر مسلمانوں کو لاحق تھا، امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ، کے زمانۂ خلافت میں تمام جزیرۂ عرب کو یہود ونصاریٰ سے پاک کیا گیا۔ اور تمام مخالف عنصر یا حلقہ بگوش اسلام ہوا یا ختم ہو گیا اور اسلام کی سلطنت نے بہت بڑی وسعت اختیار کی سلطنت ایران جیسی بارُعب اور پر ہیبت حکومت نے اسلام کی چوکھٹ کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ تقریباً تمام افریقہ، مصر، شام، عراق، خراسان اور باقی تمام قبائلی علاقے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اور یوں مسلمانوں کا خوف امن کے ساتھ تبدل ہوا اور یہ تمام تر آیت کریمہ:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ الآیہ کے حرف بحرف مطابق ہوا۔

اس آیت کریمہ سے زیادہ احقیت خلافت خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر اور کون سی دلیل ہو سکتی ہے۔ یہ غصب خلافت کے بے بنیاد دعوے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ کی تصریحات اور ائمۂ کرام کی توضیحات اور ان کے طرز عمل کے مقابلے میں کیا وقعت رکھتے ہیں؟

تحفۂ حسینیہ — از محمد اشرف سیالوی

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، کے

اِس ارشادِ گرامی کا معنی و مفہوم اپنی طرف سے بیان کرنے کی بجائے صاحبِ ناسخ التواریخ، علامہ ابن میثم بحرانی شارح نہج البلاغۃ اور دیگر شراح کے حوالہ سے بیان کیا اور ساتھ ہی ضمنی طور پر دو امر مزید توجہ کے لیے پیش کیے ایک ناحق خلیفہ کی معاونت اور اِس کے ساتھ مل کر جہاد کرنے کی حرمت، دوسری طرف آپ کا لشکر کشی اور صلاح و مشورہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی معاونت فرمانا تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ صرف مشورہ ہی نہیں کہ دشمن بھی پوچھے تو صحیح رائے دے دی جائے بلکہ عملی تعاون واشتراک بھی ہے، جو ناحق خلیفہ کے ساتھ حرام ہے اور حرام کا ارتکاب حضرت ابوالائمۃ رضی اللہ عنہ سے بالکل ناممکن اور بعید ترین ہے۔

لہذا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کا برحق ہونا روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا۔ اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے آپ کو قیم بالامر فرمانے سے بھی یہ حقیقت واضح ہو گئی۔

تحفہ حسینیہ: از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

تقریرِ استدلال اور کلامِ امیر کے فوائد فرائد

اب مزید فوائد اِس کلام الامیر، امیر الکلام کے ملاحظہ فرمائیں اور حقانیتِ خلافتِ فاروقیہ کے دلائل وشواہد کا مشاہدہ فرمائیں۔

(۱) آپ نے فرمایا:۔ اِنَّ ھٰذا الامر لم یکنْ نصرہٗ ولاخذلانہٗ الخ

جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی زمانۂ ماضی میں نصرت اور فتح مندی کا دار و مدار کثرتِ تعداد پر نہیں تھا۔ لہذا اب بھی اس پر دار و مدار نہیں جس سے صاف ظاہر کہ یہ اسلام جس کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ داعی ہیں اور اِس کے نفاذ کے ذمہ دار ہیں یہ وہی سابقہ اسلام ہے نیا نہیں ورنہ اس کی فتح مندی کا معیار یہاں پر پایا جاتا کیونکہ لازم اور ضروری ہو سکتا ہے لہذا شیعہ صاحبان کا اِس اسلام کو عامہ کا عقیدہ و نظریہ کہہ کر ٹھکرانا اور اپنے آپ کو خاصہ کہہ کر اپنے لیے نیا دین ایجاد

کرنے کا اِس ارشاد کی روشنی میں کوئی جواز نہیں ہے بلکہ آپ نے تصریح فرما دی:۔

ھو دین الّذی اظھرہٗ :۔

کہ یہی اللہ تعالیٰ کا دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے غالب فرمایا ہے۔

نیز یہ بھی فرما دیا کہ جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب امام الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تھا، دورِ فاروقی اِس مقصد کو بطورِ نیابت اور خلافتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کامل کرنے کا دور ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

"ھُوالّذی ارسَلَ رسولہٗ بالھُدیٰ ودین الحق لِیظھرہٗ علی الدینِ کُلّہٖ "

اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ اِس کو سب ادیان اور مذاہب پر غالب کرے۔

اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:۔

"ھُوَ دین اللہ الّذی اظھرہٗ "

یہ وہ دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے غالب فرمایا۔ اور دورِ فاروقی میں مجوسیت کی بھی کمر توڑ کر رکھ دی گئی۔ اور وہ علاقہ بھی شہادتِ توحید اور شہادتِ رسالت کی آذانوں سے اور تکبیرات کی آوازوں سے گونجنے لگا۔ اور عظیم عیسائی سلطنتِ روم کو بھی کچل کر رکھ دیا جہاں صلیب اور تصاویرِ مسیح ومریم کی جگہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہونے لگی۔ الغرض آپ نے واضح فرمایا کہ اِس مقصدِ بعثت کی تکمیل اِس نائب رسول کے ہاتھوں ہوئی اور اِن ممالک میں اسلام کو ان باطل ادیان پر غلبہ اور تسلط حاصل ہو گیا۔ اگر خدانخواستہ اصل دین مٹ چکا ہوتا تو اِس کے غلبہ کا ذکر کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ اور موجودہ دین کو اللہ تعالیٰ کا دین غالب قرار دینے اور زمانۂ رسالت کی طرح محض نصرتِ خداداد سے اِس کے منصور اور غالب ہونے کا فیصلہ دینے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

(۲) آپ نے فرمایا:۔

"ھو جندہ الّذی امدہ واحدہٗ ۔"

کہ تمہارا لشکر اللہ تعالےٰ کا لشکر ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے تیار کیا ہے یعنی غلبۂ اسلام کے لیے ۔ اور کفر و شرک کی کمر توڑنے کے لیے ۔ اور اسے مدد دی ہے ۔ یعنی ملائکہ کے ساتھ بدر میں اور حنین میں عملی طور پر اور دیگر مواقع پر ان کی روحانی امداد کے ذریعے ۔

اس ارشاد سے بھی صاف ظاہر کہ لشکر فاروقی اور عساکر و افواجِ عمر نگاہِ مرتضےٰ میں اللہ تعالےٰ کے عساکر اور افواج ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر حال میں اپنے لشکر اور عساکر کی مدد فرمانے والا ہے لہذا ان افواج کے متعلق کسی بدظنی کا اور ان کے ایمان و اخلاص پر حملہ کرنے کا بھی اور ان کے ارتداد و انحراف کا تصور تک بھی کرنا حضرت علی رضی اللہ عنہ، کو جھٹلانے کے مترادف ہے ۔ لہذا تمام افواج کا کامل اور مخلص مومن ہونا ظاہر اور واضح اور جب افواج اور خدام فاروقی اس شان کے مالک ہیں تو خود مخدوم اور امیر الامراء اور قائد عساکر کا ایمان و اخلاص بھی شک و شبہ سے بالاتر ہونا یقینی ہے ورنہ ان کا فرماں بردار اور وفادار لشکر اللہ کا لشکر کیوں کر قرار پا سکتا تھا؟

(۳) حضرت امیر نے فرمایا:۔

"حتّٰی بلَغَ ما بلغ وطلَعَ حیثما طلَعَ ۔"

یعنی یہ دین جس بلندی پر پہنچنا تھا پہنچا اور جہاں اس کا آفتاب چمکنا تھا، چمکا ۔ اس عبارت میں جو الفاظ میں نہ سما سکنے والی ترقی اور بیان سے باہر اشاعتِ دین بیان کی گئی ہے، اس کا اندازہ عربی اسلوب سے واقف شخص ہی کر سکتا ہے ۔ یہ انداز وہاں اختیار کیا جا سکتا ہے ۔ جہاں الفاظ اس مقصد کی ادائیگی سے قاصر اور عاجز ہوں ۔ اور اذہان اس کے تصور اور احاطہ سے عاجز ہوں ۔ جس سے صاف ظاہر کہ اے فاروق! یہ مذہب اسلام آپ کے دور میں اس بلندی اور رفعت پر فائز ہے ۔ کہ نہ میرے الفاظ میں اس کی تعبیر ممکن اور نہ ہی سامعین و حاضرین میں اس کے کما حقہٗ تصور اور احاطہ کی طاقت و ہمت ۔ امیر المؤمنین کے اس ارشاد کے بعد بھی کوئی سوچ سکتا

ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اصل دین کو ختم کر کے رکھ دیا تھا؟ اور بالکل نیا دین جاری کر دیا تھا؟ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ، مجبور تھے ۔ اس لیے اپنے دور میں بھی اس کو اصلی حالت میں نہ لا سکے ؟ کیونکہ تمام لشکر کے الگ ہو جانے ہو جانے اور آپ کو تنہا چھوڑ جانے کا خطرہ لاحق تھا؟ لہذا زبان پہ مہر سکوت لگائے رکھی؟

مگر اس وقت ان کو ان الفاظ کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کرنا اس توہم کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے کافی ہے، اور خطبۂ روضہ کافی کے موضوع اور من گھڑت ہونے کا بین برہان ہے ۔ جس کا تذکرہ بمعہ تبصرہ گزر بھی چکا ہے ۔

(۴) آپ نے فرمایا:۔

نحنُ علیٰ موعودٍ من اللہ واللہ منجز وعدہٖ وناصرِ جندہٖ ۔"

کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وعدے پہ قائم ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کو پورا کرنے والا ہے اور اپنے لشکر کی امداد اور نصرت فرمانے والا ہے ۔ جس کی مفصل و مکمل تشریح حضرت شیخ الاسلام کے کلام صداقت نشان اور حقیقت ترجمان میں گزر چکی کہ اس وعدہ سے مراد وعدۂ خلافت ہے ۔ اور دین کی تمکین و راسخیت اور اور خوف کو امن سے بدلنے کا وعدہ جو قرآن مجید میں صراحتہً مذکور ہے ۔ اور حدیث رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے واضح اور ثابت ہے کہ ہدایت کا دار و مدار ثقلین کی اتباع اور پیروی پہ ہے ۔ لہذا دونوں کا اس پر اتفاق ثابت ہو گیا کہ خلافت فاروقیہ اسی وعدہ کا ایفاء ہے ۔ لہذا اس خلافت پہ انکار و اعتراض ضلالت و گمراہی ہے اور حضرت علی المرتضیٰ کی تکذیب بلکہ قرآن مجید اور ثقل اکبر کی تکذیب اور ذات باری تعالیٰ پر اعتراض و تنقید ہے ۔

نیز جب خلافت فاروقیہ اس وعدہ کے عملی طور پہ پورا کیے جانے کی شہادت ہے تو اس دین کو جس کی اشاعت اور ترویج و ترقی کا بیڑا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اٹھایا اس کو خدا تعالیٰ کا آخری دین اور کامل و اکمل دین تسلیم کرنا لازم

اور واجب ٹھہرا لہٰذا اس پر اعتراض کسی بھی مؤمن کے لیے جائز اور درست نہیں ہے۔

"کما سبق بیانہٗ فی الدلیل الاوّل"

(۵) آپ نے فرمایا:۔

"مکان القیّم بالامر مکان النظام من الخرز۔"

یعنی اے عمر فاروق تم امرِ خلافت اور امرِ اسلام کے قائم رکھنے والے ہو اور تمہاری وجہ سے اہلِ اسلام میں ربط باہم اور اتحاد و اتفاق قائم ہے۔ اور تمہاری شہادت سے یہ رشتہ لوٹ جائے گا۔ اور پھر کبھی ان میں یہ ربط و ضبط پیدا نہیں ہو سکے گا۔ اقوام عالم کی تاریخ پر نظر رکھنے والے اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ وقت کی اہم ترین شخصیات اور بادشاہ میدانِ جنگ میں کام آتے رہے۔ اور ان کے ولی عہد اور قائم مقام کے ذریعے نظامِ سلطنت برقرار رہا۔ مگر حضرت امیر المؤمنین جیسا حقائق شناس اس امیر اور بادشاہِ اسلام کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کر رہا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا معاملہ نگاہِ ولایت میں ان دنیوی امراء و سلاطین سے مختلف تھا۔ اور یہی وہ حقیقت ہے، جس کی گواہی بعد کے حالات و واقعات نے دی۔ اور پھر سے اس نظام کی کامل شیرازہ بندی نہ ہو سکی۔ بلکہ باہمی افتراق و انتشار نے اس خلافت حقہ کی گرفت کو کمزور کر دیا۔

الغرض حضرت امیر المؤمنین کی دور رس نگاہوں اور عواقب پر مرکوز نظر دل نے یہ بتلا دیا کہ غلبۂ اسلام کا ضامن اور امت کے اتحاد اور یک جہتی کا ضامن بھی ایک فرد ہے۔ لہٰذا میں ان کو میدانِ جنگ میں جانے کا مشورہ کبھی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ جو منفعت ان کے پیش نظر ہے وہ دوسری صورت میں بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور جو نقصان اسلام اور اہل اسلام کا ان کے میدانِ جنگ میں جانے اور شہید ہو جانے سے ہو سکتا ہے اس کا کوئی تدارک نہیں ہو سکتا اور نہ آپ کا کوئی صحیح بدل ہو سکتا ہے۔ چہ جائے کہ نعم البدل۔ کیا اب بھی محبت کے مدعیوں کی مخمور نگاہیں خوابِ غفلت

اور مستی کی نیند سے بیدار نہیں ہوئیں اور مولا علی رضی اللہ عنہ کا بیانِ حقیقت ترجمان ان کو پڑھنے کی توفیق نہیں ہوئی؟ اور ان کے دل و دماغ اس کو سمجھنے کی طرف مائل نہیں ہوئے۔

(۶) آپ نے فرمایا:۔

"العرب الیوم وإن کانوا قلیلا فھم کثیرون بالاسلام عزیزون بالاجتماع۔ یعنی عرب تعداد میں گو کم ہیں اور قلیل مگر قوتِ اسلام نے ان کو عظیم اور کثیر بنا دیا ہے۔ اور ان میں اخوتِ اسلامیہ کی وجہ سے جو جمیعت اور وحدت ہے۔ وہ ان کے غلبہ کی ضامن ہے۔ کیا یہ صاف اور بے غبار بیان اور واضح ترین ارشاد اس حقیقت کی بین دلیل اور روشن برہان نہیں ہے کہ عرب اور افواجِ عمر میں ایمان کامل اور اسلام خالص موجود ہے اور انّما المؤمنون اخوۃ کے تحت ان میں ایمانی رشتہ کی وجہ سے کامل بھائی چارہ موجود ہے۔ اور علی الخصوص امیر المؤمنین کی ذات نے ان سب کو متحد اور منظم اور باہم مرتبط اور منظم کر دیا ہے۔ لہٰذا بالکل واضح ہو گیا کہ ان افواج و عساکر اسلام کے ایمان و اخلاص پر اعتراض دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جھٹلانا ہے۔

(۷) آپ نے فرمایا:۔

"فکن قطبا واستدر الرحی بالاسلام۔"

یعنی تم چکی کے نچلے پاٹ کی میخ بن کر اپنی جگہ پر قائم رہو اور عرب جو چکی کی مانند ہیں ان کو گردش میں لاؤ اور کفر و کفار کو پیس کر رکھ دو۔ اور اسلام کو غالب و سربلند کر دو۔ اس بیانِ حقیقت ترجمان سے صاف ظاہر کہ چکی کی منفعت اس کے قطب سے وابستہ ہے۔ اور عربوں کی افادیت اور منفعت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے وابستہ ہے۔ اگرچہ ساری امت کی شان یہ ہے کہ

کُنتُم خیر امّةٍ اخرجت للناس۔ الخ

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے نفع کے لیے نکالی اور پیدا کی گئی ہو لیکن

جومنفعت اورافادیت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی بدولت حاصل ہوئی وہ سب سے نمایاں اورامتیازی شان کی حامل ہے اوریہی وجہ ہے کہ نگاہِ نبوت ورسالت نے اسلام کی عزت وغلبہ کو ان کی ذات سے وابستہ دیکھ کر انہیں اللہ تعالیٰ سے طلب کرتے ہوئے عرض کیا۔

"اللّٰھُمَّ اعزّ الاسلام بعمر بن الخطاب۔"

ب اے اللہ! اسلام کو عمر بن الخطاب کے ذریعے عزت وعظمت اورغلبہ وقوت عطا فرما۔ الغرض نگاہ نبوت ورسالت میں وہ موجب عزت اسلام ہیں اور نگاہِ ولایت میں بھی قطب الاسلام ہیں لہذا جو ان کو اس مرتبہ پہ فائز نہیں سمجھتے وہ دشمن اسلام ہیں۔

(٨) حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دوران مشورہ فرمایا کہ لشکرِ فارس اہل اسلام کے خلاف اقدام کی سوچ رہا ہے۔ لہذا انہیں پہل کرنے کا موقعہ ہی نہیں دینا چاہیئے۔ تو آپ نے فرمایا:۔

"فامّا ماذکرت من مسیر القوم إلیٰ قتال المسلمین فان اللہ سبحانہٗ اکرہ لمسیرھم منك وَھُوَاقدرُ علیٰ تغییر ما یکرہ۔"

لیکن وہ جو آپ نے ذکر کیا ہے۔ یعنی قوم فارس کا قتال مسلمین کے لیے روانہ ہونا تو اللہ تعالیٰ ان کی روانگی کو آپ کی نسبت زیادہ ناپسند سمجھنے والا ہے۔ اور وہ اپنی ناپسندیدہ چیز کو تبدیل کرنے پر بھی زیادہ قادر ہے۔ اس ارشادِ گرامی سے بھی صاف ظاہر اور بالکل واضح ہے کہ نگاہِ مرتضوی میں فارسیوں کا اہل اسلام کے خلاف قدم اٹھانا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بہت ہی ناپسندیدہ ہے۔ اگر وہ کامل مومن ہوں اور خدمتِ اسلام میں مخلص پھر تو اس ارشاد کی حقانیت مسلّم ہے۔ ورنہ مرتدین اور مخالفین اسلام کے اعداد کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ناراضگی اور ناپسندیدگی کا کیا مطلب لہذا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد بھی ان افواج اور عساکر اسلام کے ایمان اور اخلاص پر واضح دلیل ہے۔

(٩) آپ نے فرمایا:۔

واما ماذکرت مِنْ عددھم فانا لم تکن نقاتل فیما مضٰی بالکثرۃ وانّما کنا نقاتِلُ بالنصر والمعونۃِ۔

رہا آپ کا یہ ذکر فرمانا کہ دشمنانِ اسلام کی تعداد بہت زیادہ ہے تو یقیناً ماضی میں ہم کثرتِ تعداد کے بل بوتے پر جہاد و قتال نہیں کرتے تھے۔ بلکہ صرف اور صرف اللہ کی نصرت ومعونت اور امداد وتعاون کے ساتھ جہاد کیا کرتے تھے۔ لہذا اس ارشاد سے بھی واضح کہ جس طرح ماضی میں اللہ تعالیٰ کی نصرت وامداد مسلمانوں کے شامل حال رہی، اب بھی ان کو یہ اعزاز واکرام اور فضل وکرم نصیب رہے گا۔ اگر نگاہِ مرتضوی میں موجودہ اسلام سابق اسلام کی طرح ہے۔ اور مجاہدین اسلام سابقہ حالت پہ ہیں پھر تو اس قیاس ومساوات کا جواز ہے۔ ورنہ نہیں۔ اس لیے کوئی محب تسلیم کرے نہ کرے مومنین اور مومنات ہونے کے دعویدار مانیں یا نہ مانیں حضرت امیر المؤمنین الوالائمہ سرچشمۂ ولایت رضی اللہ عنہ، تو اس حقیقت کا برملا اعلان فرما رہے ہیں کہ اب بھی وہی اسلام ہے جو زمانۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تھا۔ اور اب بھی وہی مخلص اور جان نثارانِ اسلام مصروفِ جہاد ہیں جو اس وقت تھے۔ لہذا فتح ونصرت ان کے اب بھی اسی طرح قدم چومے گی جس طرح ماضی میں چومتی رہی ہے۔ اس لیے علامہ ابن میثم بحرانی نے کہا:۔

" فاجابہٗ بتذکیر قتال المسلمین فی صدر الاسلام فانّہٗ کانَ من غیر کثرۃ۔ وانّما کان بنصر اللہ ومعونتہٖ فینبغی ان یکون الحال الآن کذالك وبوعد اللہ المسلمین بالاستخلاف فی الارض و تمکین دینھم الذی ارتضیٰ لھم وتبدیلھم بخوفھم امنًا کما ھُوَ مقتضیٰ الآیۃ۔

کہ حضرت علی نے ان کو جواب دیتے ہوئے صدر اسلام میں اہل اسلام کے جہاد اور حرب وقتال کی کیفیت یاد دلائی کہ وہ جہاد کثرتِ تعداد کی بنا پر نہیں ہوا

کرتا تھا بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی نصرت اور معونت پر اس کا دار و مدار تھا۔ لہذا (اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے اب بھی) شایانِ شان یہی ہے کہ اسی طرح فتح ونصرت حاصل ہو نیز آپ نے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ کا اہل اسلام کے ساتھ وعدۂ خلافت یاد دلایا اور ان کے لیے اپنے پسندیدہ دین کو مضبوط اور راسخ کرنے کا عہد و پیمان اور ان کے خوف کو امن سے تبدیل کرنے کا عزم اور ارادہ جیسے کہ مقتضائے آیت ہے یاد دلایا اور اطمینان رکھنے اور اضطراب و بے چینی کو دل سے نکال دینے کا مشورہ دیا کیونکہ اس نے ہمیں نصرت وغلبہ اور خلافت ارضیہ کا وعدہ دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر وعدہ کو پورا کرنے والا ہے۔ کیونکہ اس کی خبر کا خلاف نہیں ہو سکتا۔

وعدنا بموعود وھو النصر والغلبة والاستخلاف فی الارض کما قال وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض الآیة۔

(شرح ابن میثم جلد ثالث ص۱۹۶، ۱۹۷ طبع جدید)

یہ ہیں فاروق اعظم کہ اسلام کی سربلندی اور رفعت کے لیے بے چین اور مضطرب ہیں اور حضرت علی مرتضیٰ ان کو مطمئن اور پرسکون رکھنے کی کوشش میں ہیں جس سے فاروق اعظم کی شان "اشداء علی الکفار" ظاہر ہے اور مولائے مرتضیٰ کی شان رحماء بینھم۔ والحمد للہ۔

(۱۰) جب حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی زبانی خلافت فاروقی کا خلافت موعودہ ہونا اور خلافت الٰہی ہونا واضح ہو گیا تو حضرت صدیق کی خلافت کا بھی موعود من اللہ ہونا اور خلافت الٰہیہ ہونا واضح ہو گیا۔ کیونکہ یہ خلافت خلافتِ صدیقیہ کی فرع ہے۔ اور حضرت عثمان کی خلافت کا موعود من اللہ ہونا بھی ظاہر ہو گیا کیونکہ وہ خلافتِ فاروقیہ کی فرع ہے۔ اور اس میں انہی مخلصین اور جاں نثارانِ اسلام نے اپنا حق خود ارادی اور خداداد اختیار استعمال کیا۔

اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت کا موعود ہونا بھی واضح ہو گیا۔ کیونکہ وہ اس ذریعہ سے ثابت ہوئی جس سے خلافت اصحابِ ثلاثہ ثابت ہوئی۔

"انہ بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر وعمر وعثمان علی ما بایعوھم علیہ"۔ لہذا شیعہ صاحبان کا آیت استخلاف کو حضرت مہدی علیہ اسلام کے ساتھ خاص کر دینا اور خلافت مرتضویہ کو بھی اس سے نکال دینا جیسے کہ تفسیر صافی وغیرہ میں ہے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ان دونوں ارشادات کے سراسر خلاف ہے۔ اور تفسیر قرآن میں امام اول کے قول کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ بلکہ ان کی منشا اور مرضی و پسند کے برعکس تفسیر بلکہ تحریف کرنے کے برابر کیونکہ وعدہ میں صیغۂ خطاب استعمال کیا گیا ہے۔ وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات الخ۔ اور ظاہر ہے مخاطبین اولین صحابہ کرام علیہم الرضوان ہیں تو ان کے دور کو کس طرح نکالا جا سکتا ہے۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصی اور خلیفہ بلا فصل مانا جاتا ہے۔ تو کیا اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے بغیر ہی وہ وصی بھی بن گئے۔ اور خلیفہ بھی ہاں اس کو عام رکھ لیا جائے اور بعد میں جن جن امراء اسلام نے اسلام کی ترویج واشاعت اور اس کی سربلندی اور عروج وکمال میں حصہ لیا یا لیں گے جس طرح حضرت مہدی علیہ السلام ان سب کی خلافت موعودہ تسلیم کر لی جائے تو بالکل بجا ہے لیکن خلفائے ثلاثہ کی خلافت کو بہر حال ارشادِ مرتضوی کی روشنی میں خلافتِ حقہ اور موعود من اللہ تسلیم کرنا لازم اور فرض۔

ہرقل کی طرف سے مغلوبیت کا اعتراف اور غلبۂ اسلام کا کتبِ سابقہ کی پیشین گوئیوں کے مطابق ہونا

حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کے اِن ارشاداتِ عالیہ کی ہی تائید اور تصدیق کے طور پر ذرا ہرقل اور قیصرِ روم کا اعترافِ شکست اور مغلوبیت کا یقین اور اِس فتوحات کے نہ تھمنے والے طوفانی سلسلہ کا کتبِ سماویہ کی پیشین گوئیوں کے مطابق ہونا بھی ملاحظہ کرتے چلیں۔

(۱) صاحب ناسخ التواریخ نے نقل کیا ہے۔ کہ جب ہرقل بادشاہ روم کی لڑکی خالد بن ولید رضی اللہ عنہٗ کے ہاتھوں گرفتار ہوئی اور اس نے اپنے رہبان اور بطاریق بھیج کر اِس کی واپسی کی اپیل کی اور فدیہ لے کر چھوڑنے یا بطور کرامت وعنایت چھوڑنے کا مطالبہ کیا تو آپ نے کہا فی الحال ہم اس کو مفت میں چھوڑتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ دوبارہ اِس کو تیرے محل سرائے سے گرفتار کر لیں گے جب وہ شاہزادی واپس پہنچی اور اِس کے ہمراہیوں نے ہرقل کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا پیغام پہنچایا تو اِس نے حاضرین مجلس کی طرف منہ کر کے کہا:۔

ایں ہماں سخن است کہ روزِ نخست وقتی کہ کتاب محمد بمن آمد مردم روم را گفتم سخن او برحق است دینِ او بپذیرید از مَن نپذیرفتند وارادہ قتل من کردند۔ زود باشد کہ دواہی ما ازیں صعب تر گردد وایں نہ از قدرت و کرامت عربست بلکہ از خداوند آسمان وزمین است (صـــ ۲۱۳ ـ ۲۱۴ جلد دوم از کتاب دوم)

یہ وہ بات ہے جو کہ میں نے پہلے دن کہی جس وقت کہ محمد عربی کا خط میرے پاس آیا۔ میں نے رومی لوگوں کو کہا اِن کی بات درست ہے۔ لہٰذا اِن کے دین کو قبول کر لو (تو تباہی وبربادی سے بچ جاؤ گے۔ جیسے کہ انہوں نے کہا ہے۔ اسلم تسلم۔ اسلام لے آؤ گے تو بچ جاؤ گے) مگر میری بات کو انہوں نے تسلیم نہ کیا بلکہ میرے

قتل کرنے کے درپے ہو گئے بہت جلدی ہماری مشکلات اِس سے بھی بڑھ جائینگی۔ اور یہ عربوں کی قدرت وطاقت اور عزت وکرامت نہیں (کہ اتنی عظیم سلطنتوں سے ٹکر لے کر اِن کو تباہ وبرباد کر دیں) بلکہ آسمان وزمین کے مالک اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہے۔

ہرقل کا خواب اور پھر انطاکیہ سے فرار

(۲) اسی طرح ناسخ التواریخ میں ہے کہ ہرقل سویا ہوا تھا کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے ایک شخص اترا اور اِس نے ہرقل کو تخت سے نیچے گرا دیا۔ اور تاج اس کے سر سے لے لیا اور کہا ارض سوریۃ یعنی ملک شام سے تیری سلطنت کے زوال کا وقت پہنچ گیا ہے۔ اور وہ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے لشکر میں سخت آندھی چلی ہے، اور آگ بھڑک اٹھی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ہرقل گھبرا کر بیدار ہوا اور اس کو یقین ہو گیا کہ میں عربوں کے مقابلے میں برقرار نہیں رہ سکتا اور اِس کے بعد اپنے ہم شکل جرنیل کو لشکر کی قیادت سونپ کر رات کی تاریکی میں انطاکیہ سے قسطنطنیہ کی طرف بھاگ نکلا اور لشکر اسلام نے انطاکیہ کو فتح کر لیا۔ اور بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا! اور ہزاروں رومی قیدی بنا لیے گئے (صـــ ۳۲۳۔ جلد دوم، کتاب دوم)

تورات کی بشارت

(۳) اس ضمن میں کتابِ دانیال علیہ السلام سے اِس لشکر خداوند کے غلبہ اور نصرت اور معونت اور خلافت الٰہیہ کی شان ملاحظہ کرتے چلیں۔ شاہِ بابل ,, بخت نصر نے خواب دیکھا جو اسے بھول گیا اِس نے اپنے درباری معتبرین وحکماء اور بیت المقدس فتح کرنے کے بعد گرفتار کئے ہوئے یہودیوں کو خبردار کیا کہ میرا خواب بھی بتلاؤ۔ اور اس کی تعبیر بھی وگرنہ سب کو قتل کر دوں گا۔ تو حضرت دانیال علیہ السلام نے وہ خواب بھی بتلایا۔ اور اس کی تعبیر بھی۔ ملاحظہ ہو عہدنامہ قدیم یعنی تورات صـــ ۸۲۲)

اے بادشاہ تو نے ایک بڑی مورت دیکھی وُہ بڑی مورت جس کی رونق بے نہایت تھی۔ تیرے سامنے کھڑی ہوئی۔ اور اس کی صورت ہیبت ناک تھی۔ اِس مورت کا سر خالص سونے کا تھا اِس کا سینہ اور اِس کے بازو چاندی کے تھے۔ اس کا شکم اور اِس کی رانیں تانبے کی تھیں۔ اس کی ٹانگیں لوہے کی اور اس کے پاؤں کچھ لوہے اور کچھ مٹی کے تھے۔ تو اسے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ ایک پتھر ہاتھ لگائے بغیر ہی کاٹا گیا۔ اور اِس مورت کے پاؤں پر جو لوہے اور مٹی کے تھے لگا۔ اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تب لوہا۔ اور مٹی اور تانبا اور چاندی اور سونا ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے۔ اور تابستانی کھلیان کے بھوسے کی مانند ہوئے۔ اور ہوا ان کو اڑا کر لے گئی۔ یہاں تک کہ ان کا پتہ نہ چلا اور وہ پتھر جس نے اِس مورت کو توڑا، ایک بڑا پہاڑ بن گیا۔ اور تمام زمین میں پھیل گیا وہ خواب یہ ہے اور اس کی تعبیر بادشاہ کے حضور بیان کرتا ہوں۔

اے بادشاہ! تو شہنشاہ ہے جس کو آسمان کے خدا نے بادشاہی اور توانائی اور قدرت وشوکت بخشی ہے۔ اور جہاں کہیں بنو آدم سکونت کرتے اس نے میدان کے چرندے اور ہوا کے پرندے تیرے حوالے کر کے تجھے ان سب کا حاکم بنایا ہے۔ وہ سونے کا سر تو ہی ہے اور تیرے بعد ایک اور سلطنت برپا ہو گی جو تجھ سے چھوٹی ہو گی اور اس کے بعد ایک اور سلطنت تانبے کی ہو گی جو تمام زمین پر حکومت کرے گی۔ اور چوتھی سلطنت لوہے کی مانند مضبوط ہو گی اور جس طرح لوہا، توڑ ڈالتا ہے۔ اور سب چیزوں پر غالب آتا ہے۔ ہاں جس طرح لوہا سب چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے۔ اور کچلتا ہے۔ اس طرح وہ ٹکڑے ٹکڑے کرے گی اور کچل ڈالے گی اور جو تو نے دیکھا کہ اس کے پاؤں اور انگلیاں کچھ تو کمہار کی مٹی کی اور کچھ لوہے کی تھیں سو اس سلطنت میں تفرقہ ہو گا مگر جیسا کہ تو نے دیکھا اس میں لوہا، مٹی سے ملا ہوا تھا اس میں لوہے کی مضبوطی ہو گی اور چونکہ پاؤں کی انگلیاں کچھ لوہے کی اور کچھ مٹی کی تھیں اس لیے سلطنت کچھ قوی اور کچھ ضعیف ہو گی اور جیسا تو نے دیکھا کہ لوہا مٹی سے ملا ہوا تھا۔

وہ بنی آدم آمیختہ ہوں گے۔ لیکن جیسا لوہا، مٹی سے میل نہیں کھاتا۔ ویسے ہی وہ بھی باہم میل نہ کھائیں گے۔ اور ان بادشاہوں کے ایام میں آسمان کا خدا ایک سلطنت برپا کرے گا جو تا ابد نیست نہ ہو گی۔ اور اس کی حکومت کسی دوسری قوم کے حوالہ نہ کی جائے گی۔ بلکہ وہ اِن تمام مملکتوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور نیست کرے گی۔ اور وہی ابد تک قائم رہے گی جیسا تو نے دیکھا۔ کہ وہ پتھر ہاتھ لگائے بغیر پہاڑ سے کاٹا گیا۔ اور اس نے لوہے اور تانبے اور مٹی اور چاندی اور سونے کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ خدا تعالیٰ نے بادشاہ کو وہ کچھ دکھلا دیا جو آگے ہونے والا ہے۔ اور یہ خواب یقینی ہے۔ اور اس کی تعبیر یقینی ہے۔

اقول:۔ اس طویل اقتباس کو بار بار غور سے پڑھیئے اور بتلایئے کہ اللہ تعالیٰ نے جس حکومت کو پتھر سے پہاڑ کی صورت میں بخت نصر کو دکھلایا وہ کونسی ہے۔ اور دانیال علیہ السلام کے بقول جو ابدی ہے اور نیست ونابود ہونے والی نہیں وہ کون سی حکومت ہے۔ اور بخت نصر اور اس کے جانشینوں کے علاقوں پر جو حکومت غالب آئی وہ کون سی ہے اور کیا ہے کوئی عقل سلیم کا مالک جو اس میں شک وشبہ اور تردد سے کام لے کہ وہ سلطنت سلطنت اسلام ہے۔ جو خلافت راشدہ کے دور میں پھیل کر پہاڑ کی صورت ناقابل شکست وریخت ہوئی اور بقول دانیال علیہ السلام اسے اللہ تعالیٰ قائم کرنے والا ہے۔ اور ہمیشہ کے لیے برقرار رکھنے والا کیونکہ چودہ صدیوں کے بعد وہ علاقے بہرحال اسلام کے زیر اقتدار ہیں اور اہل اسلام ہی اِن کے حاکم ہیں گو نظام خلافت برقرار نہیں رہا، اور یہ گواہی تورات کے علاوہ زبور نے بھی دی۔ اور قرآن نے اس سے حکایت کرتے ہوئے بیان فرمایا:۔

" ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثها عبادی الصالحون "

یعنی البتہ تحقیق ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھا کہ اس زمین کے میرے صالحین بندے وارث ہوں گے اور کون کہہ سکتا ہے کہ غلامانِ مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے

علاوہ اس زمین کے وارث صالحین بندے ہوئے لہذا خلافتِ راشدہ کا دور ہی اس تورات و زبور کی شہادت کا مصداق ہے۔ اور وہ خلافت ہی خلافت موعودہ ہے۔ جس کا وعدہ اللہ تعالٰے نے آیت استخلاف میں فرمایا۔ اور اس کی تفسیر و تاویل حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس خلافت کے ساتھ فرمائی لہذا کتاب اللہ اور اہل بیت کے اتفاق اور تورات و زبور کی تائید سے اس خلافت کا خلافتِ حقہ ہونا ظاہر اور واضح ہوگیا اور اس کا مقصودِ باری تعالیٰ ہونا بھی روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا۔

تنزیہہ الامامیہ　　از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

جواب سے عجز اور بے بسی

نوٹ: علامہ ڈھکو صاحب نے بنیادی دلائل یعنی حضرت امیرالمؤمنین علی رضی اللہ عنہ کے غزوۂ فارس اور غزوۂ روم میں قیمتی مشوروں اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ساتھ اپنی محبت و مودت اور ارادت و عقیدت اور ان کے لشکر کو اللہ تعالیٰ کا لشکر قرار دینا اور ان کے دین و مذہب کو اللہ تعالیٰ کا دین قرار دینا اور خلافت کو خلافتِ موعودہ قرار دینا وغیرہ نظر انداز کرکے ضمناً اور تبعاً مذکور ایک عبارت پر جرح اور قدح شروع کرلی۔ آخر کسی کتاب کا جواب دینے اور رد کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ کہ جس کا کچھ جواب آتا ہو وہ دے دیا اور جس کا جواب نہ آتا ہو اس کو چھوڑ دیا۔ اور شیر مادر سمجھ کر ہضم کر گیا کہ گویا اس عبارت کا کتاب میں ذکر ہی نہیں تھا۔

نہج البلاغۃ کی تمام تر عبارات کے متعلق تقریباً ڈھکو صاحب کا یہی طرزِ عمل رہا ہے نہ کہتے ہیں حوالہ غلط ہے، نہ کہتے ہیں روایت ضعیف ہے۔ نہ کہتے ہیں طرزِ استدلال غلط ہے۔ بس مکمل خاموشی کے ساتھ تقیہ کے پردے میں گزر جاتے

ہیں جو ان کی بے بسی اور عاجزی کا کھلا اور بین ثبوت ہے۔ بہرحال ناسخ التواریخ کے ضمنی حوالہ کے متعلق جو کچھ گوہر افشانی کی ہے۔ وہ ملاحظہ ہو اور پھر اس کے جوابات ملاحظہ فرمائیں رسالہ تنزیہہ الامامیہ از ص۱۱۸ تا ص۱۲۲ ملخصاً۔

پیر صاحب آف سیال شریف تحریر فرماتے ہیں۔ اب سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا تعامل ملاحظہ ہو۔۔۔۔ در کارہا و لشکر کشیہا اُو را اعانت میفرمود ولئے نیکو میداد۔

(۱) پیر صاحب نے اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق اس حوالہ میں جس طرح قطع و برید کی ہے۔ دجل و فریب کی دنیا میں اس کی مثال شاذونادر ہی ملے گی۔ (تنا صاحب ناسخ التواریخ فرماتے ہیں، اگرچہ شیعان حیدر کرار کے عقیدہ کے مطابق حضرت علی علیہ السلام عمر کی خلافت کو غاصبانہ سمجھتے تھے۔ لیکن (وہ اپنی روایتی بلند حوصلگی اور قوتِ ایمانی کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی کے) کاموں میں اور لشکر کشیوں میں ان کی اعانت کرتے اور مفید مشوروں سے نوازتے تھے چنانچہ اس موقعہ پر جناب امیر علیہ السلام نے وہ صائب مشورہ دیا جن کا تفصیلی تذکرہ نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۲۶ میں موجود ہے جسے مؤلف نے نقل بھی کیا ہے۔

اربابِ عقل و انصاف غور فرمائیں کہ اگر اس پس منظر میں ناسخ کی پوری عبارت پڑھی جائے۔ تو اس سے خلافتِ عمر کا بطلان واضح ہوتا ہے؟ یا اس کی صحت ثابت ہوتی ہے۔

(۲) اب رہا عبارت کا ابتدائی جملہ "علی علیہ السلام بعقیدت مردم شیعی اگرچہ خلافت عمر را از راہِ غصب میدانست الخ کو چھوڑ کر صرف در کارہا و لشکر کشیہا اُو را اعانت مے فرمود، سے استدلال کرنا کہ اگر حضرت امیر علیہ السلام خلافتِ عمر کو صحیح نہیں سمجھتے تھے تو یہ مشورہ کیوں نہ دیا کہ تم میدان میں جاؤ تاکہ وہ وہاں جاتے اور مارے جاتے تو جناب امیر کی خلافت کے لیے راستہ ہموار ہو جاتا۔ تو یہ استدلال بچند وجہ درست نہیں۔

اوّلاً جس شخص سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہوتا ہے۔ لہذا غلط مشورہ دینے کا حضرت امیر علیہ السلام کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا جیسے کہ کوتاہ اندیش ملاؤں کا خیال ہے کہ غلط مشورہ دے کر خلافت حاصل کر لیتے۔

ثانیاً:۔

بوقت مشورہ حضرت امیر کے سامنے صرف حضرت عمر کی موت وحیات کا سوال نہ تھا بلکہ اسلام کی بقاء وفناء کا مسئلہ درپیش تھا اور اگرچہ اس وقت تک لوگوں نے جناب امیر کی ولایت کا اقرار نہیں کیا تھا مگر کفر اور شرک کی وادی سے نکل کر خدا کی توحید اور رسول خدا کی رسالت کا اقرار کر کے اسلام کی چار دیواری میں داخل تو ہو گئے جیسے صاحب ناسخ نے کہا ہے۔

در غلبۂ اسلام ازیں کم نبود کہ کافراں بوحدانیت خدا و نبوت پیغمبر اقرار مے دارند و راہ بکوچۂ سلامت نزدیک مے کردند۔

ثالثاً:۔

مشورہ طلب کرنے یا مشورہ دینے سے حضرت علی علیہ السلام اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تعلقات کو خوشگوار سمجھ لینا محض خوش فہمی ہے جس طرح عزیز مصر کا محبوس یوسف علیہ السلام کی طرف تعبیر خواب میں رجوع تعلقات کی خوشگواری کی دلیل نہیں تھا، بلکہ یوسف علیہ السلام کے برحق نبی ہونے کی دلیل اسی طرح صائب مشورہ آپ کے امام برحق ہونے کی دلیل ہے۔

رابعاً:۔

چونکہ حضرت امیر غزوات نبویہ میں جناب حضرت عمر کے جنگی کارنامے دیکھ چکے تھے اس لیے اندیشہ تھا کہ راہ فرار اختیار نہ کریں اور اسلام اور اہل اسلام کی

توہین نہ ہو لہذا کسی تجربہ کار جرنیل کو بھیجنے کا مشورہ دیا جس سے ظاہر ہے کہ عمر صاحب ان صفات سے عاری تھے۔

خامساً:

اگر اصحاب ثلاثہ حضرت امیر کی نگاہ میں برحق خلیفے ہوتے تو بڑی بڑی جنگوں اور فوج کشیوں میں آپ جیسا آزمودہ کار اسلامی جرنیل کیوں شامل نہ ہوا یا کیوں شامل نہ کیا گیا؟ اب منطق کی جس شکل سے بھی نتیجہ نکالو، یہی ثابت ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کے مقدس نظریہ اور مذہب میں اصحاب ثلاثہ برحق خلفاء رسول نہیں تھے۔

"والحقّ مع علی وعلیٌّ مع الحق"

الجواب بفضل اللہ المتعال۔

تحفہ حسینیہ ازابوالحسنات محمد اشرف السیالوی غفرلہ

جواب الاوّل

(۱) حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ کے دو مشورے ذکر فرمائے ہیں جو نہج البلاغہ سے منقول ہیں۔ اور دو عبارتیں فروع کافی اور ناسخ التواریخ کی ذکر فرمائیں فروع کافی میں یہ مذکور ہے کہ "القتال مع الامام الغیر المفروض طاعتہ حرام قطعاً۔ لا غزو الا مع امام عادل"

کہ ایسے امام کی معیت میں جہاد اور قتال حرام ہے اور قطعی حرام ہے جس کی اطاعت اللہ تعالیٰ نے فرض نہ کی ہو اور جہاد صرف امام عادل کے ساتھ اور اس کی معیت میں جائز ہے اس فتویٰ کے ساتھ نہج البلاغہ کے دو اقتباس ملا کر اور پھر ناسخ التواریخ کی یہ عبارت ملا کر دیکھیں تو ہر صورت میں نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مقدس نظریہ اور مذہب میں امیرالمؤمنین عمر برحق خلیفہ تھے۔

اب اس کے جواب میں ڈھکو صاحب کا یہ واویلا کہ پوری عبارت

نقل نہیں کی، قطع و برید کی گئی۔ دجل وفریب سے کام لیا گیا وغیرہ اہل عقل اور ارباب دانش کی نظر میں پر کاہ کی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تعامل اور کردار بیان فرما رہے تھے نہ کہ مردم شیعی کا عقیدۂ فاسدہ تو کیا صاحب ناسخ نے اس تعامل کا اقرار کیا ہے۔ یا نہیں جب ایک طرف تعامل کا اقرار ہے تو جواب فروع کافی کی روایت کا دینا چاہئے تھا کہ جب یہ جہاد و قتال ہی مردم شیعی کے عقیدۂ فاسدہ میں حرام تھا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حرام کام میں لوگوں کو شامل کرنے اور میدان جنگ میں بھیجنے کے مشورے کیوں دیتے رہے اور خود حصہ دار کیوں بنتے تھے۔ لہٰذا ان دونوں عبارتوں کو اور نہج البلاغہ والی عبارتوں کو سامنے رکھیں تو آپ کے مقدس نظریہ و عقیدہ میں امیر عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق معلوم ہوتی ہے یا شیعہ کے نظریہ فاسدہ میں حضرت ابوالائمہ کی عصمت ختم ہوتی ہے اور حرام کام میں آپ کی حصہ داری لازم آتی ہے جب دو لوازم میں سے دوسرا لازم فریقین کی نظر میں باطل ہے تو لامحالہ شق اول متعین ہوگئی اور آپ کی نظر میں خلافت فاروقیہ کا برحق ہونا واضح ہو گیا۔

لمحہ فکریہ:۔ دنیائے عدل وانصاف میں کیا اس کی کوئی نظیر ملتی ہے کہ دلیل کے اجزاء اور حصص میں سے اہم جزو اور حصہ کو نظر انداز کر کے جوابی کاروائی شروع کر لی جائے جب ایک طرف امام جعفر کا فتوٰی ہے اور دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تعامل تو نتیجہ بہرحال وہی ہے جو حضرت شیخ الاسلام نے بیان فرمایا بلکہ شیعی عقیدہ کو شیعی کتب کے حوالے سے ہی باطل فرمایا۔

رسالہ "مذہب شیعہ" کا مطلب شاید ڈھکو صاحب نے یہ سمجھا کہ جو کچھ ذاکر صاحبان بیان کرتے ہیں یا اوٹ پٹانگ کشید کردہ نظریات بیان کئے جاتے ہیں شیخ الاسلام علیہ الرحمہ بھی وہی بیان کرتے آپ کا مقصد اس رسالہ کی تالیف سے صرف اور صرف یہ تھا کہ شیعی روایات کی رو سے جو صحیح عقیدہ ہونا چاہئے وہ بیان کیا جائے۔ اور ائمہ کرام کا حقیقی نظریہ اور عقیدہ واضح کیا جائے۔

ڈھکو صاحب اس دجل اور فریب کاری سے کام خود لیتے ہیں اور الزام حضرت شیخ الاسلام کو دیتے ہیں ہاں کیوں نہ ہو آئینہ میں اپنی صورت ہی نظر آتی ہے۔

جواب الثانی

شق ثانی ڈھکو صاحب نے یہ ذکر کی تھی کہ اس عبارت کا مقصد یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ کیوں نہ دیا کہ میدان جنگ میں چلے جاؤ تاکہ آپ وہاں شہید ہو جاتے اور خلافت مرتضوی کے لیے راستہ ہموار ہو جاتا۔

حضرت شیخ الاسلام کے پورے کلام میں یہ طرز استدلال کہیں بھی مذکور نہیں ہے۔ بلکہ صرف اتنا قدر مذکور ہے:۔

مسلمان بھائیو! اور نہیں تو اتنا کم از کم سوچو کہ اس قسم کے مشورے دوست اور خیرخواہ دیا اور لیا کرتے ہیں یا دشمن؟ ص۵۷

جس کا مطلب اور مقصد حضرت شیخ الاسلام کی مفصل عبارت اور ہماری پیش کردہ فوائد عبارت کی طویل فہرست سے ظاہر اور واضح ہے۔ اور وہ مطلب قطعاً نہیں کہ آپ کو مشورہ دیا جاتا کہ میدان جنگ میں جاؤ تاکہ شہید ہو کر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے راہ خلافت ہموار کر دو اگر یہ مشورہ دینا عداوت اور دشمنی ہوتی تو اہل سنت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت امیرالمومنین رضی اللہ عنہ کے اعداء میں شمار کرتے نعوذ باللہ جنہوں نے بنفس نفیس میدان جنگ میں جانے اور اطراف و اکناف کے اہل اسلام کو بھی ہمراہ لے جانے کا مشورہ دیا تھا۔

اور کون عقل کا اندھا یہ کہہ سکتا ہے کہ میدان جنگ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جانا ان کے شہید ہونے کے مترادف تھا؟ اس پر کیا دلیل یا معمولی قرینہ بھی قائم ہو سکتا ہے۔ حضرت خالد جیسے خطر پسند جرنیل جو تنہا ہزاروں سے لڑتے رہے میدان جنگ میں شہید نہ ہوئے تو آپ کے شہید ہونے کا یقین کس کو ہو سکتا تھا؟

بلکہ وجہ استدلال صرف اور صرف یہ تھی کہ تمہاری فتح و نصرت کا اللہ تعالیٰ ضامن ہے اور تم سے ہی اہل اسلام کا باہمی ربط و ضبط ہے اور تمہارے شہید ہو جانے پہ ان میں باہمی اتحاد و اتفاق برقرار نہیں رہے گا وغیرہ وغیرہ لہٰذا تم خود میدانِ جنگ میں نہ جاؤ۔ اگر اس میں ایک پہلو مصلحت اور منفعت والا ہے کہ اہل اسلام بے جگری سے لڑیں گے تو دوسرا پہلو ضرر اور نقصان والا بھی ہے۔ بلکہ وہ زیادہ خطرناک ہے۔ لہٰذا وزنی رائے یہی ہے کہ خود تشریف نہ لے جاؤ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ لینا اور آپ کا خلافت فاروقیہ کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرنا دوستی کی دلیل بنایا گیا۔ اور دشمنی اور عداوت کے معدوم ہونے کی اور شیعی تزعومات و تخیلات کے فاسد و باطل ہونے کی حجت اور دلیل بنایا گیا۔

لہٰذا جو بمباری ڈھکو صاحب نے کی ہے وہ اپنے توہمات اور تخیلات فاسدہ کے قلعہ اور محل سرائے پہ ہے نہ کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے طرزِ استدلال پہ۔

مقام تعجب ہے کہ آپ نے ابن میثم اور ناسخ التواریخ وغیرہ کے حوالوں سے جو معانی اور مطالب حضرت امیر کی عبارات کے متعین فرمائے اور اس خلافت کو اللہ تعالیٰ کی موعود خلافت قرار دیا اور تمکینِ دین اور خوف کو امن سے بدلنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضمانت کا اعلان فرمایا اس وجہ استدلال کو تو ہاتھ نہ لگایا اور ایک حرف بھی اس کے ردو انکار میں ذکر نہ کیا اور جو آپ نے نہ ذکر کیا نہ آپ کے ذہن میں وہ تصور و خیال تھا وہ فرض کر کے اس پہ جرح و قدح شروع کر لی۔ کیا ردّو قدح اور جوابی کارروائی کا طریقہ یہی ہوتا ہے؟

الغرض اس حقیقت کے واضح ہونے کے بعد ہمیں شق ثانی پر پانچ وجوہ سے ڈھکو صاحب کی جرح و قدح کا جواب دینے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی لیکن اربابِ عقل و دانش پہ ان کی سخافت اور سفاہت ظاہر کرنے کے لیے ان پہ بھی مختصراً تبصرہ کیے دیتے ہیں۔

جواب نمبر۱:۔ یہ بجا کہ جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہوتا ہے۔ اور اس کو

صحیح مشورہ دینا چاہیے۔ مگر غاصبانہ اور ظالمانہ حکومت کو حکومت اسلام اور خلافتِ الٰہیہ قرار دینا اور اس خلیفہ کے دین کو اللہ تعالیٰ کا دین اور اس کی افواج کو اللہ تعالیٰ کی فوج اور ان کی فتح و نصرت کا اللہ تعالیٰ کو ضامن قرار دینے اور زمانہ رسالتمآب کی طرح ملائکہ کی معاونت کی امید دلانے کا آخر کیا مطلب تھا؟ مشورہ جس امر کے متعلق تھا صرف اس پر اکتفاء کیا جاتا۔

جواب نمبر۲:۔ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں مشورہ دیتے وقت حضرت علی المرتضیٰ کے سامنے صرف عمر صاحب کی موت و حیات کا مسئلہ نہ تھا بلکہ اسلام کی بقا و فنا کا مسئلہ تھا مگر دریافت طلب امر یہ ہے کہ جب شیعہ صاحبان کے نزدیک اسلام رہ ہی نہیں گیا تھا اور نہ مسلمان بلکہ ارتد الناس إلا ثلاثۃ یعنی سوائے تین افراد کے دوسرے تمام صحابہ العیاذ باللہ مرتد ہو چکے تھے۔ اور وہ اپنا مذہب اور دین چلا رہے تھے۔ تو دینِ حق اور مذہب اسلام جب تھا ہی نہیں تو کس کی بقاء کے لیے حضرت امیر علیہ السلام نے جہاد و قتال حرام ہونے کے باوجود حصہ داری اختیار فرمالی اور مجاہدین و محاربین اور ان کے امیر اور خلیفہ کی مدح و ثناء میں رطب اللسان ہو گئے؟

نیز شیعہ صاحبان فرماتے ہیں جس کا ولایتِ علی پر ایمان نہیں وہ نماز پڑھے یا زنا کرے برابر ہے۔ ملاحظہ ہو مجالس المؤمنین، قاضی نور اللہ شوستری ج اول ص۲۸۲

"مَنْ لَمْ یوال من الانام ولیّہٗ سیّان عند اللہ صلّیٰ او زنیٰ۔

این مضمون کلام ہدایتِ انجام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام است کہ سواءً لِمَنْ خالَفَ ھٰذا الامر صَلّیٰ اَو زَنیٰ، یعنی مخلوق میں سے جو شخص ولی خدا سے محبت نہیں رکھتا اللہ تعالیٰ کے نزدیک برابر ہے نماز پڑھے یا زنا کرے اور یہی مضمون ہے امام صادق کے فرمان کا کہ جو امر امامت کا مخالف ہے اس کی نماز اور زنا برابر ہے۔ تو جس مذہب و ملت کی وجہ سے نماز اور زنا برابر ہو اس میں اسلام نام کی کونسی شے ہوگی اور اس کا فائدہ کیا ہو سکتا ہے؟ اگر شہادت توحید و رسالت مفید ہو تو پھر نماز زنا کے برابر نہیں ہو سکتی اور برابر ہے تو پھر اس

شہادت کا فائدہ نہیں ہو سکتا لہٰذا اِس مقصد کے تحت بھی ایسے مشورے دینے کا کوئی جواز نہیں۔ اور نہ ایسی حکومت اور خلافت کو خلافتِ الٰہیہ قرار دینے کا۔

جواب نمبر۳: ۔ ڈھکو صاحب نے جنگ کے متعلق مشورہ کو عزیزِ مصر کے یوسف علیہ السلام سے تعبیرِ خواب پوچھنے پر قیاس کیا ہے۔ اِس بد فہمی اور کج بحثی کا بھی کوئی علاج ہے؟ کہاں تعبیرِ خواب کا معاملہ جو مومن عیسائی اور یہودی سے پوچھ سکتا ہے اور کافر مومن سے اور کہاں جنگ اور حرب وقتال کا معاملہ اور اس کی تدبیریں جو اخص الخواص کے بغیر کسی پر ظاہر نہیں کی جا سکتیں۔ شاید ڈھکو صاحب اس صلاح و مشورہ کو بھی خواب ہی قرار دے رہے ہیں اور حضرت امیر علیہ السلام کو اس کی تعبیر دینے والا، ڈھکو صاحب ذرا پنک سے ہوشیار ہونے کے بعد سوچیں کہ جنگی معاملات پر صلاح و مشوروں کو تعبیرِ خواب سے کوئی نسبت اور تعلق ہو سکتا ہے؟ پھر یہ بھی مستی اور بد ہوشی ہیں یاد نہیں رہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر عزیزِ مصر نے پوچھی تھی جس نے اِن کو قید کر رکھا تھا یا بادشاہِ مصر نے جس نے عزیز کو معزول کر دیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو منصب وزارت سونپ دیا تھا۔ علاوہ ازیں صحیح تعبیر کو دلیلِ نبوّت بنا دیا گیا ہے۔ اور صحیح مشورہ کو دلیلِ امامت، سبحان اللہ حجۃ الاسلام اور مجتہد العصر جو ٹھہرے ایسے لغو استدلال ذکر نہ کریں تو کیا کریں؟ کیا محض صحیح تعبیر نبوّت کی دلیل ہے؟ یوں تو سارے اکمل معبّرین نبی بن جائیں گے! اور اگر سارے صحیح مشورہ دینے والے امام برحق ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صحیح مشوروں کو خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم قبول فرماتے رہے۔ اور قرآن مجید آپ کی موافقت میں اُترتا رہا۔ پھر آپ کی امامت پر اعتراض کیوں؟ ہر رائے کا صحیح ہونا تو وہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے حق میں تسلیم نہیں بلکہ آپ ہمیشہ قیس بن سعد کو امارتِ مصر سے معزول کرنے اور حضرت محمد بن ابی بکر کو امارت سونپنے پر پچھتاتے رہے۔ اور اظہارِ افسوس کرتے رہے۔ اور امام حسن رضی اللہ عنہ نے بصرہ کی طرف جانے اور اصحاب جمل کے ساتھ براہِ راست جنگ کرنے سے روکا مگر آپ نے نہ صرف اِن کے

مشوروں کو رد کیا بلکہ خود مار کر اِن کی پنڈلی کو زخمی کر دیا۔ ملاحظہ ہو شرح حدیدی ص ۴۷ ج ۲

لہٰذا جب ہر مشورہ امام کا قابلِ قبول ہونا ضروری نہ ہو تو اِس کو دلیلِ امامت کیونکر بنا سکتے ہیں؟ اور جب خود امام کو اپنے فیصلہ پر افسوس اور پچھتاوا لاحق ہو تو ہر سوچ اور نظریہ کو دلیلِ امامت کیوں کر بنا سکتے ہیں؟ ڈھکو صاحب محض شاعری سے کام لینا کافی نہیں معقول و منقول دلائل و براہین پیش کر و محض سید نوازش علی شاہ صاحب کا عطیہ ہضم کرنے کے لیے چند ورق سیاہ کر دینا تو کافی نہیں ہو سکتا۔

جواب نمبر۴: ۔ حضرت امیر کو یہ اندیشہ تھا کہ عمر صاحب کہیں راہِ فرار اختیار نہ کر لیں۔ لہٰذا یہ مشورہ دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دِل کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ وہی علیم بذات الصدور ہے۔ جہاں تک اظہار کا تعلق ہے۔ اور بیان کا تو آپ نے اِس قسم کے تاثر اور گمان کا ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں فرمایا۔ چہ جائیکہ تصریح فرمائی ہو۔ لہٰذا جو صاف اور واضح ارشادات ہیں اور عبارت وا شارت اور دلالت واقتضاء کے لحاظ سے حضرت فاروق اعظم کے خدا داد کمالات اور اوصاف پر دلالت کرتے ہیں اِن کو چھوڑ کر اِس ژاژ خائی پر اُتر آنا یہود منش سبائی ٹولہ کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ کوئی منصف غیر مسلم بھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا چہ جائے کہ مومن ہونے کا مدعی۔

علاوہ ازیں بطور سپاہی لڑنا علیحدہ امر ہے۔ اور سپاہیوں کو لڑانا دوسرا امر ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص خود لڑے تو بہادری اور شجاعت کے نمایاں جوہر نہ دکھلا سکے۔ لیکن تجاویز اور طریق کار کے لحاظ سے کامیاب کمانڈر اور جرنیل ثابت ہو، جنگ کے لیے ہر فرد کا شمشیر زن ہونا لازم نہیں، بلکہ بعض اپنے ذہن اور غور و فکر اور تدابیر و تجاویز سے شمشیر زنی کی نسبت زیادہ کار آمد ہوتے ہیں —— اور کوئی دیانتدار انسان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت سے موازنہ کرے تو وہ اِس فرق کو واضح طور پر محسوس کر سکتا ہے کہ کس تے انتہائی کامیابی کے ساتھ اِس ذمہ داری کو نبھایا اور کونسا میدانِ کارزار ہے جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کو قیصر و کسریٰ کے ساتھ مصالحت

اور مسالمت کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اور کونسا مقام ہے جہاں آپ کی افواج کو شکست اور پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ اور کونسا موقعہ ہے، جہاں کمانڈروں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کے حکم اور فیصلہ کو نظر انداز کیا ہو اور ان پر اپنی مرضی مسلط کی ہو، حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ، جیسے کامیاب ترین جرنیل اور کمانڈر کو معزول کرنے پر بھی فتوحات میں کوئی فرق پڑا۔ یا ان کو محاذ آرائی کی جرأت ہوئی جب کہ مرتضوی دور میں اس قسم کی صورتِ حال نظر نہیں آتی۔ آپ صفین میں جنگ بند کرنے کے حق میں نہ تھے۔ لیکن کمانڈروں اور افواج نے آپ کی مرضی کے برعکس بند کرنے پر آپ کو مجبور کیا۔ آپ تحکیم پر راضی نہیں تھے مگر مجبور کیا گیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی ثالثی پر رضامند نہیں تھے مگر خواہ مخواہ ان کو ثالث بنا دیا گیا وغیرہ وغیرہ بالآخر حضرت امیر علیہ السلام کو مجبور ہو کر دعا کرنی پڑی کہ اے اللہ مجھے ان سے بہتر ساتھی عطا فرما اور ان کو مجھ سے برے حاکم اور مجھے اپنے پاس بلا لے۔ اس لیے یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ شیخین رضی اللہ عنہما میں روحِ محمدی اور نبوی پرتو اثر انداز تھا۔ اور کفر و شرک کی دنیا میں انقلاب برپا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو منتخب فرما لیا تھا۔ جس طرح رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ہر حقیقت بین نگاہ یہ فیصلہ دینے پر مجبور نظر آتی ہے۔ کہ انہوں نے حق نیابت اور خلافت ادا کر دیا۔ اور زمانہ اس قسم کے نائبین اور خلفاء کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اور اسی فرق اور امتیاز سے مجبور ہو کر شیعہ صاحبان نے آیتِ استخلاف کو صرف حضرت مہدی علیہ السلام میں محصور اور محدود کر دیا اور خلافتِ مرتضوی کو اس سے نکال دیا۔

عجیبہ: آذانوں میں اب دورِ مہدی میں بجائے ان کی خلافت کے اعلان کے سیّدنا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، کی خلافت بلا فصل کا اعلان ہو اور آیت استخلاف سے ان کو خارج کر دیا جائے۔ اس سے بڑھ کر دورِ فاروقی کے رعب اور دبدبہ کا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ اعداء اور بد اندیشوں کے ذہن بھی

ماؤف ہو کر رہ گئے۔ اور تضاد و تناقض کا شکار ہو گئے۔ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کا معاملہ دورِ نبوی میں جو رہا، اس کو چھوڑئے حضرت علی رضی اللہ عنہ، کی بیعت کے موقعہ پر جو افسانے تراشے گئے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کے ہاتھوں مجبور و بے بس ہو کر ان کے ابوبکر صدیق کے ساتھ بیعت کرنے کے جو ڈرامے سٹیج کئے گئے۔ اس کے بعد بھی ان کو بزدل اور کم حوصلہ ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ کبھی افراط کا یہ عالم کہ شیرِ خدا رضی اللہ عنہ، کو ان کے سامنے بے بس تسلیم کیا جائے۔ اور کبھی تفریط کا یہ عالم کہ بھاگ جانے کے خطرہ کے تحت میدانِ جنگ میں جانے سے روک دیا ہے کوئی اس برادری میں معقول انسان جو اس افراط و تفریط کی دلدل سے نکل کر راہِ اعتدال پر گامزن ہو۔ اور اعترافِ حقیقت میں بخل سے اور بغض و عناد سے کام نہ لے۔ ابن ابی الحدید معتزلی شیعی نے اس ضمن میں بہت اچھا کہا ہے؟

ابنِ ابی الحدید معتزلی شیعی کا منصفانہ فیصلہ

كانَ من عناية الله بهذا الدين ان الهم الصحابة ما فعلوا والله متم نوره ولو كره المشركون (شرح حدیدی ص ۱۱۴ ج ۱۱۔)

اللہ تعالیٰ کی اس دین کے ساتھ خاص عنایت اور اس کی ترویج و ترقی اور اس کے غلبہ و تسلط کا حتمی ارادہ تھا اور خاص توجہ کہ صحابہ کرام کو علی الترتیب شیخین رضی اللہ عنہما کو خلیفہ بنانے کا الہام فرمایا اور اللہ تعالیٰ اپنے نورِ اسلام کو تام اور کامل کرنے والا ہے۔ اگرچہ مشرکین اس کو ناپسند ہی کریں۔

ابن ابی الحدید نے کہا کہ اوّل اوّل حضرت علی رضی اللہ عنہ، کو خیال تھا کہ مجھے خلیفہ نہ بنا کر انہوں نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اور دنیا کی طرف میلان اور رغبت کی وجہ سے مجھے نظر انداز کیا ہے۔ لیکن بعد میں آپ کو اطمینان ہو گیا کہ انہوں نے جو قدم اٹھایا ہے۔ وہ عین صواب ہے۔ اور سراسر مصلحت اور دین و

ملت کے لیے انتہائی مفید اور کارآمد اور خواہشاتِ نفس اور حرص و ہوا کے تقاضوں سے سراسر پاک اور منزہ اقدام۔

ھذا یقتضی ان امیر المؤمنین علیہ السلام کان فی بدء امرہ یظن ان العقد لغیرہ کان من غیر نظر فی المصلحۃ وانہ لم یقصد بہ الا صرف الامر عنہ والاستئثار علیہ فظھر ما ظھر منہ من الامتناع والقعود فی بیتہ الی ان صح عندہ و ثبت فی نفسہ انھم اصابوا فیما فعلوا و انھم لم یمیلوا الی ھوی ولا ارادوا الدنیا و انما فعلوا الاصلح فی ظنونھم۔ الخ

(شرح حدیدی ج نمبر ۱۱ ص ۱۱۲)

یعنی حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا ابتداء میں علیحدگی اختیار کرنا اس ظن اور گمان پر مبنی تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے عقد خلافت اور مہاجرین و انصار کے ان کی بیعت کرنے میں مصلحت کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اور اس کا مقصد صرف مجھ سے خلافت کو دور کرنا اور مجھ پر دوسروں کو ترجیح دینا ہے۔ لہذا آپ بیعت کرنے سے بھی رکے رہے اور گھر میں بیٹھے رہے حتیٰ کہ آپ رضی کے نزدیک بالآخر یہ حقیقت درست ثابت ہو گئی اور آپ کے نزدیک واضح ہو گیا کہ صحابہ کرام نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ اس میں صائب الرائے ہیں۔ اور درست سمت میں قدم اٹھانے والے۔ اور یہ اقدام انہوں نے خواہشاتِ نفس اور دنیوی میلان اور رغبت کے تحت نہیں کیا بلکہ اپنے خیال میں جو بہتر سمجھا وہی کیا۔ الغرض حضرت امیر رضی اللہ عنہ اپنی خوشی اور رضامندی سے ہی مجلس مشاورت میں شامل ہوتے اور حضرات خلفاء کے ساتھ پورے خلوص اور ہمدردی اور محبت و مودت اور اتحاد و یگانگت کی فضا میں مشورے دیتے اور ان کی خلافت کو دین اسلام کی ترویج اور ترقی کا ضامن سمجھ کر اسی لیے ان کے

وصال کو ناقابل تلافی نقصان اور اسلام کے لیے نہ مندمل ہونے والا زخم قرار دیا جیسے متعدد دفعہ اس کا حوالہ گزر چکا ہے اور ڈھکو صاحب نے اس کو شیر مادر سمجھ کر ہضم کر لیا ہے۔

جواب نمبر ۵:۔ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ اگر نگاہ مرتضوی میں یہ تینوں برحق خلیفے تھے تو آپ جیسا آزمودہ کار جرنیل بڑی بڑی جنگوں اور فتوحات میں کیوں شریک نہیں ہوا۔

ا:۔ اس کے جواب میں پہلی چیز تو قابل غور یہ ہے کہ ڈھکو صاحب نے خود اپنا رد کر دیا۔ اور اپنے سابقہ جواب کی تردید کر دی۔ پہلے کہا کہ شہادت توحید اور شہادت رسالت کی وجہ سے لوگ کفر سے نکل کر اسلام کے قریب ہو رہے تھے۔ لہذا اس مصلحت کو سامنے رکھ کر آپ مجالس مشاورت میں شریک ہوتے تھے۔ تو اسی مقصد کو سامنے رکھ کر آپ جہاد میں کیوں نہ شریک ہوتے رہے۔ عملی طور پر جہاد میں شامل ہونے سے یہ مصلحت بطریق احسن حاصل ہو جاتی لہذا آپ کو اس کے حصول کے لیے عملی کوششیں بھی کرنی چاہیئے تھیں صرف مشوروں پر اکتفاء نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ فرمائیے ڈھکو صاحب کچھ آیا سمجھ شریف میں اگر مشورہ صحیح تھا تو عملی جہاد بھی درست تھا لہذا خود بھی حصہ لینا چاہیئے تھا کیونکر حصہ نہ لیا؟ اگر کوئی خارجی کہہ دے لِمَ تقولون ما لا تفعلون تو کیا جواب ہو گا؟ آپ کے پاس تو یقیناً جواب نہیں ہو گا۔ لیکن ہم بحمد اللہ اس کا منہ بھی اس طرح بند کریں گے کہ جنگ عام سپاہی بھی لڑ سکتا ہے۔ لیکن جنگ لڑانا ہر کسی کا کام نہیں۔ اور نہ وہ فرد واحد کا کام ہوا کرتا ہے۔ بلکہ ایک مشاورتی کمیٹی ہی اس فرض کو باحسن طریق سرانجام دے سکتی ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس اہم ترین کام کو سرانجام دیا کرتے تھے۔

(ب) مسیلمہ کذاب جیسے جھوٹے مدعیان نبوت کے خلاف کاروائی میں اور مانعین زکوٰۃ وغیرہ کے خلاف حرب و قتال میں اگر آپ شامل نہیں ہوئے اور کفار کو اسلام کے قریب اور سلامتی کے قریب کرنے کے لیے جہاد میں آپ نے حصہ نہیں لیا تو

اعتراض حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات پر ہوگا۔ کہ انہیں صرف اور صرف اپنی امامت وخلافت سے سروکار تھا وہ ملتی تو تلوار کبھی میان میں داخل نہ کرتے اور نہیں ملی تو اس کو میان سے باہر نہیں نکالا۔ اور نہ ہی قدم گھر سے باہر رکھا تراہ لوٹ مٹ کر کافر بنیں یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے منحرف ہوجائیں۔ اور جھوٹے مدعیان نبوت کے دام تزویر میں پھنس جائیں یا احکام اسلام کو مسترد کر دیں اس کے برعکس خالد بن الولید جیسے صدیقی دور کے کمانڈر انچیف کو معزول کر دیا جاتا ہے۔ تو وہ ذرا بھر ملال اور کبیدگی ظاہر کیے بغیر .... کہتا ہے میں امیر عساکر ہو کر وہ خدمت نہیں کر سکتا تھا۔ جو ایک سپاہی کی حیثیت سے کر سکتا ہوں۔ مجھے عہدہ سے غرض نہیں خدمت اسلام سے غرض ہے۔ تو ان محبوں کے حق میں کیوں نہ ہوں ؎

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو؟

"ج"، بعض دفعہ اہم شخصیات کو میدان جنگ میں نہ بھیجنا ہی عین مصلحت ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزدہ تبوک میں اپنے ہمراہ نہ لیا اور نہ ہی آخری غزوہ میں امیر عساکر بنایا جس کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بھیجنے کا عزم فرمایا تو کیا سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کروگے؟ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت وبسالت پر؟ لا واللہ صرف اور صرف یہی کہا جائے گا کہ مصلحت کو ملحوظ رکھا۔ تو ان حضرات نے بھی کسی اہم مصلحت کے تحت ایسا کیا ہوگا۔

"د": ۔ کیا آزمودہ کار جرنیل کا صرف یہی مصرف ہے کہ اس کو جنگ کی بھٹی میں جھونکے رکھیں کیا اس کے قیمتی صلاح ومشورہ سے زیادہ فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا؟ اس لیے ان حضرات نے آپ کو وزیر خاص اور مشیر خاص بنایا۔ اور ان کے مشوروں کو اہمیت دی اور بہت زیادہ منافع ومصالح حاصل ہوئے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اس منصب کو خود بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

ص ۲۱۹

"انا لکم وزیراً خیر لکم منی امیراً" (نہج البلاغۃ مصری جلد اول)

میں تمہارے لیے وزیر کی حیثیت میں زیادہ مفید اور کارآمد

ہوں بہ نسبت امیر اور خلیفہ ہونے کے، اور یہ اس وقت فرمایا جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مہاجرین وانصار آپ کے گرد جمع ہوئے۔ اور آپ کو خلافت وامامت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی درخواست کی تو آپ نے اپنا سابقہ منصب ان کے سامنے رکھا کہ میں اسی حالت میں بہتر ہوں بہ نسبت اس نئی ذمہ داری سنبھالنے کے کیا خلافت خلفاء کی حقانیت صرف اسی صورت میں آپ کی نگاہوں میں ثابت ہوتی کہ سپاہی یا کمانڈر بنائے جاتے۔ اور وزیر ومشیر ہونے کی صورت میں اس خلافت کی حقانیت ظاہر نہیں ہو سکتی تھی؟

"الحقّ مَع علیّ وعلیٌّ مع الحق" بجا لیکن حقائق کا مطالعہ کرو اور واقعات کا مشاہدہ کرو کہ وہ علی مرتضیٰ اور حق جو باہم لازم وملزوم ہیں وہ کن کے ساتھ رہے؟ کن کے مشیر اور کن کے وزیر رہے؟ منطق کے قیاس اقترانی کی باقی سبھی اشکال کو چھوڑ کر شکل اول سے ہی نتیجہ معلوم کر لو۔ حق علی کے ساتھ ہے۔ اور علی اصحاب ثلاثہ کے ساتھ ہیں لہٰذا حق بھی ان کے ساتھ ہے والحمد للہ علی ذالک۔

ڈھکو صاحب کی بے بسی:۔

لیکن پھر عرض کر دوں یہ روایت جو ناسخ التواریخ سے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے ذکر کی تھی وہ ضمنی طور پر ذکر کی گئی تھی۔ اصل دلائل نہج البلاغہ کے خطبات تھے۔ اور اس روایت کو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کے ساتھ ملا کر شیعی اذہان کو جھنجھوڑنا مقصود تھا۔ کہ ان دونوں عبارات کا حتمی نتیجہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کا نگاہ مرتضوی میں برحق ہونا ہے۔ مگر ڈھکو صاحب نہ فروع کافی کی عبارت کو چھیڑتے ہیں اور نہ نہج البلاغۃ کی عبارات کو اور نہ ان کی تشریحات کو جو ناسخ التواریخ اور ابن میثم کے حوالے سے پیش کی گئیں اور قرآن مجید کی آیت اور فرمان مرتضوی سے اس خلافت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے موعود ہونا اور ثقلین کی شہادت سے اس کا برحق ہونا لہٰذا ڈھکو صاحب کو یہ اُدھار چکانا چاہیے۔ اور اپنے برادران مذہب کو

اس بارے میں تسلی کرانی چاہیے۔ کہ حضرت علی مرتضیٰ اور قرآن کیا کہتے ہیں؟ اور ہم کیا کہتے ہیں اور کیوں؟ ادھر اُدھر بھاگ دوڑ اور اصل اور اہم دلائل کو چھوڑ کر ذیلی اور ضمنی اور جزوی چیز کو لے کر اپنے ایمان کی طرح چند اوراق سیاہ کر دینا کافی نہیں ہو سکتا۔

رسالہ مذہب شیعہ: از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دعوائے خلافت بلافصل سے دستبرداری

آیئے اب ہم آپ کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا کھلا فیصلہ سنائیں، جس کو اہلِ تشیع کے مجتہدِ اعظم یعنی صاحبِ ناسخ التواریخ نے نقل کیا ہے۔ ج ۲، ص ۱۹۴

اگر ابوبکر و عمر سزاوار نہ بودند چگونہ بیعت کردی و اطاعت فرمودی و اگر لائقِ خلافت بودند من از ایشاں کمتر و فروتر نیستم چناں باش از برائے من کہ از برائے ایشاں بودی۔ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما خلافت کے مستحق نہیں تھے، تو آپ نے ان کی بیعت کس طرح کی اور ان کی فرمانبرداری کیوں کرتے رہے؟ اور اگر مستحقِ خلافت تھے، تو میں ان سے کم نہیں ہوں۔ میرے ساتھ آپ اس طرح موافقت و معاونت کریں جس طرح کہ ان کے زمانے میں ان کے ساتھ کرتے رہے۔

فقال علی علیہ السلام اما الفرقۃ فمعاذ اللہ ان افتح لہا بابا واسہل الیہا سبیلا ولکنی انہاک عما ینہاک اللہ ورسولہ عنہ واہدیک الیٰ رشدک واما عتیق وابن الخطاب فان کانا اخذا ما جعلہ رسول اللہ لی فانت اعلم بذالک والمسلمون ومالی ولہذا الامر وقد ترکتہ منذ حین فاما ان لا یکون حقی بل المسلمون فیہ شرع فقد اصاب السہم الثغرۃ واما ان یکون حقی دونہم فقد ترکت لہم طبت نفسا ونفضت یدی عنہ استصلاحا۔

تو حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لیکن تفرقہ اندازی، تو اللہ تبارک و تعالیٰ مجھے اس سے بچائے کہ میں تفرقہ اندازی کا دروازہ کھولوں یا فتنہ کا راستہ آسان کروں، میں آپ کو صرف اس چیز سے منع کرتا ہوں جس چیز سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور میں آپ کو رشد و ہدایت کی راہ دکھاتا ہوں۔ رہا ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کا معاملہ تو اگر انہوں نے اس چیز کو غصب کر لیا ہوتا، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے مختص فرمایا تھا، تو آپ اور دوسرے اہلِ اسلام اس کو زیادہ جانتے ہوتے اور مجھے اس خلافت کے ساتھ واسطہ ہی کیا ہے، حالانکہ میں نے تو اس کے خیال کو بھی مدت سے ذہن سے نکال دیا ہوا ہے۔ پس خلافت کے متعلق دو ہی احتمال ہیں، ایک یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت صرف میرا حق نہ تھا، بلکہ سبھی مسلمان یعنی صحابہ کرام اس میں مساوی طور پر حصہ دار تھے، تو اس صورت میں خلافت جس کا حق تھی، اس کو مل گئی، حق بحق دار رسید۔ دوسری صورت یہ تھی کہ خلافت صرف میرا ہی حق تھا۔ دوسرے کسی شخص کا حق نہیں تھا، تو میں نے ان خلفاء کے لیے چھوڑ دی اپنی خوشی اور رضا کے ساتھ اور بطیبِ خاطر اپنا حق ان کو بخش دیا اور صلح و صفائی کے ساتھ ان کے حق میں دستبردار ہو گیا۔

لیجیے صاحب! یہ ہے مولیٰ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا حتمی فیصلہ۔ جب مولائے مشکل کشا کرم اللہ وجہہ الکریم فرما دیں کہ اگر صرف میرا حق تھا، تو میں نے صلح و صفائی کے ساتھ اور خوشی اور رضا کے ساتھ امرِ خلافت ان کو بخش دیا اور ان کے حق میں دستبردار ہو گیا اور آجکل کے ذاکروں کے یہ ٹوٹکے کہ حیدرِ کرار شیرِ خدا رضی اللہ عنہ سے صحابہ کرام نے خلافت چھین لی اور غصب کر لی۔ اب انصاف سے کہیے کہ کس کو صحیح اور درست مانا جائے۔ ذاکر لوگ اپنی لمبی لمبی اذانوں میں وصی رسول اللہ و خلیفۃ بلافصل اور خدا جانے کیا کیا گانٹھتے چلے جاتے ہیں۔ کیا اس سے حضرت

سیّدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کی صاف صاف تکذیب لازم نہیں آتی ؟ منبروں پر چڑھ کر شیرِ خدا مولا مشکل کشا رضی اللہ عنہ کو جھٹلانا اور ان کی تکذیب کرنا کس محبت اور تولّیٰ کا تقاضا ہے۔ اگر یہی محبت ہے تو پھر دشمنی کسے کہتے ہیں ؟

تنزیہ الامامیہ — از محمد حسین ڈھکو صاحب

مؤلف رسالہ نے ناسخ التواریخ جلد دوم ص۱۹۱ سے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، اور عثمان (ذی النورین رضی اللہ عنہ،) کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے جو مشہور سُنّی مورخ واقدی متوفی (۲۳۰ھ) کی کتاب الشوریٰ سے منقول ہے۔ چنانچہ صاحب ناسخ التواریخ رقمطراز ہیں :۔

واقدی در کتاب شوریٰ از ابن عباس حدیث کند کہ عثمان علی علیہ السلام را حاضر ساخت فقال :۔

نشدتك الله ان تفتح للفرقة بابا ۔ الخ

اس سے معلوم ہوا کہ یہ دراصل اہل سنت کی روایت ہے۔ جو ہمارے خلاف حجت نہیں ہو سکتی یہ تو ہے روایتی سقم !

اور اس میں درایتی سقم یہ ہے کہ اس میں حق امامت سے دستبرداری کا تذکرہ ہے جو کہ ناممکن ہے کیونکہ نبوت کی طرح امامت بھی ایک عہدۂ خداوندی ہے جسے وہ عطا کرے وہ شخص نہ اس سے دستبردار ہو سکتا ہے۔ اور نہ کسی دوسرے کو دے سکتا ہے۔

الغرض یہ روایت . . . . بے جوڑ ہے اور اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ۔

○

تحفہ حسینیہ — از ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی غفرلہ،

علامہ ڈھکو صاحب نے اس روایت کے متعلق دو سقم ذکر کئے ہیں ایک یہ کہ روایت سنیوں کی ہے۔ دوسرا یہ کہ خلافِ عقل ہے۔ کیونکہ امامت سے دست برداری یا اس کا انتقال دوسری جگہ ممکن نہیں ہے۔ امر اوّل کے متعلق گزارش ہے کہ

(۱) صاحبِ ناسخ نے ابتداء کتاب میں تصریح کر دی تھی کہ میں سُنی اور شیعہ دونوں کی متفق علیہ روایات درج کروں گا۔ اور کوئی روایت مذہب تشیع کے خلاف ہوئی تو اس میں اپنا مذہب و مسلک واضح کر دوں گا۔ لہذا صاحبِ ناسخ التواریخ اس روایت کو ذکر کر کے جب کوئی جرح و قدح نہیں کرتا تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہوا کہ اس کو نہ اس میں روایتی سقم نظر آیا نہ درایتی اور نہ اس کو اپنے مذہب و مسلک کے خلاف معلوم ہوئی۔

لہذا ڈھکو صاحب کو اب یہ سقم بیان کرنے کی ضرورت کیوں پڑی ؟

اگرچہ عبارت صاحبِ ناسخ کی پہلے ذکر ہو چکی مگر دوبارہ اس کو ملاحظہ فرمائیں ناسخ جلد اوّل ص۳۵ ۔

معلوم باد کہ راقم حروف در تاریخ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم و آل او ۔ بیشتر خبر اہل سنت را مینگارد کہ شیعی و سنی در آن اتفاق دارند و اگر سخنی بر خلاف عقیدت علماء امامیہ اثنا عشریہ در میان آید آنرا باز می نماید ۔

۲ ۔ یہی مضمون و مفہوم خود نہج البلاغۃ میں مندرج آپ کے خطبات سے بھی ثابت ہے۔ لہذا روایتی سقم کا دعویٰ بے بنیاد ہے ۔

ا ۔ قبیلہ اسد کے ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا تمہیں تمہاری قوم نے خلافت اور امامت سے کیوں دور رکھا حالانکہ تم اس کے زیادہ حق دار تھے ! تو آپ نے اُس کے جواب میں ارشاد فرمایا :۔ فانّها كانت اثرة شحت عليها

نفوس قوم وسخت عنها نفوس قوم آخرین۔ نہج البلاغۃ مصری صفحہ ۳۶۸ جلد اول)
یعنی امارت وخلافت ایک اعزاز و امتیاز تھا اور تفوق و برتری کا ذریعہ جس پہ ایک فریق نے بخل اور حرص کا مظاہرہ کیا اور دوسرے فریق نے جود وسخا کا مظاہرہ کیا۔ اگر جبر واکراہ سے جاتی تو اس کو جود وسخا سے تعبیر نہ کیا جاتا۔ اور اگر جود وسخا ہے۔ تو پھر جبر واکراہ نہیں ہے۔ بلکہ عفو ودرگزر ہے اور یہی واقدی کی کتاب الشوریٰ والی روایت کا مدلول ومقصود ہے۔

"ب"۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مہاجرین وانصار نے آپ کو خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے عرض کیا تو آپ نے فرمایا۔ دعونی والتمسوا غیری (الی) وان ترکتمونی فانا کاحدکم ولعلی اسمعکم واطوعکم لمن ولیتموہ امرکم وانا لکم وزیراً خیر لکم منی امیراً۔
نہج البلاغۃ مصری جلد اول صفحہ ۲۱۹ ۔

ترجمہ:۔ مجھے چھوڑئیے اور میرے علاوہ اس منصب کے لیے کسی دوسرے شخص کو تلاش کرو۔۔۔۔۔۔۔ اور اگر تم مجھے چھوڑ دو اور اس ذمہ داری کے سنبھالنے پہ مجبور نہ کرو) تو میں تمہاری طرح ایک فرد ہوں اور ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری نسبت اس شخص کے حکم کو زیادہ قبول کرنے والا اور زیادہ اطاعت کرنے والا ہوں گا جس کو تم امر خلافت کا متولی اور مالک بناؤ اور میرا تمہارے لیے وزیر ہونا بہ نسبت تمہارا امیر ہونے کے بہتر ہے (لہذا مجھے وزارت کے منصب پر رہنے دو اور امارت کے لیے دوسرے شخص کا انتخاب کر لو) اس ارشاد سے بھی صاف ظاہر ہے کہ آپ کا حق اگر تھا بھی تو آپ اس کے لیے نہ کوشاں ہیں اور نہ اصرار کرنے والے بلکہ دوسرے شخص کو ملنے پہ رضامند ہیں۔ اور سب سے زیادہ اطاعت امیر اور اس کی فرمانبرداری کے لیے تیار اور صرف وزارت کے منصب پر رہ کر خدمت اسلام اور اہل اسلام کے لیے تیار وآمادہ۔

سوچنے کی بات ہے کہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے بعد ان کے مرتبہ کا اور ان جیسا سابق الاسلام اور قرب مصطفوی پہ فائز کوئی شخص نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اگر آپ ایسے شخص کی امامت وخلافت پہ رضامند ہو رہے ہیں اور اس کی وزارت قبول کرنے پہ تیار تو شیخین رضی اللہ عنہما کے حق میں کیوں کر راضی نہیں ہوں گے!

"ج"۔ آپ نے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی اس شکایت پہ کہ ہمیں مشورہ میں شریک نہیں کیا جاتا اور ہم سے امور خلافت کی انجام دہی میں کام نہیں لیا جاتا، ارشاد فرمایا" واللہ ما کانت لی فی الخلافۃ رغبۃ ولا فی الولایۃ اربۃ ولکنکم دعوتمونی الیہا وحملتمونی علیہا۔ نہج البلاغۃ صفحہ ۵۱۹ ج اول
بخدا نہ مجھے خلافت میں کوئی رغبت تھی اور نہ ولایت وحکومت میں کوئی حاجت اور دلچسپی لیکن تم نے مجھے اس کی طرف بلایا اور مجھے اس پر برانگیختہ اور آمادہ کیا۔ اگر آپ اس خلافت وولایت کے مدعی ہوتے اور دست بردار نہ ہوئے ہوتے تو رغبت ومیلان اور دلچسپی کی نفی کیونکر فرماتے۔ اور حضرت طلحہ حضرت زبیر اور دیگر حضرات صحابہ کی طرف یہ منسوب کیوں فرماتے؟ کہ تم نے مجھے اس کی طرف بلایا اور تم نے مجھ پہ یہ بوجھ ڈالا جس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ سب مہاجرین وانصار کو اس استحقاق میں مساوی اور برابر سمجھتے تھے! اور اگر بالفرض اپنا حق سمجھتے تھے تو اس سے دست بردار ہو چکے تھے۔ اور اس کی خاطر کسی نزاع واختلاف میں پڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

(د) فاقبلتم الیّ اقبال العوذ المطافیل علی اولادها تقولون البیعۃ البیعۃ قبضت یدی فبسطتموها ونازعتکم یدی فجذبتموها، (نہج البلاغۃ صفحہ ۳۱۴ ج ۱)
تم میری طرف اس طرح متوجہ ہوئے جیسے نئی نئی بچوں کو جنم دینے والی اونٹنیاں اپنے بچوں کی طرف دوڑ کر آتی ہیں جب کہ تم کہتے تھے بیعت لو بیعت لو۔ میں نے اپنا ہاتھ بند کیا مگر تم نے اس کو کھولا۔ میں نے تم سے اپنا ہاتھ کھینچا اور چھڑایا لیکن تم نے اسے

زبردستی اپنی طرف کھینچا۔

اس ارشاد سے بھی یہی حقیقت ظاہر ہے کہ آپ امارت وخلافت کے متمنی اور آرزومند نہیں تھے بلکہ اس کو مشترکہ حق سمجھتے تھے یا اس سے دستبردار ہو چکے تھے۔

۵۷) آپ کا ارشاد گرامی ہے۔

رضینا عن اللہ قضاءہٗ وسلّمنا للہ امرہٗ اترانی اکذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ لانا اوّل من صدقہٗ فلا اکون اوّل من کذب علیہ فنظرت فی امری فاذا طاعتی قد سبقت بیعتی واذا المیثاق فی عنقی لغیری۔

(نہج البلاغۃ ص۱۰۴ ج۱)

ہم اللہ تعالیٰ کی اس قضا پر راضی ہیں اور ہم نے اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے امر و حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے کیا تیرا خیال ہے کہ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولوں بخدا میں پہلا شخص ہوں جس نے آپ کی تصدیق کی لہذا میں ہی پہلا ان کی تکذیب کرنے والا کیونکر ہو سکتا ہوں؟ میں نے اپنے معاملہ میں غور و فکر کیا تو ناگاہ میری طاعت میری بیعت وخلافت سے سبقت لے جا چکی تھی اور میری گردن میں دوسروں کی اطاعت کا عہد و میثاق تھا۔

یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے عہد لیا ہوا تھا کہ خلافت بغیر نزاع و اختلاف کے مل جائے تو بہتر ورنہ خلفاء سے اختلاف نہ کریں

کما قال ابن میثم۔ انّہٗ کان معهوداً الیہ ان لا ینازع فی امر الخلافۃ بل اِن حَصَلَ لہٗ بالرفق والّا فلیمسک فقولہ نظرتُ فی امری فاذا طاعتی سبقتْ بیعتی ای طاعتی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما امرنی بہ من ترک القتال قد سبقت بیعتی للقوم فلا سبیلَ الی الامتناع منہا۔

(شرح ابن میثم جلد ثانی ص۹۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے یہ عہد و پیمان لیا گیا تھا کہ امر خلافت میں نزاع نہ کریں۔ بلکہ اگر نرمی سے اور آسانی سے مل جائے تو بہتر ورنہ اس سے باز رہیں لہذا آپ کے قول میری طاعت میری بیعت سے سبقت لے جا چکی تھی کا مطلب یہ ہے کہ میرا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا ترک قتال و نزاع میں قوم کی بیعت سے پہلے مقدر ہو چکا تھا۔ لہذا ان کی بیعت سے رکنا اور دور رہنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اور ایک قول اس کی تشریح میں یہ ہے کہ:۔

"المیثاق ما لزمہٗ من بیعۃ۔ ابی بکر بعد ایقاعها۔ ای فاذا میثاق القوم قد لزمنی فلم یمکننی المخالفۃ بعدہٗ"

یعنی لوگوں کے ابوبکر صدیق کی بیعت کر لینے کے بعد آپ پر بیعت کرنا لازم ہو گیا تو یہی لزوم بیعت ہی میثاق ہے۔ تو جب قوم کی طرف سے یہ عہد و ذمہ داری قبول کرنا واجب ٹھہرا تو اس کے بعد میرے لیے اس کی مخالفت کرنا ممکن نہ رہا۔ الغرض قوم کی بیعت کے بعد اپنے آپ کو پابند بیعت سمجھیں تو بھی دستبرداری کا ثبوت یقینی اور اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کو پابند کر دیا گیا تھا تو بھی دستبرداری کا تحقق بھی زیادہ یقینی ہو گیا۔ اور قضاء الٰہی پر رضا لازم ہوتی ہے اور اس کے امر و حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور جب کہ خلفاء سابقین کی خلافت بھی اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر اور اس کے امر سے ہے۔ لہذا آپ پر اس کے متعلق رضامندی اور تسلیم لازم ٹھہری تو بھی خلفاء سابقین کے لیے خلافت سے دستبرداری اور اس پر مجسم تسلیم و رضا بننا ضروری ٹھہرا۔ اور اگر اس پر بھی حزن و ملال باقی رہا تو پھر رضا بالقضاء اور تسلیم امر کا دعویٰ بالکل درست نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ نے ہی فرمایا:۔

مَنْ اَصْبَحَ علی الدنیا حزیناً فقد اَصْبَحَ لقضاء اللہ ساخطاً۔

نہج مع شرح حدیدی جلد ۱۹ ص۵۲۔

یعنی جو شخص دنیا کے ہاتھ سے نکل جانے پر حزن وملال کا اظہار کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کی قضا پر ناراض ہوا اور ناپسندیدگی کا اظہار کرنے والا ٹھہرا۔

اور تسلیم ورضاء کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ مفید اور نافع امر درپیش ہو تو تسلیم و رضاء وگرنہ مخالفت اور نزاع بلکہ رنج وراحت، نفع ونقصان اور نعمت ونقمت ہر حال میں تسلیم ورضاء سے کام لینا پڑتا ہے:۔ ؎

اگر رنج وراحت وگر قبل وقید — مَنْ از حق شناسم نہ از عمرو زید
درین نوع از شرک پوشیدہ ہست — کہ زیدم بیازرد وعمرم بخست

لہذا سید المتابعین اور رئیس الموحدین اور سلاسل اربعہ کے امام وپیشوا سے بھی اسی امر کی توقع بلکہ یقین رکھنا ضروری ہے۔

"و" جب اہل شوریٰ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کرکے انہیں خلافت کے لیے منتخب فرما لیا تو آپ نے ارشاد فرمایا نہج البلاغۃ جلد اول ص ۱۲۶

واللہ لاسلمنّ ما سلمت امور المسلمین الی التماسا لاجر ذلک۔

بخدا اس عثمان کے لیے اس منصب امامت اور عہدہ خلافت کو تسلیم کروں گا جب تک امور مسلمین صحیح طور پر سرانجام پذیر ہوتے رہیں گے اللہ تعالیٰ سے اس صبر وتسلیم کا اجر حاصل کرنے کے لیے جب آپ کی طرف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں تسلیم پائی گئی تو شیخین رضی اللہ عنہما کے حق میں بطریق اولیٰ لہذا اس پر چون وچرا کی کیا گنجائش ہے۔

"ز" جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا اور عام لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کرلی تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور جناب ابوسفیان نے آپ سے بیعت کرنے کا عزم ظاہر کیا اس موقعہ پر آپ نے فرمایا۔ نہج البلاغۃ جلد اول ص ۴۶۔

ایہا الناس شقوا امواج الفتن بسفن النجاۃ وعرّجوا عن طریق المنافرۃ وضعوا تیجان المفاخرۃ افلح من نہض بجناح او استسلم فاراح الخ

اے لوگو فتنوں کی موجوں کو نجات کی کشتیوں کے ساتھ عبور کرو۔ اور منافرت وکدورت کے راستہ سے الگ تھلگ رہو اور شعوب وقبائل کی فوقیت وبرتری والے تاج جو مفاخرت کو سروں سے اتار دو۔ کامیاب وہ شخص ہوا جس نے اعوان وانصار سے تقویت حاصل کی۔ اور پھر اٹھ کھڑا ہوا یا پھر اقرار و اعتراف اور تسلیم کا راستہ اختیار کیا خود بھی راحت اٹھائی اور دوسروں کو بھی راحت پہنچائی۔

ھذا ماء آجنٌ ولقمۃ یغصّ بہا آکلہا ومجتنی الثمرۃ لغیر وقت ایناعہا، کالزارع بارض غیرہ۔

یہ ترش پانی ہے۔ اور گلے میں پھنس جانے والا لقمہ ہے۔ اور پکنے سے پہلے پھل کو چننے والا ایسا ہے جیسے دوسرے کی زمین میں بیج بونے والا، اور فصل کاشت کرنے والا۔

جب یہ حقیقت مسلّم ہے۔ کہ آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں امامت وخلافت کا دعویٰ نہیں کیا اور اس کو اسی طرح بے منفعت سمجھتے رہے جس طرح غیر کی زمین میں بلا اذن بیج بونا یا پھل کو پکنے اور تیار ہونے سے پہلے توڑنا تو لامحالہ ماننا پڑے گا۔ کہ آپ نے دوسرا راستہ اختیار فرمایا۔ یعنی استسلم فاراح۔ اعتراف وتسلیم سے کام لے کر خود بھی راحت پائی اور دوسروں کو بھی راحت پہنچائی۔ لیکن موت اور ہلاکت کے ڈر سے نہیں کیونکہ آپ تو اس کی طرف اس سے بھی زیادہ راغب تھے جتنا کہ شیر خوار بچہ ماں کے دودھ کی طرف راغب ہوتا ہے۔ بلکہ خصوصی علم اسرار کی وجہ سے جیسے کہ فرمایا بل اندمجت علی مکنون علم الخ میں ایک پوشیدہ علم کو اپنے اندر لئے ہوئے ہوں۔ اور اس کی تشریح پہلے گزر چکی۔ کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے عہد لے رکھا تھا کہ خلافت کے حصول کے لیے شیخین سے نزاع واختلاف نہیں کرنا لہذا واضح ہوگیا کہ آپ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت اور عہد وپیمان کا پاس اور لحاظ فرماتے ہوئے اور اہل اسلام واسلام کی بہتری کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور فتنوں کی آلائش سے دامن کو بچاتے ہوئے اور اپنے وقت اور باری کا انتظار کرتے ہوئے ضروری

تعاون کی پیش کش کے باوجود تسلیم و رضاء اور مصالحت و مسالمت کا راستہ اختیار کیا اور اس میں اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی امید رکھ کر جو بغیر قلبی رضاء و تسلیم کے ممکن نہیں اور یہی مقصد تھا واقدی صاحب کی کتاب شوریٰ کے حوالے کا جو اتنے خطبات مرتضویہ سے ثابت ہے جو نہج البلاغہ جیسے شیعہ کے قرآن ثانی میں موجود ہیں۔

لہٰذا صاحب ناسخ التواریخ نے انہی حقائق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اِس روایت کو متفق علیہ قرار دیا۔ اور اِس پر جرح و قدح سے گریز کیا مگر علامہ ڈھکو صاحب کو چونکہ اپنے مذہبی معلومات کم ہیں کیونکہ دوسرے مشاغل زیادہ ہیں اسی لیے اسی بہانے اِس روایت کا جواب دینے بلکہ جواب کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کی ٹھانی حالانکہ کوئی کتاب شیعہ صاحبان کی نہیں جو واقدی کی روایات سے پُر نہ ہو خود نہج البلاغہ میں جو خطبات مذکور ہیں یہ بھی اسی طرح لوگوں کی کتابوں سے ماخوذ اور منتخب ہیں جن میں واقدی بھی شامل ہے بعض جگہ نام کی تصریح بھی کر دی گئی ہے۔ بعض جگہ تصریح نہیں کی گئی۔ ملاحظہ ہو نہج البلاغہ۔ جلد اول ص ۵۶۶

من خطبة لهٗ علیه السلام خطبها بذی قار و هو متوجه إلی البصرة ذکرها۔ الواقدی فی کتاب الجمل۔

لہٰذا صرف واقدی کا نام لے کر گلو خلاصی نہیں کرائی جا سکتی ورنہ شیعہ صاحبان کی معتبر سے معتبر کتاب بھی غیر معتبر ہو کر رہ جائے گی۔

کیا از روئے عقل و درایت خلافت سے دستبرداری ممکن ہے؟

علامہ ڈھکو صاحب نے خلافت و امارت سے دستبرداری کو خلاف عقل قرار دیتے ہوئے علت یہ بیان کی کہ امامت نبوت کی مانند اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ منصب ہے۔ نہ نبوت و رسالت سے دستبرداری ممکن نہ ہی امامت و خلافت سے یہ عقل اور درایت اور علت و دلیل دیکھ کر کیوں نہ کہوں سے

ع جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

معلوم ہوتا ہے کہ ڈھکو صاحب نے بے عقلی کو ہی عقل اور درایت سے محرومی کو ہی درایت سمجھ رکھا ہے۔ ذرا غور فرمائیے۔

(۱) جب نبوت اور امامت خداداد عہدے ہیں تو اِس سے مراد کیا ہے۔ دنیوی حکومت جس میں تنفیذ احکام شرعیہ کی قدرت و طاقت حاصل ہو۔ یا صرف تبلیغ احکام اور رشد و ہدایت پر مشتمل امور کا بیان۔

اگر پہلی شق مراد ہے۔ تو پھر ہر نبی کے لیے حکومت و سلطنت کا تحقق اور ثبوت ہونا چاہیے۔ حالانکہ قطعاً ایسا نہیں۔ حضرت عیسیٰ، حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہم السلام اور ان کے علاوہ بہت سے انبیاء علیہم السلام نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود حکمران اور مالک سلطنت نہیں تھے، بلکہ شیخ صدوق نے خصال میں ذکر کیا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے صرف چار حضرات زمین میں ملوکیت اور بادشاہت پر فائز ہوئے۔ اور یہ عنوان قائم کیا: "ملوک الانبیاء فی الارض اربعة" جلد اول ص ۲۴۸

حضرت شموئیل علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ سے ہمیں صاحب سلطنت اور حکمران مانگ کر دیں جس کی زیر قیادت ہم جہاد کریں۔ تو آپ نے دعا فرمائی جس کے صدقہ میں طالوت کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا گیا۔ قال اللہ تعالیٰ: "ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکاً"

لہٰذا حکومت و سلطنت نبوت و رسالت کے لیے لازم نہیں ورنہ ان حضرات کی نبوت و رسالت کا ہی انکار کرنا پڑے گا جو حکومت و سلطنت پر فائز نہ رہے ہوں تو ذرا سوچ کر بتلانا بارہ ائمہ میں سے کتنے بچ جائیں گے خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کب قائم ہوئی؟ اور آپ نبی و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کب سے ہیں؟

(۲) شیعہ صاحبان کے علم المرتضیٰ فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کا عرصہ تیس ۳۰ سال ہے اگرچہ حکومت و سلطنت کا عرصہ ساڑھے چار سال ہے۔

ملاحظہ ہو کتاب الشافی ص۱۷۲

" بتغییر یسیر فان امیر المؤمنین کان وحدہ الخلیفۃ فی ھذہ المدۃ عندنا و یکون المراد من الحدیث استمرار الخلافۃ بعدی ۔ بخلیفۃ واحدٍ یکون مدۃ ثلاثین سنۃ و ھکذا کان ۔

لہذا واضح ہو گیا کہ روحانی منصب علیحدہ امر ہے ۔ اور حکومت و سلطنت اور امارت و خلافت علیحدہ امر ہے ۔ جس کو محروم درایت لوگوں نے گڈمڈ کر دیا ہے ۔

(۳) سب شیعہ صاحبان غصب خلافت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس وراثت کے لوٹے جانے کا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف بھی اس نظریہ کی نسبت کرتے ہوئے کہا " دتراثی نہبًا " لہذا ان میں کوئی عقل مند ہے ۔ تو بتلائیے کہ غصب کون سی شے کی گئی تھی ؟ روحانی مرتبہ یا حکومت و سلطنت ۔ نبی و رسول شہید کیا جا سکتا ہے مگر اس کی نبوت و رسالت نہ غصب کی جا سکتی ہے اور نہ لوٹی جا سکتی ہے ، جیسے حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام ، لہذا امام بھی ، شہید ہو سکتا ہے ، مگر اس کا روحانی مرتبہ و مقام سلب نہیں ہو سکتا ۔ البتہ حکومت و سلطنت ہی ایسی شے ہے جو غصب ہو سکتی ہے ۔ اور یہاں کلام بھی اسی حکومت و امارت میں ہے ۔ اور حق تصرف و اقتدار میں اس لیے علامہ صاحب کی یہ درایت بالکل بے بصیرتی پر مبنی ہے ۔

(۴) حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مصالحت کر کے روحانی منصب ان کے حوالے کیا تھا یا امور حکومت و سلطنت میں تصرف کا اختیار ۔ پہلی شق کا بطلان مسلم ہے لیکن دوسری کا تحقق بھی مسلم ہے ۔ کیوں کہ اتفاق اور اجتماع اسی وقت سامنے آیا جب دونوں اقتدار ایک شخص میں جمع ہو گئے ۔ اور شام اور عراق اور عالم اسلام میں اقتدار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے ہو گیا جس کی پیشین گوئی خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی ۔

ان ابنی ھذا سید ولعل اللہ ان یصلح بہ بین فئتین من المسلمین عظیمتین " میرا یہ بیٹا سردار ہے اور بلند ہمت ۔

امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی بدولت اہل اسلام کی دو عظیم جماعتوں میں صلح کرا دے گا ۔
ملاحظہ ہو ناسخ التواریخ جلد پنجم کتاب دوم ص۵۸ بحوالہ کشف الغمہ ۔

نگاہِ مرتضیٰ میں خلافت و امارت مثل سراب

(۵) " ا ۔۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امارت کو دنیا سے تعبیر فرمایا ۔ جو سراب کی مانند زائل ہونے والی ہے ۔ یا بادل کی طرح چھٹ جانے والی ہے ۔ اور صرف چند روزہ متاع ہے ۔ ملاحظہ ہو نہج البلاغہ ص۱۵۱ ۔

فما راعنی الا انثیال الناس علی فلان یبایعونہ فامسکت یدی (الیٰ) فخشیت ان لم انصر الاسلام واھلہ ان اری فیہ ثلمًا او ھدمًا تکون المصیبۃ بہ علیّ اعظم من فوت ولایتکم التی انما متاع ایام قلائل یزول منہا ما کان کما یزول السراب او کما یتقشع السحاب ۔

مجھے نہ گھبراہٹ میں ڈالا مگر لوگوں کے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر مجتمع و متفق ہونے نے تو میں نے پہلے پہل بیعت سے ہاتھ روکا مگر فتنہ ارتداد وغیرہ کو دیکھا تو مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ اگر میں اس وقت اسلام اور اہل اسلام کی امداد کے لیے آگے نہ بڑھوں تو دین میں رخنہ پیدا ہو جائے گا ۔ بلکہ دین کے منہدم ہونے کا امکان ہے جس کی وجہ سے مجھ پر اس اس ولایت کی نسبت زیادہ مصیبت ہوئی کیوں کہ ولایت و خلافت تو صرف چند روز کا معاملہ ہے جو سراب کی طرح زائل ہونے والی ہے یا بادل کی طرح چھٹ جانے والی الخ

نگاہِ مرتضوی میں امارت و خلافت جوتے سے بھی کم قیمت

(ب) حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:۔ تمہاری ولایت و خلافت میرے لیے میرے اس جوتے سے بھی حقیر ہے اور بے قیمت جس جوتے کی تمہاری نظر میں کوئی قیمت نہیں ہے:۔

قال عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما دخلتُ علی امیر المؤمنین علیہ السلام بذی قار وھُوَ یَخْصِفُ نعلہٗ فقال لی ما قیمۃ ھٰذا النعل فقلت لا قیمۃ لھا۔ فقال علیہ السلام واللہ لھی احبّ الیّ من امرتکم إلّا ان اقیم حقاً او ادفعَ باطلاً۔

(نہج البلاغۃ مصری جلد اول صـ۹۴)

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ آپ مقام ذی قار میں موجود تھے اور اپنا جوتا گانٹھ رہے تھے تو آپ نے مجھے فرمایا اس جوتے کی کیا قیمت ہے۔ تو میں نے عرض کیا اس جوتے کی کوئی قیمت نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ تمہاری امارت اور خلافت سے مجھے یہ جوتا زیادہ محبوب اور پیارا ہے۔ مگر یہ کہ میں اس امارت میں حق کو قائم کروں یا باطل کو دفع کروں؟

نگاہِ مرتضوی میں امارت و خلافت بکری کی ناک کی ریزش سے زیادہ حقیر

(ج) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:۔

اما والذی خلق الحبّۃ وبرء النسمۃ لولا حضور الحاضر وقیام الحجۃ بوجود الناصر وما اخذ اللہ علی العلماء ان لا یقاروا علی کظّۃ ظالم ولا سغب مظلوم لالقیت حبلھا

علی غاربھا ولسقیت آخرھا بکأس اولھا ولالفیتم دنیاکم ھٰذہ ازھد عندی من عفطۃ عنز۔ (نہج البلاغۃ صـ۴۲)

غور سے سنو! مجھے اس ذات اقدس کی قسم جس نے دانہ کو پھاڑ کر پودے اگائے۔ اور نفوس انسانیہ کو تخلیق فرمایا۔ اگر حاضرین اور بیعت کے طلبگار موجود نہ ہوتے اور انصار و اعوان کے موجود ہونے سے حجت قائم اور کامل نہ ہو جاتی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل علم سے یہ عہد نہ لیا گیا ہوتا کہ ظالم کے ظلم اور ناحق مال کھانے پر اور مظلوم کی بھوک اور شدت پر صبر نہ کریں بلکہ ظالم کو ظلم سے باز رکھیں اور مظلوم کی نصرت و امداد کریں تو میں اس امارت و خلافت کی رسی اسی کی گردن پر ڈال دیتا۔ اور اس کے آخر کو اوّل حصہ والے پیالے سے پلاتا یعنی وہی سلوک اب بھی کرتا جو پہلے کیا تھا اس کو نظر انداز کرتا اور قریب نہ جاتا۔ اور تم اس کو میرے نزدیک بکری کی ناک کی ریزش سے بھی زیادہ ناقابل رغبت پاتے اور حقیر و ذلیل۔

(د) خلافت و امارت کا نگاہِ مرتضوی میں خنزیر کی ہڈی سے حقیر ہونا،،

یہ تو پہلے ثابت ہو چکا کہ آپ نے فرمایا کہ یہ امارت اور خلافت چند روزہ متاع دنیا ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہو چکا کہ تمہاری یہ دنیوی حکومت میری نظر میں جوتے اور بکری کے ناک کی ریزش سے بھی حقیر ہے۔ اب سنیئے کہ آپ فرماتے ہیں:۔

واللہ لدنیاکم ھٰذہ اھونُ فی عینی من عراق خنزیر فی ید مجذوم (نہج البلاغۃ مع شرح حدیدی جلد نمبر ۱۹ صـ۶۷)

بخدا تمہاری یہ دنیا میری نگاہ میں خنزیر کی ہڈی سے بھی حقیر ہے۔ جو جذام اور کوڑھ کی بیماری میں مبتلا شخص کے ہاتھ میں ہو۔ یہ حقارت بیان کرنے کا ایسا اسلوب اور انداز ہے کہ شاید اس سے زیادہ بیان حقارت کے لیے کوئی دوسری تعبیر موجود ہی نہ ہو۔

(ھ) قبل ازیں تینی عبارات خلافت سے بے رغبتی اور ولایت سے عدم دلچسپی کی

ذکر کی جا چکی ہیں ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں کہیں فرمایا:۔

ما کانت لی فی الخلافۃ رغبۃ ولا فی الولایۃ اربۃ۔

کہیں فرمایا:۔ فبسطتم یدی وقبضت وغیرہ وغیرہ۔ جن سے صاف ظاہر کہ آپ عند اللہ حاصل مرتبہ کی بات نہیں کر رہے۔ بلکہ امت محمدیہ کی ولایت امور اور نظام سلطنت اور دنیوی اعزاز و امتیاز کی بات کر رہے ہیں۔

(د) اور یہی آپ سے قبیلہ بنو اسد کے آدمی نے سوال کیا تھا کہ تمہیں تمہاری قوم نے خلافت و امارت سے دور کیوں رکھا؟ تو آپ نے فرمایا:۔

کانت اثرۃ شحت علیہا نفوس قوم وسخت عنہا نفوس قوم آخرین۔

کہ خلافت و امارت ایک اعزاز و امتیاز تھا جس پر ایک قوم نے بخل اور حرص کا اظہار کیا اور دوسرے فریق نے سخاوت اور عالی ہمتی کا یعنی نہ سائل کا سوال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حاصل مرتبہ و مقام سے تمہیں کیوں محروم کیا گیا اور نہ آپ نے اس کا جواب دیا۔ سوال کا تعلق بھی اسی دنیوی منصب اور عہدہ سے تھا اور جواب کا تعلق بھی اسی سے۔ اور یہی ناسخ التواریخ کی عبارت کا مدلول و مفہوم بلکہ معنی و مقصود ہے جس کو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ذکر کیا کہ اگر اس عہدہ اور منصب میں سبھی حصہ دار تھے تو حق حقدار کو پہنچا۔ اور اگر صرف میرا حق تھا ان کا نہیں تھا تو میں نے ان کے لیے چھوڑ دیا۔ اپنی خوشی اور طیب خاطر سے اور امت مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی بہتری اور بھلائی کے لیے اس سے ہاتھ اٹھا لیا۔ یہی مضمون آپ کے اس خطبہ میں موجود ہے۔ جو آپ نے امیر معاویہ کے خط کے جواب میں لکھا اور خط لانے اور لے جانے والا ابو مسلم خولانی تھا جس کو شرح حدیدی میں نصر بن مزاحم کی کتاب صفین کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے۔ مقصودی جملہ پیش خدمت ہے۔

بل عرفت ان حقی ہو المأخوذ وقد ترکتہ لہم تجاوز اللہ عنہم۔ شرح حدیدی جلد ۱۵، ص ۷۸۔

بلکہ میں نے جانا کہ میرا حق ہی لیا گیا ہے اور تحقیق میں نے اس کو ان کیلئے چھوڑ دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرماتے۔

لہٰذا ان حقائق کی عظیم روشنی میں بھی روایتی اور درایتی سقم دور نہ ہوئے ہوں تو پھر آنکھوں کا کالا موتیا دور کرانے کی ضرورت ہے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور استحقار منصب امامت کا لزوم العیاذ باللہ

علاوہ ازیں ڈھکو صاحب کو اگر اب بھی اصرار ہے۔ کہ امامت و خلافت نبوت و رسالت کی مانند عہدہ ہے جس سے دست برداری اور منتقلی ممکن نہیں تو میں پوچھتا ہوں اگر کوئی نبی و رسول کہے العیاذ باللہ کہ نبوت و رسالت سراب ہے۔ چند روزہ عزت ہے۔ میرے جوتے سے بھی حقیر ہے۔ اور بکری کی ناک کی ریزش سے بھی زیادہ قابل نفرت ہے تو کیا یہ منصب نبوت اور رسالت کی توہین ہے یا نہیں؟ بلکہ اللہ تعالیٰ کی توہین ہے یا نہیں؟ یقیناً یہ منصب کی بھی توہین ہے۔ اور عطا کرنے والے کی بھی توہین اس لیے کسی پیغمبر نے بھی ہزار مشکلات اور مصائب کے باوجود ایسا کوئی لفظ اس منصب کے حق میں استعمال نہیں کیا اگر امامت و خلافت جو اہل سنت اور اہل تشیع میں محل نزاع ہے۔ وہ بھی ایسا ہی منصب ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے عطا کیا تو یقیناً ان کلمات میں اس منصب کی بھی توہین ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بھی جو کوئی عام مسلمان بھی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ ابو الائمہ اور معدن ولایت حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ لہٰذا روز روشن کی طرح عیاں اور بالکل مستغنی عن البیان ہو گیا۔ کہ یہاں پر جو امامت اور خلافت محل نزاع ہے۔ وہ روحانی منصب نہیں وہ جس صحابی کو ملا بلا فصل اور بلا واسطہ اور براہِ راست ملا۔ کیونکہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دستر خوان نعمت و کرم ہر ایک کے لیے عام تھا! عربی و عجمی اور حبشی و رومی اور فارسی و حجازی کی اس میں کوئی تفریق نہیں تھی بس جس نے خلوص دل سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا طوق گلے میں ڈال لیا وہی محبوب خدا بن گیا۔

قال اللہ تعالیٰ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ الآیۃ۔

بلکہ کلام صرف اور صرف دنیوی منصب اور عہدہ میں ہے جس کے تحت نفاذ اسلام اور اقامتِ دین کی ذمہ داری بندہ پر عائد ہوتی ہے۔ اگر صحیح معنوں میں ادا کرے تو یہ خلافت علیٰ منہاج النبوت ہے۔ اور برحق جیسے کہ خلافت خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اگر ادا نہ کرے تو عنداللہ مجرم اور قابل مواخذہ وعتاب اور مستحق عقاب وعذاب جیسے امراء جور کی امارت اور حکومت اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا

ضرورت امیر

إِنَّهُ لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِیرٍ بَرٍّ اَوْ فَاجِرٍ یَعْمَلُ فِی اِمْرَتِهِ المؤمن ویَسْتَمْتِعُ فیها الکافر ویبلغ اللہ فیها الاجل ویجمع به الفئ و یقاتل به العدو وتامَنُ به السبل و یُؤخَذُ به للضعیفِ من القویّ حتیّٰ یستریح برّ و یُستراحُ من فاجرٍ۔ الخ

نہج البلاغۃ مصری جلد اول ص۱۰۶

یقیناً لوگوں کے لیے امیر کی ضرورت ہے محسن اور نیک ہو یا فاجر اور گناہگار جس کے دورِ امارت میں مومن عمل صالح کر سکے اور کافر ذی چند روزہ زندگی سے نفع اندوز ہو سکے اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کی اجل مقرر تک پہنچائے اور اموال فیٔ جمع کئے جا سکیں اور دشمن کے ساتھ اسکی قیادت میں جنگ لڑی جا سکے اور راستوں کو پرامن رکھا جا سکے اور قوی و توانا سے ضعیف کا حق وصول کیا جا سکے۔ تاکہ نیک لوگ خود راحت پائیں اور فساق و فجار سے راحت حاصل کی جا سکے اور ان کے فسق و فجور سے تحفظ حاصل ہو سکے۔

اور یہی وجہ ہے کہ خود اہل تشیع نے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ امام کا انتظار کر کر کے تھک جانے کے بعد اب خود ہی امام مقرر کر لیا۔ اور اس کی قیادت میں ملک کا نظم و نسق چلا رہے ہیں اور نہ ختم ہونے والی جنگ شروع کر رکھی ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے خمینی صاحب کے لیے کونسی نص نازل فرمائی ہے اور عرش اعلیٰ سے

کونسی ندا کی گئی ہے؟ کہ بارھویں امام سے پہلے تیرھویں امام سے کام چلا لو۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ سب کچھ چشم سر سے دیکھ کر بھی یہی رٹ ہے یہ عہدہ اللہ دیتا ہے۔ یہ ناقابل استرداد ہے اور اس سے دست برداری ناممکن ہے۔ اس کا منتقل ہونا محال ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات احمقوں کی جنت میں بسنے والے ہیں:

منصب امامت ناقابل انتقال ہے تو غصب کیونکر ہو گیا؟

علامہ ڈھکو صاحب اور ان کے حکیم صاحب سے ایک سوال

ایک طرف تو یہ دعویٰ ہے کہ امامت نبوت کی مانند ایک عہدہ خداوندی ہے۔ وہ جسے عطا کر دے وہ شخص نہ اس سے دست بردار ہو سکتا ہے۔ نہ کسی دوسرے شخص کو دے سکتا ہے۔ ص۱۲۳۔ اور ظاہر ہے کہ جب وہ شخص خود کسی کو نہیں سکتا تو دوسرا اس سے لے بھی کوئی نہیں سکتا کیونکہ امام ہو کر اور کائنات پر تصرف کے اختیارات کا مالک ہو کر اس میں منتقلی اور تبدیلی نہیں کر سکتا۔ تو دوسرا شخص لے کس طرح سکتا ہے؟ لہذا غصب اور دفع حق وغیرہ کی جتنی روایات اپنی کتب سے ذکر کی ہیں وہ سب غلط ہو کر رہ جائیں گی مثلاً:۔

(۱) تقمصها دونی الاشقیان۔ الخ میرے سوا دو نے خلافت کا کرتہ پہن لیا اور انہوں نے میرے ساتھ ناحق جھگڑا کیا اور خلافت پر گمراہی سے سوار ہو گئے۔ ص۵۶ تنزیہ الامامیہ۔

(۲) ما زلتُ مدفوعاً عن حقّی منذُ قبض اللہ نبیّه علیه السلام۔

میں ہمیشہ اپنے حق سے دور رکھا گیا جب سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فوت کیا۔

(۳) اجمعوا علی منازعتی حقا کنت اولیٰ به من غیری۔

انہوں نے اجماع و اتفاق کیا اس حق کے چھیننے پر جس کا میں بنسبت دوسروں کے زیادہ حقدار تھا۔

(۴) ولا یخطُرُ ببالی انّ العرب تزعج ھٰذا الامر من بعدہٖ عَنْ اھل بیتہٖ ۔ میرے دل میں اس کا خیال تک نہیں آتا تھا کہ عرب اس امر خلافت کو آپ کے بعد ان کے اہل بیت سے منتقل کر دیں گے۔ ص۵۷

(۵) إنّی لم ازل مظلوماً منذ قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ میں ہمیشہ مظلوم رہا جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا ص۵۷

(۶) إنّهما ظلمانا حقنا۔ ص۵۹۔ ان دونوں نے ہمارا حق بطور ظلم اور جبر و قہر سے لیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

الغرض جتنی روایات اس مضمون کی ہیں یا وہ سب غلط ہیں اور یا پھر یہ دعویٰ غلط ہے کہ اس منصب میں منتقلی متصور نہیں ہو سکتی، کیونکہ جب آپ کی امامت آپ کے پاس رہی تو حق سے دور کیسے کیا گیا؟ جب آپ کے پاس رہی تو ظلم کیسے ہو گیا؟ جب امامت آپ سے چھن نہ سکی تو اس امر کا دوسری جگہ انتقال کیسے پایا گیا لہٰذا یہ فیصلہ ان دونوں صاحبان کو کرنا ہو گا کہ اسلاف شیعہ نے جھوٹ بولا اور افترا کیا یا ان اخلاف نے جھوٹ بولا اور غلط دعویٰ کیا؟۔

حضرت علی رضی اللہ پیدائشی مظلوم

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں مظلوم کا لفظ استعمال کر کے تمام صحابہ کرام کے حق میں بالعموم اور خلفاء ثلاثہ کے حق میں بالخصوص ظالم ہونے کا عقیدہ رکھ لیا جاتا ہے۔ اور پھر طرح طرح سے سب وشتم اور گالی گلوچ کا ان کو حق دار سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس لیے ذرا اس روایت پر غور فرما لیں اور اس کے بعد ایک جیسا فتویٰ تجویز کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:۔

(۱) ما زلتُ مظلوماً منذُ ولدتنی اُمّی حتّٰی إن کان عقیلاً لیصیبہٗ رمدٌ فیقولُ لا تذرونی حتّٰی تذروا علیاً فیذرونی وما بی رمدٌ ۔ (ص۲۷ کتاب علل الشرائع للصدوق)

میں اس دن سے مظلوم ہوں جس دن سے مجھے میری ماں نے جنم دیا ہے۔ میرے بھائی عقیل کی آنکھوں کو بیماری لاحق ہوتی اور وہ کہتا میری آنکھوں میں دوائی اس وقت تک نہ ڈالنا جب تک علی کی آنکھوں میں دوائی نہ ڈالو تو گھر والے میری آنکھوں میں دوائی ڈال دیتے حالانکہ مجھے کوئی بیماری نہیں ہوتی تھی۔

اب دریافت طلب یہ مسئلہ ہے کہ آپ ٹھہرے مظلوم اور والدین ٹھہرے ظالم تو شیخین اور والدین ظالم ہونے میں برابر ہو گئے لہٰذا حکم دونوں فریق کا ایک ہی ہونا چاہیے۔ ان میں تفریق روا نہیں رکھنی چاہیے۔ (بلا امتیاز و تفریق دونوں فریق پر کیا فتویٰ عائد ہوتا ہے؟

ہے کوئی شیعہ جو اپنی روایت کے مطابق اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اپنے اعتراف کے مطابق آپ کے والدین کو ظالم کہے؟ اور اگر یہاں فتویٰ اس شرم وحیاء کے تحت نہیں لگ سکتا کہ وہ حضرت علی کے والدین ہیں آپ جو کہیں سو کہیں لیکن ہم پر سکوت لازم ہے۔ تو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جن روابط اور رشتوں میں منسلک ہیں کیا ان کا بھی یہی تقاضا نہیں کہ ہم شرم وحیا سے کام لیں اور مہر بلب رہیں۔

مذہب شیعہ

از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ کے وصی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی حقیقت

اگر حجت نہ ہو تو وصیت کے بارے میں چند روایات ملاحظہ فرما لیجیے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق خلافت کی وصیت ہرگز نہیں فرمائی اس کے ثبوت کے لیے اہل تشیع کی معتبر ترین کتاب تلخیص الشافی مطبوعہ نجف اشرف مصنفہ محقق طوسی امام الطائفہ ص۳۷۲ جلد دوم

وقد روی عن ابی وائل والحکیم عن علی بن أبی طالب علیہ السلام أنه قیل له الا توصی؟ فقال ما اوصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فاوصی ولکن قال ان اراد اللہ خیراً فسیجمعھم علی خیرھم بعد نبیھم۔

یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے آخری وقت میں عرض کیا گیا کہ حضور اپنے قائم مقام کے سلیے وصیت کیوں نہیں فرماتے؟ جواب میں فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبکہ وصیت نہیں فرمائی تو میں کیسے وصیت کروں البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے بھلائی کا ارادہ فرمایا تو میرے صحابہ کا اجماع میرے بعد ان میں سے سب سے اچھے آدمی پہ ہو جائے گا۔

اسی طرح ایک اور روایت بھی ملاحظہ ہو (یہی کتاب اسی صفحہ پر)

روی صعصعۃ بن صوحان ان ابن ملجم لعنہ اللہ لما ضرب علیاً علیہ السّلام دخلنا علیہ فقلنا یا امیر المؤمنین استخلف علینا قال لا فانا دخلنا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ حین ثقل فقلنا یا رسول اللہ استخلف علینا فقال لا انی اخاف ان تتفرقوا کما تفرقت بنو اسرائیل عن ھارون ولکن ان یعلم اللہ فی قلوبکم خیرا اختار لکم۔

یعنی صعصعہ بن صوحان روایت کرتے ہیں کہ جب ابن ملجم ملعون نے حضرت علیؓ علیہ السلام کو زخمی کیا تو ہم حضرت شیر خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضور اپنا خلیفہ مقرر فرمائیں تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض جب زیادہ ہو گیا تو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہمارے لیے کوئی اپنا خلیفہ مقرر فرمائیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہرگز نہیں مجھے اس بات کا خوف ہے کہ اگر میں خلیفہ مقرر کر دوں تو تم اختلاف کرو گے جیسا کہ بنی اسرائیل نے ہارون کے متعلق اختلاف کیا تھا لیکن یہ یقین رکھو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں بہتری دیکھی تو تمہارے لیے خود ہی بہتر خلیفہ مقرر کر دے گا الخ

ایک اور روایت بھی سن لیں۔ ص۲۰۷ یہی کتاب:-

وفی الخبر المروی عن امیر المؤمنین علیہ السلام لما قیل لہ الا

توصی؟ فقال ما اوصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم فأوصی ولکن اذا اراد اللہ بالناس خیراً استجمعھم علی خیرھم کما جمعھم بعد نبیھم علی خیرھم (وکذا فی الشافی ص۱۷۱)

یعنی حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی گئی کہ حضور آپ وصیت کیوں نہیں فرماتے؟ شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت نہیں فرمائی تھی تو میں کیسے وصیت کروں لیکن جب اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے گا تو ان کو ان میں سے جو اچھا ہے اس پر اتفاق بخشے گا جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لوگوں میں سے جو اچھا تھا اسی پر اجماع اور اتفاق بخشا تھا۔

یہی روایات شیعوں کے علم الھدیٰ نے اپنی کتاب شافی مطبوعہ نجف اشرف ص۱۷۱ میں لکھیں۔

تحفۂ حسینیہ: از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی غفرلہٗ

تتمہ مبحث وصیت:-

ابوبکر احمد بن عبدالعزیز نے اپنی سند کے ساتھ ہذیل بن شرحبیل سے نقل کیا ہے کہ طلحہ بن مصرف نے ان سے دریافت کیا:-

(۱) انّ الناس یقولون إنّ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم اوصی إلی علیٍّ علیہ السلام فقال ابوبکر یتأمّر علی وصیّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ وَدّ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) انّہ وجد من رسول اللہ عھداً فخزم انفہ بہٖ (شرح حدیدی جلد ثانی ص۵۲)

لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف وصیت فرمائی تو انہوں نے کہا کیا ابوبکر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی پر امیر بن سکتے تھے؟ ابوبکر کی تو دلی خواہش تھی کہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عہد پاتے تو اس کو اپنے ناک کی نکیل بناتے اور اسی کے مطابق عمل پیرا ہوتے۔

(۲) ابوبکر احمد بن عبدالعزیز الجوہری نے ہی نقل کیا ہے کہ علی بن ہشام نے عاصم بن عمرو بن قتادہ سے نقل کیا ہے۔

لقی علی علیہ السلام عمر فقال لہٗ علی انشدک اللہ ؟ ھل استخلفک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ؟ قال لا ۔ قال فکیف تصنع انت وصاحبک ؟

قال امّا صاحبی فقد مضٰی لسبیلہ وامّا انا فساخلعھا من عنقی إلی عنقک فقال جدع اللہ انف من ینقذک منھا لا ولکن اللہ جعلنی علماً فاذا قمت فمن خالفنی ضلّ صـ ۵۸ ج ثانی ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے ان سے کہا میں تجھے اللہ تعالیٰ کے نام اقدس کا واسطہ دے کر دریافت کرتا ہوں کیا تجھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ بنایا انہوں نے کہا نہیں تو آپ نے فرمایا تم اور تمہارے یار کیا کریں گے؟ انہوں نے کہا میرے یار اور ساتھی تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو چکے۔ رہا میں تو میں ابھی خلافت کا بوجھ اپنی گردن سے اُتار کر تمہارے گلے ڈالتا ہوں تو آپ نے فرمایا:۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کی ناک کاٹے جو تمہیں اس خلافت سے دور کر دے۔ یہ مقصد نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے علم حق اور دلیل صدق بنایا ہے۔ جس وقت میں خلافت کے ساتھ قائم ہونگا تو جو شخص بھی میری مخالفت کرے گا گمراہ ہو جائے گا۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں وصیت ہوتی تو آپ کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت پر عمل ضروری تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھلا بھی اسی میں تھا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور وصیت کے برعکس عمل سے ان کو باز رکھا جاتا۔ لہذا حضرت عمر کے خلع پر آمادہ ہونے کے باوجود نہ آپ کا وصیت پر عمل کرنا اور نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عمل کرانا اس امر کی بین دلیل ہے۔ کہ خلافت سے متعلق کوئی وصیت موجود نہیں تھی ورنہ صحابہ کرام کے ساتھ ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھی حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت لازم آئے گی۔

نیز یہ جملہ کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی ناک کاٹے جو تمہیں خلافت سے دور کرے وصیت کے دعوے کو بیخ وبن سے اکھیڑ دیتا ہے۔ کیونکہ وعید اور سزا اور ناک کٹنے کا حق دار وہ شخص ہو گا جو خلاف شرع کرے نہ جو کہ شریعت اور حکم رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل کرے۔

(۳) فقال العباس لعلی علیہ السلام: لا تدخل معھم وارفع نفسک عنھم قال انی اکرہ الخلاف قال اذن ترٰی ما تکرہ ۔

(شرح حدیدی جلد اوّل صـ ۱۹۱)

حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا ان کے ساتھ شوریٰ میں شامل نہ ہونا اور اپنے آپ کو ارکان شوریٰ کی برابری اور ہمسری سے بالاتر رکھنا آپ نے کہا میں مخالفت کو ناپسند کرتا ہوں۔

حضرت عباس نے فرمایا تو پھر تجھے وہی کچھ دیکھنا پڑے گا جس کو ناپسند کرتے ہو۔ سبحان اللہ وصیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کو پسند کریں اور مخالفت فاروق کو پسند نہ کریں۔ یہ کیسی منطق اور دلیل ہے۔ لہذا اس سے صاف ظاہر کہ وصیت امامت وخلافت کا دعویٰ خلاف واقع اور خلاف حقیقت ہے۔

(۴) قطب راوندی نے روایت کیا کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے جب اہل شوریٰ کو کہا کہ اگر تم میں اختلاف پیدا ہو جائے اور تین تین میں تقسیم ہو جاؤ تو پھر ان تین کی اتباع کرنا جن میں عبدالرحمٰن بن عوف ہوں تو حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا۔

ذھب الامر منا الرجل یرید ان یکون الامر فی عثمان فقال علی علیہ السلام وانا اعلم ذلک ولکنی ادخل معھم فی الشوریٰ لانّ عمر قد اھلنی الان للخلافۃ وکان قبل ذلک یقول: إنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان النبوۃ

والامامة لا یجتمعانِ فی بیت فانا ادخل فی ذٰلک لا ظهر للناس مناقضة فعلہ لروایتہٖ (بحوالہ شرح حدیدی ص۱۸۹ جلد اول)

امرِ خلافت ہم سے چلا گیا اس شخص کا ارادہ یہ ہے کہ خلافت حضرت عثمان کے لیے حاصل ہو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں بھی اس کو جانتا ہوں مگر اس کے باوجود میں شوریٰ میں اس لیے شامل ہو رہا ہوں کہ اب عمر بن الخطاب نے (شوریٰ میں شامل کر کے) مجھے خلافت کا اہل ثابت کر دیا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے کہا کرتے تھے۔ کہ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے نبوت اور امامت ایک گھرانہ میں اکٹھی نہ ہوں گی تو میں اس لیے شوریٰ میں داخل ہو رہا ہوں تاکہ اِن کے عمل کا روایت کے خلاف ہونا لوگوں پر ظاہر کر دوں۔

قطب راوندی رئیس شیعہ کی اس روایت پر نظرِ انصاف کے ساتھ غور کرو تو وصیت کے دعوٰی کی بنیاد متزلزل بلکہ نیست و نابود ہو کر رہ جاتی ہے۔

اوّلاً اس لیے کہ وصیت پر گواہ پیش کرنا ان کی روایت کے رد میں زیادہ وقیع تھا بنسبت شوریٰ میں شامل ہو کر ان کے عمل اور ان کی روایت میں تضاد ثابت کرنے کے۔

ثانیاً محض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شوریٰ میں اِن کو نامزد کرنا ہی اِن کے عمل و روایت میں مناقضت ثابت کرنے کے لیے کافی تھا شمولیت کیوں ضروری سمجھی گئی؟

ثالثاً روایت بالفعل اجتماع کی نفی کر رہی تھی اور شوریٰ میں شامل کرنا صرف اہلیت پر دلالت کرتا تھا لہذا عمل اور روایت میں مناقضت تھی ہی نہیں۔

رابعًا

جب شامل ہونے کے باوجود خلافت نہ ملی تو آپ کی صداقت ظاہر اور

واضح ہو گئی نہ کہ مناقضت قول و فعل۔

خامسًا

کچھ بھی ہو وصیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنا اور کرانا ضروری تھا۔ نہ کہ صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمل اور روایت میں تضاد ثابت کرنا اہم تھا۔ اِن کا تضاد تو ثابت ہونے سے رہا۔ خود آپ کے قول اور عمل میں تضاد و تخالف ثابت ہو گیا۔ کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خلافت و امامت کی وصیت تھی تو شوریٰ میں شمولیت والا عمل اس کے خلاف ہے۔ اور اگر یہ عمل صحیح ہے تو دعویٰ وصیت اس سے غلط ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور عمل کا ثبوت تو شیعہ و سُنّی کے اجماع سے ثابت ہے۔ بلکہ بعد میں بیعت بھی لہذا وصیت کا دعویٰ باطل ہو کر رہ گیا۔ اور تضاد ثابت کرنے والے خود تضاد کا شکار ہو کر اپنے ذہنی دعویٰ کی اہمیت بلکہ صداقت کو ختم کر بیٹھے لہذا شیعہ صاحبان کا دعویٰ وصیت یقیناً حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے عمل نے باطل کر دیا ہے اور اس کی صحت اور صداقت بالکل غلط ہو کر رہ گئی ہے۔

(۵) ابن قتیبہ نے حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ سے منقول بعض غرائب کلام کی شرح کی۔ من جملہ غرائب کلام کے آپ کا شوریٰ کے دن یہ ارشاد بھی ہے:۔

إنَّ لنا حقًّا اِن نعطه ناخذہ و إن نمنعهُ نرکب اعجاز الابل و إن طال السری، لو عهد الینا رسول الله صلی الله علیه وسلم عهدًا لجالدنا علیه حتی نموت او قال لنا قولاً لانفذنا قوله علی رغمنا۔ لن یسرعُ احدٌ قبلی إلیٰ صلة رحم ودعوة حق والامرُ الیك یا ابن عوف علیٰ صدق النیة وجهد النصح واستغفر الله لی ولکم۔

بحوالہ شرح حدیدی ص۱۳۴ جلد نمبر ۱۹۔ وکذا ص۱۹۵ جلد اول شرح ابن

ابی الحدید الشیعی المعتزلی۔

ہمارے لیے حق ہے اگر ہمیں دیا جائے تو اس کو لے لیں گے اور اگر اس سے روک دیئے گئے تو اونٹوں کے پچھلے حصے پر سوار رہیں گے اگرچہ مسافت طویل ہی کیوں نہ ہو گئی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف عہد فرماتے تو ہم اس کے نفاذ پر جرأت وجلادت سے کام لیتے حتیٰ کہ جان دے دیتے یا ہمیں کوئی فرمان دیتے تو ہم آپ کے فرمان کو نافذ کرتے۔ اپنی خواہش کے برعکس یا اپنی مشقت وتکلیف کے باوجود۔ مجھ سے کوئی شخص صلہ رحمی اور دعوت حق میں سبقت نہیں لے جا سکتا اے عبدالرحمٰن بن عوف! اب معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ صدق نیت اور پوری ہمدردی وخلوص کی بنا پر اس کو سرانجام دو!

اس خطبے میں وضاحت فرمادی کہ ہمارے حق میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی عہد وپیمان نہیں ہے۔ اور نہ ہی ایسا کوئی فرمان ورنہ ہم اس کو ہر حال میں پورا کرتے۔ خواہ جان ہی کیوں نہ دینی پڑتی۔

اور جو حق آپ نے اپنا سمجھا وہ قرابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے۔ نہ کہ وصیت کی وجہ سے اس لیے فرمایا اگر مل جائے تو ٹھیک نہ ملے تو ہر مشقت اور تکلیف برداشت کرنے کو تیار ہیں کیونکہ اونٹ کے پچھلے حصے پر سوار کو زیادہ مشقت اٹھانا پڑتی ہے۔ اور یا یہ مقصد ہے کہ ہم دوسروں کے پیچھے چلنے اور ان کی اتباع کرنے پر تیار رہیں۔ جیسے اونٹ کے پچھلے حصے پر سوار اگلے حصے پر سوار ہونے والے شخص کے تابع ہوتا ہے۔ اس سے بھی وصیت اور وجوب حق کی نفی ہو جاتی ہے۔

وصیّت ووراثت والی روایات کا معنی ومفہوم

الغرض وصیّت اور عہد کی نفی پر بہت سی روایات شاہد صادق ہیں اور جن روایات میں وصیت اور وراثت کا ذکر ہے۔ ان کا وہ معنی نہیں جو شیعہ

صاحبان نے مُراد لیا ہے جیسے کہ ابن ابی الحدید معتزلی شیعی نے تصریح کی ہے۔

قال رضی اللہ عنہ و فیہم الوصیۃ والوراثۃ امّا الوصیۃ فلاریب عندنا ان علیّاً علیہ السلام کان وصّی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وان خَالَفَ فی ذٰلِکَ مَنْ هُوَ منسوبٌ عندنا۔ إلی العناد ولسنا نعنی بالوصیۃ النص والخلافۃ ولکنّ اموراً اخریٰ لعلها اذا لمحت کانت أشرف واجل واما الوراثۃ فالامامیۃ یحملونها علی میراث المال والخلافۃ و نحنُ نحملها علی وراثۃ العلم۔

(صفحہ ۱۴۰ شرح حدیدی جلد اوّل)

آپ نے فرمایا۔ اہل بیت میں وصیت ہے اور ان میں وراثت ہے۔ رہی وصیّت تو اس میں ہمارے نزدیک ریب وتردد کی مجال نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی تھے۔ اگرچہ اس میں ان لوگوں نے مخالفت کی جو ہمارے نزدیک عناد کی طرف منسوب ہیں لیکن وصیّت سے یہ مقصود نہیں کہ آپ کے حق میں نصّ خلافت وارد ہے۔ بلکہ دوسرے امور ہیں کہ عین ممکن ہے کہ اگر وہ ظاہر ہوں اور ان کا انکشاف ہو جائے۔ تو وہ خلافت سے بھی بلند وبالا معلوم ہوں۔ اور وراثت کے لفظ سے امامیہ میراثِ مال اور خلافت مراد لیتے ہیں لیکن ہم اس کو وراثتِ علم پر منطبق کرتے ہیں۔

نصّ صریح وقطعی اور وصیتہ وغیرہ کا انکار

ابن ابی الحدید نے سقیفہ بنو ساعدہ میں صحابہ کرام علیہم الرضوان اور مہاجرین وانصار میں ہونے والے مناظرہ ومباحثہ پر مشتمل بہت سی روایات ذکر کرنے کے بعد کہا:

واعْلَمْ انّ الاخبار والآثار فی ھٰذا الباب کثیرۃٌ جدّاً

ومن تاملها وانصف علم انه لم يكن هناك نص صريح و مقطوع به لا تختلجه الشكوك ولا تتطرق اليه الاحتمالات كما تزعم الامامية (الى) ولاريب ان المنصف اذا سمع ما جرى لهم بعد وفاة رسول الله صلى الله عليه وسلم يعلم قطعاً انه لم يكن هذا النص ولكن قد سبق الى النفوس و العقول انه قد كان هناك تعريض وتلويح و كناية وقول غير صريح وحكم غير مبتوت ولعله يصده عن التصريح بذلك امر يعلمه ومصلحة يراعيها او وتوقف مع اذن الله تعالى فى ذلك۔

(شرح حدیدی ص۵۹، جلد ثانی)

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین رکھئے کہ آثار و اخبار باب خلافت اور عہد و پیمان کے عدم ثبوت اور تحقیق و اثبات میں بہت زیادہ ہیں اور جو شخص ان میں غور و تامل کرے۔ اور انصاف سے کام لے اسے قطعی اور حتمی علم اس بات کا ہو جاتا ہے کہ اس ضمن میں کوئی نص صریح اور قطعی موجود نہیں جس میں شکوک و شبہات اور احتمالات کی گنجائش نہ ہو جیسے کہ امامیہ فرقہ کا دعویٰ ہے۔

ہر منصف آدمی جب وہ واقعات اور معاملات سنتا ہے جو وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیش آئے۔ تو اسے یہ یقین ہو جاتا ہے۔ کہ امر خلافت میں کوئی نص موجود نہیں تھی نہ ابو بکر صدیق کے لیے اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے لیکن نفوس و عقول اصحاب میں یہ امر سبقت لے جا چکا تھا کہ کچھ اشارات اور تلویحات موجود ہیں اور تعریضات و کنایات اور غیر صریح اور غیر یقینی احکام ہیں جن سے بعض حضرات نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر استدلال کیا اور بعض حضرات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو راجح

اور مقدم خیال کیا۔

اور عین ممکن ہے کہ کوئی امر مانع نگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسا ہو جس کے تحت آپ نے تصریح نہ فرمائی ہو اور کوئی مصلحت ایسی پیش نظر ہو جس نے تصریح کی رخصت نہ دی ہو۔ یا آپ اللہ تعالیٰ کے اذن کے منتظر رہے ہوں۔ اور اس کا اذن وارد نہ ہوا۔

ابوجعفر نقیب البصرہ شیعی کا نظریہ

اس ضمن میں رئیس اہل التشیع نقیب الاشراف لاہل البصرۃ کا اعتراف بھی ملاحظہ فرماتے جائیں:۔

قلت قرأت، هذا الخبر على ابى جعفر يحيىٰ بن محمد العلوى الحسينى۔ المعروف بابن ابى زيد نقيب البصرة رحمة الله تعالى فى سنة عشر وستمائة من كتاب السقيفة لاحمد بن عبد العزيز لاحمد بن عبد العزيز الجوهرى قال لقد صدقت فراسة الحباب (الى) فما زال يقرّر لابن عمه قاعدة الامر بعده حفظاً لدمه ودماء اهل بيته فانهم اذا كانوا ولاة الامر كانت دماء هم اقرب إلى الصيانة والعصمة مما اذا كانوا سوقة تحت يدوال من غيرهم فلم يساعده القضاء والقدر و كان من الامر ما كان ثم افضى إلى ذريته فيما بعد الى ما قد علمت۔

(شرح حدیدی جلد ثانی ص۵۳)

شارح نے کہا میں نے سقیفہ میں انصار و مہاجرین کی باہمی گفتگو پر مشتمل روایت احمد بن عبد العزیز جوہری کی کتاب سے ابو جعفر یحییٰ بن محمد علوی حسینی المعروف

ابن ابی زید نقیب بصرہ پر پڑھی (جس میں حباب بن منذر کا یہ قول منقول ہے منا امیر و منکم امیر ایک امیر ہم سے ہو اور ایک تم میں سے ہمیں بخدا تم پر کوئی حسد نہیں ہے۔ لیکن ہمیں یہ اندیشہ ہے۔ کہ تمہارے بعد امر خلافت کے وارث وہ لوگ ہو جائیں جن کی اولاد۔ بھائی اور باپ دادے ہمارے ہاتھوں قتل ہوئے۔ تو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، نے کہا اگر ایسا وقت آیا تو میں ان کی مخالفت کروں گا۔ اگر مجھ میں ہمت و طاقت ہوئی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا ہم امراء ہیں تو تم وزراء ہو اور امر خلافت ہمارے درمیان مشترک ہو گا۔ تو انصار نے بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، کی بیعت کی اور سب سے پہلے نعمان بن بشیر کے والد حضرت بشیر بن سعد انصاری نے بیعت کی۔ تو ابوجعفر نقیب نے کہا۔ کہ حباب بن المنذر کی رائے درست نکلی کیونکہ جس امر کا انہیں خوف تھا حرّہ کے موقعہ پر وہ پیش آگیا۔ اور انصار سے مشرکین بدر کے قتل کا بدلہ وصول کیا گیا۔ پھر انہوں نے کہا کہ یہی خوف رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھا۔ کہ اگر میرے اہل بیت بطور رعایا رہے تو ان کے لیے سخت خطرات ہیں لہٰذا ہمیشہ اپنے چچا زاد بھائی (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے لیے امارت و حکومت کا راستہ ہموار کرتے رہے تاکہ ان کا اور جملہ اہل بیت کا خون اور جانیں محفوظ رہیں لیکن قضاء و قدر نے آپکا ساتھ نہ دیا۔ اور جو ہونا تھا ہو گیا۔ اور بعد ازاں آپ کی ذریت کا معاملہ جس انجام کو پہنچا۔ وہ تجھے معلوم ہی ہے۔ الغرض ابوجعفر نقیب بصرہ کے اس بیان سے واضح ہو گیا کہ گو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قلبی خواہش یہی تھی کہ حکومت کی باگ ڈور حضرت علی رضی اللہ عنہ، اور آپ کی اولاد کے ہاتھ میں ہو لیکن قضاء و قدر نے اور اللہ تعالیٰ کے ازلی فیصلہ نے آپ کا ساتھ نہ دیا۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ اور یہی ابن ابی الحدید نے کہا۔ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اذنِ باری تعالیٰ کے منتظر تھے۔ لیکن اذن نہ ملا۔ اس لئے آپ نے اعلان نہ فرمایا۔

اِذن نہ ملنے کی حکمت و مصلحت

جب شیعہ صاحبان اِس حقیقت کے مدعی ہیں اور اسے عین ایمان سمجھتے ہیں کہ قوم قریش کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قلبی کدورت تھی اور کینہ و عداوت اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِن کی خلافت کا بھی اعلان فرما دیتے اور ان کے لیے وصیت بھی فرما دیتے تو گویا اپنے ہاتھوں اسلام کے تعمیر شدہ قلعہ میں دراڑیں ڈالنے اور اسے مسمار کرنے کی بنیاد فراہم کرتے اور وہ ہستی مقدس جو لوگوں کو حکمت کا درس دینے کے لیے مبعوث ہوئی تھی وہ خود خلافِ حکمت اور مصلحت کیونکر کرتی۔ اور جس اسلام کی نشو و نما کے لیے سینکڑوں جانوں کو قربان کیا تھا۔ اور اِن کے خون سے اِس مبارک درخت کی آبیاری کی تھی اِس کی جڑوں پر خود ہی کلہاڑا رکھ دیتے صرف اپنی اولاد اور اپنے چچا زاد کی ممکنہ تکلیف کے پیش نظر۔

لہٰذا یا شیعہ صاحبان کو اِس نظریہ سے دست بردار ہونا چاہئے کہ اِن میں رحماء بینھم والی صفت موجود نہیں تھی اور آپس میں بغض و کینہ موجود تھا اور علی الخصوص علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، جیسے محسنِ اسلام کے ساتھ اور یا اس دعویٰ سے دست بردار ہونا چاہیے کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہٗ اور اِن کی اولاد کے حق میں خلافت کی وصیت اور اس کا اعلان فرمایا۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں بہرحال جمع نہیں ہو سکتیں اور شیعہ صاحبان کو یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت کا دعویٰ کرنے اور اِس کے لیے طاقت استعمال کرنے سے صرف اِس لیے گریز کیا کہ اسلام کو نقصان نہ پہنچے۔ تو جو حکمت عملی حضرت علی رضی اللہ عنہ، کو سمجھ آگئی وہ خود سید الانبیاء، اور امام الحکماء اور معلّمِ حکمت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں سمجھ میں نہ آئی؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کے لیے اختلاف ونزاع سے دور رہنے کی وصیت

بلکہ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے۔ کہ خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو وصیت فرمائی تھی کہ خلافت کے لیے نزاع واختلاف سے دور رہنا جیسے کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے کلام سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہٗ نے فرمایا:۔

أذا المیثاق فی عنقی لغیری رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ان خلفاء کی اطاعت کا حکم دیا تھا لہٰذا میرے لیے اس کا خلاف ممکن نہیں ہے۔ اور اسی طرح آپ نے فرمایا۔ مجتنی الثمرۃ قبل اینا عھا کالزارع بأرض غیرہ کہ پھل پکنے سے پہلے توڑنا اور چننا ایسے ہے جیسے دوسرے کی زمین میں بیج بونا اور کھیتی باڑی کرنا یعنی بلا اذن واجازت جس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ ابھی میری خلافت کا وقت ہی نہیں آیا۔ تو میں قبل از وقت وصیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے برعکس کس طرح امامت وخلافت کا دعویٰ کروں؟ تفصیل عنقریب آتی ہے؟ لہٰذا واضح ہوگیا کہ سرور انبیاء علیہم التحیۃ والثناء نے اسلام کا تحفظ اور اس کی نشو ونما اور ترویج واشاعت کو مقدم سمجھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ثانوی حیثیت دی۔

مقتضائے حکمت کیا تھا؟

یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کے ہاتھوں دیگر قبائل کے لوگ قتل ہوئے تھے تو آپ کے قبیلہ کی عظیم شخصیات بھی دوسرے لوگوں کے ہاتھوں شہادت کے درجہ تک پہنچی تھیں۔ مثلاً حضرت ابو عبیدہ بن الحارث

حضرت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہما اور دیگر حضرات لہٰذا دو طرفہ امکان کینہ کشی اور انتقام کا موجود تھا۔ تو لامحالہ حکمت ومصلحت کا تقاضا ہی یہ تھا کہ بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کے حق میں وصیت کرنے کے ایسے حضرات کو آگے لایا جاتا جن پر ہر فریق مطمئن ہو سکتا تھا اور وہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی ذاتِ مقدسہ تھیں اس لیے ان کے دور میں اسلام کو وہ ترقی نصیب ہوئی اور ترویج واشاعت کہ تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے اور اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ اختلاف ونزاع سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور وصیت کے ذریعے پابند کر دیا۔ گویا اگر وصیت آپ کی طرف سے ہے۔ تو ان حضرات کا ساتھ دینے کی اور موافقت ومعاونت کی نہ کہ خود ان کے خلیفہ بلافصل ہونے کی۔

علاوہ ازیں اس طریقۂ خلافت سے جس کو شیعہ صاحبان نے اختراع کیا ہے۔ خود ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی موردِ طعن وتشنیع بن سکتی تھی کہ آپ کا مقصد اپنے اقربا اور اپنی اولاد کی شخصی حکومت قائم کرنا تھا اور نبوت و رسالت کو اس کے حصول کے لیے ذریعہ و واسطہ بنایا جس سے خود آپ کی نبوت ورسالت کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہو سکتے تھے۔ لہٰذا یہ طریقہ سراسر خلافِ مصلحت اور منافی حکمت تھا۔ اس لیے آپ سے اس کا صادر ہونا ناممکن تھا۔

انوکھی وصیت

دنیا میں جس بادشاہ اور حکمران نے کسی کو اپنا نائب اور جانشین نامزد کیا اور ولی عہد بنایا کسی کے متعلق اختلاف پیدا نہ ہوا صرف حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہٗ کی ولی عہدی اور وصیت خلافت ہی ہے جو اہل اسلام کے لیے معمہ بن کر رہ گئی۔ اور اس میں شکوک وشبہات پیدا ہو گئے۔ کیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل دوسرا ہر حکم آپ بیان فرما سکتے تھے۔ صرف ولی اور خلیفہ بلافصل مقرر کرنے کا طریقہ طے نہ فرما سکے اور اس راہ میں حائل موانع اور شکوک وشبہات کو ختم نہ فرما سکے

نعوذ باللہ من ذالک ۔ اور یہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات تک محدود نہیں اولاد میں اس قدر اختلاف پیدا ہوئے کہ جس سے خود شیعہ صاحبان دو درجن فرقوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے جس سے صاف ظاہر کہ وصیت علانیہ کسی کے حق میں نہیں پائی گئی۔ ورنہ یہ اختلافات رونما نہ ہوتے اور علی الخصوص انصار کبھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ چھوڑتے کیونکہ ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات مقدسہ سے سے کوئی رنج اور تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ کہ ذاتی کینہ و بغض اور عناد کی وجہ سے ان کو اس مخالفت پہ کمربستہ سمجھ لیا جائے۔ اور اپنی دنیوی وجاہت انہوں نے ویسے مدنظر نہیں رکھی تھی۔ ورنہ ابو بکر صدیق کی بجائے اپنے لیے خلافت کو مختص کر لیتے۔ اور ایسا کم عقل کون ہوسکتا ہے۔ کہ دین اور دنیا دونوں کو خیرباد کہہ دے۔ بلکہ کسی کی دنیا کے لیے اپنے دین کو قربان کر دے۔ اور بالخصوص وہ فریق جس کی شان ایثار اور قربانی اور خدمات اسلام و اہل اسلام کا قرآن گواہ ہو اور اگر وصیت بطور رازداری اور اسرار پائی گئی ہے تو امت اس کی پابند ہی نہیں لہذا محل نزاع میں اس کو پیش کرنے کا کوئی جواز نہیں ۔

تنزیہہ الامامیہ — از علامہ ڈھکو صاحب

۱- حضرت شیخ الاسلام کی ذکر کردہ وصیت کے متعلق روایات کے جواب میں ڈھکو صاحب نے سارا زور اس پہ صرف کیا ہے کہ یہ صرف اہل سنت کی روایات ہیں اور جناب علم الہدی نے ان کا رد کرنے کے لیے ان کو نقل کیا ہے جبکہ شیعہ کتب وصیت خلافت سے متعلق روایات سے بھری پڑی ہیں لہذا ان کے مقابل ان روایات کے پیش کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے شیعان حیدر کرار تمام تر مذہبی اختلاف کے باوجود ان روایات کے منکر ہیں اور ان کا رد کرتے ہیں جن میں وصیت خلافت کا انکار ہے۔

۲- جن روایات کے ساتھ ہم استدلال کرتے ہیں وہ متفق علیہ ہیں ان کے روایت کرنے والے اور تصحیح کرنے والے خود اہل سنت بھی ہیں جس طرح شیعہ جبکہ معارضہ میں پیش کی جانے والی روایات صرف اہل سنت کی نقل کردہ ہیں نہ کہ شیعہ کی۔ یا ان کے راوی متعصب اور منحرف ہیں لہذا مقام معارضہ میں ان کے پیش کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

تحفہ حسینیہ — از ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی عفی لہ

جہاں تک وصیت کے ثبوت اور تحقق کا معاملہ ہے۔ تو اس کے متعلق آپ ابو جعفر نقیب بصرہ اور ابن ابی الحدید شیعی کی رائے ملاحظہ کر چکے اول الذکر اس کے قائل کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی خیال مبارک یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کریں۔ اور وصیت فرمادیں لیکن قضا و قدر نے آپ کی موافقت نہ کی اور خداوند تعالی کی قضا، اور اس کی تقدیر کا تسلیم کرنا ہر مومن پہ لازم ہے۔ چہ جائیکہ نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جو تسلیم و رضا کا درس دینے کے لیے مبعوث ہوئے۔ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا رضینا عن اللہ قضاءہ وسلمنا للہ امرہ۔ کہ ہم اللہ تعالی کی قضا پر راضی ہوئے۔ اور اللہ تعالی کے امر کو تسلیم کیا اور ابن ابی الحدید صاحب نے ببانگ دہل کہا ہے کہ کوئی ایسی نص صریح اور حتمی دلیل خلافت و وصیت کی موجود نہیں ہے۔ لہذا یہ دعوی علم الہدی صاحب کا کہ تمام تر شیعہ نص خلافت اور وصیت کے قائل ہیں خواہ امامیہ خواہ غیر امامیہ قطعاً غلط ہے۔

نیز جن کتب سے اس ضمن میں حوالے پیش کئے جاتے ہیں وہ سُنی ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ حقائق نگاری اور واقعات کی نقل بلا تعصب مذہب کے پیش کیے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تمام تر شیعہ صاحبان کو ان کتب کا سہارا لینا پڑتا ہے خود واقدی کے خطبات قطع و برید کر کے صاحب نہج البلاغہ نے ذکر کئے ہیں لہذا ان کتب کے وہ حوالہ جات جو مفید مطلب ہوں ان کو اس پہ مذہب کی بنیاد رکھ لینا اور دوسروں کو غلط اور موضوع روایات کہہ دینا اور ان کے راویوں کو متعصب اور اہل بیت سے منحرف قرار

دے دینا ایسی نارواتفریق ہے اور دھاندلی جس کا دنیائے علم وتحقیق اور جہان عدل وانصاف میں کوئی جواز نہیں ہے۔

پھر یہ بات بھی خیال شریف میں رہے کہ احمد بن عبدالعزیز جوہری وغیرہ جن کے حوالے ابن ابی الحدید نے نقل کئے ہیں وہ اہل سنت ہی نہیں چہ جائیکہ ان کو اس مذہبی تعصب میں مبتلا سمجھا جائے۔ اور فضائل اہل بیت کرام سے اہل سنت کی کتابیں بھری پڑی ہیں، لہٰذا ان کے حق میں کس قسم کی بدظنی اور طعن وتشنیع کا مطلب ہی کیا ہوسکتا ہے؟ آخر دوسری روایات جن کو متفق علیہ قرار دیا گیا ہے وہ انہیں اہل السنت کی نہیں؟ اور ان کے راوی ان کے اہل مذہب نہیں ہیں۔

مزید برآں ہم دلائل عقل ونقل سے یہ ثابت کرچکے ہیں کہ وصیت خلافت کی کوئی روایت موجود ہی نہیں اور اگر ہے تو اس کا وہ معنی ہی نہیں ہے۔ بلکہ محض وصیت کا لفظ دیکھ کر مطمئن ہوجانے والی بات ہے حالانکہ نزاع نہ لفظ وصیت میں ہے اور نہ لفظ وراثت میں بلکہ اس کے مخصوص معنی میں یوں تو ساری امت وصی ہے۔ اور وارث بھی۔ آپ نے ان کو وصیتیں بھی فرمائیں۔ اور علوم نبویہ اور آپ کی شریعت مقدسہ ان کے پاس ہے لہٰذا وصی بھی ہوئے اور وارث بھی العلماء ورثۃ الانبیاء اور خود شیعی کتب سے ہم نے بھی ثابت کیا ہے اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے بھی جیسے کہ آپ کی درج کردہ اگلی روایات سے ظاہر ہے۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو وصیت فرمائی تو وہ یہی تھی کہ ان حضرات صحابہ اور خلفاء کے ساتھ اختلاف نہ کرنا اور ان کی موافقت ومعاونت کرنا۔

اس تعارض کو دور کیجئے

اگر ایک طرف یہ روایات ہوں اور دوسری طرف خلافت کی وصیت ہو تو ان میں کھلا اور واضح تعارض ہے جس کو دور کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ آپ خلیفہ ہیں تو دوسرے باغی اور فاسق لہٰذا ان کے ساتھ مقابلہ ضروری ہے اور کم از کم عدم تعاون اور اگر موافقت اور تعاون اور ترک نزاع وترک مناقشت

ضروری ہے۔ تو پھر خلافت کی وصیت غلط ہے۔ مثلاً کسی کو قاضی مقرر کر دیا جائے لیکن قضاء اور فیصلہ کرنے سے روک دیا جائے۔ یا دوسرے قاضی کی متابعت کا پابند کر دیا جائے۔ تو کون کہے گا کہ واقعی اس کو قاضی بنا دیا گیا ہے۔ الغرض جو کچھ ثابت ہوسکے گا۔ وہ صرف اس قدر ہوگا کہ اگر تمہیں خلیفہ بنا دیا جائے۔ تو بہتر ہے۔ کیونکہ تمہارے اندر اہلیت وصلاحیت موجود ہے اور اس میں اہل سنت کو کیا اختلاف ہے جو آپ کو چوتھا برحق خلیفہ تسلیم کرتے ہیں اور جس میں اختلاف ہے وہ ان روایات کی موجودگی میں ثابت نہیں ہوسکتا کیونکہ خلیفے تو آپ ہوں اور اتباع دوسرے حضرات کی آپ پر لازم ہو۔ اذا المیثاق فی عنقی لغیری یہ بالکل غیر معقول بات ہے جو عام عقل مند آدمی بھی نہیں کرسکتا چہ جائیکہ سرچشمۂ عقل ودانش ومعدن علم وحکمت۔

لہٰذا نہ تواتر وصیت کا دعویٰ درست ہے اور نہ انکار وصیت کے راویوں پر یہ الزام ہی درست ہے۔ اور نہ ہی تمام تر شیعہ کے متعلق یہ دعویٰ ہی درست ہے۔ کہ وہ انکار وصیت کی روایات کو رد کرتے ہیں لہٰذا صاحب شافی کا یہ واویلا قطعاً غلط ہے۔

متفق علیہ پر عمل اور مختلف فیہ کا ترک کوئی صحیح اصل اور قاعدہ نہیں

رہا صاحب شافی کا یہ دعویٰ کہ ہماری طرف سے جو روایات قاضی القضاۃ نے مغنی میں نقل کی ہیں، ان میں فریقین کا اتفاق ہے اور دوسری روایات میں یا اہل سنت متفرد ہیں یا ان کے راوی متعصب اور منحرف ہیں یہ طرز استدلال ہر جگہ کام نہیں دے سکتی اور نہ ہی اس میں کوئی معقولیت ہے۔ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہنا بالکل بجا ہے۔ کہ یہ طرز یہود ونصاریٰ سے ماخوذ ہے اور ان کا عطیہ ہے۔ کیونکہ اہل اسلام کے مقابلہ میں ان کا بھی انداز یہی ہوتا ہے۔ کہ نبوت عیسیٰ وموسیٰ علیہما السلام متفق علیہ ہے اور نبوت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم مختلف فیہ علیٰ ہذا القیاس فضائل وکمالات موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام متفق علیہ ہیں اور فضائل وکمالات محمدیہ مختلف فیہ لہٰذا عقل کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف فیہ کو چھوڑ کر

متفق علیہ پر عمل کیا جائے۔ اور اس کے تقاضا کو پورا کیا جائے اگر علم الہدیٰ صاحب کا یہ نسخہ ہدایت تیر بہدف ہے۔ تو یہود و نصاریٰ کا کیوں نہیں اور وہ غلط ہے۔ تو یہ صحیح کیسے ہو سکتا ہے؟

اور یہی استدلال خوارج و نواصب کا بھی ہے۔ کہ شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت ان کے دور میں متفق علیہ تھی اور کوئی نزاع و خلاف ان کے ساتھ خلافت کے معاملہ میں نہیں تھا۔ اگر ہوا تو برادرانہ شکر رنجی کے طور پر تھا۔ کہ ہمیں شریک مشورہ کیوں نہ کیا گیا۔ یا ان کی خلافت کے بعد غلط فہمیاں پیدا کر کے لوگوں کو بہکایا اور ورغلایا گیا نہ کہ ان کے دور میں جبکہ حضرت علی رضہ کے ساتھ ان کے دور خلافت میں نزاع و خلاف رہا اور جنگ و جدال اور قتل و قتال تک نوبت پہنچی اور بالآخر تحکیم نے آپ کی خلافت کو مخدوش کر کے ہی رکھ دیا لہٰذا عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف فیہ کو چھوڑ کر متفق علیہ کو اختیار کیا جائے۔ تو کیا یہ استدلال درست ہے اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اس طرز استدلال کو نص خلافت و وصیت میں کیوں حرف آخر سمجھ لیا گیا ہے۔

مختلف فیہ روایات کیوں اور کیسے؟

ہم قبل ازیں اس طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ غالی شیعوں نے اپنا دین و ایمان اس کو سمجھ رکھا ہے کہ فضائل اصحاب اور ان کی حقانیت خلافت کی مقدور بھر کوئی روایت ذکر نہیں کرنی اور کر بھی دی تو ایسی تحریف اور تغییر و تبدیل کے بعد اور قطع و برید کے بعد کہ اصل معنی و مفہوم بدل جائے یا حقیقی مقصد کسی کو سمجھ نہ آسکے۔

نہج البلاغۃ جیسی کتاب میں شریف رضی جیسے آدمی نے جو خطبات مرتضویہ پر خود قینچی چلائی اور عبارات میں قطع و برید کی اور جو ذکر کیں ان کی ترتیب میں ایسی گڑبڑ کی کہ ابن میثم جیسا معقول شیعی شارح بھی چلا اٹھا اور اسے کہنا پڑا "ہذا خبطٌ عجیب من السید"، یہ عجیب خبط اور تغییر و تبدیلی ہے اور اصل عبارت جو شیخین کی

فضیلت پر دلالت کرتی تھی۔

انّ مکانہما فی الاسلام لعظیم وان المصاب بہما لجرحٌ فی الاسلام شدید الخ یعنی شیخین ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا مقام اسلام میں بہت بلند ہے اور ان کی وفات اسلام کے لیے ناقابل تلافی نقصان اور گہرا زخم ہے اس کو بالکل چھوڑ دیا اور کہیں چار و ناچار حضرت ابوبکر یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی فضیلت جو زبان مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے صادر ہوئی ذکر کر دی مگر نام مبارک کی جگہ فلاں کا لفظ لکھ دیا وغیرہ وغیرہ کیا ان حرکات اور تلبیسات کے بعد بھی ان روایات کا جو شیعہ صاحبان نے خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی تنقیص شان اور ان کی خلافت پر تنقید و تنقیص میں ذکر کی ہیں کوئی وزن ہو سکتا ہے؟

مفید مدعیٰ قوت دلیل ہے:

لہٰذا یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ مدعیٰ کا اثبات قوت دلیل اور اسکی واقعیت پر ہے نہ کہ متفق علیہ ہونے پر اور جو روایات فضائل اصحاب اور ان کی صحت خلافت میں پیش کی گئی ہیں اور وہ عبارات جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کو خلافت الٰہیہ اور منصوص من اللہ قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کا ایفا "وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنہم فی الارض الآیۃ"، قرار دیا اس کے بعد وصیت اور نص خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں ثابت کرنا ان کو جھٹلانے کے مترادف ہے اور ان پر بہتان اور افترا پردازی کے برابر بلکہ اس صورت میں ان کے حق میں قرآن کی غلط تفسیر کرنے اور خدا تعالے پر بہتان باندھنے اور افترا کرنے کا اعتقاد لازم آئے گا لہٰذا ایسی روایات قطعاً غلط ہیں اور ناقابل اعتبار اور یا ان کا وہ معنی نہیں جو شیعہ مراد لیتے ہیں شیعہ کے وصیت و وراثت کے الفاظ سے استدلال کی بالکل وہی صورت ہے جیسے کہ کوئی

کے العیاذ باللہ کہ اللہ تعالےٰ کے لیے میراث ثابت ہے کما قال اللہ تعالیٰ لِلّٰہِ میراث السموات والارض، وغیر ذلک جیسے کہ انسانوں کے لیے ثابت ہوتی ہے لہٰذا دونوں وراثت کے معاملے میں برابر ہیں نعوذ باللہ حالانکہ لفظاً وراثت ثابت ہے نہ وہ معنی و مقصد جو انسانوں میں ثبوتِ وراثت کے لیے ہوا کرتا ہے فتأمل حق التامل!

علامہ ڈھکو صاحب کا جھوٹا دعویٰ

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے وصیت کے متعلق پہلی دو روایات تلخیص الشافی کے حوالے سے نقل فرمائیں جن کے متعلق ڈھکو صاحب فرماتے ہیں۔ سو قارئین پر مخفی نہ رہے کہ ان روایات کے نقل کرنے میں مؤلف نے کئی قسم کی خیانت کی ہے۔

(ا) یہ بے سروپا روایات کتاب الشافی کے ص۱۷۱ پر ہیں نہ کہ تلخیص کے ص۳۴۷ پر جس کا مؤلف نے حوالہ دیا ہے۔

(ب) پہلی روایت جو باسناد حکیم اور ابووائل مروی ہے۔ وہ وہاں ان الفاظ کے ساتھ موجود نہیں بلکہ اس کے الفاظ وہ ہیں جو مؤلف کی نقل کردہ تیسری روایت کے ہیں۔ اور اس عنوان کی کوئی روایت ان صفحات پر نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کے پاس اصل کتاب موجود نہیں ہے۔ یا اسے دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی بلکہ مناظرہ کے کسی رسالہ یا کتاب سے نقل کرنے پہ اکتفاء کیا ہے۔

الجواب وھو الملھم للصدق والصواب

علامہ موصوف نے خود ہی تلخیص الشافی کے مذکورہ صفحات دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور الزام حضرت شیخ الاسلام رحؒ کو دے رہے ہیں گویا ؎

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ڈھکو صاحب ذرا تکلیف فرما کر تلخیص کو دوبارہ دیکھیں یہ دونوں روایات جن میں سے پہلی ابووائل اور حکیم سے مروی ہے اور دوسری صعصعہ بن صوحان سے وہ دونوں تلخیص کے ص۳۴۷ پر موجود ہیں اور بالکل انہی الفاظ کے ساتھ جو رسالہ مذمت شیعہ میں موجود ہیں اور تیسری روایت کا صفحہ ۱۷۱ درج کیا گیا ہے اور شافی کا حوالہ دیا گیا ہے الغرض پہلی دونوں روایات شافی اور تلخیص دونوں میں موجود ہیں، اگرچہ پہلی روایت کے الفاظ میں اختلاف ہے مگر مفہوم ایک ہے اور اس لیے اس کو بحوالہ شافی الگ کر کے ذکر کیا گیا ہے اور چوتھی روایت صرف شافی کے صفحہ ۱۷۱ کے حوالے سے مذکور ہے۔ لہٰذا ان حوالہ جات میں تو کوئی خیانت نہیں صرف ڈھکو صاحب کی کاہلی اور سستی اور تغافل نے اس جھوٹے دعوے کو جنم دیا ہے۔ حوالہ پھر نوٹ فرمالیں تلخیص الشافی ص۳۴۷ سطر نمبر ۶ سے وہ عبارت اس طرح شروع ہوتی ہے۔

فإن قيل كيفَ تستدلون على انّهُ استخلَفَهُ بعد الوفاة بما ذكرتموهُ وقد روى عن ابى وائل والحكيم۔ اور سطر نمبر ۱ پر روایات کی عبارت ختم کر کے طوسی صاحب اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ ان روایات میں وصیت نہ کرنے اور خلیفہ نہ بنانے کی تصریح موجود ہے تو تم اپنی ذکر کردہ روایات سے بعد وصال نبوی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے خلیفہ بنائے جانے پر استدلال کیوں کر کر سکتے ہو تو اس کا پہلا جواب طوسی صاحب نے یہ دیا۔

قيلَ لهُ اوّل ما نقول انّ هٰذين الخبرين وما جَرىٰ مجراهما اخبار آحاد لا تعارض ما هو مقطوع على صحته۔ الخ

کہ یہ دونوں اور اس مضمون کی دوسری روایات اخبارِ آحاد کے قبیل سے ہیں اور وہ ہماری نقل کردہ روایات کے معارض نہیں ہو سکتیں دوسرا جواب عقلی بحث و تمحیص کے بعد یہ ذکر کیا ہے۔ اللّٰهُمَّ إلّا أن يكون قال ذلك على وجه التقية والاستصلاح۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ابووائل اور حکیم کی روایت میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضیلت کا جو ذکر حضرت علی نے کیا وہ تقیہ کے طور پر ہوا اور رعیت کی موافقت حاصل کرنے اور ان کی دلجوئی کے لیے کیونکہ ان میں سے جمہور شیخین کی خلافت

حقہ کے قائل تھے) اور اسی ضمن میں طوسی صاحب نے شافی میں منقول روایت کی عبارت بھی درج کی ہے جو سطر نمبر ۱۲ سے اس طرح شروع ہوتی ہے۔

علیٰ أن فی الخبر المروی عن امیر المؤمنین لما قیل لہ الا توصی فقال ما اوصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاوصی ولکن اذا اراد اللہ بالناس خیرا استجمعھم علیٰ خیرھم کما جمعھم بعد نبیھم علیٰ خیرھم۔

تو اب واضح ہو گیا کہ تینوں روایات تلخیص شافی میں موجود ہیں اور ان کے جوابات وغیرہ کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ مگر ڈھکو صاحب ہیں کہ آنکھیں بند کر کے کہے جا رہے ہیں تلخیص میں ان کا ذکر ہی نہیں۔ اور پھر ان الفاظ کے ساتھ مذکور نہیں حالانکہ دونوں طرح کے الفاظ سے علیحدہ علیحدہ تلخیص میں مذکور ہیں دنیائے علم و تحقیق میں اس قسم کے دجل و فریب اور مکاری و عیاری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جس قسم کی عیاری و مکاری اور دجل و فریب کاری کا علامہ ڈھکو صاحب مظاہرہ کرتے ہیں۔

معارضہ میں پیش کی گئی روایات وصیت کی حقیقت اور صاحب شافی اور صاحب تلخیص شافی کا رد

صاحب شافی علم الہدیٰ اور صاحب تلخیص طوسی صاحب نے ابو وائل اور حکیم اور صعصعہ بن صوحان سے منقول روایات کے معارضہ میں دو روایات اپنی کتب سے نقل کی ہیں جن کو ان مذکورہ روایات کا معارض قرار دے کر بزعم خویش اہل سنت کو چاروں شانے چت کر دیا ہے۔ اہل انصاف اور ارباب عقل و دانش ان کا مطالعہ فرماویں اور غور کریں کہ محل نزاع و اختلاف سے انہیں کوئی واسطہ بھی ہے۔ اور کوئی صاحب علم و دانش ایسی روایات کو معارضہ میں پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟

روایت اولیٰ:۔ فمنھا ما رواہ ابو الجارود عن ابی جعفر ان امیر

المؤمنین لما حضرہ الذی حضر قال لابنہ الحسن ادن منی حتی اسر الیک ما اسر الیّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وائتمنک علی ما ائتمننی علیہ۔

کتاب الشافی ص۱۷۳ و تلخیص الشافی ص۳۷۲ سطر نمبر ۲۱، ۲۲۔

ابو الجارود نے امام ابو جعفر محمد بن باقر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب امیر المومنین کو حاضر ہوا جو حاضر ہوا تو آپ نے اپنے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو فرمایا مجھ سے قریب ہو تا کہ میں تمہیں بطور راز وہ چیز بتلاؤں جو مجھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور راز بتلائی تھی اور تمہیں اس چیز کا امین بناؤں جس کا مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امین بنایا تھا۔

روایت ثانیہ:۔

روی حماد بن عیسیٰ عن عمر بن شمر عن جابر عن ابی جعفر قال اوصی امیر المومنین الی الحسن واشھد علی وصیتہ الحسین ومحمدا وجمیع ولدہ ورؤساء شیعتہ واھل بیتہ ثم دفع الیہ الکتاب والسلاح فی خبر طویل یتضمن الامر بالوصیۃ فی واحد بعد واحد الی ابی جعفر محمد بن علی بن الحسین بن علی۔

شافی ص۱۷۳ و تلخیص ص۳۷۲

حماد بن عیسیٰ نے عمر بن شمر سے اس نے جابر سے اور اس نے امام ابو جعفر سے روایت کی ہے۔ کہ امیر المومنین نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو وصیت کی اور اس پر حضرت حسین کو، محمد بن حنفیہ اور تمام اولاد، رؤسا شیعہ اور اہل بیت کو گواہ بنایا پھر کتاب وصیت ان کے حوالے فرمائی اور ہتھیار بھی اور یہ روایت بہت طویل ہے جس میں امام ابو جعفر محمد باقر تک یکے بعد دیگرے ائمہ کے لیے وصیت کا ذکر ہے۔

تنبیہ:۔ یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ اہل تشیع کے دونوں چوٹی کے عالم اور

مناظر و متکلم جن دونوں روایات کو منتخب کر کے ذکر کر رہے ہیں ان سے زیادہ واضح اور صریح اور قوی روایت دوسری کوئی نہیں ہوگی ورنہ اقوی اور صریح ترین کو چھوڑ کر ضعیف اور غیر صریح کا انتخاب بے جواز اور قطعاً غیر موزون ہے۔ آئیے اب ان کی حقیقت پر غور کریں اور ان کے محل نزاع سے بے جوڑ اور بے تعلق ہوتے کا مشاہدہ کریں۔

(۱) پہلی روایت میں امام حسن کو قریب بلا کر بطور راز اور اسرار کچھ القاء کرنے کا ذکر ہے۔ اور امین اسرار بنانے کا حالانکہ کلام وصیت خلافت میں ہے۔ اور اس کا علانیہ پایا جانا ضروری تھا نہ کہ کان میں خلافت کی وصیت کرنا عقل و خرد کے ہوتے ہوئے اور بقائمی ہوش و حواس کوئی شخص ان روایات کے معارض اور مخالف اس روایت کو سمجھ سکتا ہے۔ اور اس کی موجودگی میں ان کے ساتھ استدلال ساقط ہو سکتا ہے۔ جو کچھ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ وہ صدور الاحرار قبور الاسرار کے مطابق راز ہائے درون سینہ کا آپ پر انکشاف ہے۔ اور اس کو سینہ میں محفوظ رکھنے کی وصیت اس کا ہمیں انکار نہیں بلکہ سب سلاسل حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرتبط ہیں بالخصوص قادریہ و چشتیہ اور وہ سب اولیاء اللہ جو اکابرین سلاسل مذکورہ ہیں وہ ان اسرار کے امین ہیں بقدر الاستعداد اور جس میں ہماری بحث ہے وہ یہ ہے کہ اعلان کر دیا جاتا لوگو میں نے اپنے لخت جگر حضرت حسن کو تمہارے لیے اپنے بعد امیر اور خلیفہ و امام مقرر کیا ہے۔ وہ یہاں سے ثابت نہیں لہٰذا یہ روایت یہاں ذکر کرنا اور اسے معارض سمجھنا قطعاً غلط ہے۔

ابوالجارود کا حال

(۲) اس روایت کا راوی ابوالجارود ہے۔ آئیے اس کے متعلق بھی امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اور امام ابو جعفر محمد باقر رضی اللہ عنہ کے ارشادات ملاحظہ فرمائیں، تاکہ راوی کی شان معلوم ہونے کے بعد اس روایت کی حقیقت واضح ہو جائے۔

(ا) اس کو امام ابو جعفر محمد باقر رضی اللہ عنہ نے سرحوب کا لقب عطا فرمایا۔ اور خود ہی فرمایا سرحوب کہتے ہیں شیطان کو۔ سماه بذلك ابوجعفر و ذكر ان سرحوبا اسم الشيطان۔

(ب) امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے کہ ایک لونڈی گزری جس کے پاس کوڑے کرکٹ کی ٹوکری تھی جس کو اس نے الٹ دیا۔ تو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:۔ ان الله قد قلب قلب ابي الجارود كما قلبت هذه الجارية هذا القمقم فما ذنبي۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ابوالجارود کے دل کو اس طرح الٹ دیا ہے۔ جس طرح کہ اس لونڈی نے اس ٹوکری کو تو اب میرا کیا گناہ و قصور ہے۔

(ج) امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ما فعل ابوالجارود اما والله لايموت الا تائها" ابوالجارود کا کیا حال ہے۔ بخدا وہ حیران و سرگردان ہو کر مر جاوے گا۔

(د) ابو بصیر کہتا ہے۔ امام ابو عبداللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے ابوالجارود و کثیر النواء اور سالم بن ابی حفصہ کا ذکر کیا پھر فرمایا: کذابون مکذبون کفار علیهم لعنة الله۔ یہ کذاب ہیں اور بہت زیادہ تکذیب کرنے والے اور جھٹلانے والے ہیں اور بڑے کافر ہیں اللہ تعالیٰ کی ان پر لعنت ہو۔ ملاحظہ فرمائی آپ نے اس راوی کی شان جو جلیل الشان ائمہ کرام کی زبانی منقول ہے۔ اس کے بعد کونسا مومن اور محب اہل بیت اس کی روایات پر اعتبار کر سکتا ہے (اختیار رجال کشی ص ۱۹۹، ۲۰۰) ہاں شیطان اور کافر کو ضرور اس کی روایات پر اعتماد کرنا چاہیئے کیونکہ ان کے ساتھ ان کو مناسبت تامہ ہے۔

دوسری روایت:۔

(۱) دوسری روایت میں اگرچہ وصیت کا لفظ بھی ہے۔ اور چند حضرات کا اس وصیت پر گواہ ہونا ذکر کیا گیا ہے لیکن محل نزاع سے اس کو بھی تعلق نہیں کیونکہ اعلان عام ہونا چاہیئے تھا۔ اب آپ دار آخرت کی طرف کوچ فرمانے والے ہیں۔ اور شہر کوفہ میں کونسا آپ کا محب ہوگا جو حاضر خدمت نہ ہوگا۔ اس موقعہ پر آپ کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت و نیابت اور امارت و حکومت و ولی عہدی اور جانشینی کا اعلان کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن صرف وصیت کرنے کا ذکر ہے۔ اور اس کی کتابت کا اور اس پر گواہ قائم کرنے کا۔ لہٰذا اس سے لفظ وصیت تو ثابت

ہوگا مگر وہ معنی وصیت کا جس میں ہمارا کلام ہے۔ اور جس کی نفی پر ابووائل و حکیم اور صعصعہ بن صوحان کی روایات دلالت کرتی ہیں ان کا اثبات اس روایت میں کہاں ہے۔

(۲) اس میں امام حسین، امام زین العابدین اور امام محمد باقر رضی اللہ عنہم کی فرداً فرداً وصیت کا بھی ذکر ہے۔ ذرا آنکھیں کھول کر اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر تاریخ عالم اور صفحاتِ ایام کا مشاہدہ کر کے بتلاؤ ان میں سے کوئی حاکم اسلام اور خلیفہ و حکمران ہوا ہے۔ جب نہیں اور یقیناً نہیں تو اس وصیت کو محل نزاع سے کیا تعلق ہوا۔ اور اگر آپ کو ان کے انجام کی خبر نہیں تھی اور محض گمان کی بنا پر ان کے لیے وصیت خلافت فرمادی تو آپ کے علم ماکان ومایکون کا انتفاء ثابت ہو گیا۔ جو مذہب شیعہ کے سراسر خلاف ہے۔

(۳) اس روایت کا دار و مدار جابر جعفی پر ہے۔ اور وہ ایک پُر اسرار شخصیت ہے جس کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں ہو سکتا۔

جابر جعفی راوی کا حال

(ا) زرارہ کہتا ہے میں نے امام ابوعبداللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے احادیث جابر کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:۔ ما رائیتہ عند ابی قط الامرۃ واحدۃ وما دخل علی قط۔ وہ میرے پاس تو کبھی آیا نہیں اور میں نے اسکو اپنے والد گرامی کے پاس صرف ایک دفعہ دیکھا۔

(ب) ذریح محاربی کہتا ہے کہ میں نے جابر جعفی اور اس کی روایات کے متعلق امام ابوعبداللہ سے دریافت کیا۔ دو مرتبہ آپ نے جواب ہی نہ دیا۔ اور تیسری مرتبہ عرض کرنے پر فرمایا: دع ذکر جابر فان السفلۃ اذا سمعوا باحادیثہ شنعوا او قال اذاعوا۔ جابر کے ذکر کو چھوڑو کم عقل لوگ جب اس کی احادیث سنیں گے تو طعن و تشنیع کریں گے یا فرمایا کہ ان کو شائع کریں گے۔ یا فرمایا کہ ان کو شائع کریں گے۔ اور عام (اور وہ اس قابل نہیں کہ انہیں شائع اور عام کیا جائے)

(ج) عمر بن شمر نے جابر سے نقل کیا ہے کہ مجھے امام محمد باقر رضی اللہ عنہ نے ایک کتاب عطا فرمائی۔ اور فرمایا:۔

"ان انت حدثت بہ حتی تھلک بنو امیۃ فعلیک لعنتی ولعنۃ آبائی ان انت کتمت منہ شیئاً بعد ھلاک بنی امیۃ فعلیک لعنتی ولعنۃ آبائی ثم دفع الی کتاباً آخر ثم قال وھاک ھذا فان حدثت بشیٔ منہ ابداً فعلیک لعنتی و لعنۃ آبائی۔"

اگر تو اس کتاب کے مندرجات کو بنو امیہ کی ہلاکت سے پہلے بیان کر دے یا ان کی ہلاکت کے بعد ان میں سے کسی کو چھپائے تو تجھ پر میری لعنت اور میرے آباء کی طرف سے لعنت ہے۔ اور دوسری کتاب دے کر فرمایا کہ اس کو لے اور اس میں سے کچھ بھی کبھی بیان کیا تو تجھ پر میری لعنت اور میرے آباء کی لعنت۔

(د) ایک روایت میں ہے کہ جابر کہتا ہے میرے پاس پچاس ہزار روایات ہیں جن کے بیان کرنے کے قابل میں کسی کو نہیں سمجھتا اور دوسری میں ہے کہ ستر ہزار روایات ایسی ہیں (جب کہ امام محمد باقر سے ایک ملاقات اور امام جعفر صادق سے ایک بھی نہیں تو اتنا ذخیرہ کس سے حاصل کیا؟ معلوم ہوتا ہے خانہ زاد ہیں اور جعلی و وضعی۔ الغرض جابر کہتا ہے۔ میں نے امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا تم نے اپنے اسرار مجھ پر منکشف کر کے مجھ پر بہت زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے۔ نہ میں عوام کے سامنے ان کو بیان کر سکتا ہوں اور نہ ہی ضبط کر سکتا ہوں بلکہ سینہ میں سمندر کی امواج کا سا تلاطم پیدا ہو جاتا ہے تو آپ نے فرمایا:۔

یا جابر اذا کان ذلک فاخرج الی الجبال فاحفر حفیرۃ ودل رأسک فیھا ثم قل حدثنی محمد بن علی بکذا وکذا۔ (رجال کشی ص ۱۲۹ تا ص ۱۷۱۔)

اے جابر جب یہ صورت حال پیش آئے تو پہاڑوں کی طرف نکل جایا کر اور گڑھا کھود کر سر اس میں ڈال کر کہہ دیا کر مجھے محمد بن علی نے ایسے ایسے بیان کیا۔

اس کے علاوہ بھی بہت کچھ اس کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے یہ حقیقت واضح ہوسکتی ہے۔ کہ ایک ہی ملاقات میں اتنی روایات کا حصول اور اس قدر محرم راز بن جانا اور کتابہائے علوم اسرار کا وارث بن جانا اور پھر ان کے متعلق لعنت کے ساتھ افشاء وکتمان کی تاکید اور جوش سینہ کو دور کرنے کے لیے گڑھوں میں سر دے کر روایات بیان کرنے کی وصیت وغیرہ۔ اور پھر شانِ کتمان یہ کہ لوگ اِن روایات کو سُن کر امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ، سے اِن کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے دوڑے آرہے ہیں الغرض اس قسم کی پُراسرار شخصیت کی روایت کسی عقلمند اور طبع سلیم کے مالک کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ یہ ہے حالت اِن دونوں روایتوں کے متن کی جس کو محل نزاع وخلافت سے تعلق ہی نہیں۔ اور یہ ہے حالت اِن کے راویوں کی۔ جب منتخب ترین روایات کا یہ حال ہے۔ تو دوسری روایات کا کیا حال ہوگا؟ ؎

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

(۵) علاوہ ازیں دونوں جگہ روایت کی سند حضرت امام ابو جعفر رضی اللہ عنہ، پر ختم ہوجاتی ہے۔ جب کہ آپ یقیناً وصیت کے وقت موجود نہیں تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت ہجرت کے چالیسویں سال ہوئی اور آپ کی ولادت واقعہ کربلا کے کافی عرصہ بعد ہے۔ تو لامحالہ اس روایت میں انقطاع ہے۔ اور درمیان سے راوی متروک ہے۔ ائمہ اسلام کی صداقت اپنی جگہ لیکن اصول روایت کے لحاظ سے مجال بحث موجود ہے۔

صعصعہ بن صوحان: علماء شیعہ کی نقل کردہ روایات کے راویوں کا حال ملاحظہ کر لیا۔ لیکن اس کے برعکس حضرت شیخ الاسلام کی نقل کردہ روایات کا حال ملاحظہ کریں صعصعہ بن صوحان حضرت علی رضی اللہ عنہ، کے مخلص خدام اور جانثاروں میں سے ہے۔ اور موقعہ پہ موجود علیٰ ہذا القیاس دیگر روایات میں بھی یہ انقطاع نہیں ہے۔

نیز حضرت صعصعہ کے متعلق ذرا اپنے اصحاب جرح وتعدیل کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) قال ابو عبد اللہ علیہ السلام ما کان مع امیر المؤمنین من یعرف حقہٗ الا صعصعۃ بن صوحان واصحابہٗ۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ، نے فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کوئی بھی ایسا شخص نہیں تھا جو آپ کے حقوق کی صحیح معرفت رکھتا ہو۔ ماسوا صعصعہ بن صوحان اور ان کے ساتھیوں کے مزید تفصیل کے لیے رجال کشی ص ۶۳ تا ۶۵۔ مطالعہ کریں۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ثناء ان کے حق میں اور ان کا امیر معاویہ کے دورِ خلافت میں منبر پہ کھڑے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ، کی مدح وثنا کرنا اور امیر معاویہ کی شان میں تغلیظ وتشدید سے کام لینا بصراحت مذکور ہے لہٰذا وہ روایات ایسے لوگوں کی روایات کے مقابل کیوں کر قابل قبول ہوسکتی ہیں جو صاحب شافی اور صاحب تلخیص شافی وصیت کے اثبات میں پیش کر رہے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ، کے وصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی حقیقت

مذہب شیعہ

از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

روایت نمبر ۴:۔

اس وصیت کے سلسلے میں ایک اور روایت بھی ملاحظہ فرمالیں۔

والمروی عن العباس انہٗ خاطب امیر المومنین فی مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یسال عن القائم بالامر بعدہٗ وانہٗ امتنعَ من ذٰلِکَ خوفاً ان یصرفہٗ عن اہل بیتہ فلا یعود الیہم ابداً۔ (کتاب الشافی ص ۱۷)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ، نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت مرض میں کہا کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کریں کہ حضور علیہ السلام کے بعد کون امیر المؤمنین ہوگا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ، نے اس

خوف اور اندیشہ کے تحت نہ پوچھا۔ کہ کہیں حضور علیہ السلام اپنے اہل بیت سے امر خلافت کو دور نہ کر دیں۔ اور امیر نہ بنائیں تو اس تصریح کی وجہ سے پھر کبھی بھی اہل بیت میں خلافت نہیں آسکے گی۔ وکذا فی تلخیص الشافی ص۳۵۲ سطر نمبر ۱۶۔

ملاحظہ فرما لیا آپ نے یہ ہیں وصیت اور خلافت بلا فصل کے متعلق نصوص قطعیہ جن کی تکذیب کو نہ ختم ہونے والی آذانوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ رسالہ مذہب شیعہ ص۲۷

تتمہ مبحث وصیت — تحفہ حسینیہ — از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی عفی عنہ

اس مضمون و مفہوم کی روایات ابوبکر احمد بن عبدالعزیز جوہری کے حوالہ سے ابن ابی الحدید معتزلی شیعی نے شرح حدیدی میں نقل کی ہیں عبارات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) عن عبد الله بن عباس قال خرج علي عليه السلام على الناس من عند رسول الله صلى الله عليه وسلم في مرضه فقال له الناس كيف اصبح رسول الله صلى الله عليه وسلم يا ابا حسن قال اصبح بحمد الله بارئا قال فاخذ العباس بيد علي ثم قال يا علي انت عبد العصا بعد ثلاث احلف لقد رأيت الموت في وجهه واني لاعرف الموت في وجوه بني عبد المطلب فانطلق الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فاذكر له هذا الامر ان كان فينا اعلمنا وان كان في غيرنا اوصى بنا فقال لا افعل والله ان منعنا اليوم لا يؤتيناه الناس بعده قال فتوفي رسول الله صلى الله عليه وسلم ذالك اليوم۔

(شرح حدیدی ص۵۱ ج۲)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے نکلے آپ کے مرض وصال میں تو لوگوں نے کہا اے ابوالحسن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کس حال میں صبح کی ہے؟ تو آپ نے کہا

بحمد اللہ آپ تندرست ہیں تو حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اے علی تم تین دن کے بعد ماتحت اور محکوم ہو جاؤ گے (اور تمہارا یہ ذریعہ قوت و توانائی ختم ہو جائے گا) میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں نے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس میں موت کے آثار دیکھ لیے ہیں اور میں موت کے قریب بنو عبد المطلب کے چہروں کی حالت سے ان کی موت کو پہچان لیتا ہوں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر امر خلافت و حکومت کا تذکرہ کرو۔ اگر ہم میں ہے تو اس سے ہمیں باخبر فرما دیں۔ اور جتلائیں اور ہمارے علاوہ دوسرے لوگوں میں ہے تو انہیں ہمارے متعلق وصیت فرما دیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ میں اس طرح نہیں کرتا بخدا اگر آج آپ نے ہمیں حکومت و خلافت سے منع فرمایا۔ تو آپ کے بعد لوگ ہمیں کبھی بھی حکومت و خلافت نہیں دیں گے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اسی روز سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے۔ کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے درمیان کچھ بعد اور دوری پیدا ہو چکی تھی اسی دوران آپ کی ملاقات حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے ہوئی تو انہیں کہا اگر تمہیں اپنے چچے کے آخری دیدار کا شوق ہو تو ان کے پاس حاضری دیجئے۔ اور میرے خیال میں اس کے بعد تمہیں ان کی ملاقات کا موقعہ نہیں مل سکے گا حضرت علی رضی اللہ عنہ میری بات سن کر غمگین ہو گئے۔ اور مجھے کہا آگے چلو اور میرے لیے اذن طلب کرو۔ میں آگے چلا اور ان کے لیے اذن طلب کیا۔ اذن ملنے پر آپ اندر داخل ہوئے۔ اور دونوں نے ایک دوسرے سے معانقہ کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ اور پاؤں چومنے لگے اور کہا۔ اے چچا جان مجھ سے راضی ہو جاؤ؟ اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہو تو انہوں نے فرمایا میں راضی ہو گیا۔

ثم قال يا ابن اخي اشرت عليك باشياء ثلاثة فلم تقبل ورئيت في عاقبتها ما كرهت وها انا اشير عليك براي رابع فان

قبلتهٔ و الّا نالك مانالك ممّا قبلهٔ قال ماذاك یاعمّ؟ قال
اشرتُ علیك فی مرض رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم
ان تسأله فان کان الامر فینا اعطاناه وان کان فی غیرنا
اوصیٰ بنا فقلت اخشی ان منعناه لا یعطیناه احدٌ
بعده فمضت تلك۔ الخ

(شرح حدیدی جلد ثانی ص۴۸)

آپ نے فرمایا۔ اے میرے بھتیجے میں نے پہلے تین امور کے متعلق تمہیں مشورہ دیا مگر تم نے قبول نہ کیا مگر ان کا انجام وہ ہوا جو تمہیں پسند نہیں تھا۔ اور غور سے سنو اب میں چوتھا مشورہ دینے لگا ہوں۔ اور اگر اس کو قبول کرلو تو بہتر ورنہ جو نتیجہ پہلے نکلا اسی طرح اس کا نتیجہ بھی برآمد ہوگا تو آپ نے کہا اے میرے چچا وہ کیا مشورے تھے۔

آپ نے فرمایا۔ میں نے مرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ آپ سے امر خلافت کے متعلق دریافت کرلیں۔ اگر ہم میں ہے تو ہمیں عطا فرمائیں اور اگر دوسروں میں ہے تو انہیں ہمارے متعلق وصیت فرمائیں تو تم نے کہا۔ مجھے خوف واندیشہ ہے کہ اگر آپ ہم سے اس امر کو روک لیں تو آپ کے بعد ہمیں کوئی نہیں دے گا۔ چنانچہ وہ وقت گزر گیا اور موقعہ ہاتھ سے نکل گیا۔

نوٹ:۔ دوسرا مشورہ رسول محتشم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے بعد بیعت لینے سے متعلق اور اپنی طرف سے اور ابوسفیان کی طرف سے پیش کش کا تذکرہ جو بعد میں ذکر کیا جائے گا اور تیسرا مشورہ شوریٰ میں شامل نہ ہونے سے متعلق تھا جس کے متعلق آپ نے فرمایا۔ مجھے اختلاف پسند نہیں اس کا تذکرہ گزر چکا۔ اور چوتھا مشورہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملات میں دخل سے گریز کا تھا اور ینبع میں اپنے اموال اور مزرع میں جانے کا تاکہ ان کے قتل کی ذمہ داری تم پر عائد نہ ہو۔ ورنہ خلافت مل گئی تو بھی اس میں تمہارے لیے کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہوگی چنانچہ انجام کار آپ نے فرمایا۔

واللّٰه لکان عمّی کان ینظرُ من وراء ستر رقیق و اللّٰه
مانلتُ من هذا الامر شیئًا الّا بعد شرٍّ لاخیر فیه۔

بخدا گویا میرے چچا باریک پردہ کے پیچھے سے اس کا انجام کار دیکھ رہے تھے۔ بخدا میں نے امر خلافت سے جو کچھ حاصل کیا وہ شر وفساد کے بعد حاصل کیا جس میں کوئی خیر اور بہتری نہیں ہے۔

الغرض جوہری اور ابن ابی الحدید کی نقل کردہ ان دونوں روایات سے بھی واضح ہوگیا کہ آپ کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حالات سے قبل خبردار کیا تھا اور انجام کار سے بھی آگاہ کردیا تھا۔ کہ اگر تمہارا حق ہے۔ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا اعلان کروالو۔ اور عطا کرنے کا مطالبہ کرو۔ ورنہ محکومی اور ماتحتی تمہارا مقدر بن جائے گی۔ جس سے صاف ظاہر اور مہر نیمروز کی طرح عیاں ہیں کہ آپ کے لیے نہ وصیت خلافت موجود تھی اور نہ کوئی نص خلافت اور غدیر خم کے واقعہ پر ابھی تیسرا مہینہ بھی نہیں گزرا تھا۔ اگر اس میں اعلان خلافت ہوچکا تھا۔ اور مبارک وسلامت کے مژدے اور پیغام بھی دیئے جاچکے تھے۔ تو اب اس موقعہ پر اس امر کا فیصلہ کرانے کے لیے آپ نے کیوں زور دیا۔ اور اپنے وصال تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس مشورہ کو قبول نہ کرنے پر اپنے ارمان واحساسات کا اظہار کیوں کیا جب کہ آپ کا وصال سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے اٹھارہ سال بعد خلافت امیر عثمان رضی اللہ عنہ کے چھٹے سال میں ہوا۔ گویا اس طویل عرصہ میں بھی آپ پر نص خلافت اور وصیت خلافت کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔ اور آپ اپنے اسی موقف پر قائم تھے۔ کہ تمہیں دریافت کرکے حقیقت حال معلوم کرلینی چاہئے تھی جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اتنے قریبی اس وصیت سے بے خبر ہیں تو دوسرے مہاجرین وانصار حضرات کو کیا خبر ہوسکتی تھی؟

لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ نہ بنانے پر انہیں ارتد الناس الّا ثلاثة کے فتویٰ سے جو نوازا گیا ہے کہ سبھی العیاذ باللہ مرتد ہوگئے ہیں ماسوا تین کے تو اس

ظلم اور زیادتی اور اندھیر نگری کا کیا جواز ہے۔ نصوص کتاب اللہ اور ارشادات مرتضوی کے برعکس محض اس جرم میں ان پہ مرتد ہونے کا فتویٰ لگ رہا ہے تو وہ جرم ثابت بھی تو ہو۔ جب اہل بیت کو ہی معلوم نہیں خود صاحب امر اور خلافت کے حقدار کو بھی اپنا استحقاق پتہ نہیں تو ابوالجارود اور جابر جعفی جیسے کذابوں پہ یہ وحی کیسے نازل ہو گئی۔

ابوجعفر صاحب طوسی صاحب تلخیص کا جواب

(۱) صاحب تلخیص نے پہلا جواب اس روایت کا یہ دیا ہے کہ یہ خبر واحد ہے اور خبر واحد نصوص اور احادیث متواترہ کی مخالفت پر مشتمل نہ ہو تو بھی اس کے متعلق ہمارا مذہب معروف و مشہور ہے۔ یعنی باب عقائد میں ان کا اعتبار نہیں ہے چہ جائیکہ وہ خبر واحد جو ان ادلّہ اور احادیث متواترہ کی مخالفت پر مشتمل ہو لہٰذا جس شخص نے اس روایت کو نص خلافت کے دفاع اور معارضہ پیش کیا ہے، وہ امر بعید کا مرتکب ہے۔ فمن جعل هذا الخبر المروی عن العباس رحمة الله عليه دافعاً لما يذهب اليه الشيعة من النص الذی قدمناه للتاعلی صحته وبينا استغاضة الرواية به فقد ابعد۔ اور دوسرا جواب یہ دیا۔

(۲) على ان الخبر اذا سلمناه وصحت الرواية به غير دافع للنص ولا منافٍ له لان سواله رحمة الله عليه يحتمل ان يكون عن حصول الامر لهم وثبوتهم فی ايديهم لا عن استحقاقه ووجوبه۔ علاوہ ازیں اس روایت کو اگر تسلیم کریں اور اس روایت کی صحت مان لی جائے تو اس سے ہماری نص خلافت کا دفاع نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اس کے منافی ہے کیونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اس مشورہ کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ آپ سے اس امر کے حصول کا مطالبہ کریں۔ اور اپنے ہاتھوں میں ثبوت اور استقرار کے متعلق دریافت

کریں۔ نہ کہ استحقاق اور وجوب کے متعلق اس کی مثال دے کر توضیح کرتے ہوئے کہا مثلاً ایک شخص کسی کے لیے ایک عطیہ کا اعلان کرتا ہے۔ اور اسے علیحدہ کر کے رکھ بھی دیتا ہے پھر اس کا وقت وفات قریب آجاتا ہے۔ تو عطیہ والے کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ دریافت کرے۔

اتری ما منحتنيه وافردتنی به يحصل لی من بعدك ويصير الی يدی ام يحال بينی وبينه ويمنع من وصوله الی ورثتك ولا يكون هذا السوال دليلاً علی شكه فی الاستحقاق بل يكون دالاً علی شكه فی حصول الشیٔ الموهوب له ومصيره الی قبضته والذی يبين صحة تاويلنا وبطلان ما توهموها قول النبی صلی الله عليه وسلم فی جواب العباس علی ما وردت به الرواية انكم المقهورون وفی رواية انكم المظلومون۔ ص ۳۵۲۔

یہ تو بتلائیے کہ جو عطیہ تم نے مجھے دیا ہے اور مجھے اس کے ساتھ ممتاز فرمایا ہے۔ کیا تمہارے بعد مجھے حاصل ہو گا؟ اور میرے ہاتھ آئے گا؟ یا میرے اور اس کے درمیان رکاوٹ کھڑی کر دی جائے گی اور تمہارے ورثاء اس کو مجھ تک پہنچنے سے روک دیں گے جس سے قطعاً یہ لازم نہیں آتا کہ اسے اپنے استحقاق میں شک ہے۔ بلکہ یہ سوال صرف اس امر میں شک پہ دلالت کرتا ہے کہ آیا موہوب چیز حاصل ہو گی یا نہیں اور میرے قبضہ میں آئے گی یا نہیں؟

ہماری اس تاویل کی دلیل صحت اور مانعین کے توہم کا بطلان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ سے اس امر کے حصول کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔ تم مقہور و مغلوب ہو گے اور دوسری روایت میں ہے۔ کہ تم مظلوم ہو گے!

طوسی صاحب کی مغالطہ آفرینی اور دھوکہ دہی

جواب اوّل کا دار و مدار اس پر ہے کہ یہ خبر واحد ہے۔ اور وہ باب عقائد میں حجت نہیں علی الخصوص جبکہ ادلۂ قطعیہ اور روایات متواترہ کے خلاف ہو اور وصیت خلافت کی متواترہ روایات کا حال آپ معلوم کر چکے ہیں اور دلائل قطعی الدلالۃ موجود نہیں جیسے کہ تصریح کر دی ہے۔ جبکہ شیعہ کے نزدیک امامت قطعی عقائد کے قبیل سے ہے۔ مثلاً انما ولیکم اللہ ورسولہٗ والذین آمنوا کے ساتھ شانِ نزول کو نہ ملاؤ تو حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کے ساتھ دیگر اہل ایمان بھی اس میں شریک ہیں اور صرف مفہوم آیت میں نہیں بلکہ واقعات نے بھی ان کا اشتراک اور شمول ثابت کر دیا ہے اور شانِ نزول ساتھ ملاؤ تو وہ ظنی ہے بلکہ تمام عام اخبار احاد سے بھی شان نزول میں منقول روایات کا درجہ کم ہوتا ہے۔ لہٰذا قطعیت کہاں سے آگئی اور اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کی دلیل خلافت کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے جیسا کہ طوسی صاحب جیسے محقق پر مخفی نہیں اور یہ بھی اس صورت میں ہے جب ولی میں خلافت کے علاوہ دوسرا کوئی احتمال نہ ہو۔ اور خلافت بھی بلا فصل مراد ہو۔ کوئی محقق بقائمی ہوش و حواس اور مذہبی تعصب سے ہٹ کر اس قسم کی ضعیف اور پوچ دلیل دے سکتا ہے؟ علیٰ ہٰذا القیاس دیگر مزعومہ دلائل کا بھی یہی حال ہے۔ اور اس کے بر عکس حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کی زبانی حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کی خلافت کا خلافت منصوصہ موعودہ ہونا ثابت ہو چکا لہٰذا یہ جواب معیار تحقیق پر قطعاً پورا نہیں اترتا۔

جواب دوم کا دار و مدار اس فرق پر ہے کہ سوال استحقاق سے نہیں بلکہ حصول خلافت اور اس کے قبضہ میں آنے سے ہے۔ لیکن اس میں محقق صاحب نے اپنی ساری ذہانت و فطانت اور شانِ تحقیق کو مذہبی تعصب کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ اور دیانت و امانت کا خون ناحق کیا ہے۔ اب ملاحظہ ہوں

اس جواب کے وجوہ بطلان:

۱) حضرت عباس رضی اللہ عنہٗ نے کہا آپ کا وقت وصال قریب ہے تم محکوم بن کر رہ جاؤ گے لہٰذا دریافت کر لو کہ امیر المؤمنین اور قائم بالامر کون ہو گا؟ جب آپ کی خلافت کا اعلان ہو چکا اور وصیت خلافت کر دی گئی تو اب قائم بالامر کے متعلق سوال کا مطلب کیا اور اس غیب کے دریافت کرنے کا مطلب کیا ہوا کہ حق دار تو ہم ہو گئے۔ لیکن قبضہ بھی کر سکیں گے یا نہیں بلکہ یہ کہنا چاہیئے تھا کہ اقتدار عملی طور پر بھی ہمارے حوالے ہونا چاہیئے لہٰذا یہ عرض کرو کہ اب اقتدار میرے حوالے فرما دو۔ اور اپنی ظاہری حیات طیبہ میں مجھے اس مسندِ اقتدار پر بٹھا دو۔ تاکہ کوئی احتمال نزاع باقی نہ رہے۔ اور یہی مفہوم ہے جوہری کے حوالے سے نقل کردہ دوسری روایت کا کہ عرض کرو اگر خلافت ہمارا حق ہے تو ہمیں عطا کرو۔ اور نہیں تو جن کا ہے انہیں ہمارے حقوق کی نگہداشت کی وصیت فرماؤ لیکن آپ نے بارگاہِ رسالت میں یہ عرض کرنے سے معذرت کر دی اور دوسرا خدشہ ظاہر فرمایا۔ کہ کہیں ہمیں منع نہ کر دیا جائے اور ہمیشہ کے لیے اس منصب سے محروم نہ ہو جائیں

۲) حضرت علی رضی اللہ عنہٗ نے یہ اندیشہ اور خدشہ کیوں ظاہر کیا کہ اگر آپ ہمیں خلافت نہ بخشیں تو پھر بعد میں ہمیں کوئی نہیں دے گا کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایفاء عہد اور شان وفا پر آپ کو شک و شبہ تھا؟ العیاذ باللہ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت اپنے کئے ہوئے اعلان سے برگشتہ ہو جانے کا گمان تھا؟ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کے اس جواب کو محقق صاحب کے اختراعی احتمال سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ بلکہ ان پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وعدہ خلافی اور پیمان شکنی کی بدگمانی اور سوءِ ظن کا بہتان ہے۔

۳) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وصال کا علم بہر حال تھا۔ ہمارا مذہب بھی یہی ہے۔ اور شیعہ صاحبان تو ہر امام کو عالم ما کان و ما یکون مانتے ہیں چہ جائیکہ نبی الانبیاء

اور امام الائمہ صلی اللہ علیہ وسلم لہٰذا اپنے قرب وصال کا یقین ہونے کے باوجود خود آپ نے کیوں نہ ان کے مطالبہ کے بغیر ہی اپنی مسند پہ بٹھا دیا۔ دنیاوی حکمران اپنی بیماری اور تکالیف کے دوران قائم مقام حکمران اور قائم مقام صدر یا وزیر اعظم نامزد کر دیتے ہیں تاکہ نظام درست رہے۔ اور متوقع امکانی خطرات میں یہ نامزدگی اور قائم مقامی کار آمد ثابت ہو۔ لیکن یہاں صورت حال بالکل مختلف ہے۔ بحیثیت نائب حکمران اور قائم مقام بادشاہ مقرر کیا جانا تو دور کی بات ہے، شیعہ صاحبان تو نماز جیسے اہم فریضہ میں جس کی امامت کے لیے شب و روز میں پانچ دفعہ امام کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قائم مقام امام بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ خلافت کا معاملہ تو اس سے بہت مختلف ہے۔ لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بادشاہ عرب ہونے کے باوجود اور بیماری جیسے عذر کے باوصف یہ قائم مقامی عمل میں نہ لانا اس حقیقت کی واضح نشاندھی ہے کہ کوئی وصیت اور تنصیص آپ اس ضمن میں نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس امر کو اللہ تعالیٰ کے منشا اور اس کی رضا پر چھوڑنا چاہتے تھے۔ اور امت کو اپنے امام کے انتخاب میں اور اس کے طریقوں کی تعیین میں با اختیار بنانا چاہتے تھے جیسے کہ صعصعہ بن صوحان اور ابو الطفیل وحکیم کی روایات میں اس کی تصریح موجود ہے۔ لہٰذا اس توجیہ کی لغویت دوپہر کے سورج سے بھی زیادہ روشن ہے۔

۴) طوسی صاحب تمثیل میں بڑی دور کی کوڑی لائے اور انہیں بڑی دور کی سوجھی ہے۔ کہ عطیہ سے ممتاز تو ہمیں کیا گیا۔ مگر دریافت طلب امر یہ ہے کہ حاصل بھی ہو گا یا تمہارے ورثا قابض ہو جائیں گے۔ تو اس کو یہ غیبی خبر پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ یوں کہنا چاہیئے تھا۔ کہ حضرت وہ عطیہ میرے حوالے کر دو تاکہ بعد میں مجھے محرومی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ آخر علم غیب کے متعلق امتحان تو مطلوب نہیں۔ اس شے کا حصول مطلوب ہے لہٰذا براہِ راست مطلوب و مقصود امر کی استدعا کرنی چاہیئے۔ لہٰذا اس تمثیل کی لغویت بھی واضح ہے۔

۴) مغلوب و مقہور ہونے بلکہ مظلوم ہونے والی روایت جو ذکر کی ہے ذرا اس کے

عواقب پر بھی غور کر لیتے۔ کیا اس میں کہیں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دخل تو نہیں کہ تین ماہ قبل استحقاق بیان کر کے دوسروں کو چوکس کر دیا۔ مگر عملاً اقتدار سونپنے کا وقت آیا۔ تو کوئی عملی قدم نہ اٹھایا جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت سے محروم ہو گئے۔ اگر آپ ظاہری حیاتِ طیبہ میں اس اختیار و اقتدار سے دست بردار ہو جاتے۔ تو نبوت و رسالت میں کونسا خلل لازم آ سکتا تھا؟ جب کہ مکی زندگی میں حکومت حاصل نہ تھی بلکہ سکون و قرار سے گھر میں کوئی رہنے نہیں دیتا تھا۔ اور مدینہ منورہ میں بھی کئی سال تک حکومت و شہنشاہی کی بنیاد نہیں پڑی تھی۔ لہٰذا اگر ظاہری حکومت کے حصول سے قبل نبوت و رسالت میں کوئی خلل اور نقص نہیں پڑا تھا۔ تو اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسی مقرب اور معظم اور محبوب ہستی کے حوالے کر دینے سے کیا خلل پڑ سکتا تھا؟ جب کہ ان کی حکومت آپ کی حکومت ہی ہوتی جیسے کہ آپ کی حکومت و سلطنت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکومت تھی۔ لہٰذا اس روایت کو اگر نص خلافت و وصیت امامت کے پس منظر میں دیکھیں تو خود ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس مغلوبیت و مقہوریت اور مظلومیت مرتضیٰ میں برابر کی حصہ دار ہے۔ بلکہ مکمل طور پر ذمہ دار ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

سچ فرمایا مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم حبك الشئ یعمی و یصم کسی چیز کی محبت اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔ محقق صاحب کو بھی خلافت منصوصہ اور وصیت و امامت کی قطعیت ثابت کرنے کی محبت نے دیگر مفاسد لازمہ سے اندھا اور بہرہ کر دیا ہے حتی کہ ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مورد الزام بنا لیا اور جب یہ غلط ہے اور یقیناً غلط ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہاں پر کوئی نص خلافت تھی نہ اس کی وصیت اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن اعلان

مذہب شیعہ — از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ العزیز

روایت نمبر ۵ :۔

حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کا ایک اور فرمان بھی پڑھ لیجئے جو نہج البلاغۃ خطبہ نمبر ۵ میں درج ہے جس میں تصریح ہے کہ حضرت عباس اور جناب ابوسفیان حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہٗ کی خدمت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دن حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ ہم آپ کے ساتھ خلافت کی بیعت کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں مولیٰ علی رضی اللہ عنہٗ نے فرمایا۔

یا ایہا الناس شقّوا امواج الفتن بسفن النجات و عرجوا عن طریق المنافرۃ وضعوا تیجان المفاخرۃ ، افلح من نہض بجناح او استسلم فاراح ہذا ماء آجن و لقمۃ یغص بہا آکلہا و مجتنی الثمرۃ لغیر وقت ایناعہا کالزارع فی ارض غیرہ فان اقل یقولوا احرص علی الملک و ان اسکت یقولوا جزع من الموت ہیہات بعد اللتیا والتی واللہ لابن ابی طالب آنس بالموت من الطفل بثدی امّہ۔

پس اے لوگو! تم فتنوں کی موجوں کو نجات کی کشتیوں کے ذریعے طے کرو۔ اور منافرت و مخالفت کے طریقے چھوڑ دو۔ تکبر کے تاجوں کو پھینک دو۔ جو شخص بال و پر کے ساتھ بلند ہوا تو فلاح پا چکا۔ یا جس نے اطاعت کر لی اس نے امن و امان حاصل کر لی۔ مجھے خلیفہ بنانے کی پیش کش ایک گدلے پانی کی طرح ہے یا ایسا لقمہ ہے جو کھانے والے کے گلے میں پھنس جائے۔ میرے خلیفہ بننے کا سوال ایسا ہے جیسے کوئی کچے پھل کو قبل از وقت توڑے یا جیسے کوئی دوسرے کی زمین میں کھیتی باڑی کرے پس اگر میں تمہارے کہنے کے مطابق خلافت کا دعویٰ کر دوں تو فتنہ باز لوگ کہیں گے کہ اس نے ملک کے لیے لالچ کیا اور اگر چپ رہوں تو یہی لوگ کہیں گے کہ موت سے ڈر گیا حالانکہ

موت کا خوف وغیرہ میری شان سے کس قدر بعید ہے۔ اللہ کی قسم علی بن ابی طالب موت کو اپنی ماں کے دودھ کی طرف رغبت کرنے والے بچے سے بھی زیادہ پسند کرتا ہے۔

اس روایت نے بیعت میں توقف کرنے کا تخمینہ بھی اڑا دیا۔ اس خطبے کو خلط ملط کرنے کے لیے شیعوں کے مجتہد اعظم نے انتہائی کوشش کی مگر شیرِ خدا کا واضح ارشاد نہیں چھپ سکا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی خلافت حضور کے بعد قبل از وقت کچے پھل توڑنے والے شخص کے مشابہ ___ اور کسی دوسرے شخص کی زمین میں کھیتی شروع کر دینے والے کی مانند و مثل صرف ایسی صورت میں ہی متصور ہو سکتی ہے۔ کہ ابھی ان کی خلافت کا زمانہ نہیں آیا۔ اور ابھی وہ خلافت کے حق دار نہیں ہوئے۔ اور ڈر کی وجہ سے بیعت کرنا بھی واضح ہو گیا کہ شیرِ خدا قسم کھا کر فرما رہے ہیں کہ موت سے میں نہیں ڈر سکتا۔ رسالۂ مذہب شیعہ ص ۶۵، ۶۶۔

تحفۂ حسینیہ — از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی غفرلہٗ

حضرت عباس رضی اللہ عنہٗ اور حضرت ابوسفیان کی اس پیش کش اور مشورہ کا متعدد مقامات پر ذکر ہے۔ لہٰذا ان تمام عبارات کا بھی مشاہدہ کرتے چلیں تاکہ حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کے جواب کی اہمیت واضح ہو سکے۔

(۱) حضرت عباس رضی اللہ عنہٗ نے فرمایا۔ میں نے تین مشورے تمہیں پہلے دیئے لیکن تم نے تسلیم نہ کیے (اور ان میں سے ایک پہلے ذکر ہو چکا اب دوسرا ذکر کیا جاتا ہے)

فلما قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتانا ابوسفیان بن حرب تلک الساعۃ فدعوناک الی ان نبایعک و قلت لک ابسط یدک ابایعک و یبایعک ہذا الشیخ فانا ان بایعناک لم یختلف علیک احدٌ من بنی عبد المناف و اذا بایعک بنو عبد مناف لم یختلف علیک احد من

قریش واذا بایعتك قریش لم یختلف علیك احدٌ من العرب فقلت لنا بجهازِ رسول الله صلی الله علیه وسلم شغل وھٰذا الامر فلیس تخشی علیه فلم نلبث ان سمعنا التکبیر من سقیفة بنی ساعدة فقلتَ یا عمّ ماھٰذا ؟ قلت مادعوناك الیه فابیت قلتَ سبحان الله ویکون ھٰذا قلتُ نعم، قلت افلا یرد؟ قلتَ لك وھل ردّ مثل ھٰذا قط۔

(ابوبکر جوہری بحوالہ شرح حدیدی جلد ثانی ص۴۸)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا تو ابوسفیان بن حرب اس وقت ہمارے پاس آیا۔ تو ہم نے تمہیں دعوت دی کہ ہم تمہارے ساتھ بیعت کرتے ہیں اور میں نے کہا اپنا ہاتھ بڑھایئے میں تمہارے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں اور یہ شیخ بھی تمہارے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے اگر ہم دونوں نے تمہارے ہاتھ پر بیعت کر دی تو بنو عبد مناف میں سے کوئی شخص تمہارے ساتھ اختلاف نہیں کرے گا اور انہوں نے بیعت کر لی تو قریش میں سے کوئی اختلاف نہیں کرے گا اور جب قریش نے بیعت کر لی تو عربوں میں سے کوئی تمہارے ساتھ اختلاف نہیں کرے گا۔ تو تم نے کہا ہم رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہیں اور اس معاملہ میں ہمیں کوئی اندیشہ اور خوف نہیں ہے۔ لیکن زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ ہم نے سقیفہ بنی ساعدہ سے تکبیر کی آواز سُنی تو تم نے دریافت کیا اے میرے چچا یہ کیا ہے؟ تو میں نے کہا یہ وہ ہے کہ جس کی ہم نے آپ کو دعوت دی لیکن تم نے انکار کر دیا۔ تم نے کہا سبحان اللہ یہ ہوسکتا ہے تو میں نے کہا ہاں۔ تم نے کہا کیا اب اس کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ تو میں نے کہا کیا کبھی ایسے معاملات بھی رد کئے جاسکتے ہیں اور طے ہونے کے بعد انہیں دوبارہ چھیڑا جاسکتا ہے؟

(۲) علی علیه السلام وبعض بنی هاشم مشتغلون باعداد جهازه وغسله فقال العباس لعلی وهما فی الدار امدد یدك ابایعك فیقول الناس عم رسول الله صلی الله علیه وسلم بایعَ ابن عم رسول الله فلا یختلف علیك اثنان فقال له او یطمع یا عم فیها طامع غیری قال ستعلم فلم یلبثا ان جاء تهما الاخبار بان الانصار اقعدت سعداً لتبایعهٗ وان عمر جاء بابی بکر فبایعه وسبقَ الانصار بالبیعة فندم علی علیه السلام علیٰ تفریطه فی امر البیعة وتقاعدهٗ عنها۔

(شرح حدیدی ص ۱۶۰ ج ۱)

حضرت علی اور بعض بنو ہاشم رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل اور تجہیز و تکفین میں مشغول تھے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہٗ نے حضرت علی رضی اللہ عنہٗ سے کہا۔ اپنا ہاتھ بڑھاؤ میں تمہارے ساتھ بیعت کرتا ہوں جب کہ وہ دونوں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت کدہ پر تھے۔ کیونکہ جب لوگوں کو میری تمہارے ساتھ بیعت کا علم ہوجائے گا تو وہ کہیں گے کہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچے نے آپ کے چچازاد بھائی کے ساتھ بیعت کرنی ہے۔ لہٰذا دو شخصوں کو بھی تمہارے ساتھ اختلاف نہیں ہوگا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہٗ نے کہا اے چچا جان کیا اس میں میرے علاوہ کوئی دوسرا شخص بھی طمع اور امید رکھنے والا ہے۔ تو آپ نے کہا عنقریب تمہیں معلوم ہوجائے گا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ان کو خبر ملی کہ انصار نے حضرت سعد بن عبادہ کو بیعت کرنے اور خلیفہ بنانے کے لیے بٹھا رکھا ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ کو لائے اور ان کے ساتھ بیعت کی۔ اور انصار سے بیعت میں سبقت لے گئے تو اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہٗ بیعت کے معاملہ میں کوتاہی اور سستی کرنے پر نادم ہوئے۔

(۴) نہج البلاغۃ کے اس خطبہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ابن ابی الحدید نے ذکر کیا کہ جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے غسل اور تجہیز و تکفین میں مصروف ہو گئے۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت خلافت کر لی گئی۔ تو حضرت زبیر، جناب ابوسفیان اور مہاجرین کی ایک جماعت نے حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ علیحدگی میں ملاقات کی تاکہ اس امر میں غور و فکر کریں اور ایسا کلام کیا جو انہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے خلاف برانگیختہ کرنے اور ابھارنے والا تھا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:۔

قَدْ سمعنا قولكم فلا لقلّة نستعين بكم ولا لظنة نترك آراءكم فامهلونا نراجع الفكر الخ۔ یعنی ہم نے تمہارا قول سن لیا نہ قلت کی وجہ سے ہم تمہارے ساتھ استعانت کرتے ہیں اور نہ تمہارے متعلق کسی بدگمانی کی وجہ سے تمہاری آراء کو نظر انداز کرتے ہیں، لہذا ہمیں مہلت دو، ہم غور و فکر کر لیں۔

فان يكن لنا عن الاثم مخرج يصر بنا وبهم الحق صرير الجدجد ونبسط إلى المجد اكفا لا نقبضها او نبلغ المدىٰ وان تكن الاخرىٰ فلا لقلّة فى العدد ولا لوهن فى الأيدى والله لولا ان الاسلام قيد بالفتك لتدكدكت جنادل صخر يسمع اصطكاكها من المحل العلى۔

اگر ہمارے لیے گناہ سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ ہوا تو ہمارے اور ان کے درمیان حق باآواز بلند پکارے گا۔ اور ہم بزرگی کی طرف ہاتھ بڑھائیں گے اور پھر انہیں سمیٹیں گے نہیں جب تک غایت کو پہنچ نہ جائیں اور اگر دوسری صورت ہوئی تو نہ تعداد میں قلت اور کمی کی وجہ سے ہوگی اور نہ ہی ہاتھوں میں ضعف و ناتوانی کی وجہ سے بخدا اگر اسلام نے اظہارِ جلادت و شجاعت پر پابندی عائد نہ کر دی

ہوتی اور اس کے حدود و قیود کا تعین نہ کر دیا ہوتا تو سخت پتھروں کی بارش ہوتی اور ان کی گھن گرج بلند و بالا مکانوں میں سنائی دیتی۔ اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا کمر بند کھولا اور فرمایا۔ الصبر حلم والتقوىٰ دين والحجة محمد والطريق الصراط ايها الناس شقوا ۔الخ

صبر حلم اور بردباری کا نام ہے۔ اور تقویٰ و پرہیزگاری ہی دین ہے۔ اور حجت و دلیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور راستہ جو کہ چلنے کے لائق ہے وہ صراط مستقیم ہی ہے۔ اے لوگو! فتنوں کی امواج کو نجات کی کشتیوں کے ساتھ عبور کرو۔ الی آخر ما قال

تنقیح خطبہ اور وجہ استدلال:

نہج البلاغۃ کے عنوان خطبہ سے بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور جناب ابوسفیان رضی اللہ عنہ دونوں کا بیعت کی پیش کش کرنا ثابت ہے۔

من كلام له لما قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم وخاطبه العباس وابوسفيان بن حرب فى ان يبايعا له۔

اور شارح ابن ابی الحدید کے حوالہ سے واضح ہو گیا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور مہاجرین کی ایک جماعت نے بھی یہ پیش کش کی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے تمام بنو عبد مناف پھر قریش پھر تمام عرب کی بیعت کی ضمانت دی۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے انکار کر دیا۔ دیگر روایات کے مطابق آپ کو غمگینی لاحق ہوئی۔ اور بیعت خلافت نہ لینے پر نادم ہوئے لیکن نہج البلاغۃ کی روایت سے واضح ہوا کہ آپ سمجھتے تھے۔ کہ ابھی میرا بیعت لینے کا موقعہ ہی نہیں ہے بلکہ بیعت خلافت لینا کچا پھل توڑنے اور غیر کی زمین میں بیج بونے والی بات ہے۔

اور بنو تیم کو کمزور سمجھ کر اور ان کو حقیر سمجھتے ہوئے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کو توڑنا اور لوگوں کو ان سے منحرف کرنا منافرت کی راہ پر چلنا ہے۔ اور جاہلیت کے

دوسروں کی طرح قبائلی فخر و ناز اور تفوق اور برتری کا دعویٰ کرنے کے مترادف ہے۔

لہٰذا فرمایا کہ فخر و مباہات کے یہ تاج سروں سے اُتار پھینکو اور ساتھ ہی یہ بھی واضح فرمایا کہ میں موت و ہلاکت کے ڈر سے یہ باتیں نہیں کر رہا ہوں بلکہ اندمجت على مكنون علم لو بحت به لاضطربتم اضطراب الارشية فى الطوى البعيدة۔

ایک مخفی علم اور راز پر مطلع ہوں اور محیط و مشتمل کہ اگر میں اس کو ظاہر کروں تو تم اس طرح لرز جاؤ جیسے گہرے کنویں سے ڈول کھینچتے وقت رسے لرزتے ہیں جس کے متعلق شارح ابن ابی الحدید کہتا ہے هذا اشارة إلى الوصية التى نصّ بها عليه السلام انّه قد كان من جملتها الامر بترك النزاع فى مبداء الاختلاف عليه۔

اس جملہ میں اس وصیت کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخصوص ٹھہرایا گیا۔ من جملہ دیگر امور کے اس میں یہ بھی داخل ہے کہ اگر تمہارے ساتھ اختلاف ہو اور خلافت بغیر نزاع کے ہاتھ نہ آسکے تو تم نزاع اور جھگڑا نہیں کرو گے بلکہ تسلیم و رضا سے کام لو گے جس کا مفصل ذکر اس خطبہ کے بعد تیسرے حوالہ میں آرہا ہے۔ الغرض اس خطبہ میں خلافت مرتضوی کے وقت کا موخر ہونا اور آپ کا اپنی باری کی انتظار میں ہونا واضح ہوگیا۔ کما قال ابن ابی الحدید: یرید انه لیس هذا الوقت هو الوقت الذی یسوغ فیه طلب الامر وانه لم یان بعد۔ ص۲۱۴ ج۱

اور وصیت ثابت ہوئی تو یہی کہ اختلاف و نزاع سے گریز کرنا لہٰذا وصی رسول کا یہ معنی نہیں کہ خلافت بلافصل کی وصیت کی گئی بلکہ صبر اور تسلیم و رضا کی وصیت کی گئی بلکہ صبر اور تسلیم و رضا کی وصیت کی گئی۔ اور ترک نزاع کی نیز یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ اصل محرک خلافت و امارت کا معاملہ طے کرنے کے انصار بنے اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے خلافت ان سے لی ہے۔ اور اگر یہ حضرات

سقیفہ میں جا کر اپنی خدا داد عظمت و جلالت اور رفعت و مرتبت کے ذریعے اس کو انصار سے حاصل نہ کرتے تو چوتھے درجہ میں بھی آپ کو خلافت کا ملنا ناممکن تھا چہ جائیکہ بلافصل کا حصول اور انصار کو وصیت خلافت کا علم ہوتا یا نص خلافت معلوم ہوتی تو وہ یہ قدم بالکل نہ اٹھاتے اور جب اپنی خلافت ترک کی تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بناتے۔ نیز یہ بھی واضح ہوگیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی پیش کش صرف حضرت ابوسفیان کی طرف سے نہیں تھی۔ تاکہ اس کو اسلام دشمنی سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا بلکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات صحابہ بھی اِن کے ساتھ متفق تھے اور ان میں سے کسی نے بھی آپ کے لیے نہ وصیت کا ذکر کیا اور نہ نص کا بلکہ صرف بنو تیم اور بنو عدی کی حکومت اور بنو عبد مناف پر حکمرانی کو سامنے رکھ کر اس خلافت کو کالعدم کرنے بلکہ اس کے انعقاد سے قبل بنو عبد مناف اور بنو ہاشم کی حکومت قائم کرنے کا مشورہ دیا۔

خوفِ قتل وغیرہ کی وجہ سے ازراہِ تقیہ بیعت اور اطاعت کا رد

حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے اس خطبے نے واضح کر دیا کہ وہ موت اور قتل کے اندیشے اور خوف کے تحت اس خلافت و امارت کو تسلیم نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ موت تو ان کو اس سے بھی زیادہ محبوب ہے جس قدر کہ شیر خوار بچے کو ماں کا دودھ محبوب ہوتا ہے۔ علامہ ابن میثم اور صاحب درۃ نجفیہ نے اس کی شرح میں کہا۔

قد عرفت ان محبة الموت والانس به متمكن من نفوس اولياء الله لكونه وسيلة لهم إلى لقاء اعظم محبوب والوصول إلى اكمل مطلوب وإنّما كان آنس به من الطفل بثدى امه لان محبة الطفل للثدى وانسه وميله إليه طبعىّ حيوانى فى

معرض الزوال ومیلہ الی لقاء ربہ والوسیلۃ الیہ میل عقلیؑ باق فاین احدھما من الآخر۔

(ابن میثم جلد اوّل ص۲۷۹)

(درۂ نجفیہ ص۶۹ ج۱)

تحقیق تو جان چکا ہے، کہ موت کی محبت و انس اولیاء اللہ کے نفوس و قلوب میں متمکن ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ موت اِن کے لیے عظیم تر محبوب اور کامل تر مطلوب کی طرف وصول کا ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ اور بچے کی ماں کے پستان کے ساتھ مانوس ہونے سے بھی آپ کے موت کے ساتھ زیادہ مانوس ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بچے کا اِس کی طرف میلان اور انس طبعی ہے۔ اور تقاضائے حیوانیت جو کہ معرض زوال میں ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کا میلان اور انس اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کی بارگاہ میں حاضری کے ساتھ اور اس کے وسیلہ یعنی موت کے ساتھ عقلی و روحانی اور دائمی و ابدی ہے۔ لہٰذا ان میں۔ باہم کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کی شجاعت و بسالت کی حکمت بیان کرتے ہوئے فاضل ابن میثم نے جلد اوّل ص۱۵۰ پر تحریر کیا۔

لانّ المانع عن الاقدام علی الاھوال والمکارہ إنّما ھو خوف الموت وحب البقاء والعارف بمعزل عن تقیۃ الموت اذ کانت محبۃ اللہ شاغلۃ عن الالتفات إلیٰ کل شیٍٔ بلْ ربّما یکونُ مشتھیً لہٗ لکونہٖ وسیلۃً إلیٰ لقاء محبوبہٖ الاعظم وغایتہ القصویٰ۔

کیونکہ ہولناک اور مشکل ترین امور میں اقتحام اور مداخلت سے صرف موت کا خوف اور زندگی کی آرزو اور محبت مانع ہوا کرتی ہے اور عارف کا مقام موت کے ڈر اور خوف سے کہیں دور اور بالاتر ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت اِس کو دوسری تمام اشیاء کی طرف التفات اور اشتغال سے مانع ہوتی ہے بسا اوقات

موت اِسے دوسری تمام اشیاء سے زیادہ مرغوب و مطلوب ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ عظیم تر محبوب امر اور انتہائی مرغوب مقصد کا ذریعہ اور وسیلہ ہوتی ہے۔

لہٰذا یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ آپ کا خلافت صدیقی کو تسلیم کرنا بلکہ دوسرے لوگوں کو اِس کی مخالفت سے باز رکھنا اور اس کو امواج فتن میں تھپیڑے کھانے اور عصبیت جاہلیہ کے تاج سر پر رکھنے کے مترادف قرار دینا سراسر مصلحت اور حکمت پر مبنی تھا۔ اور اس میں کسی قسم کا ڈر اور خوف واندیشہ شامل نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہ آپ کے شایان شان تھا۔ لہٰذا شیعہ برادری کی وہ ساری افتراء پردازی اور افسانہ سازی جو آپ کے صدیق اکبر رضی اللہ عنہٗ کے ساتھ بیعت کرنے کے متعلق ذکر کی گئی ہے۔ اِس ارشاد سے لغو اور باطل ہو گئی کیونکہ گلے میں رسّے ڈلوا کر اور گھسیٹ کر لائے جانے کے بعد کہنا میں بیعت نہ کروں تو کیا کرو گے جب انھوں نے کہا تمہارا سر قلم کر دیں گے۔ تو آپ کا حجرۂ مقدسہ کی طرف منہ کر کے کہنا یا بن ام انّ القوم استضعفونی وکادو یقتلوننی قوم نے مجھے ضعیف و ناتواں سمجھا اور وہ میرے قتل کے درپے ہیں۔ لہٰذا مجھے بیعت کرنے میں معذور سمجھنا۔ اور اس کے بعد بیعت کر لینا۔ اِس فرمان کے سراسر خلاف ہے۔ بلکہ آپ تو پیشگی اسی توہم کا رد کر رہے ہیں کہ میرے سکوت کو موت سے گھبراہٹ کے ساتھ تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن بخدا یہ توہم سراسر غلط اور باطل ہے۔ تو گویا جس امر کا توہم بارگاہِ مرتضوی میں ناقابل برداشت تھا۔ اِس کو مدعیان محبت . . . . نے ایک حقیقت بنا کر رکھ دیا اور مقامِ عرفان سے گرا دیا اور اپنے فرزند ارجمند حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے بھی شجاعت و بسالت میں کمتر ثابت کر دکھلا دیا اور حق کی پاسبانی اور حفاظت و نگرانی میں قربانی کے جذبات سے سراسر عاری اور خالی ثابت کر دکھلایا ۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

اور اگر کسی وصیت کی وجہ سے آپ نے ان کے ساتھ حرب و قتال اور مجادلہ و نزاع سے گریز کیا تھا۔ تو پھر گلے میں رسے ڈلوانے دروازے جلوانے حضرت

زہراء کی توہین وتحقیر کرانے کے بعد بیعت کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ لہٰذا ان امور کا سراسر افسانہ اور افتراء ہونا واضح ہوگیا والحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ علاوہ ازیں جب دوسروں کو خلافت صدیق رضی اللہ عنہ کی مخالفت سے منع کر رہے ہیں تو خود اس طرح کے اقدام کیوں کر کرسکتے ہیں جو مخالفت اور ناسازگاری پر دلالت کریں۔ اور عداوت ومنافرت کی علامت و دلیل ہوں یہ ایک کھلا تضاد ہے جو سرچشمہ ولایت کی ذات مقدسہ سے بہت بعید ہے بلکہ ناممکن؟

شیعی شارحین کا اضطراب

ابن میثم اور صاحب درۃ نجفیہ نے حضرت امیر قدس سرہ العزیز کے اس ارشاد کی تشریح وتوضیح میں کہا کہ میرے لیے خلافت کے دعویٰ کا یہ وقت نہیں اور وہ گلے میں اٹک جانے والا لقمہ اور بدبودار اور ترش پانی ہے۔ اور قبل از وقت کچا پھل توڑنا اور غیر کی زمین میں کاشت کرنا ہے کیونکہ میرے لیے کافی ناصر و مددگار نہیں ہیں۔

تنبیہ علی ان ذلک الوقت لیس وقت الطلب لھٰذا الامر لعدم الناصر او لغیر ذٰلک ابن میثم (جلد اوّل ص۲۷۸ و درہ نجفیہ ص۶۹۔)

حالانکہ حضرت عباس اور جناب ابوسفیان اور جماعت مہاجرین کی درخواست اور بیعت کے مطالبے پر آپ نے یہ جواب دیا تو آپ اگر ان کی امداد و اعانت کو ناکافی سمجھتے تھے۔ تو صاف فرما دیتے کہ تم میں مقابلہ کی سکت نہیں اور میں تمہاری اس امداد و اعانت پر بھروسہ نہیں کرسکتا۔ نہ یہ کہ تم فتنہ پردازی سے گریز کرو اور تاج مفاخرت سروں سے اتار پھینکو جبکہ مدینہ منورہ کو سواروں اور پیادوں سے بھر دینے کی پیش کش ہو رہی ہو۔ تو قلت ناصر کا دعویٰ کیونکہ صحیح ہوسکتا ہے۔ پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے خطبات کو سامنے رکھیں جو قبل ازیں ذکر ہوچکے تو بھی قلت انصار کا عذر بالکل لغو معلوم ہوتا ہے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے۔ کہ بار بار تعصب سے ہٹ کر شرح کرنے کی قسمیں کھانے والے جب بھی مذہب رفض

اور تشیع کا حضرت امیر کے ہاتھوں بیڑا غرق ہوتا دیکھتے ہیں تو پھر اسی تعصب سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں۔

محقق طوسی کا اعتذار اور اس کا رد

محقق طوسی نے حضرت عباس والی اس پیشکش کی توجیہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کے لیے نص موجود نہیں تھی بلکہ ایک طریق نصب خلیفہ کا اسی نص پر کرنا تھا اور دوسرا طریقہ شوریٰ واختیار اور انتخاب کا تھا۔ لہٰذا حضرت عباس رضی اللہ عنہ دونوں طرح سے خلافت کو آپ میں منحصر اور مختص کرنا چاہتے تھے اور قوم کو الزام دینا چاہتے تھے کہ اگر آپ کا منتخب خلیفہ ہے تو ہمارا بھی منتخب ہے علاوہ ازیں ہمارا خلیفہ منصوص بھی ہے لما بلغه فعل اهل السقيفة و قصدهم الامر من جهة الاختيار اراد ان يحتج عليهم بمثل حجتهم الخ

تلخیص الشافی ص۳۵۲۔ علاوہ ازیں دوسرا جواب یہ دیا کہ بیعت کرنا وجود نص کے خلاف نہیں دیکھو ابوبکر صدیق رضی اللہ نے (حضرت) عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تنصیص بھی کر دی اور لوگوں کو بیعت کا حکم بھی دیا اور انہوں نے بیعت کی۔

وقد رأيناه مع نص ابی بکر علیه حمل الناس علی بیعته دعاهم الیها فبایعوه ولو یمنع تقدم النص من البیعة ص۳۵۲۔

رد اعتذار اور بیان حقیقت

(۱) لیکن طوسی صاحب صرف اپنی ذکر کی ہوئی روایت پر نظر رکھتے ہیں اور اس ضمن میں وارد دوسری تمام روایات سے نظر ہٹا لیتے ہیں۔ جس سے حقیقت حال پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ یہاں پر دو قسم کی روایات ہیں۔ پہلی قسم کی وہ روایات جن میں سقیفہ کے اندر ابھی انصار کا اجتماع ہوا تھا اور نہ ابوبکر صدیق کے لیے

بیعت کا کوئی امکان سامنے تھا۔ اس وقت بیعت کی پیشکش اور بنو عبد مناف اور قریش بلکہ عرب کے آپ پر متفق ہونے کا ذکر اس امر کی واضح دلیل ہے کہ آپ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں نص موجود نہیں تھی اور تقرر خلیفہ کی صورت بھی آپ کے نزدیک یہی انتخاب والی تھی۔ جس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی مشغولیت کا ذکر کیا۔ اور یہ بھی کہ میرے علاوہ اسکا امیدوار کون ہے؟ مگر آپ نے فرمایا انجام دیکھ لینا۔ چنانچہ بعد میں آپ نے کہا کہ اب اس خلافت کو رد نہیں کیا جا سکتا تو انہوں نے فرمایا بعد از انعقاد اس کا رد کیونکہ ممکن ہے۔ لہٰذا اس مضمون کی تمام روایات کو دیکھ کر پھر بنظر انصاف و دیانت غور و فکر کرو تو طوسی صاحب کے جواب کی حیثیت پرکاہ کے برابر بھی نہیں رہ جاتی۔

۲) دوسری قسم کی روایات وہ ہیں جو انعقاد خلافت کے بعد اس کو متزلزل کرنے اور اس کو ختم کرنے کے متعلق پیش کش پر مشتمل ہیں جن میں حضرت عباس کے ساتھ جناب ابوسفیان حضرت زبیر اور جماعت مہاجرین بھی شامل ہے، لیکن ایک دفعہ خلافت کے تقرر کے بعد دوسرے شخص کی بیعت کرنے سے آیا۔ اتمام حجت ہو سکتا ہے۔ اور پہلی بیعت و انتخاب کے ساتھ معارضہ و مناقضہ ہو سکتا ہے۔ قطعاً نہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا بار بار اور باصرار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں حضرت طلحہ اور حضرت زبیر اور جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کے سامنے اظہار کیا اور اعلان فرمایا۔ انّها بیعة واحدة لایثنی فیها النظر ولا یستانف فیها الخیار وغیرہ وغیرہ اور خود حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا۔ وھل یرد مثل ذٰلِكَ قط۔ کہ کبھی انعقاد بیعت کے بعد اور تقرر خلافت کے بعد کے بعد اس کا رد ممکن ہے؟ لہٰذا اس روایت پر بھی یہ جواب قطعاً منطبق نہیں ہوتا۔ اس لیے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بیعت کی پیش کش کرنا اور ہر موقعہ اس خلافت و امامت پر

متصرف ہونے کی تلقین کرنا اس حقیقت کی طرف مشعر ہے۔ کہ نص خلافت موجود نہیں تھی علی الخصوص جب دوسری روایات کو ساتھ ملایا جائے جن میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے کا مشورہ دیا کہ خلافت کس کے لیے ہے۔

۳) نیز طوسی صاحب کا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی تصریح و تنصیص پر اس کو قیاس کرنا بھی کسی طرح درست نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں تنصیص اور تصریح کے ساتھ ہی بیعت کا حکم ہے اور انتقال اقتدار پایا گیا ہے۔ جب کہ بقول شیعہ صاحبان حضرت علی کے لیے خلافت کی تصریح و تنصیص تقریباً تین ماہ پہلے پائی گئی اور انتقال اقتدار کی نوبت نہ آئی۔ علاوہ ازیں حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حکم ابوبکر صدیق میں جو فرق ہے۔ وہ کیونکر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حکم ابوبکر کی مخالفت و موافقت دونوں محتمل ہیں جب کہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کسی مومن کے لیے ممکن نہ تھی علی الخصوص وہ انصار جو میزبان رسول اور میزبان مہاجرین تھے اور اپنے وطن میں اپنی حکومت سے دست بردار ہو رہے تھے ان سے یہ مخالفت کیونکر ممکن تھی؟

الحاصل حضرت عباس رضی اللہ عنہ، کے اس ارشاد میں کوئی معمولی اشارہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ، کے تقرر خلافت کا نہیں ملتا اور نہ اس جواب سے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ، نے ان کو دیا حیرت کی بات ہے کہ صحابہ کرام کی جلالت مرتبت اور قرآن و احادیث اور ارشادات مرتضویہ سے ثابت ان کی رفعت کو کس طرح نظر انداز کر کے اور اس مضمون کی دوسری روایات کو کس طرح پس پشت ڈال کر جوابی کاروائی کی ناکام سعی کی جاتی ہے۔ اور سراسر تعصب کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اور بلا وجہ اور بلا دلیل صحابہ کرام علیہم الرضوان کو ظالم اور غاصب بنانے کی سعی نا تمام اور جہد نا مشکور کی جاتی ہے۔

نوٹ: ۔ نہج البلاغة کے اس خطبے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ، کی خلافت بلا فصل

کی صریح نفی اور ترک نزاع و اختلاف کی وصیت کا ڈھکو صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور بالکل خاموشی سے گزر گئے ہیں۔ جو کھلا اعتراف عجز ہے۔ اور جواب نہ بن سکنے کا عملی اقرار اور علامہ ڈھکو صاحب کا معمول ہی یہی ہے۔ کہ جس دلیل اور روایت کا جواب نہ آتا ہو۔ اس سے آنکھیں بند کر کے نکل جاتے ہیں اور جہاں کچھ نہ کچھ بولنے کا امکان ہو وہاں شاعری شروع کر دیتے ہیں حالانکہ در رسالہ مذہب شیعہ،، کے اندر مندرج دلائل کا جواب نہیں آتا تھا۔ تو خواہ مخواہ رد لکھنے کا تکلف ہی کیوں کرنا تھا۔ اور ان اوراق کے سیاہ کرنے کی کیا ضرورت تھی!

رسالۂ مذہب شیعہ از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز۔

روایت نمبر ۴:۔

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، کا ایک اور فرمان بھی پڑھ لو۔ ناسخ التواریخ جلد سوم کتاب ۲ ص ۵۱ پر مرقوم ہے۔

لَقَدْ عهد إليَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم وقال يا علي لتقاتلنَّ الفئة الناكثة والفئة الباغية والفرقة المارقة انّهم لا ايمان لهم لَعلّهُم ينتهون۔

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا اور یہ عہد لیا کہ تم ضرور بالضرور اور بہر صورت وعدہ توڑنیوالوں، بغاوت کرنے والوں اور سرکشی کرنے والوں کے خلاف جنگ کرنا۔ بے شک ان کے لیے ایمان نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ وہ باز آئیں۔

اب یا تو خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کو برحق تسلیم کیا جائے۔ یا حضرت امام المتقین علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، کو معاذ اللہ تعالیٰ عہد توڑنے والا تسلیم کیا جائے؟ ان دونوں صورتوں کے بغیر بتائیے تیسری کونسی صورت متصور ہو سکتی ہے؟ کیونکہ شیرِ خدا رضی اللہ عنہ، نے ان کے خلاف جنگ نہیں کی بلکہ ہر معاملہ میں

ان کی امداد و اعانت کی اور کوئی قول یا فعل آپ سے ایسا ظاہر نہ ہوا جو ان کے ساتھ کسی معاملہ میں مخالفت پر بطور دلیل پیش کیا جا سکے!

تتمۂ مبحث مذکور تحفۂ حسینیہ از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

اقول:۔ جب کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ، کے کلمات جو خطبہ سابقہ کے ابتداء میں سے حذف کئے گئے اور شارح ابن ابی الحدید نے ان کو نقل کیا یعنی آپ کا حضرت زبیر، جناب ابوسفیان اور جماعت مہاجرین کو یہ فرمانا فلا لقلة نستعين بكم ولا لظنة نترك آراءكم الخ ہم نہ تو قلت تعداد کی وجہ سے تم سے امداد و اعانت کے طلبگار ہیں اور نہ کسی بد گمانی کی وجہ سے تمہاری آراء کو نظر انداز کرتے ہیں بس ہمیں سوچنے کا موقعہ دیجئے اور یہ معلوم کرنے کا کہ آیا از روئے شرع ہمارے لیے اس اقدام میں کوئی گناہ تو نہیں لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ، نے ان مشورہ دینے والوں کی آراء پر تنقید کرتے ہوئے اس کو فتنہ کی امواج میں تھپیڑے کھانے اور منافرت و مخالفت کی راہ چلنے اور جاہلیت کی قبائلی فوقیت و برتری کے مزعومہ تاجِ مفاخرت سر پر رکھنے سے تعبیر کیا اور اس اقدام کو قبل از وقت قرار دیا۔ اس سے صاف ظاہر کہ نگاہِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں یہ حضرات نہ باغی تھے اور نہ ناکث اور نہ ہی قاسط و مارق بلکہ خلافت الٰہیہ کے وارث و مالک جس طرح نحن علیٰ موعود من اللہ الخ والے خطبہ سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی برضا و رغبت بیعت کرنے سے اور ان کو امامت کا اہل تسلیم کرنے سے جیسے کہ سابقہ صفحات میں تفصیلی عبارات ہدیۂ ناظرین ہو چکی ہیں۔ الحمد للہ علیٰ ذالک محمد اشرف عفرلہ،۔

علامہ ڈھکو صاحب کا عجز اور بے بسی

نوٹ:۔ علامہ ڈھکو صاحب نے اس روایت اور عبارت کا جواب بھی نہیں

دیا اور حاضری کے چاولوں کی طرح ہضم کر گئے ہیں۔

روایت نمبر ۵:

خدا کے شیر کی شان میں ایک اور خطبہ نہج البلاغۃ کا ملاحظہ فرمائیں

نہج البلاغۃ مصری جلد اول ص۸۱

رضینا عن اللہ قضاءہ وسلمنا للہ امرہ أترانی اکذب علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ لانا اوّل من صدقہ فلا اکون اول من کذب علیہ فنظرت فی امری فاذا طاعتی قد سبقت بیعتی واذا المیثاق فی عنقی لغیری۔

یعنی ہم اللہ تعالیٰ کی قضاء پر راضی ہو چکے اور ہم نے اللہ تعالےٰ کے امر و حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ کیا تم میرے متعلق یہ گمان کرتے ہو کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولوں گا؟ خدا کی قسم میں پہلا شخص ہوں جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی تھی تو سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے والا میں نہیں ہو سکتا میں نے اپنی خلافت کے بارے میں پوری طرح اور خوب سمجھ سوچ لیا ہے۔ پس میرے لیے اطاعت کرنا اس بات پر سبقت لے جا چکا ہے کہ میں لوگوں کو بیعت کرنا شروع کر دوں جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد و پیمان دوسروں کی اطاعت کا میرے ذمے لگ چکا ہے۔

اس خطبہ کی شرح میں اہل تشیع کے علامہ ابن میثم بحرانی ص۹۸ ج۱ پر رقمطراز ہیں۔

فنظرتُ فاذا طاعتی قد سبقت بیعتی ای طاعتی لرسول اللہ فی ما امرنی بہ من ترك القتال قد سبقت بیعتی للقوم فلا سبیل الی الامتناع منہا وقولہ اذا المیثاق فی عنقی لغیری ای میثاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعھدہ الیّ بعدم المشاقۃ و قیل المیثاق ما لزمہٗ من بیعۃ ابی بکر بعد ایقاعہا ای

فمیثاق القوم قد لزمنی فلم یمکننی المخالفۃ بعدہ۔

یعنی جس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے امر فرمایا تھا۔ کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مخالفت نہ کروں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اس قوم کی اطاعت اور ان کے ساتھ بیعت کرنے سے قبل ہی واجب ہو چکی تھی۔ تو میرے لیے ان کی بیعت سے رکے رہنے اور ان کی بیعت نہ کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں تھی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ میرے ذمہ دوسروں کی اطاعت کا وعدہ اور عہد پہلے ہی سے لگ چکا تھا۔ اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں آپ کے عہد کی مخالفت نہ کروں اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ میثاق نبوی سے مراد یہ ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کرنے کا وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا تھا۔ تو اس لازم اور واجب التعمیل وعدہ کے بعد تو میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں اس کی مخالفت کروں

علامہ ڈھکو صاحب کی بے بسی۔

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی ذکر کردہ اس دلیل کو بھی ڈھکو صاحب نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور خاموشی سے نکل گئے مگر عملاً بے بسی کا مظاہرہ کر گئے۔

تحفہ حسینیہ — از ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی

اسی خطبہ کی شرح میں فنظرتُ فی امری الخ کے تحت شارح ابن ابی الحدید معتزلی شیعی نے کہا ہے۔

ھٰذہ کلمات مقطوعۃ من کلام یذکر فیہا حالہٗ بعد

وفات رسول الله صلی الله علیه وسلم و انّه کان معهوداً
إلیهِ ان لا ینازع فی الامر ولا یثیر فتنة بل یطلبهٗ بالرفق
فان حصَلَ لهٗ والا امسکَ۔

(شرح حدیدی جلد ثانی ص۲۹۶)

یعنی یہ کلمات آپ کے اِس کلام سے لیے گئے ہیں جس میں آپ نے وفاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنی حالت کا ذکر کیا ہے۔ یعنی یہ کہ آپ کی طرف سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ امر خلافت میں نزاع وا ختلاف سے کام نہ لینا اور نہ فتنہ برپا کرنا بلکہ نرم روی اور رفق وملائمت سے خلافت طلب کرنا مل جائے تو بہتر اور نہ ملے تو اس سے رُک جانا اور اعراض ور وگردانی کرنا قولهٗ

فاذا طاعتی لرسول الله ای وجوب طاعتی فحذف المضاف
واقیم المضاف الیه مقامهٗ قد سبقت بیعتی للقوم ای وجوب
طاعة رسول الله صلی الله علیه وسلم عَلَیَّ و وجوب امتثالی
امره سابقٌ علی بیعتی لانّهٗ صلی الله علیه وسلم
امرنی بها۔

یعنی طاعتی لرسول اللہ میں مضاف محذوف ہے۔ اور مضاف الیہ کو مضاف کی جگہ قائم کیا گیا ہے۔ معنی یہ ہے۔ کہ اطاعت رسول صلی اللہ وسلم کا وجوب و لزوم مجھ پہ اور آپ کے ارشاد کی تعمیل کی فرضیت میرے قوم کی بیعت کرنے سے سبقت لے جا چکی تھی۔ لہذا میرے لیے اس سے رُکے رہنے کی وجہ جواز نہیں تھی۔ کیونکہ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے اس کا حکم دیا تھا۔

واذا المیثاق فی عنقی لغیری ای رسول الله اخذ علی
المیثاق بترك الشقاق والمنازعة فلم یحل لی ان اتعدیٰ
امره اذا خالف نهیهٗ۔

دوسروں کے لیے میثاق میری گردن میں تھا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے مجھ پہ مخالفت اور نزاع سے باز رہنے کی ذمہ داری ڈالی۔ اور عہد لیا لہٰذا میرے لیے آپ کے حکم سے تجاوز کرنے اور آپ کی نہی اور منع کی مخالفت کا امکان نہیں تھا۔

فوائد خطبہ اور مذہب اہل سنت کا اثبات

(۱) سبحان اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، کو پابند کیا گیا کہ مخالفت نہ کرنا اور فتنہ و فساد برپا نہ کرنا اور نرم روی اور اعتدال پسندی سے کام لینا حالانکہ آپ انجام کار سے باخبر تھے کہ خلافت پر ابوبکر اور عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کو یکے بعد دیگرے اقتدار اور تصرف حاصل ہوگا۔ لیکن اِن کو حضرت علی رضی اللہ عنہ، کے لیے پابند نہ فرمایا۔ بلکہ آپ کو اِن کے لیے پابند فرمادیا جس سے صاف ظاہر کہ آپ کی نگاہ میں انہیں کی خلافت و امارت اسلام اور اہل اسلام کے لیے مفید تھی۔ اور غلبہ وقوت کا موجب اور اسی میں مصلحت اور بہتری تھی۔ اس لیے ابن ابی الحدید نے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی اہل اسلام پر خصوصی عنایت تھی کہ انہیں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، کے انتخاب کا الہام فرمایا۔

فکان من عنایة الله تعالیٰ بهذا الدین ان الهم الصحابة ما
فعلوه والله متم نورهٖ ولو کره المشرکون (شرح حدیدی جلد۱۱ ص۱۱۳)

تو اس دین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عنایت تھی۔ کہ صحابہ کرام کو الہام فرمایا اس فعل کا جو انہوں نے کیا اور اللہ تعالیٰ اپنے نور کو کامل و مکمل کرنے والا ہے۔ اگرچہ مشرک اس کی تکمیل و تتمیم کو پسند نہ بھی کریں۔

(۲) اور اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، کے حق میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی حقانیت بھی واضح ہوگئی۔

ادعی لی اباك واخاك اکتب لکم فانی اخاف ان یتمنی متمن ویقول
انا ولا ویابی الله والمؤمنون الا ابابکر۔ (مشکوٰۃ شریف)

اے عائشہ میرے سامنے اپنے باپ اور بھائی کو بلا تاکہ میں خلافت ان کو لکھ دوں۔ کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی آرزومند اس کی آرزو کرے اور کہے میں حقدار ہوں حالانکہ دوسرا کوئی حق دار نہیں۔ مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے ازلی فیصلہ قضاء و قدر کے علم کے تحت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور مؤمنین سوائے ابوبکر کے کسی دوسرے شخص پر راضی نہ ہوں گے۔ نیز فرمایا میرے بعد ابوبکر متولی خلافت ہوں گے۔ بعد ازاں عمر فاروق رضی اللہ عنہما۔

(۳) نیز یہ بھی واضح ہوگیا کہ آپ اپنے غلاموں کو بغیر نگران اور حکمران کے چھوڑ کر نہیں جارہے تھے۔ کیونکہ آپ کے علم میں تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ابوبکر صدیق پر متفق فرما دے گا اور انتظام باحسن وجوہ قائم رہے گا۔ جہاں سے اختلاف کا اندیشہ تھا۔ ان کو عہد و میثاق کے ذریعے پابند فرما دیا۔ اور حضرت صدیق کے لیے زمین ہموار کر دی۔

(۴) اہل تشیع کے ان دعوؤں اور اختراعی روایات کی قلعی بھی کھل گئی کہ مسجد قباء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بعد از وصال ابوبکر صدیق کو دیدار ہوا اور آپ نے ان کو فرمایا کہ علی پر ظلم نہ کر اور خلافت ان کے حوالے کر دے کیونکہ جب ظاہری حیات طیبہ میں آپ کو ان کی اطاعت اور موافقت کا پابند فرمارہے ہیں۔ اور عہد و میثاق لے رہے ہیں تو قبر انور سے باہر آکر وہ بھی مسجد قبا میں اور اکیلے صدیق اکبر کے سامنے یہ ارشاد فرمانے کا فائدہ کیا ہو سکتا ہے۔

نہ خود اقتدار سونپتے ہیں نہ آخری خطبہ میں ان کی خلافت و امامت کا اعلان فرماتے ہیں نہ لوگوں کو آپ کی ولی عہدی کی بیعت کا فرمان جاری کرتے ہیں۔ بلکہ آپ کو پابند اطاعت فرماتے ہیں اور آپ پر ان کی بیعت لازم کرتے ہیں۔ تو پھر مزار انور سے نکل کر ایسی تاکیدیں فرمانے کا کیا مطلب؟ لہٰذا مہر نیمروز کی طرح عیاں ہوگیا کہ یہ یار لوگوں کے تراشے ہوئے افسانے ہیں جن کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ و تعلق نہیں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہلبیت کے ساتھ تشدد کا ابطال

(۵) جب حضور خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ عہد تھا اور آپ اس کے پابند تھے۔

تو بیعت سے رکنا اور بیعت کی دعوت پر تلوار اٹھا کر لڑائی کے لیے آمادہ ہونا اور بالآخر مجبور ہو کر گلے میں رسے ڈلوا کر اور گھسیٹ کر منبر نبوی کے پاس لائے جانے کے بعد بیعت کرنا اور اس کے ساتھ ہی گھر جلائے جانے کے افسانے اور حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے بھی مضروب اور زخمی ہونے کے ڈرامے اور حضرت محسن کے اسقاط کے افتراء وغیرہ کو سامنے رکھ کر بتلاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھ کر بتلاؤ کہ وصیت پر عمل اور عہد کو نبھانے اور وعدے کو پورا کرنے کا یہی انداز ہوتا ہے جو آپ نے اختیار فرمایا۔ لہٰذا واضح ہوگیا۔ کہ یہ روایات جھوٹ اور افتراء پر مبنی ہیں

ابن ابی الحدید معتزلی شیعی نے کہا:۔ فکلّهٗ لا اصل له عند اصحابنا ولا یثبته عند احدٌ منهم ولا رواۃ اهل الحدیث ولا یعرفونهٗ وانما هو شیٌ تنفرد الشیعة بنقله۔ شرح حدیدی جلد ثانی ص۶۰ یعنی ان تمام امور کی کوئی اصل نہیں ہمارے علماء کے نزدیک اور نہ ہی ان میں سے کوئی ان امور کو ثابت کرتا ہے۔ اور نہ ہی اہل حدیث نے ان امور کو روایت کیا۔ بلکہ نہ ہی وہ ان کو جانتے ہیں۔ اور یہ ایسے امور ہیں کہ صرف شیعہ لوگ ان کی روایت کے ساتھ منفرد ہیں۔ اور وہ معاند و دشمن ہیں۔

لہٰذا ان کی نقل کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ ان کا تو کام ہی یہی ہے۔ کہ جہاں فضائل صحیح روایات سے بھی ثابت ہوں ان پر قینچی چلا دی۔ اور نقائص و معائب نہ ہوں تو اپنی طرف سے گھڑ لیے اور یہود و مجوس اور ابلیس کو خوش کرنے کی مقدور بھر سعی سے گریز نہ کیا نعوذ باللہ من شرورہم)

دوسرے مقام پر ابن ابی الحدید نے اپنے مذہب اعتزال اور تفضیلی شیعہ ہونے کے ناطے سے اپنا مذہب مختار بیان کرتے ہوئے اور اس قسم کی روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:۔

فامّا علی علیه السلام فانه عندنا بمنزلة الرسول صلی الله علیه وسلم فی تصویب قوله والاحتجاج بفعله ووجوب

طاعته ومتى صَحَّ عنهٔ انّهٗ برئ منْ احد برئنامنه كائناً من كان ولكنّ الشان فى تصحيح ما يُروىٰ عنه عليه السلام فقد اكثر الكذب عليه وولّدت العصبية احاديث لا اصل لها۔

(شرح حدیدی ج ۲۰ ص ۳۵)

لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام ہمارے نزدیک آپ کے اقوال کی درستگی اور افعال کی حجیت اور اطاعت و فرمانبرداری کے وجوب و لزوم کے لحاظ سے وہی مقام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان امور میں ہے۔ اور جب کسی صحیح روایت سے ثابت ہو جائے کہ آپ نے لوگوں میں سے کسی بھی شخص سے برأت کا اظہار کیا ہے۔ تو ہم بھی اس سے برأت اور بیزاری کا اظہار کریں گے۔ خواہ وہ کیسا بھی بظاہر بلند و بالا مقام و مرتبہ کا آدمی کیوں نہ ہو۔ لیکن اصل معاملہ ان روایات کی صحت و ثبوت اور واقعیت کا ہے۔ اور اس تحقیق کا کہ واقعی آپ سے یہ مروی و منقول ہے کیونکہ آپ پر بہت زیادہ دروغگوئی سے کام لیا گیا اور من گھڑت روایات کی آپ کی طرف نسبت کر دی گئی اور آپ کی محبت کے جوش اور تعصب میں بے بنیاد اور حقیقت و واقعیت سے بالکل دور روایات کو اختراع کر لیا گیا (اس لیے ہر قسم کی روایت کا بغیر معیار صحت پر پرکھے اعتبار نہیں کیا جا سکتا)

اور یہ حقیقت محتاج وضاحت نہیں کہ جن کی عدالت اور دیانت اخلاص اور نیک نیتی نصوص کتاب اور صحیح روایات و احادیث اور ارشادات مرتضویہ سے ثابت ہو ان کے خلاف اس طرح کی بے بنیاد روایات سے الزام تراشی اور افتراء پردازی کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتی خود امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔

لیس من العدل القضاء على الثقة بالظن۔

نہج البلاغۃ مع شرح ابن میثم جلد ۵ ص ۳۵۲۔ یعنی یہ عدل و انصاف کے خلاف ہے۔ کہ موثوق بہ اور معتمد علیہ شخص پر محض ظن و گمان اور تخیل و توہم کی بنا پر کوئی حکم لگا دیا جائے (جو اس کی قطعی طور پر ثابت عدالت، امانت و دیانت اور تقویٰ

و پرہیزگاری کے خلاف ہو) اس لیے ابن ابی الحدید نے ہی مسعودی وغیرہ کی نقل کردہ روایات جن کا تعلق حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے گھر میں بلا اجازت داخل ہونے اور آگ لگانے کے لیے لکڑیاں اکٹھے کرنے کے دعویٰ سے ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:۔

فهو خبرٌ واحد غير موثوق به ولا معول عليه فى حق الصحابة بَلْ ولا فى حق احد من المسلمين ممن ظهرت عدالتهٗ ص ۳۴ / ج ۲۰ ۔

ترجمہ:۔ وہ خبر واحد ہے اور اس پر وثوق و اعتماد نہیں نہ صرف صحابہ کرام علیہم الرضوان کے حق میں بلکہ کسی بھی ایسے مسلمان کے حق میں جس کی عدالت ظاہر اور واضح ہو۔

الغرض نہج البلاغۃ میں مذکور اس خطبہ اور ارشاد مرتضوی نے واضح کر دیا کہ آپ کا خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم سے تعاون اور ان کی امداد و اعانت اس عہد نبوی اور پیمان مصطفوی اور وعدہ مرتضوی کے تحت ہے۔ اور اسی عہد و پیمان کی تائید و تصدیق آپ کے طرز عمل اور تعامل سے ہوتی ہے ابن ابی الحدید نے قول امیر رضی اللہ عنہ يهلك فِيَّ رجلان محب مفرط و باهت مفتر کے تحت کہا کہ آپ نے دو قسم کے لوگوں کی ہلاکت کا ذکر کیا ہے۔ ایک محبت میں حد سے تجاوز کرنے والا گروہ یعنی غالی اور اعیان و اکابر صحابہ کی تکفیر کرنے والے اور ان کو منافق یا فاسق کہنے والے اور دوسرے قسم کے لوگ وہ ہیں جو آپ کی توہین و تنقیص کرنے والے ہیں اور آپ کے ساتھ بغض رکھنے والے اور آپ کے ساتھ حرب و قتال سے کام لینے والے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ، کا تعامل خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کیساتھ

(۱) اس کے بعد اپنا اعتزالی اور شیعی عقیدہ بیان کر کے کہا:۔

فاما الافاضل من المهاجرين والانصار الذين ولو الخلافة والامامة قبله فلو انّهٗ انكر امامتهم و غضب

عليهم وسخط فعلهم فضلاً ان يشهر عليهم سيفه او يدعوا الى نفسه لقلنا انهم من الهالكين كما لو غضب عليهم رسول الله صلى الله عليه وسلم (الى) ولكنا رأيناه رضي امامتهم وبايعهم وصلّى خلفهم وانكحهم واكل من فيئهم فلم يكن لنا ان نتعدّى فعله ولا نتجاوز ما اشتهر عنه۔الخ

(ص ۲۲و۲۲۱ / ج ۲۰)

لیکن وہ اکابر اور افاضل صحابہ مہاجرین والانصار جو آپ سے پہلے خلافت وامامت کے والی ہوئے اور اس میں متصرف ہوئے خلیفہ بننے یا بنانے کے لحاظ سے، تو اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی امامت کا انکار کرتے اور صرف ان پر ناراض ہی ہوتے۔ اور ان کے فعل کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے خواہ ان کے خلاف تلوار نہ اٹھاتے۔ یا اپنی طرف لوگوں کو نہ بھی بلاتے تب بھی ہم کہتے کہ وہ افاضل واکابر مہاجرین وانصار بھی ہلاکت کے گڑھے میں گرنے والے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے ان کی امامت وخلافت کو پسند کیا ان کے ساتھ بیعت خلافت کی اور عہد وفا باندھا۔ ان کے پیچھے نمازیں پڑھیں۔ اور انہیں اپنے رشتے دیئے۔ اور ان کے دور میں حروب وقتال میں حاصل ہونیوالے اموال غنیمت کو استعمال فرمایا۔ لہٰذا ہمارے لئے قطعاً روا اور جائز نہیں کہ ہم آپ کے فعل اور عمل سے تجاوز کریں۔ اور آپ کا ان کے ساتھ جو تعامل وتعاون مشہور ومعروف ہے۔ اس کو نظر انداز کریں اور پس پشت ڈالیں۔

(۲) ابن ابی الحدید نے اپنے مشائخ معتزلہ مفضلہ شیعہ کے حوالے سے ذکر کیا۔

انّ الامامة كانت لعلىّ عليه السلام ان رغب فيها ونازع عليها وان اقرّها في غيره وسكت عنها تولينا ذلك الغير وقلنا بصحة خلافته وامير المؤمنين لم ينازع الائمة

الثلاثة ولا جرد السيف ولا استنجد بالناس عليهم فدلّ ذلك على اقراره لهم على ما كانوا فيه فلذالك تولیناهم وقلنا فيهم بالطهارة والصلاح ولو حاربهم وجرد السيف عليهم واستصرخ العرب على حربهم لقلنا فيهم ما قلناه فيمن عامله هذه المعاملة من التفسيق والتضليل

(ص ۹۹ / ج ۳)

یعنی امامت دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تھی، خواہ اس میں رغبت اور اور دلچسپی ظاہر کرتے۔ اور اس کی وجہ سے نزاع واختلاف کرتے۔ خواہ دوسروں میں اس کو برقرار رکھتے اور اس پر سکوت اختیار فرماتے تو اس صورت میں ہم اس شخص سے محبت وتولی رکھتے۔ اور اس کی خلافت وامامت کو تسلیم کرتے۔ اور حقیقت حال یہ ہے کہ امیر المؤمنین نے ائمہ ثلاثہ کے ساتھ نزاع واختلاف نہیں فرمایا۔ نہ ان کے خلاف تلوار میان سے نکالی۔ اور نہ لوگوں سے ان کے خلاف امداد وتعاون کا مطالبہ کیا تو اس سے ثابت ہوا کہ آپ نے ان کو اس حالت پہ برقرار رکھا اور اس کا اقرار کیا جس میں کہ وہ تھے۔ اس لیے ہم ان سے محبت کرتے ہیں اور ان کی طہارت اور افضلیت اور صلاح وتقویٰ کے قائل ہیں۔ اور اگر اس کے برعکس آپ ان کے ساتھ حرب وقتال اور جنگ وجدال فرماتے ان کے خلاف تلوار اٹھاتے اور عربوں کو ان کے ساتھ جنگ پر ابھارتے تو ہم ان کے متعلق بھی وہی قول کرتے جو ہمارا قول ان لوگوں کے متعلق ہے جن سے حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے جنگ کی۔ یعنی ان کو فاسق اور گمراہ سمجھتے ہیں۔

ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغۃ کا مذہب اور عقیدہ اور شیعی علماء کی دھاندلی

نوٹ:۔ اس حوالہ سے اور دیگر شرح حدیدی کے متعدد مقامات سے اور

شارح کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے۔ کہ وہ معتزلہ بغداد کے مسلک پر ہے اور تفضیلی شیعہ بھی ہے۔ اور اصحاب جمل اور اصحاب صفین کے حق میں گمراہی اور فسق کا قائل ہے۔ اور صرف حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کی مغفرت و بخشش کا قائل ہے۔ کیونکہ ان کی اپنے اقدام پر ندامت اور توبہ اس کے نزدیک ثابت ہے:۔

اما عائشة والزبير وطلحة فمذهبنا انهم اخطأوا ثم تابوا وانهم من اهل الجنة وان علياً عليه السلام شهد لهم بالجنة بعد حرب الجمل ج ۲۰ ص ۳۲

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان کے حق میں حرب جمل کے بعد جنت کی شہادت اور گواہی دی۔ الغرض ان عقائد کو دیکھنے کے باوجود کوئی شخص اس کو سنی کہتا ہے۔ اور ہر جگہ اس کے نام کے ساتھ سنی لکھنا لازم سمجھتا ہے جس طرح کہ علامہ ڈھکو صاحب اور اس کے طبیب صاحب نے کیا ہے تو اس سے بڑھ کر زرگاری اور دجل و مکاری کیا ہو سکتی ہے؟ وہ خود جگہ جگہ اپنے معتزلی ہونے اور تفضیلی شیعہ ہونے کا اقرار کرتا ہے بلکہ اس نے تصریح کی ہے۔ کہ ہم اصحاب صفین اور محاربین شام پر مسلمین کا لفظ بولنا بھی روا نہیں رکھتے ج ۲ ص ۲۹۹۔ اور ان کے ہمیشہ آگ میں رہنے کے قائل ہیں ج ا ص ۲۰۱ وغیرہ۔ مگر اس طرف سے اس کے سنی ہونے کی رٹ لگائی جا رہی ہے۔ اگر مطالعہ نہیں کیا تو جہالت پر مبنی دعویٰ ہے۔ اور اگر مطالعہ کیا ہے اور حقیقت حال معلوم ہے۔ پھر یہ کارستانی کی ہے۔ تو یہ بدترین خیانت ہے۔ اور مجرمانہ حرکت ہے۔ بحمد اللہ ہم نے اس شرح کی بیس۲۰ جلدوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ اور بیسیوں مقامات پر اس کے اہل تشیع کے ساتھ متفق اور متحد عقائد کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ اس کے حوالہ جات اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ وہ شیعہ بھی ہے۔ اور ابن علقمی جیسے کٹر اور متعصب شیعہ اور غدار اہل سنت کا نمک خوار ہے۔ اس کا بندۂ درگاہ اور انعام یافتہ بھی اور اس کے تعمیل ارشاد میں اس نے یہ شرح لکھی جیسے کہ اس نے خود خطبہ شرح ص ۳ میں تصریح کی ہے۔

خطبہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

فان مراسم المولى الوزير الاعظم والصاحب الصدر الكبير العالم العادل المظفر المنصور المجاهد المرابط مويد الدين عضد الاسلام سيد وزراء الشرق والغرب ابي طالب محمد بن آحمد بن محمد العلقمي (الیٰ) لما شرفت عبد دولته وربيب نعمته بالاهتمام بشرح نهج البلاغة) الخ۔

لہذا یہ ناممکن کہ وہ کسی جگہ گنجائش ملنے کے باوجود حق نعمت ادا نہ کرتا۔ اور اپنے ولی نعمت اور مربی کا حق نمک خواری ادا نہ کرتا۔ اور مذہب شیعہ کی ترجمانی نہ کرتا۔ اس لیے جو کچھ اس نے لکھا ہے۔ وہ حقائق کے سامنے مجبور و بے بس ہو کر اور واقعات کی شہادت اور گواہی کے بعد کوئی راستہ نہ ملنے کی وجہ سے لکھا ہے۔ اس لیے کم از کم خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے حق میں اہل تشیع کو اپنے اس ترجمان مذہب کی بات تسلیم کرنی چاہیئے۔ اور اسے قطعاً اہل سنت کے زمرہ میں داخل کر کے اس کی بات کو غیر اہم اور بے وزن نہیں کرنا چاہیئے! اور نہ اپنی گلو خلاصی کے لئے بھونڈا اور بودا انداز اختیار کرنا چاہیئے۔ کیا یہ خیال تھا کہ تمہاری کتاب کو صاحب علم اور اہل مطالعہ نہیں دیکھیں گے اور اس مجرمانہ خیانت کو نہیں پکڑیں گے۔ اور انگشت بدنداں نہیں ہوں گے۔ کہ ابن ابی الحدید آپ کیا کہتا ہے۔ اور یہ لوگ اس کے حق میں کیا کہہ رہے ہیں لیکن ؎

اذا لم تستح فاصنع ما شئت۔

رسالہ مذہبِ شیعہ : ازحضرتِ شیخ الاسلام قدس سرہ

ظاہری بیعت ہی حقیقی بیعت ہوا کرتی ہے

اب یہ کہنا کہ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صرف ہاتھ سے بیعت کی تھی اور دل سے نہیں کی تھی کس قدر لغو اور بے معنی تاویل ہے کیونکہ اس کا تو یہی معنی ہوگا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور وعدہ کا ایفا، معاذ اللہ دل سے نہیں کیا اس سے زیادہ بھی کوئی کفر ہو سکتا ہے کہ شیر خدا رضی اللہ عنہ کے متعلق اس قسم کے اتہامات گھڑے جائیں اور یہ کہنا کہ شیر خدا رضی اللہ عنہ نے ڈر کر بیعت کی تھی کس قدر بیہودگی ہے۔ شیر خدا قسم کھا کر کہیں کہ میں نہیں ڈر سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے "ولا تخافوهم وخافون ان کنتم مؤمنین"۔ یعنی اگر تم مومن ہو تو اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی سے نہ ڈرو۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمائیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان، حکم اور وعدہ کے ماتحت ان خلفاء کی بیعت اور ان کی اطاعت کر رہا ہوں اور اس کے مقابل میں اس قسم کے ڈھکوسلے اور تخمینے شیر خدا کی شیری اور دلیری کو چھپانے کی غرض سے پیش کئے جائیں تو میں حیران ہوں کہ باوجود اس کے دعوٰے محبت و تولّا کس نظریہ کے ماتحت ہے۔

اگر تھوڑی دیر کے لیے تسلیم بھی کر لیں کہ شیر خدا رضی اللہ عنہ نے صرف ہاتھ سے بیعت کی تھی اور دل سے نہیں کی تھی تو اس کا جواب بھی حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے کلام فیض انجام سے سن لیں دیکھیے (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۸ و ناسخ التواریخ جلد سوم کتاب ۲ ص ۴۳، ۴۹)

"یزعم انّه قد بایع بیده ولم یبایع بقلبه فقد اقر بالبیعة وادعی الولیجة فلیات علیها بامر یعرف وإلا فلیدخل فیما خرج منه۔ (نہج البلاغہ مصری ص ۴۹ جلد اول)

یعنی زبیر یہ خیال کرتا ہے کہ اس نے میرے ساتھ بیعت صرف ہاتھ سے کی ہے اور دل سے بیعت نہیں کی تو یقیناً بیعت کا اقرار تو کیا اور بیعت کرنے والوں کے زمرہ میں داخل ہو گیا پس چاہیے کہ اس پر کوئی علامت اور دلیل پیش کرے جس سے اس دعویٰ کو پہچانا جا سکے ورنہ چاہیے کہ وہ بھی اس بیعت میں داخل ہو جس میں لوگ داخل ہوتے اور وہ داخل ہونے کے بعد اس سے خارج ہوا۔

سن لیا حضرات صرف ہاتھ سے بیعت کرنے کی حقیقت۔ اگر شیر خدا کے نزدیک ہاتھ سے بیعت کرنا دل سے نہ کرنا بیعت کے حکم میں نہ ہوتا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو ادّعیٰ الولیجة کیوں فرماتے اور اقر بالبیعة کا حکم کیوں لگاتے یعنی بیعت کنندگان کے زمرہ میں داخل ہونے کا اس نے دعویٰ کر لیا اور بیعت کرنے کا اقرار کر لیا۔

علامہ ڈھکو صاحب کی بے بسی :

نوٹ : اس عبارت اور وجہ استدلال کا بھی علامہ ڈھکو صاحب نے ذکر تک نہیں کیا جواب دینا تو دور کی بات ہے جس سے عملاً اعتراف عجز اور اقرار بے بسی واضح ہو گیا۔

تحفہ حسینیہ

ازابوالحسنات محمد اشرف السیالوی غفرلہٗ

یہ عبارت اور اس مضمون کی اور بھی بہت سی عبارات نہج البلاغہ میں موجود ہیں خصوصاً نہج البلاغہ مصری ص ۱۲۸ کی یہ عبارت قابل غور ہے۔

ان کنتما بایعتما طائعین فارجعا وتوبا إلی اللہ من قریب وان کنتما بایعتمانی کارھین فقد جعلتما لی علیکما السبیل باظھارکما الطاعة واسرارکما المعصیة ولعمری ما کنتما باحق المھاجرین بالتقیة والکتمان وان دفعکما ھذا الامر من قبل ان تدخلا فیه کان اوسع علیکما من خروجکما منه بعد اقرارکما به۔

یعنی اگر تم دونوں نے دلی رغبت کے ساتھ میری بیعت کی تھی تو واپس

آئیے اور جلد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کیجئے اور اگر تم نے ناپسندیدگی اور دلی نفرت وکدورت کے ساتھ بیعت کی تھی تو تم نے میرے لیے اپنے اوپر راہ الزام اور حجت پیدا کر لی بسبب تمہارے اطاعت کو ظاہر کرنے اور معصیت و نافرمانبرداری کو چھپانے کے مجھے اپنی زندگانی کی قسم تم دونوں دوسرے مہاجرین کی نسبت تقیہ وکتمان کے زیادہ حقدار نہیں تھے (جب انہوں نے تقیہ نہیں کیا تو تمہیں کون سی مجبوری ہوسکتی تھی جس کے تحت تقیہ کرنا پڑا) تمہارا میرے امر خلافت اور بیعت کو اس میں داخل ہونے سے پہلے رد کر دینا زیادہ وسعت اور گنجائش رکھتا تھا بنسبت اقرار کرنے اور بیعت کر کے اس میں داخل ہونے کے بعد اس میں سے نکلنے کے۔

بیعت مرتضوی کے لیے جبر واکراہ۔

لیکن اس کے برعکس ذرا دوسرے قسم کی روایات بھی ملاحظہ فرمالیں جن میں یہ تصریح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخلصین اور خدام خاص تلواریں لے کر کھڑے تھے اور بیعت نہ کرنے کی صورت میں قتل کر دینے کی دھمکیاں دے رہے تھے! ابن ابی الحدید نے ابوہلال عسکری کی کتاب الاوائل سے نقل کرتے ہوئے وہ تفصیلاً بتاتی ہیں:

(۱) اشتر نخعی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:۔

قم فبایع الناس فقد اجتمعوا لك ورغبوا فيك والله ان نكلت عنها لتعصرن عليها عينيك مرة رابعة۔ اٹھیے اور لوگوں سے بیعت لیجئے کیونکہ وہ تمہارے لیے جمع ہوئے ہیں اور تمہاری بیعت میں ہی رغبت رکھتے ہیں بخدا اگر تم نے اس بیعت خلافت سے اب بھی اعراض کیا تو چوتھی مرتبہ اس پر آنسو بہاؤ گے۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے اور منبر پر سکن میں داخل ہوئے اور تمام لوگ جمع ہوئے اور حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما حاضر ہوئے "لا یشکان ان الامر شوریٰ"

اور ان کو اس میں قطعاً شک وشبہ نہیں تھا کہ امر خلافت شوریٰ اور انتخاب واختیار سے طے ہوگا مگر اسی دوران اشتر نخعی نے کہا کیا اب کسی کا انتظار رہے ہے؟

قم یا طلحة فبایع فتقاعس فقال قم یابن صعبه وسل سيفه فقام طلحة يجر رجله حتى بايع - اے طلحہ اٹھئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کیجئے انہوں نے توقف اور تردد کا اظہار کیا تو اشتر نے کہا اٹھ اے ابن صعبہ اور ساتھ ہی تلوار سونت لی تو حضرت طلحہ پاؤں گھسیٹتے ہوئے اٹھے اور بیعت کی۔

ثم قال قم یا زبیر والله لا ینازع احد الا ضربت قرطه بهذا السيف فقام الزبير فبايع ثم انثال الناس عليه فبايعوا -

پھر کہا اے زبیر اٹھو بخدا جو بھی نزاع واختلاف سے کام لے گا میں اس تلوار کے ساتھ اس کی گردن اڑا دوں گا تو حضرت زبیر اٹھے اور انہوں نے بیعت کی پھر سب لوگ آپ کی طرف مائل ہوئے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

(۲) پہلے پہل اشتر نخعی نے آپ کی بیعت کی۔ اپنے اوپر اوڑھا ہوا کمبل اتار دیا اور تلوار سونت لی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ کھینچ کر آپ کے ساتھ بیعت کی پھر حضرت زبیر اور طلحہ سے کہا۔

قوما فبایعا والا کنتما الليلة عند عثمان فقاما يعثران فى ثيابهما لا يرجوان نجاة حتى صفقا بايديهما على يده الخ۔ اٹھو اور آپ کی بیعت کرو ورنہ آج رات تم بھی عثمان کے پاس پہنچے ہوئے ہو گے چنانچہ وہ دونوں اُٹھے درآں حالیکہ اپنے کپڑوں میں پھسل رہے تھے اور گرتے پڑتے انہوں نے اپنے ہاتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر رکھے جبکہ انہیں اپنی نجات اور خلاصی کی امید نہیں تھی۔

(۳) ابو مخنف نے کتاب الجمل میں آپ کی بیعت کے واقعات بیان کرتے ہوئے ذکر کیا کہ پہلے پہل حضرت طلحہ نے بیعت کی پھر حضرت زبیر نے بعد ازاں مدینہ منورہ میں موجود تمام مسلمین نے ماسوا حضرت محمد بن مسلمہ حضرت عبداللہ بن عمر حضرت اسامہ

بن زید، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت کعب بن مالک، حضرت حسان بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہم کے۔

(۴) حضرت عبداللہ بن عمر کو حاضر کیا گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے کہا۔ "لا ابایع حتی یبایع جمیع الناس"۔ جب تک سب لوگ بیعت نہ کر لیں میں بیعت نہیں کروں گا۔ آپ نے فرمایا مجھے اس کی ضمانت دو کہ تم یہیں رہو گے اور کہیں چلے نہیں جاؤ گے تو آپ نے کہا میں ایسی کوئی ضمانت بھی نہیں دیتا تو جناب اشتر نخعی نے کہا "یا امیر المؤمنین" یا امیر المؤمنین ان هذا قد امن سوطك وسیفك فدعنی اضرب عنقه" امیر المؤمنین اس کو نہ آپ کے درے کا ڈر ہے اور نہ آپ کی تلوار کا مجھے اجازت دو میں اس کی گردن اڑا دوں تو آپ نے فرمایا میں اس کو مجبور کر کے بیعت نہیں لینا چاہتا۔

(۵) جب لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی اور حضرت عبداللہ بن عمر باقی رہ گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ بیعت کے معاملہ میں بات چیت کی مگر انہوں نے بیعت کرنے سے گریز کیا اور دوسرے دن حاضر ہو کر کہا:۔

"انی لك ناصح ان بیعتك لم یرض بها کلهم فلو نظرت لدینك ورددت الأمر شوری بین المسلمین فقال علی علیه السلام ویحك و هل ما کان عن طلب منی له!

ألم یبلغك صنیعهم؟ قم عنی یا احمق ما انت وهذا الکلام۔

یعنی میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ ہوں آپ کی بیعت پر سب لوگ راضی نہیں ہوئے اگر آپ اپنے دین اور تقویٰ پر نظر رکھتے ہوئے اس کو شوریٰ پر چھوڑ دیں تاکہ اہل اسلام اپنی مرضی سے خلیفہ کا انتخاب کریں (تو کتنا ہی اچھا ہو) تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تیرے لیے افسوس ہے کیا جو ہوا وہ میری طلب اور خواہش پر ہوا کیا تمہیں بیعت کرنے والوں کے عمل اور طریق کار کا اس معاملہ میں علم نہیں ہے۔ اے احمق میرے پاس سے اٹھ جاؤ تمہیں ایسی گفتگو کرنے کا کیا حق ہے؟

جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اٹھ کر چلے گئے تو تیسرے دن ایک آدمی نے آکر آپ سے عرض کیا، عبداللہ بن عمر مکہ مکرمہ کی طرف جا رہے ہیں وہ وہاں کے لوگوں کو آپ کے خلاف کر دیں گے لہٰذا ان کے پیچھے آدمی بھیج کر انہیں واپس بلاؤ۔

فجاءت ام کلثوم ابنته فسألته وضرعت الیه فیه وقالت یا امیر المؤمنین انما خرج إلی مکة لیقیم بها وانه لیس بصاحب سلطان ولا هو من رجال هذا الشان وطلبت إلیه ان یقبل شفاعتها فی امره لأنه ابن بعلها فاجابها وکف عن البعثة إلیه وقال دعوه وما أراد۔

(شرح حدیدی ص۷ تا ص۱۱ جلد ۴)

اسی دوران آپ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم آئیں اور انہوں نے آپ سے سوال و مطالبہ کیا اور منت و زاری کی اور عرض کیا اے امیر المؤمنین عبداللہ بن عمر مکہ کی طرف صرف اس لیے جا رہے ہیں کہ وہاں قیام پذیر ہوں نہ وہ صاحب اقتدار ہیں اور نہ اس کی خواہش رکھنے والوں سے ہیں اور ان کے حق میں شفاعت اور سفارش کے قبول کرنے کا آپ سے مطالبہ کیا کیونکہ وہ ان کے خاوند (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کے بیٹے تھے چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے مطالبہ کو پورا کیا اور حضرت عبداللہ بن عمر کے پیچھے آدمی بھیجنے سے رک گئے اور فرمایا اسے اس کی مرضی اور ارادہ پر چھوڑ دو۔

ابو ہلال عسکری اور ابو مخنف کی یہ روایات کیا بالکل وہی منظر پیش نہیں کر رہیں جو ابوبکر صدیق کی بیعت کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات سے ثابت کیا جاتا ہے۔ اگر وہ سچی ہیں تو جو جواب آپ کی خلافت کی حقانیت پر وارد اس اعتراض کا ہو گا کہ اجماع و اتفاق کہاں اور رضا و رغبت کہاں یہ سب کچھ اشتر کی تلوار اور اس کی دھینگا مشتی سے ہو گا' وہی جواب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے دیا جائے گا۔ ماهو جوابکم فهو جوابنا! رہا نص کا دعویٰ تو یہ اس کا محل و موقع نہیں ہے کیونکہ یہاں تو یہ دعویٰ ہے کہ تم نے بیعت کی خواہ دل سے خواہ

ظاہری طور پر لہٰذا اس کی پابندی لازم ہے اور خروج و بغاوت اور نقض عہد کا کوئی جواز نہیں ہے؟

نیز بیعت مرتضوی اور بیعت صدیق میں فرق بھی ہے وہ یہ کہ حضرت صدیق کی بیعت مہاجرین و انصار نے پہلے کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بعد میں بیعت کرنے کے لیے کہا گیا جبکہ جناب اشتر نخعی نے پہلے ہی زور شمشیر سے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کو بیعت پر مجبور کر دیا اور بعد میں دوسرے حضرات نے بیعت کی۔

ہمارا مقصد حاشا و کلا یہ نہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ خلیفہ بر حق نہیں ہیں۔ آپ کی حقانیت خلافت ظاہرہ بھی ہمارا دین و ایمان ہے اور ہمارے نزدیک باطنی اور روحانی خلافت و امامت قیامت تک کے لیے آپ کو حاصل ہے اور کوئی ولی اس وقت تک ولی نہیں ہو سکتا اور اسے ارشاد و ہدایت کا حق نہیں ملتا جب تک بارگاہ مرتضوی سے اس کی منظوری نہ ہو بلکہ ہمارا کلام صرف اور صرف اس میں ہے کہ ادھر ادھر کی روایات کو سامنے رکھ کر اور ان کی حقیقت اور اصلیت معلوم کئے بغیر کسی ایسی ہستی کو طعن و تشنیع کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے جن کی دیانت، نیک نیتی اور تقویٰ و پرہیزگاری اور اسلام و اہل اسلام کی ہمدردی اور خیر خواہی ظاہر ہو بلکہ قطعی ادلہ سے ثابت ہو۔

رہا صحابہ کرام علیہم الرضوان کا حرب و قتال کا معاملہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور وہ حضرات غلط فہمی کا شکار اور خطا کے مرتکب لیکن خطا اجتہادی پر عذاب و عقاب اور اخروی مواخذہ نہیں ہوتا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ معاملہ، لہٰذا اہل تشیع کی طرح نہ ہم ان کو کافر و منافق کہتے ہیں اور نہ فاسق و فاجر اور جہنمی بلکہ مرتکب خطا اور سابقہ خدمات اسلام اور بانی اسلام کی وجہ سے قابل عفو و لائق مغفرت جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لاکفرن عنهم سیاٰتهم ولادخلنهم جناتٍ تجری من تحتها الانهار۔ الآیة (سورہ آل عمران پ۴) کہ میں ضرور بالضرور ان کے گناہ اور خطائیں ان سے دور کروں گا اور انہیں جنتوں میں داخل کروں گا اور وہ ایسے خون ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے

ہاتھوں کو محفوظ رکھا لہٰذا ہم اپنی زبانوں کو ان کے ساتھ آلودہ کرنا جائز اور مناسب نہیں سمجھتے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ہم ان کے دلوں سے رنجش اور کدورت دور کر دیں گے۔ قال تعالیٰ: ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا علیٰ سرر متقابلین۔

تو ان ارشادات کے پیش نظر بارگاہ خداوندی اور حضرت رسالت پناہ اور حضرت علیؓ کی طرف سے ان سے درگزر ہو جائے گا اور ہم اپنی بدزبانی اور بدکلامی اور گستاخی و بے ادبی کی وجہ سے قابل مواخذہ ٹھہریں گے۔ دیکھیے اہل جمل پر غلبہ حاصل ہونے کے بعد آپ نے سب سے درگزر کیا بلکہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اسی احترام و اکرام کے ساتھ پیش آئے جیسے کہ قبل ازیں پیش آیا کرتے تھے اور اصحاب صفین کے ساتھ تحکیم اور ثالثی قبول فرمائی اور انہیں برابر کی سطح پر رکھ لیا اگر وہ العیاذ باللہ اسلام و ایمان سے خارج ہو چکے تھے تو ثالثی فیصلہ پر رضامندی کا کیا مطلب؟ اور جنگ و جدال سے ہاتھ روکنے کا کیا محل و موقع تھا؟ اسی لیے اہل السنت کا موقف یہ ہے:

ونکف عن ذکر الصحابة إلا بخیر (شرح عقائد نسفی) کہ ہم ذکر صحابہ علیہم الرضوان سے کف لسان اور سکوت اختیار کریں گے مگر خیر اور بھلائی کے ساتھ اور ان کے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں گے اور یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے۔

"اقیلوا ذوی الھیئات عثراتھم فما یعثر منھم عاثر الا ویداللہ بیدہ یرفعه" (نہج مع شرح ابن میثم ص۲۴۸ جلد خامس) بزرگ لوگوں کی لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر کرو کیونکہ ان میں سے جو بھی لغزش اور ٹھوکر کھاتا ہے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ اس کو اٹھاتا اور بلند فرماتا ہے۔

خطا بزرگاں گرفتن خطاست

نیز خدائے عادل کی بارگاہ میں میزان عدالت کے ذریعے ہی فیصلے ہوں گے تو ان حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان کی ہجرتوں، راہ خدا اور رضا رسول میں پانے والی ایذاؤں اور جہاد و قتال اور عقائد صحیحہ و اعمال صالحہ کو کیونکر نظر انداز کیا جائیگا۔ کما قال تعالیٰ: فمن یعمل مثقال ذرة خیراً یره، جو شخص بھی ذرہ بھر مقدار کی مانند بھی نیکی کریگا وہ اس کی جزا اور ثواب ضرور پائے گا۔

مذہب شیعہ — از شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

بارگاہ نبوی میں خلفاء ثلاثہ کا مقام اور شان قرب

کتاب معانی الاخبار صا۱۱ مطبوعہ ایران مصنفہ ابن بابویہ قمی کا مطالعہ فرماویں کیونکہ یہ کتاب بھی مذہب اہل تشیع میں مایۂ ناز ہے اور ان کے نزدیک بے حد معتبر۔

عن الحسن بن علی رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ابا بکر منی بمنزلۃ السمع وان عمر منی بمنزلۃ البصر وان عثمان منی بمنزلۃ الفؤاد (وکذا فی تفسیر الامام الحسن العسکری)

یعنی امام عالی مقام سیدنا حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر میرے لیے بمنزلہ میرے سمع مبارک یعنی کان کے ہیں اور عمر میرے لیے بمنزلہ میری آنکھ کے ہیں (عمر میری آنکھ ہیں) اور عثمان بمنزلہ میرے دل کے ہیں یعنی عثمان میرا دل ہیں اور اسی طرح امام حسن عسکری نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

اب امام عالی مقام امام حسن رضی اللہ عنہ روایت فرمانے والے ہوں اور پیغمبر خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام ان مقدس اور منور ہستیوں کو اپنی سمع مبارک، بصر مقدس اور دل منور کی منزلت بخشیں تو کیا ان مقدس ہستیوں کی شان اقدس میں سب وشتم براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں سب وشتم نہیں اور کیا ان کا ادب واحترام اور ان کی محبت براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب واحترام اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں؟ کچھ تو سوچیں اور غور وفکر سے کام لیں۔ (رسالہ مذہب شیعہ صا۶۹۔

علامہ ڈھکو صاحب کا اظہار عجز۔

نوٹ۔ علامہ ڈھکو صاحب نے اس روایت کا بھی جواب نہیں دیا اور یوں اس کو نظرانداز کیا ہے کہ گویا "رسالہ مذہب شیعہ" میں اس کا ذکر ہی نہیں تھا جس سے اس کی عاجزی اور بے بسی نمایاں اور واضح ہے۔ علامہ صاحب نے صرف اسی روایت اور حوالہ پر قلم اٹھایا جس کا کچھ نہ کچھ جواب بزعم خویش دے سکتے تھے اور جن کا جواب نہیں آتا تھا ان کا نام ہی نہیں لیا اور ذکر کرنا گوارا نہیں کیا۔ اگر رد لکھنے کی استطاعت نہیں تھی تو پھر یہ تکلف کیوں کیا؟

تتمہ مبحث

تحفۂ حسینیہ — از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

ارشاد نبوی میں تحریف کی سعی ناکام

روایت کا مقصودی حصہ تو آپ دیکھ چکے اور وجہ استدلال بھی، اب ذرا شیعہ صاحبان کی اس روایت میں تحریف کی کوشش بھی ملاحظہ فرماویں اور سبائی ذھنیت کا مظاہرہ اور الولد سر لابیہ کا نمونہ بھی ملاحظہ فرماویں۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی طرف حضرت علی بن محمد بن علی الرضا کے واسطے سے یہ منسوب کیا ہے،

" قال فلما کان الغد دخلت إلیہ وعندہ امیر المؤمنین وابوبکر وعمر وعثمان فقلت لہ یا ابت سمعتک تقول فی اصحابک ہؤلاء قولاً فما ہو؟ فقال علیہ السلام نعم ثم اشار بیدہ الیہم فقال ہم السمع والبصر والفؤاد وسیسئلون عن ولایۃ وصیی ہذا واشار إلی علی بن ابی طالب صلوٰت اللہ علیہ ثم قال ان اللہ یقول ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولاً ثم قال

علیہ السلام وعزۃ ربی ان جمیع امتی لموقوفون یوم القیامۃ ومسئولون عن ولایتہ وذٰلک قول اللہ عزوجل "وقفوھم انھم مسئولون۔ (معانی الاخبار ص۱۱۱)

جب دوسرا دن ہوا تو میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے پاس حضرت امیر المومنین اور حضرت) ابوبکر اور (فاروق) اور عثمان (ذوالنورین) رضی اللہ عنہم حاضر تھے میں نے عرض کیا میں نے آپ کو اپنے اصحاب کے متعلق ایک بات کرتے ہوئے سنا وہ کیا ہے؟ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہاں۔ پھر ان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا یہ سمع و بصر اور فواد ہیں یعنی کان، نگاہ اور قلب و روح اور ان سے میرے اس وصی کے متعلق دریافت کیا جائے گا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ فرمایا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔ "بے شک کان آنکھ اور دل سبھی سے اس کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ پھر فرمایا مجھے اپنے رب کی عزت کی قسم قیامت کے دن میری ساری امت کھڑی کر دی جائے گی اور علیؓ کی ولایت کے متعلق ان سے سوال کیا جائے گا اور یہ ہے قول اللہ تعالےٰ کا۔ انہیں روکو بے شک وہ سوال کئے جانے والے ہیں۔

فوائد روایت

(۱) اس روایت میں دوبارہ ان تینوں حضرات کو علی الترتیب سمع و بصر اور قلب و جگر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس سے تاکید اکید اور تائید و تقویت میں اضافہ ہو گیا۔

(۲) ان حضرات پر قرآن مجید کی آیت چسپاں کرکے ان کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سمع و بصر اور قلب و جگر ہونا ثابت کیا گیا (اور وہ بھی خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں اور حضرت علیؓ کی شہادت کے ساتھ۔ جس سے ان کی یہ شان گویا اللہ تعالیٰ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کرام کے نزدیک بھی مسلم ہو گئی کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کان،

آنکھ اور دل مقدس ہیں۔

(۳) ان تینوں حضرات سے بمع ساری امت کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں اللہ تعالیٰ لاکھوں اولیاء کے متعلق سوال کرے اور ان کے دور کی امت سے دریافت کرے مگر سوال یہ ہے کہ وہ جواب دے سکیں گے یا نہیں تو شیعہ صاحبان جنکے حق میں یہ فضیلت ثابت نہیں کہ وہ سمع نبوت اور بصر رسالت ہیں اور قلب محبوب ہیں۔ اگر وہ اس منقبت اور فضیلت سے محروم ہو کر صحیح جواب دے سکیں گے تو جو اس فضیلت اور شان امتیازی کے مالک ہیں وہ کیوں جواب نہیں دے سکیں گے اور وہ ولایت جس کو نبوت و رسالت اور محبوب خدا کے سمع و بصر اور قلب پہچان نہ سکیں ہم اس کو ولایت تسلیم ہی نہیں کر سکتے اگر ولایت برحق ہے تو ان کی طرف سے اس کی پہچان اور اس کا جواب بھی برحق ہو گا اور پہچان اور بیان صحیح نہیں ہو گا تو ولایت ہی صحیح نہیں ہو گی العیاذ باللہ۔ کیونکہ نبوت و رسالت کی آنکھ اور دل اور اس کی سمع مبارک سے بڑھ کر حقائق شناس اور حقائق کا ترجمان کون ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ان مقدس ہستیوں کی شان گھٹانے اور اس روایت میں تحریف کرنے کی سعی اور کوشش بحمد للہ ناکام ہو گئی بلکہ ان کی شان مزید قوت اور صحت کے ساتھ واضح اور ثابت ہو گئی۔ اور ہماری کتابوں میں بھی شیخین رضی اللہ عنہ کے متعلق موجود ہے "ھذان السمع والبصر" یہ دونوں میرے کان اور آنکھ ہیں مشکوٰۃ شریف باب فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم۔ لہٰذا ان دونوں حضرات کے حق میں دونوں مذہبوں کی روایتیں اس منقبت کے بیان میں متفق ہو گئیں اور شیعہ مذہب کی روایت سے مزید فائدہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان اقدس کا بھی حاصل ہو گیا والحمد للہ۔

تنبیہ: جب بندہ مقام محبوبیت پر فائز ہوتا ہے اور نوافل اور فرائض کی وجہ سے اس کو فنا صفاتی اور فنا ذاتی حاصل ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے متعلق فرماتے ہیں

کنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ وفوادہ الذی یعقل بہ۔

یعنی میں اس بندے کے کان ہوتا ہوں جن سے سنتا ہے اور آنکھیں جن سے دیکھتا ہے اور دل جس سے سوچتا اور علم حاصل کرتا ہے اور اسی طرح ہاتھوں، پاؤں اور زبان کے متعلق بھی فرمایا گیا الغرض جب عابد اور زاہد اس مقام پہ فائز ہو جاتا ہے تو سید الرسل اور امام المحبوبین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مقام پر فائز ہونے میں کون شک کر سکتا ہے۔ بلکہ آپ کی اس وصف محبوبیت میں اصالت اور دوسروں کی تبعیت میں اور آپ کے براہ راست اللہ تعالےٰ کے ان خصوص انوار کا مظہر ہوتے اور دوسروں پہ آپ کے عکس اور پرتو انوار کا فیضان ہونے میں کس کو شک شبہ ہو سکتا ہے

اب اس عظیم شان والے سمع و بصر اور قلب کو اس فرمان کی رو سے ان خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم میں موجود و متحقق دیکھ کر اور یقین کر کے بتلاؤ کہ انوار قرب اور پرتو فیوض محبوبیت کا جو ظہور یہاں پر ثابت ہو رہا ہے کیا دوسری جگہ اس شان سے ان کے ثبوت و تحقق کا کوئی امکان ہو سکتا ہے۔ بلکہ ؎

آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشا دیکھے ۔ دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

اب ان حواس نبوت کے متعلق کون سوچ سکتا ہے کہ ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان ولایت کی صحیح پہچان نہ ہو گی ہاں ہاں صحیح پہچان وہی ہے جو ان حضرات کے عمل اور قول سے ثابت ہے اور جو افراط و تفریط میں مبتلا اور مدح و ثناء میں غلو یا بغض و عناد میں غلو کے شکار لوگوں نے بیان کی ہے وہ قطعاً درست نہیں ہو سکتی ہے بلکہ افراط و تفریط میں مبتلا لوگ خود حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فرمان کے مطابق ہلاکت اور تباہی کے گڑھے میں گرنے والے ہیں

کما قال سیهلك فی صنفان محب مُفرط و مُبغض ومفرط۔

مذہب شیعہ ۔ ۔ ۔ از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ

«حضرت ابوبکر صدیق کی شان اقدس اور امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ کا بیان» چونکہ اہل تشیع ائمہ طاہرین کی اس قسم کی تصریحات کو دیکھ کر ہمیشہ سرے سے انکار کے عادی ہیں۔ اور جھٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ ائمہ طاہرین سے

یہ روایت ثابت نہیں اس لیے امام عالی مقام حسن عسکری رضی اللہ عنہ کی روایت بھی لفظ بلفظ لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کتاب بھی امام صاحب کی اپنی تفسیر یعنی تفسیر حسن عسکری مطبوعہ ایران ص ۱۶۴، ۱۶۵ ۔

هذا وصية رسول الله صلى الله عليه وسلم لكل اصحابه وامته حين صار الى الغار ان الله تعالى اوصى اليه يا محمد ان العلى الاعلى يقرئك السلام ويقول لك ان اباجهل والملأ من قريش دبروا عليك يريدون قتلك وأمرك ان تبيت عليا وقال لك منزلته منزلة اسحاق الذبيح ابن ابراهيم الخليل يجعل نفسه لنفسك فداء وروحه لروحك وقاء وامرك ان تستصحب ابا بكر فانه ان آنسك واسعدك وآزرك وثبت على ما يتعهد ويعاقدك كان في الجنة من رفقائك وفي غرفاتها من خلصائك فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لعلى ارضيت ان اطلب فلا اوجد وتطلب فتوجد فلعله ان يبادر اليك الجهال فيقتلوك قال بلى يا رسول الله صلى الله عليه وسلم رضيت ان يكون روحي لروحك وقاء ونفسي لنفسك فداء بل رضيت ان يكون روحي ونفسي فداء لك اوقريب منك اوبعض الحيوانات تمتهنها وهل احب الحيوة الا لمتصرف بين امرك ونهيك ونصرة اصفيائك ومجاهدة اعدائك ولولا ذلك لما احب ان اعيش في الدنيا ساعة واحدة فقبل رسول الله صلى الله عليه وسلم رأسه فقال له يا ابا الحسن قد قرأ على كلامك هذا الموكلون باللوح المحفوظ وقرؤا على ما اعد الله لك من ثوابه في دار القرار مالم يسمع بمثله السامعون ولا رأى بمثله الراؤن ولا خطر ببال المفكرين ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لابي بكر ارضيت ان تكون معي يا ابا بكر تطلب كما اطلب وتعرف بانك انت الذي تحملني على ما ادعيه

فتحمل عنی انواع العذاب قال ابوبکر یا رسول اللہ اما انا لو عشت عمر الدنیا اعذب فی جمیعها اشد عذاب لا ینزل علی موت مریح ولا فرح ملیح وکان ذلك فی محبتك لکان ذلك احب الی من ان اتنعم فیها وانا مالك لجمیع ممالیك ملوکها فی مخالفتك وهل انا ومالی وولدی الا فداك فقال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لاجرم ان اطلع اللہ علی قلبك ووجده موافقاً لماجری علی لسانك جعلك منی بمنزلة السمع والبصر والرأس من الجسد وبمنزلة الروح من البدن کعلی الذی هو منی کذلك ۔ الخ

یعنی جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہجرت کے موقعہ پر غار کی طرف تشریف فرما ہوئے تو اپنے صحابہ اور اپنی امت کو یہ وصیت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف جبریل علیہ السلام کو بھیج کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ پر (صلاۃ سلام بھیجتا ہے ۔ اور فرماتا ہے کہ ابوجہل اور کفار قریش نے آپ کے خلاف منصوبہ تیار کر لیا ہے اور آپ کے قتل کرنے کا ارادہ کر چکے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپ علی المرتضیٰ کو اپنے بستر پر شب باشی کا حکم دیں اور فرمایا ہے کہ ان کا مرتبہ آپ کے نزدیک ایسا ہے جیسا اسحاق ذبیح کا مرتبہ تھا (حالانکہ ذبیح حضرت اسماعیل ہیں مگر اہل کتاب اسحاق کو ذبیح کہتے ہیں) حضرت علی اپنی زندگی اور روح کو تیری ذات مقدس پر فدا اور قربان کریں گے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ ہجرت میں ابوبکر صدیق کو اپنا ساتھی مقرر فرمائیں کیونکہ اگر وہ حضور کی رفاقت اختیار کر لیں اور حضور کے عہد و پیمان پر پختہ کار ہو کر ساتھ دیں تو آپ کے رفقا جنت میں سے ہوں گے اور جنت کی نعمتوں میں آپ کے مخلصین سے ہوں گے پس حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت علی کو فرمایا کہ اے علی اس بات پر راضی ہیں کہ میں طلب کیا جاؤں تو دشمن کو نہ مل سکوں اور تم طلب کئے جاؤ تو مل جاؤ اور شاید جلدی میں تیری طرف پہنچ کر بے خبر لوگ تجھے (شبہ میں) قتل کر دیں ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ

میں راضی ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ میری روح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روح مقدس کا بچاؤ ہو اور میری زندگی حضور کی زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مقدس پر فدا ہو بلکہ میں اس پر بھی راضی ہوں کہ میری روح اور میری زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی (رفیق) پر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض حیوانات پر قربان اور فدا ہو ۔ حضور میرا امتحان لے لیں ۔ میں زندگی کو پسند ہی اس لیے کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی تبلیغ کروں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستوں کی حمایت کروں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے خلاف جنگ کروں ۔ اگر یہ نیت نہ ہوتی تو میں دنیا میں ایک ساعت بھی زندگی پسند نہ کرتا پس حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر مبارک کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ اے ابوالحسن تیری یہی تقریر مجھے لوح محفوظ کے موکلین ملائکہ نے (لوح محفوظ) سے پڑھ کر سنائی ہے ۔ اور جو تیری اس تقریر کا ثواب اور بدلہ اللہ تعالیٰ نے آخرت میں تیرے لیے تیار فرمایا ہے وہ بھی پڑھ کر سنایا ہے وہ ثواب جس کی مثل نہ سننے والوں نے سنی ہے نہ دیکھنے والوں نے دیکھی ہے نہ ہی عقلمند انسانوں کے دماغ میں آسکتی ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے ابابکر تو میرے ہمراہ چلنے کے لیے تیار ہے تو بھی اسی طرح تلاش اور طلب کیا جائے گا جیسا میں اور تیرے متعلق دشمنوں کو یہ یقین ہو جائے کہ تو ہی نے مجھے ہجرت کرنے اور دشمنوں کے مکر اور فریب سے بچ کر نکلنے پر آمادہ کیا ہے تو میری وجہ سے ہر قسم کی مصیبت اور دکھ برداشت کرے ؟ صدیق اکبر نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر میں قیامت تک زندہ رہوں اور اس زندگی میں سخت ترین عذاب و دکھ اور مصائب میں مبتلا رہوں جس مصیبت والم سے نہ مجھے موت بچانے کے لیے آسکے اور نہ کوئی دوسرا سبب آرام دے سکے اور یہ سب کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ہو تو مجھے بطیب خاطر منظور ہے اور مجھے یہ پسند نہیں کہ اتنی لمبی زندگی

ہوا اور دنیا کے بادشاہوں کا بادشاہ بن کر رہوں اور تمام نعمتیں اور آسائشیں حاصل ہوں، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت سے محروم ہوا اور میں اور میرا مال سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا اور قربان ہے بس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ تیرے دل پر مطلع ہے۔ اور جو کچھ تو نے کہا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو تیری دلی کیفیت اور وجدان کے مطابق پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے بمنزلہ میرے گوش مبارک اور بمنزلہ میری آنکھوں کے کیا ہے اور جو نسبت سر کو جسم سے ہے اللہ تعالیٰ نے تجھے اس طرح بنایا ہے اور جس طرح روح کی نسبت بدن سے ہے میرے لیے تو اسی طرح ہے جیسا کہ علی رضی اللہ عنہ میرے نزدیک ہیں"

اگرچہ اس روایت میں فضیلت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ روز روشن سے بھی زیادہ روشن اور واضح ثابت ہے مگر اہل تشیع نے تصرف اور تحریف فی الروایات کی عادت یہاں بھی نہیں چھوڑی۔

اول یہ کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جب فرمایا گیا تو حرف شرط کے ساتھ یعنی اگر وہ حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اعانت و مساعدت پر کمربستہ ہو جائیں تو وہ دنیا اور آخرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق ہیں۔ یہاں جب اللہ تعالیٰ بھی دلی کیفیات اور حالات پر مطلع ہے اور آپ نے حضرت صدیق نے حسب علم الٰہی وہی کچھ عرض کی جس کی وجہ سے حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک بمنزلہ سمع مبارک وچشم مبارک اور روح مقدس ثابت ہوئے تو پھر شرطیہ جملہ صاف تحریف و تصرف فی الروایات پر دلالت کر رہا ہے۔ جو قلبی غل و غش پر مبنی ہے۔

دوسرا روایت کے آخر میں یہ جملے کہ وعلی فوق ذلك لزيادة فضائله وشرف خصاله یعنی علی رضی اللہ عنہ۔ اس سے زیادہ ہیں کیونکہ ان کے فضائل اور شرف خصائل زیادہ ہیں۔ ارے سمع و بصر اور راس و روح نبوت پناہ سے کون سی زیادتی متصور ہے۔

بہر صورت اہل تشیع کی معتبر ترین کتب بھی خلفائے راشدین کے فضائل وعلو مرتبت کو اپنے اوراق میں جگہ دینے پر مجبور نظر آتے ہیں والحسن ماشهدت به الاعداء ائمہ طاہرین کے ارشادات کو ہر حیلے سے ردوبدل کرنے اور توڑنے موڑنے و تصرفات کرنے کی انتہائی کوشش کی مگر خلفاء راشدین کی شان کو آنچ نہ آئی۔

تنزیہ الامامیہ — از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

امام حسن عسکری کی تفسیر سے منقول اس طویل و عریض روایت سے پیر صاحب کی تائید کی بجائے تردید ہوتی ہے۔ اس روایت میں صرف دو جملے ایسے ہیں کہ جن سے بظاہر مؤلف کی مطلب برآری ہوتی ہے لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو اس سے ان کے دعویٰ پر ضرب کاری پڑتی ہے۔

پہلا جملہ: امرك ان تستصحب ابابكر فانه ان آنسك واسعدك و آزرك وثبت على ما يتعاهدك ويعاقدك الخ اور تمہیں حکم دیا ہے کہ ابوبکر کو آپ ہجرت میں ساتھ رکھیں۔ اگر وہ حضور کی رفاقت اختیار کریں الخ ارباب عقل ودانش فرمادیں اس مشروط کلام میں پیر صاحب کے چہیتے خلیفہ کی کونسی مدح و ثنا کی گئی ہے۔ بلکہ اس سے تو سراسر خلیفہ صاحب کی قدح ظاہر ہوتی ہے۔ اور ان کے ایمان و ایقان، ان کی نصرت و اعانت اور عہد و پیمان پر بقاء و ثبات کو بالکل مشکوک و مشتبہ کر دیا گیا ہے۔ اور اس روایت میں ان صفات جمیلہ کے ابوبکر صاحب کے اندر پائے جانے کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ہے بلکہ بطور جملہ شرطیہ مذکور ہے اور بموجب اذا فات الشرط فات المشروط جناب ابوبکر میں ان صفات کا نہ پایا جانا اہل علم وانصاف کے لیے اظہر من الشمس ہے۔ اگر ان میں یہ شرائط پائے جاتے تو پھر یہ اگر مگر کی تکرار نہ ہوتی۔

دوسرا جملہ: ان اطلع الله على قلبك ووجده موافقا لما جرى على لسانك الخ ہے اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اگر خداوند عالم تیری دلی کیفیت پر مطلع ہوا اور اسے

تیرے زبانی اظہار عقیدت کے موافق پایا تو تجھے بمنزلہ میرے کان، آنکھ، سر اور روح کے قرار دے گا۔ جس طرح حضرت علی کو مجھ سے یہی منزلت حاصل ہے۔

اس جملہ میں بھی مثل سابق حرف شرط ان موجود ہے۔ جس سے خلیفہ صاحب کی وفاداری اور اظہار ارادت و عقیدت مشتبہ اور مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے

(۳) اس جملے کا یہ ترجمہ کرنا یقیناً اللہ تعالیٰ تیرے دل پر مطلع ہے مترجم کی جہالت یا تجاہل کی کھلم کھلا دلیل ہے۔ ورنہ إنّ حرف تحقیق اور ان حرف شرط میں جو نمایاں فرق ہے وہ مبتدی طلبہ بھی جانتے ہیں۔

(۴) تفسیر امام حسن عسکری کی نسبت کی صحت میں ہمیشہ علماء کرام کے درمیان اختلاف رہا ہے محققین کی تحقیق یہ ہے کہ یہ نسبت صحیح نہیں ہے لہٰذا جب تک اس کتاب کے مندرجات کی دوسری روایات معتمدہ سے تائید نہ ہو جائے اس وقت تک قابل اعتبار نہیں۔ رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۱۲۷ تا ۱۲۹!

تحفہ حسینیہ — از محمد اشرف السیالوی غفرلہ

علامہ صاحب موصوف نے ابلیس کو خوش کرنے کے لیے پوری کوشش صرف کی ہے اور مقبولان بارگاہ خداوند تعالیٰ اور محبوبان بارگاہ رسالتمآب اور ولایت پناہ کی شان اقدس جہاں سے بھی ثابت ہوتی نظر آئے اپنی امکانی کوشش کے ذریعے اس کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور انہی ناپاک کوششوں میں سے ایک یہ بھی ہے ہمیں بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دشمنی اپنی جگہ مگر دشمن بھی خاندانی ہو تو اس کی دشمنی بھی کسی ضابطہ اور اخلاقی تقاضوں کے تحت ہوا کرتی ہے۔ لیکن کمینہ دشمن ہو تو وہ دشمنی میں کسی ضابطہ، اخلاق اور اصول پرستی سے کام نہیں لیتا۔ بدقسمتی سے ڈھکو صاحب بھی صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ہی دشمنوں میں سے ہیں۔

اب ذرا علمی لحاظ سے اس جوابی کوشش کا تجزیہ پیش کرتا ہوں اور ارباب

عقل و دانش کو دعوت غور و فکر دیتا ہوں کہ وہ اس پس منظر میں میری سابقہ گزارش کا جائزہ لیں۔ ڈھکو صاحب نے چار سوال یہاں اٹھائے ہیں ایک کا تعلق حضرت شیخ الاسلام کی ذات سے ہے اور تین کا تعلق روایت اور اس سے استدلال کرنے کے ساتھ ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ اور محبوب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا اعتماد

پہلا سوال: یہ جملہ شرطیہ ہے اور مشروطی کلام میں حضرت ابوبکر صدیق کے لیے کوئی وجہ فضیلت ثابت نہیں ہو سکتی بلکہ الٹا قدح اور اعتراض ہے اور مشروط خوبیاں ان میں مشکوک اور مشتبہ ہو کر رہ گئی ہیں بلکہ اہل علم اور انصاف کے نزدیک وہ خوبیاں نہیں پائی گئیں اور جب شرط نہ پائی گئی تو مشروط بھی نہ پایا گیا لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ قضیہ شرطیہ سے آپ کی خوبیاں مشکوک کیونکر ہوئیں۔

(۱) کیا اللہ تعالیٰ نے جو انہیں ساتھ رکھنے اور رفیق سفر بنانے کا حکم دے دیا وہ بھی مشروط تھا قطعاً نہیں اور جب وہ حکم مشروط نہیں تھا تو واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ میں یہ شرائط موجود اور متحقق تھے ورنہ اتنے طویل اور انتہائی خطرناک سفر میں ایسے شخص کو ساتھی بنانے کا حکم کیونکر دیا جا سکتا تھا جو نہ مونس و غمخوار ہو اور نہ ہمدرد و معاون ہو۔ اللہ تعالیٰ جیسا کریم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا محب جس کو ساتھ رکھنے کا حکم دے رہا ہے یقیناً وہ ان سب اوصاف کے ساتھ موصوف ہے ورنہ یہ محبت کا تقاضا نہ ہوا بلکہ مزید آپ کو پریشانی میں مبتلا کرنے والا معاملہ ہو گیا۔ ایک تو وطن، گھر بار اور کعبہ معظمہ جیسی جگہ سے دوری دوسرا ایسا ساتھی ساتھ رکھنے کا حکم جو کسی بھی وقت عہد شکنی کر کے جان لیوا بن سکتا ہو۔ نعوذ باللہ بلکہ اس حکم کے بعد یہ یقین رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا رفیق عطا فرمایا جو مکمل طور پر سامان راحت و تسکین مہیا کرنے والا تھا۔ اور اس کی رفاقت میں ہر غم و اندوہ اور بوجھ اور گرانی کافور ہو جانے والی تھی۔

۲۔ عملی طور پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو رفیق سفر بنایا اور ساڑھے تین سو میل کا طویل اور کٹھن سفر طے کیا اس دوران سواریاں مہیا کرنے والا کون تھا؟ خورد و نوش کا سامان مہیا کرنے والا کون تھا؟ اور دشمنوں کی دیکھ بھال اور تاک اور تناڑ رکھنے والا کون تھا؟ دو ہفتے کے قریب وقت اس سفر میں صرف ہوا بمع غار والے وقت کے اس سارے عرصے میں ہر ممکنہ خدمت کرنے والا سوائے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کوئی نہیں تھا تو حقائق اور واقعات نے شرط کا تحقق واضح کر دیا کہ آپ نے حق مؤانست بھی ادا کیا اور تعاون و امداد کی بھی ہر امکانی کوشش کی اور عہد وفا اور پیمان اخلاص کو پوری طرح نبھایا لہذا مشروط اور جزاء کا تحقق یعنی جنت میں بھی آپ کا رفیق ہونا اور اس کے بالاخانوں میں آپ کے مخلص صحابہ اور امتیوں میں سے ہونا بھی قطعی طور پر ثابت ہو گیا ڈھکو صاحب کی مثال ایسے ہی ہے جیسے انہیں کہا جائے اگر سورج طلوع ہو گیا تو دن ہو جائے گا اور وہ کہتے رہیں یہاں تو دن ہونے کو مشروط کر دیا گیا ہے طلوع آفتاب سے لہذا دن ہونے کا کوئی یقین نہیں کیونکہ ان شرطیہ ہے۔ دوسرا آنکھ والا شخص آئے اور کہے علامہ صاحب صرف ان کو ہی نہ دیکھتے رہو عین شمس کو بھی دیکھ لو وہ عیاں ہے اور دیکھو سارا جہان روشن ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں نہیں نہیں کتاب میں اور قول میں ان شرطیہ ہے لہذا سورج طلوع ہونے کا معاملہ بھی مشکوک ہے اور دن موجود ہونے کا بھی اگر دن موجود ہوتا تو پھر اگر مگر کی ضرورت کیا تھی۔

صدق شرطیہ کا دار و مدار اور نتیجہ کا معیار

۳۔ جو امور بطور قضایا شرطیہ ذکر کئے جائیں ان میں شرط و مقدم کے تحقق سے جزاء اور تالی کا تحقق معلوم کر لیا جاتا ہے۔ یا مشروط اور تالی کے عدم اور انتفاء سے مقدم اور شرط کا انتفاء معلوم کر لیا جاتا ہے۔ نہ کہ ان کا معاملہ ہمیشہ معلق اور مشکوک و مشتبہ ہو کر رہ جاتا ہے لہذا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ہجرت کے دوران

موانست اور امداد و معاونت اور تائید و تقویت اور آپ کے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق جنت ہونے میں تلازم ثابت اور مشاہدہ اور حس سے حضرت صدیق کی وفا شرط ثابت لہذا جزاء بھی قطعی اور حتمی طور پہ ثابت۔ اس مقام پر ڈھکو صاحب کا یہ کہہ دینا کہ ارباب علم اور انصاف کے نزدیک ابوبکر صاحب میں ان صفات کا نہ پایا جانا اظہر من الشمس ہے ایک ایسا دعویٰ ہے جس کو کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس زبان پر نہیں لا سکتا۔ بلکہ آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل کا اندھا ہی اس قسم کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ ڈھکو صاحب کو بتلانا چاہئے کہ کونسی بے وفائی ابوبکر صدیق نے کی اور کس جگہ امداد و تعاون کو ترک کیا اور کہاں سامانِ انس و محبت لوٹ لیا محل نزاع میں بداہت کا دعویٰ کرنا پھر اہل علم کہلانا اور مناظر اعظم ہونے بلکہ مجتہد اور حجت اسلام ہونے کا دعوی کرنا ہے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ہر طالب علم اس حقیقت سے باخبر ہے کہ اختلافی مسئلہ نظری ہوتا ہے اور وہاں دعویٰ بداہت باطل ہوتا ہے۔

(۴) بیوی، بچیوں اور بچوں کو اہل مکہ کے پاس چھوڑ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے والا ابوبکر صدیق دیکھ رہا تھا کہ میری اولاد اور عزت کے لیے کیا کیا خطرات ہیں اور خود میرے لیے کیا کیا خطرات ہیں جن کی طرف خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی توجہ دلائی کہ جس طرح ہمیں طلب کیا جائے گا تمہیں طلب کیا جائے گا بلکہ یہ سمجھا جائے گا کہ ان کو نبوت کا دعویٰ کرنے پر اگر آمادہ اور برانگیختہ کیا ہے تو ابوبکر صدیق نے اور تمہیں میری وجہ سے انواع و اقسام کی تکالیف برداشت کرنا پڑیں گی۔ لہٰذا سوچ لو اور اچھی طرح غور و فکر کر لو جس کے جواب میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں قیامت تک زندہ رہوں اور ہر عذاب اور مصیبت مجھ پر ٹوٹ پڑے نہ موت آئے تاکہ راحت ملے اور نہ فرحت و سرور کی کوئی ساعت نصیب ہو۔ جس سے غموں کی نہ ختم ہونے والی سیاہ رات میں مسرت کی کوئی جھلک

نظر آسکے مگر یاں ہم ہو تمہاری محبت میں تو یہ زندگی مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں قیامت تک زندہ رہوں اور ہر نعمت مجھے میسر اور حاصل ہو اور میں دنیا کے بادشاہوں کا بادشاہ ہوں لیکن آپ کی معیت اور رفاقت نصیب نہ ہو اور نہ محبت و عشق میں خود میری اولاد اور میرا مال سب آپ پہ قربان ہونے کے لیے ہی تو ہیں کیا ان حالات میں اس عمل اور اس اقرار و اعتراف اور اظہار و اعلان کے بعد بھی کوئی عقل سے بہرہ ور انصاف کی دولت سے مشرف شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ ایسا فدائی اور جانثار ان شرائط پر پورا نہیں اترا تھا۔

یہ تو ہو سکتا تھا کہ محبت و عقیدت اور ایمان و اخلاص کے باوجود حالات کی سنگینی کے تحت ابوبکر صدیق معذرت کر لیتے اور رخصت و اجازت لے لیتے اور اعلیٰ درجہ کے فدائیوں کا کردار ادا نہ کر سکتے لیکن العیاذ باللہ ایمان اور اخلاص بھی نہ رکھتے ہوں اور محبت و الفت بھی نہ ہو مگر بلا وجہ اہل مکہ کو اور قریش کو اپنا بھی دشمن بنا لیں اور اپنی بیوی بچیوں کا بھی خیال نہ رکھیں کسی عقل مند اور صاحب انصاف کا عقل و انصاف اس کو جائز نہیں رکھ سکتا آخر ایسے مؤمن بھی تھے جنہوں نے ہجرت بھی نہ کی تھی جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیھا۔ کیا تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی زمین یعنی مدینہ منورہ میں گنجائش نہ تھی کہ تم بھی ہجرت کر کے اس میں جا بستے تو اگر ابوبکر صدیق سراپا اخلاص اور مجسمۂ وفا نہ ہوتے اور ان کا سارا گھرانا شمع رسالت کا پروانہ نہ ہوتا تو سفر ہجرت کی رفاقت کیونکر ممکن ہوتی۔

(۵) آیئے ذرا ناسخ التواریخ سے اس واقعہ ہجرت کی ایک دو جھلکیاں ملاحظہ فرما لیں تاکہ وفاء عہد اور پیمان اخلاص کی تکمیل کا قدرے اندازہ ہو سکے اور وہ بھی دشمن صدیق کی زبان سے قلم سے۔

(۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کی گرمی میں طیلسان سر اقدس پر رکھے ابوبکر صدیق کے ہاں تشریف لائے اور فرمایا: گھر کو اپنوں اور بیگانوں سے خالی

کرادو تو ابوبکر صدیق نے عرض کیا۔ بابی انت و امی یا رسول اللہ در خانہ جز من و دو دختر من کہ یکے از آنہا نیز اہل تست کس نمے باشد آنحضرت فرمود خداوند باری مرا اذن ہجرت داد ابوبکر گفت الصحبۃ یا رسول اللہ یعنی میخواہم مصاحب تو باشم آنحضرت فرمود چنیں باشد ابوبکر از شادی بگریست ص۳۴ ناسخ التواریخ جلد اول کتاب دوم۔

میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں گھر میں میرے علاوہ اور میری دو بچیوں کے علاوہ کوئی فرد نہیں اور ان بچیوں میں سے ایک آپ کی بیوی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا تعالیٰ نے مجھے ہجرت کی اجازت دے دی ہے۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا میں آپ کی مصاحبت اور رفاقت کا طلب گار ہوں آپ نے فرمایا ایسے ہی ہو گا یہ سن کر حضرت ابوبکر کے خوشی سے آنسو چھلک پڑے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوبکر صدیق کی ذات پر مکمل اعتماد اور اعتبار تھا اور وہ گویا اسی انتظار میں تھے لہٰذا مژدہ سنانے کے لیے آپ خود تشریف لے گئے اور شرف رفاقت کا مژدہ سن کر حضرت صدیق کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

(۲) صاحب منہج الصادقین کہتا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت پر ابوبکر صدیق کے گھر سے ہی روانہ ہوئے یعنی بستر پہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سلایا اور خود حضرت صدیق اکبر کے گھر پہ ٹھہرے اور پچھلی رات کو وہاں سے غار ثور کی طرف روانہ ہوئے۔ امیر المؤمنین را بر جائے خود بخوابانید و خود از خانہ ابوبکر برفاقت او بیروں آمدہ بداں غار توجہ نمود ص۴۶۰ جلد چہارم)

مفسر شیعہ فتح اللہ کاشانی کے اس اعتراف کے بعد بھی چون و چرا کی کوئی گنجائش ہو سکتی ہے؟

(۳) حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ تین دن رات غار میں ہی قیام رہا اور عروہ کہتے ہیں کہ ابوبکر کے غلام عامر بن فہیرہ بھیڑ بکریوں کو غار کے دروازے پر لے جاتے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کا دودھ نوش

فرماتے۔ اور قتادہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر صبح اور شام خفیہ طور پہ آتے اور دونوں حضرات کے لیے کھانا لے جاتے تفسیر منہج الصادقین جلد چہارم ص۲۶۱۔

(۴) پہلا کھانا جو تیار کر کے ان راہروان منزل شوق کو دیا گیا وہ ابوبکر صدیق کی لخت جگر حضرت اسماء نے تیار کیا اور کمربند پھاڑ کر اس کے ایک حصہ کو بطور دسترخوان استعمال کیا اور اس میں وہ کھانا باندھا جبکہ دوسرا حصہ بطور کمربند باندھا از یں رو باسماء ذات النطاقین ملقب گشت اسی وجہ سے آپ کا لقب ذات النطاقین یعنی دو کمربند والی پڑ گیا وعبداللہ بن ابی بکر را فرمود روز در میان کفار زیستن کند و شبانگاہ خبر کفار را بایشاں بغار تور برد ناسخ ص۳۴۲ اور عبداللہ بن ابی بکر کو حکم دیا کہ دن کا وقت کفار کے ہاں گزارا کریں اور شام کے وقت ان کی خبر ہمیں پہنچایا کریں۔

(۵) ابوبکر پنجہزار درم در خانہ ذخیرہ داشت با خود حمل نمود گھر میں پانچ ہزار درہم کا ذخیرہ تھا وہ بھی سارے کا سارا ذخیرہ اپنے ساتھ لے لیا اور جب حضرت ابوقحافہ کو ہجرت کا علم ہوا اور دراہم کے متعلق گمان کیا کہ سبھی اپنے ہمراہ لے گئے ہیں تو افسوس کا اظہار کیا کہ ابوبکر شمارا در سختی گذاشت و آنچہ داشت با خود ہمراہ برد۔ ابوبکر تمہیں مشقت اور تنگدستی کی حالت میں چھوڑ گیا ہے اور جو کچھ اپنے پاس رکھتا تھا وہ بھی ساتھ ہی لے گیا تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہ نے چند ٹھیکریاں کپڑوں میں لپیٹ کر ان کے سامنے رکھ کر ان کا ہاتھ اوپر رکھا کیونکہ ان کی بینائی جا چکی تھی اور کہا دیکھو گھر میں دینار و درہم موجود ہیں۔ این زر ست کہ ابوبکر برائے ما نہادہ است ابوقحافہ باور داشت۔ ناسخ جلد اول ص۳۴۸۔

(۶) ابوجہل لعین جب حقیقت حال پر مطلع ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھوں سے نکل گئے تو سیدھا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دولت کدہ پہ پہنچا اور اپنا جتھا بھی ہمراہ تھا۔ حضرت اسماء سے دریافت کیا پدرت کجا است اسماء گفت من نمیدانم طمانچہ سخت بر روئے او زد کہ گوشوارش بیفتاد و از انجا بگذشت تیرے باپ کدھر ہیں تو انہوں نے کہا میں نہیں جانتی اس نے زوردار طمانچہ ان کے چہرے پہ مارا جس سے ان کے کان

چر گئے اور بالیاں گر گئیں اور پھر وہاں سے چلا گیا۔

(۷) غار سے نکل کر عازم مدینہ ہوئے تو ایک اونٹ پہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق سوار ہوئے اور دوسرے پہ عامر بن فہیرہ اور عبداللہ بن اریقط سوار ہوئے اور راہ میں ابوبکر صدیق کے واقف لوگ ملتے۔ کیونکہ آپ اسی راستہ سے شام کی طرف بغرض تجارت جایا کرتے تھے تو وہ دریافت کرتے من معک تمہارے ساتھ کون ہیں۔ تو آپ فرماتے رجل یھدینی السبیل یعنی این مرد دلیل راہ ماست و شنوندہ چناں گماں میکرد کہ قصد او راہ مدینہ است ناسخ جلد اول ص۳۴۸۔ یہ وہ شخص ہیں جو مجھے راہ دکھلاتے ہیں اور سننے والا یہ سمجھتا کہ راستہ سے آپ کی مراد مدینہ کا راستہ ہے۔ یہ شخص واقف ہیں اور ابوبکر اس راہ سے واقف نہیں ہیں جبکہ آپ کا مقصد حقیقی اللہ کی راہ ہوتا تھا یہ وہ ہستی ہے جو مجھے اللہ تعالیٰ کا راستہ دکھلانے والی ہے۔

الغرض ان واقعات سے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے اس دعوی کی عملی دلیل اور واقعاتی شہادت مل جاتی ہے جس میں آپ نے کہا تھا " ھل انا ومالی وولدی الا فداک یا رسول اللہ میں خود میرا مال اور میری اولاد سب آپ پہ فدا اور قربان ہیں اور یاد رہے صاحب ناسخ نے تصریح کی ہے کہ میں نے ہجرت کے متعلق جو روایات نقل کی ہیں یا آئندہ کروں گا وہ شیعہ وسنی دونوں فریق کی متفق علیہ ہیں اور کہیں اختلاف ہوگا تو میں اپنا نظریہ واضح کر دوں گا۔ ملاحظہ ہو ص۳۴۵ جلد اول۔

الغرض اس سفر کی پوری تفصیلات کتب سیر اور تواریخ میں موجود ہیں یہاں صرف نمونہ کے طور پر چند عبارات مختصراً عرض کی ہیں تا کہ چشم بینا اور عقل سلیم پہ واضح ہو جائے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شرائط موانست و موالفت، امداد و تعاون اور اطاعت و خدمت گزاری کی انتہا درجہ رعایت فرمائی اور ان کو کما حقہ ادا فرمایا جب شرائط کا موجود ہونا واقعات اور مشاہدات اور عقل سلیم کی شہادت اور مخالف کے اقرار و اعتراف سے واضح ہو گیا تو اس کے بعد مشروط اور جزا کے تحقق و ثبوت میں شک و شبہ کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی۔

۸۔ جب غار کے سرے پر کفار کو موجود دیکھ کر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف اور ایذا رسانی کے خیال سے حزن و ملال لاحق ہوا تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ماظنك باثنين الله ثالثهما" ان دو اشخاص کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے جن کے ساتھ تیسری اللہ تعالیٰ کی ذات ہو۔ ناسخ جلد اول ص۳۵

اور اسی کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اذ يقول لصاحبه لا تحزن ان الله معنا" جبکہ وہ اپنے یار غار سے کہہ رہے تھے غمگین نہ ہو بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ ذرا غور فرمایئے اللہ تعالیٰ کی معیت جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی۔ اسی طرح آپ نے اس کو حضرت ابوبکر صدیق کے لیے بھی ثابت فرمایا اور اس کی گواہی دی۔ اب یہ ڈھکو صاحب اور اس کی برادری کا کام ہے کہ قرآن مجید سے دکھلائیں کہ اللہ تعالیٰ مشکوک اخلاص و ایمان والوں کے ساتھ ہوتا ہے یا کامل ایمان و اخلاص والوں کے ساتھ اسی طرح وہ عہد شکن اور غدر پیشہ لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے یا مجسمۂ وفا و اخلاص کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خدمتگذاروں اور جانثاروں کے ساتھ ہوتا ہے یا ان سے جان و مال پیارے رکھنے والوں کے ساتھ

۵ آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشا دیکھے ۔۔۔ دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

(۹) فانزل الله سكينته عليه الآیہ ۔ اہل سنت کے نزدیک اس میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی تسکین قلب مراد ہے کیونکہ حزن و ملال آپ کو لاحق ہوا تھا لہٰذا سامان تسکین بھی آپ کے لیے مہیا کرنا چاہیئے تھا۔ رہا شیعہ صاحبان کا یہ بہانہ اور تعلل کہ دوسری غائب کی ضمیریں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہیں۔ اذ يقول لصاحبه۔ لہٰذا یہ بھی آپ کی طرف ہی راجع ہونی چاہیئے۔ مگر یہ کوئی وزنی اور موجب ترجیح عذر نہیں

(ا) کیونکہ اذھما میں دونوں کو ضمیر غائب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک جگہ مشترکہ طور پر تعبیر کر دیا گیا اور دوسری جگہ علیحدہ علیحدہ تعبیریں پائی گئیں کیونکہ احکام علیحدہ علیحدہ تھے

(ب) چلو اس کو چھوڑتے ہیں مگر جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے دل اقدس پر سکینہ نازل فرمائی اور آپ نے خود مطمئن ہونے کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو مطمئن کر دیا اور چونکہ اطمینان رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام بعینہٖ اطمینان صدیق تھا اس لیے ضمیر واحد پر اکتفا۔ فرما کر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان فنا فی الرسول ظاہر فرما دی اور قرآن مجید میں بہت جگہ یہی اسلوب اور انداز بیان اختیار کیا گیا ہے کما قال والله ورسوله احق ان يرضوه۔ یہاں پر بھی تثنیہ کی جگہ واحد کی ضمیر اسی لیے ذکر کی گئی ہے کہ رضائے خدا رضائے مصطفےٰ ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رضا، رضائے خداوند تبارک و تعالیٰ۔

تو اب اس میں حضرت صدیق کی ذات پر اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔ جیسے کہ شیعہ لوگوں نے یہاں زبان درازی سے کام لیا ہے۔ اور بد باطنی کا مظاہرہ کیا اور اسی کی طرف ڈھکو صاحب نے اہل علم و انصاف کا حوالہ دے کر اشارہ کیا اور حضرت صدیق کی سب قربانیوں کا خوف خدا اور خوف آخرت کو بالائے طاق رکھ کر انکار کر دیا۔

علامہ طبرسی کا شیعہ افسانہ نگاری سے گریز

اس مقام پر ہم علامہ طبرسی کے خاندانی آدمی ہونے اور با اصول مخالف اور دشمن ہونے کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے اس قسم کے توہمات کا ذکر کرنے سے اپنا دامن بچایا اور کہا "وقد ذكرت الشيعة فى تخصيص النبى صلى الله عليه وسلم فى هذه الآية بالسكينة كلاما رأينا الاضراب عن ذكره احرى لئلا ينسبنا ناسب الى شئ" یعنی شیعہ نے سکینہ کے صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کئے جانے کی تخصیص اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ساتھ شامل نہ کرنے میں کلام کیا ہے لیکن ہم اس کے ذکر سے اعراض اور روگردانی کو نہایت موزوں اور مناسب سمجھتے ہیں تاکہ کوئی شخص ہمیں تعصب اور غلو کی طرف منسوب نہ کرے مجمع البیان جلد سوم ص۴۲۔

بالفرض اگر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر سکینت کے نزول کا تذکرہ نہ کرنے سے ان کے ایمان میں کسی کمزوری کا وہم پیدا ہوتا ہے تو کیا قول باری تعالیٰ "ان الله معنا" سے اس قسم کے شیطانی وسوسوں کی بنیاد اکھڑ نہیں جاتی۔ علاوہ ازیں یہ سکینت تو حضرت

صدیق کے اظہار اضطراب کے بعد نازل ہوئی اس سے پہلے تو نہیں نازل ہوئی تھی تو اس وقت تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان میں نعوذ باللہ کسی کمی اور نقص کا توہم کسی مؤمن کو ہو سکتا ہے اور جب نہیں اور یقیناً نہیں تو اس کے بعد بھی حضرت صدیق کے لیے کوئی نقص اور ضعف ایمانی کا توہم نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کیلئے آرام جان اور سامان تسکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے۔ حقیقت حال یہ ہے یہاں مقصودی تذکرہ رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اسی لیے مکہ مکرمہ سے اخراج بھی آپ کا بیان فرمایا۔ اذ اخرجہ الذین کفروا حالانکہ صدیق اور جملہ مہاجرین رضوان اللہ علیہم اجمعین کو کفار نے مکہ مکرمہ سے نکالا اور نصرت کی نسبت بھی آپ کی طرف کی۔ الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ حالانکہ حضرت صدیق کی بھی اللہ تعالیٰ نے امداد و نصرت فرمائی اور دوران ہجرت انہیں کسی حادثہ سے دوچار نہ ہونا پڑا۔ لیکن صدیق آپ کے تابع تھے اور تابع احکام میں متبوع کے ساتھ شامل اور شریک ہوتا ہے اس لیے ان کا علیحدہ ذکر نہیں پایا گیا۔
دیکھئے کلام مجید میں آدم و حوا علیہما السلام کا درخت سے کھانا اور جنت سے نکلنا مشترکہ طور پر بیان کیا ہے لیکن مقام توبہ میں صرف آدم علیہ السلام کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے کما قال تعالیٰ فتلقّٰی آدم من ربّہ کلمات فتاب علیہ الآیۃ تو کیا شیعہ صاحبان کے نزدیک حضرت حوا رضی اللہ عنہا نے توبہ نہیں کی تھی یا اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول نہیں فرمائی بلکہ قبول توبہ میں حضرت حوا آپ کے ساتھ یقیناً شامل تھیں مگر چونکہ آپ کے تابع تھیں لہذا علیحدہ ذکر کی ضرورت نہیں تھی بلکہ یہاں پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فنا فی الرسول والے مقام کو ملحوظ رکھا گیا ہے اسی لیے ان اللہ معنا فرمایا۔
جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے لاکھوں بنی اسرائیل کے ساتھ ہونے کے باوجود "انّ معی ربّی" فرمایا۔ یعنی میرا رب میرے ساتھ ہے۔ کیونکہ دوسروں کو وہ معیت حاصل نہ تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھی۔ بلکہ فنا فی الرسول کے مقام پر فائز ہونے کی وجہ سے وہی معیت صدیق کے لیے ثابت فرمائی جو سرور عالم کو حاصل تھی۔
والحمد للہ علی ذالک

ایک اہم شبہ کا ازالہ

رہا دوسری جگہوں میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ مؤمنین پر بھی سکینت کے نزول کا ذکر جیسے کہ سورۂ فتح میں فرمایا۔ "فانزل اللہ سکینتہ علیٰ رسولہ وعلی المؤمنین" جبکہ اسی سورۂ توبہ میں فرمایا "ثم انزل اللہ سکینتہ علیٰ رسولہ وعلی المومنین" تو وجہ اس کی بالکل واضح ہے کہ وہاں حکم بھی عام بیان کیا جا رہا تھا مثلاً سورۂ توبہ میں پہلے فرمایا "لقد نصرکم اللہ فی مواطن کثیرۃ ویوم حنین" الآیہ اور سورۂ فتح میں اس کی مصلحت و منفعت بیان کرتے ہوئے فرمایا "لیزدادوا ایمانا مع ایمانہم" تاکہ ان کے ایمانوں میں اضافہ ہو اور "لیدخل المؤمنین والمؤمنات الی آخرہ۔" تاکہ اہل ایمان مردوں اور عورتوں کو جنات میں داخل کرے لہٰذا ان دونوں مقامات پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کا قصداً اور ارادۃً حکم بیان کیا گیا۔ جبکہ یہاں قصداً اور ارادۃً صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے اور ضمناً اور بالتبع حضرت صدیق اکبر کا۔ اس لیے وہاں آپ کا اس معاملہ میں شریک ہونا بیان نہیں کیا گیا۔ کیونکہ بلیغ امور ذاتیہ کی رعایت نہیں کرتا بلکہ مقام اور مقتضیٰ حال کی رعایت کرتا ہے۔ ماقبل میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکالے جانے کا ذکر کیا۔ "اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین" اور آپ کی ہی نصرت اور امداد کا ذکر کیا "الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ" اور آپ کے لیے ہی ملائکہ کے نزول کا ذکر کیا "وایدہ بجنود لم تروھا" حالانکہ نکالے ابوبکر صدیق بھی گئے تھے اور جس طرح دوران ہجرت اللہ تعالیٰ کی نصرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شامل حال رہی حضرت صدیق کے بھی شامل حال رہی اور جن جنود سماویہ سے نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و تقویت کی گئی انہیں سے ابوبکر صدیق کی بھی تائید و تقویت فرمائی گئی۔ لیکن اصل مقصود چونکہ سید عرب صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اس لیے بالتخصص آپ کا ہی ذکر فرمایا۔ اسی لیے یہاں بھی اسی اصالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ضمیر واحد ذکر کی گئی ہے۔ اور فرمایا گیا۔ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ (الآیۃ)

علاوہ ازیں سورۂ فتح کی آیت میں یا سورۂ توبہ کی آیت میں جہاں مؤمنین پہ نزول سکینت کا بیان ہے کیا ان میں حضرت ابوبکر صدیق داخل نہیں جب داخل ہیں اور یقیناً داخل ہیں بلکہ ان کے رئیس ہیں تو پھر اس ہرزہ سرائی اور بیہودہ گوئی کا فائدہ کیا ہو سکتا ہے سوائے بغض باطنی کے اظہار کے اور ابلیس کی رضامندی اور شاباش حاصل کرنے کے

حرف شرط لانے کی حکمت اور ایثار صدیق کا تقابلی جائزہ

(۱۰) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایثار عظیم ہے اور اس پر ایمان لانا ہمارا فرض ہے لیکن ذرا غور کریں قبیلہ بنو ہاشم اور بنو عبد مناف کی موجودگی بھی مسلم اور ان کا قومی حمیت و عصبیت اور قبیلہ داری کے تحت ہر ممکن امداد کرنا اور دشمنوں سے تحفظ کی کوشش کرنا بھی مسلم اور کفار و مشرکین کا انتہائی بد باطنی کے باوجود فرد واحد کو شبخون کے ذریعے شہید کرنے کی کمینہ حرکت سے کوسوں دور ہونا بھی مسلم اس لیے جو اخلاص اور جانثاری و جانسپاری کا مظاہرہ ان حالات میں اس قدر طویل سفر پر صرف دو اشخاص کے جانے میں ہے وہ کسی دوسری جگہ نہیں ہے اس لیے اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر کوئی اہل علم اور اہل انصاف نہیں رہ سکے گا کہ جس انس و محبت اور امداد و اعانت اور خدمت گذاری اور وفاداری کا ثبوت ابوبکر صدیق نے دیا ہے اس کی مثال بلکہ نظیر ملنی مشکل بلکہ ناممکن ہے اور یہیں سے ان حرف شرط لانے کی حکمت بھی واضح ہو جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو حتمی اور قطعی علم تھا لیکن سفر اتنا کٹھن اور صبر آزما تھا اور اس رفاقت میں مصائب و آلام اور تکالیف و شدائد کا سخت خطرہ تھا جس کے تحت متیقن کو معرض مشکوک میں ذکر کر دیا اور حتمی و قطعی موانست اور وفاداری کو محتمل اور مرجو صورت میں ذکر فرما دیا۔ اور کتنے مقامات پر قرآن مجید میں مختلف حکمتوں کے تحت اسی اسلوب بیان کو اختیار کیا گیا ہے "قال تعالیٰ: یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ" اے رسول گرامی جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اس کی تبلیغ کرو اگر تم نے تبلیغ نہ کی تو تم نے اللہ کی رسالت کی تبلیغ نہ کی اور فریضہ رسالت کو ادا نہیں کیا۔

کیا کوئی بد باطن کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغ رسالت فرمانا مشکوک تھا۔ قال اللہ تعالیٰ۔ ان کان للرحمن ولد فانا اول العابدین" اگر رحمن تبارک و تعالیٰ کے لیے بیٹا ہو تو میں سب سے پہلا اس کا عبادت گزار ہوں گا، تو کیا یہاں بھی کوئی شقی ازلی یہ کہہ سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹا ہونا ممکن تھا اور آپ اس میں متردد تھے؟ العیاذ باللہ۔ لہٰذا یہاں بھی مخصوص حالات اور دل کو لرزا دینے والے مصائب و شدائد کو سامنے رکھتے ہوئے یہ حکیمانہ انداز اختیار فرمایا ہے۔ اور چونکہ حضرت علی کے لیے اس قسم کے حالات در پیش نہیں تھے لہٰذا وہاں ان شرطیہ لانے اور اس متیقن کو صورت محتمل میں ذکر کرنے سے اجتناب فرمایا۔ بشرطیکہ کلام امام میں صحیح سند کے ساتھ کلمہ ان شرطیہ کا تحقق ثابت ہو۔ لیکن ڈھکو صاحب کی الٹی منطق کے تحت اگر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ میں ان شرائط اور صفات کمال کا پایا جانا مشکوک ہو گیا تو ڈھکو صاحب کو بتلانا پڑے گا کہ شک و شبہ کس کو ہوا۔ اس کلام کا متکلم اللہ تعالیٰ ہے اور مخاطب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو کیا متکلم یعنی اللہ تعالیٰ کو شک ہو گیا تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کہ مخاطب ہیں العیاذ باللہ تعالیٰ اور جب یہ باطل ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ یہاں حرف شرط کو شک و شبہ کی وجہ سے نہیں لایا گیا بلکہ اس حکمت کے پیش نظر جو ہم نے ذکر کی ہے۔ نیز بقول ڈھکو صاحب اہل تشیع کا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر علم میں سبقت لے جانا لازم آئے گا۔ کہ انہیں تو ابوبکر کی بے وفائی اور عہد شکنی کا یقین ہو گیا مگر اللہ تعالیٰ اور اس کا محبوب شک و شبہ میں ہی رہ گئے اور اگر مگر کے چکر میں "تلک عشرۃ کاملۃ۔ فہاتوا برہانکم ان کنتم صادقین" بحمدہ تعالیٰ ڈھکو صاحب کے اس ظلمانی خیال اور توہم کا آفتاب کی مانند روشن دس وجوہ سے رد ہو گیا اور وہ تار عنکبوت سے کمزور شبہ بے نام و نشان ہو کر رہ گیا۔

۲۔ دوسرا جملہ :۔

علامہ ڈھکو صاحب کو دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مخلصانہ اور نیاز مندانہ جواب میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان اطلع اللہ علی قلبک الخ اگر اللہ تعالیٰ تیرے دل پر مطلع ہوا اور تیرے زبانی اظہار عقیدت کو دل کے مطابق پایا تو تیرا میرے ساتھ وہ تعلق قائم کر دے گا جو کان اور آنکھ سر اور روح کو میرے بدن سے ہے۔ لہٰذا یہ بھی مثل سابق حرف شرط پر مشتمل ہے۔ جس سے خلیفہ صاحب کی وفاداری اور اظہار عقیدت مشتبہ اور مشکوک ہو کر رہ گئے ہیں۔

اس بیان شقاوت نشان اور حماقت ترجمان میں بھی ڈھکو صاحب نے علم و فہم اور عقل و دانش کو خیرباد کہہ کر سید الصدیقین اور رفیق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بغض و عناد اور کینہ و عداوت کا اظہار کر کے مجوس و یہود اور اسپنے روحانی پیشوا جناب عبداللہ بن سبا کو خوش کرنے کی سعی نامشکور فرمائی ہے ورنہ را، ڈھکو صاحب کو سوچنا چاہیئے تھا کہ ان شرطیہ کا یہاں کونسا موقعہ و محل ہے کیونکہ لاجرم کے بعد قطعی حکم بیان کیا جاتا ہے نہ کہ مشروط اور مشکوک حکم قرآن مجید میں جہاں بھی اس کا استعمال ہے اس کے بعد حرف تحقیق موجود ہے اور قطعی حکم بیان کیا گیا ہے۔

(۱) قال تعالیٰ: "لاجرم انھم فی الآخرۃ ھم الاخسرون" سورۃ ھود

(۲) قال تعالیٰ: "لاجرم ان اللہ یعلم مایسرون ومایعلنون" سورۃ النحل

(۳) "لاجرم ان لھم النار وانھم مفرطون"

(۴) "لاجرم انھم فی الآخرۃ ھم الخاسرون" النحل

(۵) "لاجرم انما تدعوننی الیہ لیس لہ دعوۃ فی الدنیا ولا فی الآخرۃ

لہٰذا واضح ہو گیا کہ لاجرم کے بعد مشکوک کلام اور مشتبہ حکم کا مقام ہی نہیں ہے اس لیے یہ ان شرطیہ نہیں ہے بلکہ اَن ہے جو دراصل اَنَّ تھا اور بعد میں ضمیر شان منصوب متصل تھی پھر تخفیفاً اس کو حذف کر دیا گیا اور اَنّ کو اَن پڑھا گیا اور اس کے نظائر خود کلام مجید میں بکثرت ہیں کہ اِنّ اور اَنّ کو ضمیر شان کے

حذف کرنے پہ اَن اور اِن پڑھا گیا ہے اور معنی وہی حرف تحقیق والا مراد ہے مثلاً قرآن مجید میں ہے۔ علم ان سیکون منکم مرضیٰ۔ یہاں اَن کا لفظ موجود ہے اور مضارع کو بھی مضموم پڑھا جا رہا ہے حالانکہ اَن مضارع کو نصب دیتا ہے لیکن چونکہ یہ اَن دراصل اَنّہ کا مخفف ہے اور حرف تحقیق ہے نہ کہ ان مصدریہ ناصب فعل مضارع لہذا مضارع کو مرفوع پڑھا گیا۔ الغرض یہاں بھی اِن شرطیہ نہیں ہے۔ بلکہ اَن ہے جو حرف تحقیق ہے۔ اور اصل عبارت یوں تھی لاجرم انہ اطلع اللہ علی قلبک یقیناً اور ضرور بالضرور یہی تحقیقی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دل پہ مطلع ہے ایک تاکید لاجرم کے ساتھ ہو گئی دوسری حرف تحقیق کے ساتھ تیسری تکرار نسبت کے ساتھ لہٰذا یہاں شک و شبہ کی گرد توہم اور غبار امکان کا بھی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتمہ کر دیا ہے اور دامنِ صدیق کو ایسے گرد و غبار سے محفوظ کر دیا۔

ڈھکو صاحب کی خیانت

(۲) علامہ صاحب جب اس جملہ پر بحث کرنے لگے ہیں تو لاجرم کا لفظ چھوڑ دیا ہے جس کا معنی ضرور بالضرور اور خواہ مخواہ والا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈھکو صاحب نے تعصب اور عناد کی وجہ سے علمی خیانت کا ارتکاب کیا ہے اور ناظرین کی آنکھ میں دھول جھونکنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

(۳) اگر لفظ ان پڑھا جائے اور اس کو شرط بنا کر اس جملے کے ذریعے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ارادت و عقیدت کو اگر مشتبہ بنایا جائے تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کا مطلع ہونا بھی مشتبہ اور مشکوک ہو کر رہ جائے گا۔ کیونکہ مطلع ہونے والا اللہ تعالیٰ اور جس کے دل کی اطلاع اور قلب و زبان کی موافقت پر اطلاع پائی جاتی ہے وہ ابوبکر ہیں جب ابوبکر کے دل کا زبان سے موافق ہونا مشکوک و مشتبہ ٹھہرا تو یہ اشتباہ اور شک کس کو ہوا۔ کیونکہ فعل باری تعالیٰ اِطَّلَعَ اور وَجَلَ کو اِن شرطیہ کے ساتھ

مشروط کیا گیا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ اس میں اشتباہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مطلع ہوا ہے یا نہیں اور ابوبکر کے دل اور زبان کو باہم موافق پایا ہے یا نہیں؟ جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کے علم اور اطلاع کے متعلق شک اور تردد ثابت ہو گیا تو بقول ڈھکو صاحب اس عبارت سے جس طرح نبی کریم علیہ السلام کی ذات اقدس پر اعتراض لازم آئے گا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ یقین نہیں کہ وہ مطلع ہے اسی طرح خود اللہ تعالیٰ کا اس جملہ شرطیہ کی وجہ سے مطلع ہونا مشکوک و مشتبہ ہو کر رہ گیا العیاذ باللہ دیکھیے یا حضرت! ڈھکو صاحب کو بغضِ صدیق رضی اللہ عنہ نے اتنا اندھا اور بہرہ کر دیا ہے کہ صدیق اکبر کے ساتھ ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر بھی اعتراض سے گریز نہ کیا اور نہ اللہ رب العزۃ کی ذات پر اعتراض اور اس کے علم ازلی میں شک و شبہ کے وقوع و تحقق کو تسلیم کرنے سے گریز کیا۔

اگر کوئی کہے ان ضرب زید عمراً فقد ظلم۔ اگر زید عمر کو مارے تو وہ ظالم ہے تو اس میں جس طرح عمرو کے مضروب ہونے میں تردد اور شک ہو گا زید کے ضارب ہونے میں بھی لامحالہ شک و تردد ہو گا اور متکلم کو زید سے صدورِ ضرب میں تردد ہو گا۔ جس طرح کہ عمرو پر وقوعِ ضرب میں تردد ہو گا اسی طرح اگر صدیق رضی اللہ عنہ کی ارادت و عقیدت مشکوک ہو گی تو اللہ تعالیٰ کی اس پر اطلاع بھی مشکوک ہو گی اور صاحب کلام کو دونوں نسبتوں قیامی اور وقوعی میں شک و تردد ہو گا۔

لہٰذا بغضِ صدیق میں وہ دھاندلی کی کہ اللہ تعالیٰ کو معاف کیا اور نہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو اور کیونکر نہ ہو محبوب کی عداوت اور اس پر اعتراض محب کی عداوت اور اس پر اعتراض ہوتا ہی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ میں اور میرا رسول صدیق کے ساتھ ہیں اور ان پر اعتراض کرنے والا ـــــ دراصل ہم پر اعتراض کرنے والا ہے۔

تیسرا اعتراض:۔

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کی ذات سے متعلق تھا کہ ترجمہ میں تحریف کی ہے اور

ان شرطیہ کا ترجمہ اِنْ حرفِ تحقیق والا کر دیا ہے اور مبتدی طالب علم بھی ان کے استعمالات کا محل و توقع جانتے ہیں لہٰذا یہ جہل ہے یا تجاہل لیکن ہماری گزارشات سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کا ترجمہ ہی صحیح اور واقعہ کے مطابق ہے اور لاجرم کے موقعہ و محل کے مطابق اور مبتدی طالب علم تو کجا یہاں اچھے خاصے مجتہد ہونے کے مدعی بھی جہل کا شکار ہیں یا تجاہل کا اور درحقیقت حال سے بالکل بیگانہ اور بے تعلق نظر آتے ہیں اور لاجرم کے مواقع استعمال سے نابلد اور ناآشنا محسوس ہوتے ہیں۔

چوتھا اعتراض:۔

اس کتاب کی نسبت حضرت امام حسن عسکری کی طرف مشکوک ہے اور محققین کے نزدیک یہ نسبت درست نہیں ہے۔

(ا) سبحان اللہ۔ حضرات صحابہ کرام پر اعتراض کرنا ہو تو ہر قسم کے رطب و یابس پر مشتمل اور فرضی اور وضعی کتابوں کے حوالے دینا درست بلکہ ضروری لیکن تعریفی کلمات کہیں نظر آئیں تو پھر سرے سے کتاب کی نسبت کا ہی انکار۔ چلو کتاب انہوں نے خود تصنیف نہ فرمائی ہو مگر ان کے خواص کی روایات کے ذریعے اس کو ترتیب دے دیا گیا ہو گا جس طرح فقہ جعفریہ کا خود یہی حال ہے۔ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے خود تو کوئی کتاب تصنیف نہیں فرمائی راویوں کے ذریعے ہی متعین کیا گیا کہ آپ کا مذہب یہ تھا۔ اور آپ کا فرمان اس طرح تھا۔ اس طرح یہاں بھی راویوں کی روایات سے تفسیری نکات کو جمع کر کے کتابی شکل دے دی گئی اس پر اتنی بداعتمادی کا اظہار کرنے کا سوائے اس کے دوسرا موجب و باعث کیا ہو سکتا ہے کہ ڈھکو صاحب کی بدقسمتی سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے یارِ غار اور رفیقِ ہجرت کی تعریف اس میں آ گئی۔

(ب) نیز ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ جب تک اس کے مندرجات کی تائید دوسری صحیح روایات سے نہ ہو جائے ان کا اعتبار نہیں مگر اس سے پہلے ہی وہ روایت تو

معانی الاخبار کے حوالے سے ذکر ہو چکی جس میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بمنزلہ سمع مبارک کے ہونا ثابت ہے اور حضرت فاروق کا آنکھ مبارک کی مانند ہونا اور حضرت ذی النورین کا دل انور کی مانند ہونا اور ظاہر ہے کہ وہ دونوں حضرات حضرت صدیق اکبر کے تابع ہیں لہٰذا بطریق اولی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ مبارک اور دل منور کی مانند ہونا بھی واضح ہو گیا اور یہی مضمون معانی الاخبار کی صحیح اور قوی روایت سے ثابت ہو گیا جس میں تشکیک کی ڈھکو صاحب کو کوئی صورت نظر نہیں آئی تھی لہٰذا عملی بے بسی اور عجز کا اعتراف کرتے ہوئے خاموشی سے آگے نکل گئے۔ اور جواب ہی نہ دیا بہر حال اب یہ عذر بھی ختم ہو گیا کہ دوسری کوئی روایت اس کی تائید نہیں کرتی بلکہ ثقہ محدثین کی نقل کردہ روایت سے اس کی تائید و تصدیق ثابت ہو چکی لہٰذا اب اس سے استدلال ڈھکو صاحب کی اس شرط کے باوجود بھی درست ہو گیا کہ تفسیر حسن عسکری کے مندرجات کی تائید جب تک دوسری روایات نہ کریں تو ان کے ساتھ استدلال درست نہیں۔ والحمد للہ علی ذلک وصلی اللہ علی رسولہ وآلہ وصحبہ اجمعین

ج) علاوہ ازیں ڈھکو صاحب یہ نہیں کہہ سکے کہ کسی سنی نے یہ بات لکھ کر حضرت امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دی ہے اگر ایسا امکان ہوتا تو ڈھکو صاحب اس کی فعلیت اور وقوع کے قطعی دعوی سے گریز نہ کرتے لہٰذا معلوم ہو گیا کہ یہ سنیوں کی تالیف تو ہے نہیں تو لا محالہ شیعہ صاحبان کی ہے لہٰذا ہمارا مدعا پھر بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ شیعہ کتب میں شیعہ مصنفین بھی یار غار اور رفیق ہجرت رئیس الصدیقین رضی اللہ عنہ کی منقبت اور مدح وثنا کو جگہ دینے پر مجبور نظر آتے ہیں۔

فائدہ: ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس گروہ میں جھوٹ اور بہتان کی عادت کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہ کتابیں لکھ لکھ کر ائمہ کے نام پر شائع کر دیتے ہیں اور ذرا بھر شرم و حیا دامن گیر نہیں ہوتی اور کیوں نہ ہو حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ کی دعا ہی یہی ہے کہ جو ابوبکر صدیق کو صدیق نہ کہے اللہ تعالیٰ اس کو نہ دنیا میں سچ بولنے کی

توفیق نصیب کرے اور نہ آخرت میں صادقین کے زمرہ میں داخل ہونے دے۔

نعم صديق نعم صديق نعم صديق من لم يقل له الصديق
فلا صدقه الله قولاً فی الدنيا ولا فی الآخره۔

کشف الغمہ فی مناقب الائمہ للاربلی۔

نیز جب ائمہ کرام پر اس قسم کے افترا سے گریز نہیں کرتے تو ہمارے دوسرے علماء بچارے کس شمار میں ہیں۔ لہٰذا اگر امام غزالی کی طرف سر العالمین جیسی رسوائے زمانہ کتاب کی نسبت کر دی ہے تو یہ اسی عادت معروفہ کے عین مطابق ہے کوئی اچھنبے والی بات نہیں ہے اور نہ ہی اس قسم کے افترا و اتہام سے ان کی خداداد عظمت میں کوئی خلل پیدا ہوتا ہے اور نہ اس کتاب کے ذریعے مذہب اہل سنت میں کوئی خلل پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی نسبت ہی غلط ہے۔

اہم نکتہ: جب یہ ثابت ہو چکا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ مبارک۔ بصر مقدس اور دل منور کی مانند ہیں اور آپ کے ساتھ وہ نسبت رکھتے ہیں جو سر کو جسم سے ہوتی ہے اور روح کو بدن سے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا نیابت رسول اور خلافت مصطفویہ کے اہل ہونا بھی ظاہر اور واضح ہو گیا، اور بقول شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس خلافت و ولایت کے اس لیے اہل ہیں کہ وہ بمنزلۂ نفس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور ان کے نفس رسول ہونے کا ثمرہ بھی یہی ہے جیسے کہا گیا ہے کہ وہ بھی اسی طرح ہیں جیسے کہ تم مثل آنکھ، کان، دل اور سر اور روح کے ہو لہٰذا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا مستحق خلافت و ولایت ہونا بھی اس دلیل سے واضح ہو گیا اور اسی اہلیت کی تصریح بھی اسی روایت کے آخر میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ ص ۱۶۵۔

واذا انت مضيت علی طريقة يجهارك ولم تتبعها بما يسخطه ووافيته بها اذا بعثك بين يديه كنت لولاية الله مستحقا ولم رفقتنا فی تلك الجنان مستوجبا۔

اے ابوبکر جب تم ایسے طریقے پر جاری اور گامزن رہو گے جس کو تمہارا رب

پسند فرماتا ہے اور اس کے بعد تم ایسے کسی امر کا ارتکاب نہ کرو گے جو پروردگار کو ناراض کرے اور تم اسی حالت پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری دو جبکہ وہ تمہیں وفات کے بعد اٹھائے تو تم اللہ تعالیٰ کی ولایت کے مستحق ہو گے اور ان عالی جنات میں ہماری مرافقت کے حقدار۔

اور یہ حقیقت کسی سے کیونکر مخفی رہ سکتی ہے کہ جو ہستی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قرب معنوی اور روحانی رکھتی ہو وہ ایسے طریقے پر گامزن کیونکر نہیں ہوگی اور تادمِ زیست اس پر قائم و دائم کیوں نہیں ہو گی اور جب حقیقت حال یہ ہوئی جو قبل ازیں عرض کی جا چکی ہے تو حضرت صدیق کی ولایت و خلافت کا استحقاق بھی قطعی طور پر ثابت ہو گیا۔

مذہب شیعہ — از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی افضلیت حضرت سلمان اور حضرت ابوذر سے

اگرچہ اہل ایمان اور اہل عقل و درایت کے لیے اس روایت سے زیادہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شان اور آپ کا فضل اور کیا منصوص ہو سکتا ہے مگر مؤمنین کے دل کو خوش کرنے کے لیے بطور نمونہ ایک دو روایتیں اور بھی خلفائے راشدین سابقین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی فضیلت کے بارے میں اہل تشیع حضرات کی معتبر کتابوں سے پیش کرتا ہوں۔ اہل تشیع کی معتبر کتابوں میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سلمان منا اھل البیت۔ یعنی سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہیں نمونہ کے طور پر کتاب کشف الغمہ فی معرفۃ الائمہ مطبوعہ ایران ص۱۰۶۔

وانت لو فکرت ورأیت لعلمت انه یکفیه نسبا قوله صلی اللہ علیه وسلم سلمان منا اھل البیت۔

یعنی تو اگر فکر و ہوش سے کام لے تو یقیناً جان لے گا اور دیکھ لے گا کہ سلمان فارسی کے لیے یہی نسب نامہ کافی ہے۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ سلمان ہم میں سے ہیں اور اہل بیت میں سے ہے۔

اب ہم اہل فکر و نظر کی خدمت میں فروع کافی جلد ۲ ص۲ کی عبارت پیش کرتے ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے فرق مرتبت کے متعلق وارد ہے۔

ثم من قد علمتم بعدہ فی فضله و زھدہ سلمان وابوذر رضی اللہ عنهما۔ الخ

یعنی پھر وہ شخص جس کے متعلق تمہیں علم ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد جن کا مرتبہ فضل و زہد میں ہے تو وہ سلمان فارسی اور ابوذر ہیں رضی اللہ عنہما۔ الخ

اب جن کا مرتبہ فضل و زہد میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بعد ہے وہ اہلبیت ہوں اور اول مرتبے والی ہستی کہ جن کو بمنزلہ "السمع والبصر والروح" بھی فرمایا گیا ہو وہ اہل بیت نہ ہوں تو کس قدر ہٹ دھرمی اور بے انصافی پر مشتمل ایک غلط نظریہ ہے۔

وانت لو فکرت وتدبرت ذلك لعلمت فضل ابی بکر و زھدہ علی جمیع الصحابة ویکفیه فضلا وکمالا و مرتبة قوله صلی اللہ علیه وآله وصحبه وسلم لابی بکر رضی اللہ عنه انت منی بمنزلة السمع والبصر والروح وقد مر بیانه بهنانی۔

تنزیہہ الامامیہ — از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

مؤلف محترم نے فروع کافی کی ایک عبارت کے بعض فقروں کو توڑ مروڑ کر اصحاب ثلاثہ کی مدح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر وہ سیاق و سباق اور داخلی و خارجی قرائن کو مدنظر رکھتے اور شرم و حیا کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیتے تو اس روایت سے ہرگز استدلال نہ کرتے۔

اس روایت کا پس منظر یہ ہے کہ بنو امیہ نے صوفیہ کی ایک جماعت تیار کی تھی جس کا طرۂ امتیاز صوف کا لباس اور ترک لذائذ کرنا کہ مادی اقتدار

اہل بیت سے چھیننے کے بعد روحانی اقتدار پر بھی ڈاکہ ڈالیں پہلے پہل ان کی سرگرمیاں عوام تک محدود رہیں مگر حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے ان کا دائرہ کار خواص تک پھیل گیا بلکہ ائمہ اہل بیت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ان کی محافل و مجالس میں جا کر ان کے لباس و روش و رفتار اور سیرت و کردار پہ حملے کرنے لگے انہیں واقعات میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ سفیان ثوری اور چند دوسرے متصوفہ نے امام موصوف کے لباس فاخرہ پہ اعتراض کر دیا۔

امام رضی اللہ عنہ نے اصول مناظرہ کے مطابق مسلمات خصم پیش کر کے ان کے موقف کی غلطی واضح کی کہ تمہارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑا زاہد ابو بکر ہے ان کے بعد تم سلمان اور ابوذر کو سب سے بڑا زاہد سمجھتے ہو مگر ان کی حالت یہ تھی کہ ابو بکر (صدیق رضی اللہ عنہ) نے وفات کے وقت صرف پانچواں حصہ راہ خدا میں خرچ کرنے کی وصیت کی اور جناب سلمان و ابوذر بھی سال بھر کا خرچہ رکھ لینے کے بعد باقی ماندہ راہ خدا میں خرچ کرتے تھے جب تمہیں ان پر اعتراض نہیں تو ہم پر اعتراض کا کیا حق ہے؟

الغرض امام علیہ السلام نے معترض کو خاموش کرنے کے لیے اس کے عقیدہ کے مطابق کلام کیا اپنا عندیہ ظاہر نہیں کیا جس کی تائید مزید جملہ "ثم من قد علمتم بعدہ" سے ہوتی ہے۔

جواب دیگر

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس روایت کو معتبر تسلیم نہ کیا جائے جس کی عقلائی وجہ یہ ہے کہ اس کے راوی سنی ہیں پہلا راوی ہارون بن مسلم ہے جو جبری العقیدہ تھا اور دوسرا راوی مسعدہ بن صدقہ ہے جو عامی (سنی) تھا لہٰذا اس کی جواب دہی کا فریضہ ہم پہ عاید ہی نہیں ہوتا۔ رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۱۲۹ تا ۱۳۲ ۔

الجواب بتوفیق ملہم الصدق والصواب

(۱) علامہ ڈھکو صاحب نے بلاوجہ صوفیاء کرام کو بنو امیہ کا تیار کردہ گروہ قرار دے دیا اور انہیں اہل بیت کے روحانی اقتدار کے لیے خطرہ قرار دے دیا گروہ صوفیاء بنو امیہ کا نہیں بلکہ حضرت علی مرتضیٰ شیر خدا رضی اللہ عنہ کا تیار کردہ ہے اور آپ کے علوم باطنیہ اور اسرار کا امین ہے جیسے کہ محدثین و مفسرین اور فقہاء آپ کے علوم ظاہرہ کے امین اور ترجمان ہیں اور قاضی نور اللہ شوستری نے تمام اکابر صوفیاء کرام کو اپنی جماعت یعنی اثنا عشری شیعہ میں داخل کرنے کی مقدور بھر سعی نامشکور فرمائی ہے اور ان کی دلق پوشی اور پابرہنہ ہونے اور ژولیدہ سر اور پراگندہ بال ہونے کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے۔

قومے ملوک طبع کہ از روے سلطنت	گوئی کز احترام سلاطین کشور اند
شاہان دلق پوش کہ گاہ حمایتی	زیر گلیمشان جم و خاقان و قیصر اند
امروز از نعیم جہاں چشم دوختند	فردا خود از کرشمہ بفردوس ننگرند
ننگ بحشم خوار دریں پا برہنگاں	نزد خرد عزیز تر از دیدہ سر اند
آدم بہشت رابدو گندم اگر فروخت	حقا کہ ایں گروہ بیک جو نمی خرند

مجالس المؤمنین جلد دوم ص ۳ ۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فیض پانے والوں میں حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کو بھی شمار کیا ہے اور علی الخصوص جناب کمیل بن زیاد نخعی کو اور نقشبندیہ سلسلہ کے علاوہ سب کے منبع فیوض اور سرچشمہ کمالات حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تسلیم کیا ہے لہٰذا اس گروہ پر ڈھکو صاحب کا یہ حملہ بنو یزیدی کارروائی کے زمرہ میں آتا ہے رہا روحانی اقتدار چھیننے کا معاملہ تو یہ چھیننے سے نہ چھینا جا سکتا ہے اور نہ اس پر کوئی قابض ہو سکتا ہے اور ان حضرات کا کام ہی یہ تھا کہ فیض کو عام کریں جیسے کہ سرور

عالم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو دولت ایمان سے مالا مال کرنے اور ان کو نگاہِ نبوت سے پاک کرنے کے لیے مبعوث ہوئے اور اپنے دامن سے وابستہ کر کے مقام محبوبیت و ولایت پر فائز کرنے کے لیے" کما قال تعالیٰ: قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ" اور یہ امر ذہن نشین رہے کہ جس طرح مال میں زکوٰۃ ہے اسی طرح علم ظاہر میں عوام کا حق ہے اور علم باطن میں خواص اور مستحقین کا اور ہر ایک صاحب ثروت اس نعمت خداداد سے فیض رسانی کا بھی پابند ہے" قال اللہ تعالیٰ. ومما رزقناھم ینفقون یعنی مما رزقناھم من انوار المعرفۃ یفیضون جو انوار معرفت ہم نے ان کو عطا کئے ہیں ان کا فیضان فرماتے ہیں اور یہ بھی یاد رہے مادی اقتدار میں بخل ہوا کرتا ہے اور اسی میں عزت سمجھی جاتی ہے لیکن روحانی نعمتیں بانٹنے سے عزت ہوتی ہے اس لیے ارباب سلاسل کی عظمتوں کے سکے اب بھی قائم ہیں والحمد للہ!

(۲) ان حضرات کا سوال امام ابو عبداللہ رضی اللہ عنہ سے یہ تھا کہ جو لباس آپ کا ہے اس طرح کا لباس آپ کے آباؤ اجداد علی الخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ نے استعمال نہیں فرمایا اور امام وقت کو ائمہ سابقین کی روش پر رہنا چاہیئے لہٰذا یہ تو فرمایئے کہ اس کی حکمت اور مصلحت کیا ہے؟ یہ ایک خالص علمی سوال تھا۔ اور رہنمائی کے لیے اس پہ حضرت امام ابو عبداللہ کو تحقیقی جواب عطا فرمانا چاہیئے تھا نہ کہ محض ٹالنے اور چپ کرانے تک محدود رہنا چاہیئے تھا اسی لیے رجال کشی میں دوسرا جواب دیا گیا ہے کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس وقت تنگی اور عسرت کا دور تھا۔ اور اب دنیا نے اپنے مال و دولت کے دہانے کھول رکھے ہیں اس لیے اس حالت اور اس حالت میں فرق کا پایا جانا بعید نہیں ہے۔ اِنَّ سُفیان الثوّری دخل علی ابی عبد اللہ علیہ السلام وعلیہ ثیاب جیاد فقال یا ابا عبد اللہ ان آبائک لم یکونوا یلبسون مثل ھذہ الثیاب فقال ان آبائی کانوا فی زمان مقفر مقصر وھذا زمان قد ارخت الدنیا

عزالیھا فاحق اھلھا بھا ابرارھم"۔ رجال کشی ص ۳۳۶

الغرض کسی متقدا زمانہ سے سادگی کے ترک کرنے اور آباؤ اجداد کے لباس کے معاملہ میں سنت سے اختلاف کرنے کی وجہ دریافت کرنے کو بے ادبی اور گستاخی سمجھنا عجیب سی حرکت ہے اس میں صرف اور صرف حکمت اور مصلحت کی دریافت ہی مقصود ہو سکتی ہے۔ لہٰذا بدظنی کی کیا گنجائش ہے؟

(۳) تحقیقی جواب یہ ہوا جو ہم نے بحوالہ رجال کشی ذکر کیا اور الزامی وہ ہوا جو ڈھکو صاحب نے ذکر کیا اب ذرا نظر انصاف سے ان میں تطبیق کی کوشش فرمادیں کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ اور حضرت ابوبکر، حضرت سلمان اور حضرت ابوذر کے زمانے مختلف ہیں کہ ان کے وسائل تھے لہٰذا وہ تو مال جمع کر لیتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وسائل نہیں تھے اور لباس بھی عمدہ نہیں بنا سکتے تھے۔ علی الخصوص جبکہ حضرت صدیق کی خلافت محدود وقت اور محدود علاقہ میں تھی اور فقر و فاقہ والے علاقہ میں جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا علاقہ وسیع اور وقت خلافت بھی زیادہ پھر اس تحقیقی اور الزامی جواب میں مطابقت کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے ایام خلافت میں مال و دولت کی ریل پیل تھی اور آپ معقول وظائف اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب بدر کو دیتے تھے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ لاکھوں درہم کا نذرانہ امام حسن رضی اللہ عنہ کو پیش کیا کرتے تھے لہٰذا اس عذر کی معقول توجیہ کوئی نہیں ہو سکتی اور یہ سب یار لوگوں کی بناوٹ ہے کہ ہر موقعہ جو مناسب جواب سمجھا خود تجویز کر کے اس کی نسبت ائمہ کی طرف کر دی جیسے کہ محدثین شیعہ کی عادت معروفہ ہے۔

(۴) جب سوال کرنے والے بنو امیہ کے ساختہ پرداختہ تھے تو وہ ابوذر اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہما کے لئے کونسی فضیلت ثابت کر سکتے تھے جب کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اور جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے ساتھ معروف و مشہور ہے اپنے ان پیشواؤں کے نظریہ

کے برعکس وہ ان کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد دوسرا درجہ فضل وزہد میں کیونکر دے سکتے تھے؟ لہٰذا اس کو الزامی جواب کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ یا پھر ان حضرات کو بنوامیہ کا ترجمان کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے۔ یقیناً ان کا مذہب اس جماعت سے مختلف ہے اسی لیے حضرت ابوذر اور حضرت سلمان کے متعلق فضل وزہد کے یقین کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۵) نیز حضرت امام ابوعبداللہ علیہ السلام نے من قد علمتہ فرمایا ہے شاید ڈھکو صاحب کو معلوم ہوگا کہ قرآن وحدیث میں اور علم کلام میں علم کا لفظ منطقی اصطلاح کے مطابق استعمال نہیں ہوتا جو ظن اور جہل مرکب کو بھی شامل ہوا کرتا ہے بلکہ یقین اور واقعی قطعی عقیدہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر الزام مقصود ہوتا تو زعم سے تعبیر فرماتے یا قول وادعاء سے تعبیر فرماتے اور ظاہر ہے کہ اہل بیت اور قرآن وسنت کی تعبیر اور اسلوب بیان ایک جیسا ہونا چاہیئے۔ لہٰذا علامہ موصوف کا اس کو دلیل الزامی بنانا اور اہل بیت کرام کو محض مناظرین کی سطح پہ لے آنا ان کی شان اقدس میں تقصیر اور تفریط کے مترادف ہے بلکہ یہ یقینی حجت وبرہان اور واقعی دلیل ہے اور مسترشدین کے لیے ہدایت وارشاد اور صحیح رہنمائی کا اہتمام ہے۔

(۶) نیز علامہ ڈھکو صاحب کو یہ حقیقت معلوم ہوگی کہ کلام مقید میں نفی واثبات قیود کی طرف راجع ہوا کرتے ہیں لہٰذا اگر ڈھکو صاحب کی یہ بیہودہ منطق اور تاویل تسلیم بھی کر لی جائے تو الزامی طریقہ جواب میں صرف ان دونوں حضرات کے حضرت ابوبکر صدیق سے مرتبہ میں مؤخر ہونے کا ذکر کیا گیا نہ کہ سرے سے آپ کے فضل اور زہد کا انکار لہٰذا اگر یہ الزامی جواب ہے اور حضرت امام کے نظریہ کے مطابق نہیں تو حضرت صدیق کو ان سے مقدم ماننا نہ کہ ان کو صاحب فضل اور صاحب زہد تسلیم کرنا۔ ڈھکو صاحب کا دعویٰ ہے کہ سب ائمہ مذاہب میں متفق ہیں اور امام ابوجعفر محمد بن علی فرماتے ہیں: لست بمنکر فضل ابی بکر ولست بمنکر فضل عمر،

نہ میں ابوبکر کی فضیلت کا منکر ہوں اور نہ عمر کی فضیلت کا رضی اللہ عنہما۔ لہٰذا نفس فضل وزہد کا مالک ہونا تو یقیناً ثابت ہے البتہ ان تینوں حضرات کے باہمی مراتب کے بیان میں حضرت امام جعفر اور جناب سفیان ثوری کے نظریہ میں قدرے فرق ثابت ہوا تو اس صورت میں بھی ڈھکو صاحب کا جواب بالکل باطل اور غلط ہو کر رہ گیا۔

(۷) نیز قرآن مجید اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی اور امام حسن، امام زین العابدین امام محمد باقر اور امام جعفر صادق کے ارشادات پہلے ذکر ہو چکے جن میں مہاجرین وانصار کے بالعموم اور بالخصوص حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل ومناقب تحقیقی انداز میں بیان ہو چکے لہٰذا اس کلام کو بھی انہیں ارشادات کی روشنی میں دیکھا جائے گا جب وہاں ان کے فضائل کا بیان تحقیقی انداز میں ہے تو یہاں جدلی انداز کیوں ہو گیا اور اگر جدلی ہوتا تو وہ حضرات بھی کہہ سکتے تھے جناب والا جس ابوبکر کو آپ مانتے ہی نہیں اس کی سنت کو اپنے آباء کی سنت کے مقابل کس طرح پیش کر سکتے ہو۔ اور جب انہوں نے یہ اعتراض نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ امام صاحب نے مخالفین پر تو یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں محض الزامی کاروائی کر رہا ہوں پتہ نہیں ڈھکو صاحب کو کہاں سے الہام ہو گیا

(۸) علاوہ ازیں الزامی اور جدلی انداز اختیار کرنے میں سقم یہ ہے کہ حضرت امام موصوف کے لباس فاخرہ پر اعتراض کیا گیا جیسے کہ ڈھکو صاحب کا وہم ہے اور دلیل میں آپ کے آباء کرام کا فعل اور ان کی سنت پیش کی گئی جبکہ آپ نے الزامی کاروائی میں حضرت صدیق کی وصیت کا ذکر کر دیا اس سے لباس فاخرہ کے جواز پر استدلال کیونکر درست ہو گیا وہ تب تھا جب حضرت صدیق کا ایسا لباس ذکر فرماتے اور وصیت خمس کی ہو یا ثلث کی اس میں بھی وجہ استدلال کوئی نہیں جبکہ یہ واضح نہیں کیا گیا کہ ان کی مالیت کتنی تھی۔ اگر بیس، چالیس درہم ترکہ ہو اور اس میں سے پانچواں حصہ کی وصیت کر دی ہو تو اس میں اس شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ پر استدلال کیسے صحیح ہو گیا۔ پھر اہلسنت کے نزدیک حضرت ابوذر کا مذہب معروف یہ ہے کہ وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد صبح کے لیے ذخیرہ کر رکھنے کو بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان کے اس عمل کو بھی

مسلمات میں سے شمار کرنا واقع کے خلاف ہے۔ یا کم از کم حضرت سفیان ثوری کے نظریہ اور معلومات کے خلاف ہے۔ اور حضرت سلمان مدائن میں امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے گورنر ہونے کے باوجود اپنے ہاتھ سے کھجور کے پتوں سے ٹوکریاں بنا کر گزر بسر کرتے تھے سال کے اخراجات کے ذخیرہ کرنے کی گنجائش کہاں ہو سکتی تھی۔

ملاحظہ ہو حاشیہ احتجاج طبرسی ص۱۱۰

بہر حال نہ ہم ائمہ کی طرف ایسے پوچ جواب کی نسبت درست سمجھتے ہیں اور نہ اس کو حجت الزامیہ اور مناظرانہ انداز تسلیم کرتے ہیں۔ نہ واقعات اور حقائق اس امر کی تائید کرتے ہیں اور نہ ہی "ثم من قد علمتم بعدہ فی فضلہ و زھدہ" کا جملہ الزامی جواب ہونے کی تائید کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت اور واقعہ کے مطابق اعتقاد جازم پر دلالت کرتا ہے لہٰذا اس کو محض الزامی کاروائی قرار دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ شیعہ جیسے دشمن صحابہ کی کتابوں میں بھی حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے فضائل و کمالات پر مشتمل روایات مل جاتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ قاہرہ کا اعجاز ہے اور ان مقدس ہستیوں کی عظمت شان کے ساتھ اعتناء و اہتمام کا ثمرہ و نتیجہ۔ والحمد للہ علی ذلک!

کتب شیعہ میں سُنّی راوی

جواب دیگر کا عنوان قائم کر کے علامہ صاحب نے اس روایت کو سنی راویوں کی روایت ہونے کی وجہ سے ناقابلِ قبول قرار دیا ہے۔ بہت خوب

(۱) آپ تو تقیہ کے قائل تھے اور اس کے لباس میں چھپے رہتے تھے اور ہمیں مغالطہ دیتے تھے لیکن ہمارا تو یہ مذہب نہیں تھا۔ لہٰذا تم نے سنی راویوں سے دیدہ دانستہ یہ روایات کیوں لے لیں جو تمہارے مذہب و مسلک کے خلاف ہیں۔ بلکہ اس پر پانی پھیرنے والی ہیں اور تمہیں لاجواب اور عاجز و بے بس کرنے والی۔

(۲) اس کتاب پر امام زماں قائم آلِ محمد حجت العصر نے مہر بھی لگا دی "ھذا کاف لشیعتنا" یہ کتاب ہمارے شیعوں کے لیے کافی ہے۔ جب روایات غلط تھیں اور عقیدہ کے فساد کی موجب تو امام موصوف کی اس مہر کا مطلب کیا ہوا؟ یہی کہ ہمارے شیعوں کی گمراہی کے لیے کافی ہے؟ نعوذ باللہ من سوء الفہم۔

"جہالت یا خیانت"

(۳) ہارون بن مسلم کے متعلق فرمایا وہ جبری العقیدہ تھا اور رد ہر فرما دیا۔ راوی سنی ہیں کیا ڈھکو صاحب ابھی تک اس سے بے خبر ہیں کہ اہل سنت نہ جبری ہیں نہ قدری نہ بندے کو مختار مطلق مانتے ہیں کہ خالق فعال ہو اور نہ مجبور محض کہ مردہ بدست زندہ کی مانند ہو۔ ان کے نزدیک بندہ از روئے خلق محتاج باری تعالیٰ ہے۔ اور باعتبار کسب اور جمع وسائل و اسباب مختار ہے۔ اور کتب کلامیہ میں انہوں نے جبریہ اور قدریہ کا رد کیا ہے۔ اگر ڈھکو صاحب کو حقیقت حال سے واقفیت نہیں تھی تو جہالت ہے اور جہالت بھی مرکبہ۔

آنکس کہ نداند و بداند کہ بداند ۔۔۔ در جہل مرکب ابد الدہر بماند

اور ایسی صورت میں ڈھکو صاحب کی زبان میں ہی یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں

نے اصولت محکم آید و نے فروع ۔۔۔ شرم بادا از خدا و از رسول

اور اگر علم ہونے کے باوجود اس طرح کہا ہے تو بدترین دھوکا اور فریب کاری ہے اور علمی دنیا میں خیانت کی بدترین مثال ہے۔ نیز جبری العقیدہ شخص کی روایت ناقابل قبول تب ہوتی جب اس کا تعلق اس کے عقیدہ جبر کے اثبات یا اس کی تائید و تقویت سے ہوتا اور جب اس روایت کا اس عقیدہ سے قطعاً کوئی تعلق ہی نہیں تو اس عذر فاسد کی وجہ سے اس روایت پر اعتراض کرنے کا کیا مطلب؟ نیز مسعدہ بن صدقہ کو سُنّی کہنا بھی دیانت و امانت کا خون ناحق بہانے کے مترادف ہے، کیونکہ وہ تبریہ فرقہ سے تعلق رکھتا ہے جو گو حضرات شیخین حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے قائل ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح انہیں بھی امام تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت

زبیر اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہم سے بغض وعناد رکھتے ہیں۔ اور ان سے برأت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں ملاحظہ ہو حاشیہ روضہ کافی صد ۔ و رجال کشی صد۲۰۲
کیا ایسے عقیدہ والا شخص سنی ہو سکتا ہے اور کوئی اہل سنت کے عقائد سے باخبر شخص ایسے لوگوں کو سنی کہنے کی جسارت کر سکتا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ موصوف کا کام صرف ہیرا پھیری ہے اور مغالطہ دہی اور فریب کاری الغرض یہ راوی اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مخالف نہیں ہے تو حضرات ائمہ کی محبت وعقیدت کا دم بھرنے والا بھی ہے اور ان کے مخالفین جو اس کے نظریہ کے مطابق واقعی مخالف ہیں ان کا دشمن بھی ہے۔ ایسی صورت میں جو روایت ائمہ کرام کی عظمت شان کے خلاف ہوتی وہ اس کو کیونکر بیان کرتا اور شیعی محدث کلینی اس کو ذکر کیوں کرتا اور امام مہدی اس پر مہر تصدیق کیونکر ثبت فرماتے۔
لہٰذا اس کو ناقابل قبول ٹھہرانے کی یہ وجہ درست نہیں ہو سکتی۔

شریفانہ زبان

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ابن شہاب زہری کے متعلق شیعہ کے اپنے اعتراف اور اس کی خاص طرز بیان جس سے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے خلاف غلط تاثر قائم ہو سکے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو شیعہ کہہ دیا تو ڈھکو صاحب نے اس پر یہ زبان استعمال کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تقیہ باز حضرات اہل جماعت کے گھروں میں گھس جائیں، ان کی کتب کے بطون سے ان کے بچے بھی پیدا ہوتے رہیں مگر گھر والوں کو اس کی مطلق اطلاع نہ ہو یا للعجب صد۱۷۲۔

لیکن ہارون بن مسلم اور مسعدہ بن صدقہ کو تقیہ کے بغیر ہی شیعہ برادری کے گھروں میں کیونکر گھسنے کا موقعہ مل گیا کیا ان کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے رہتے ہیں کیا یہاں بھی وہی الفاظ دہرائے نہیں جا سکتے؟ لیکن ہماری شرافت

ہمارے لیے مانع ہے۔ اور ڈھکو صاحب کے لیے کوئی مانع موجود نہیں ہے۔ اس لیے ہم ان کو اس زبان میں جواب دینے سے قاصر ہیں اور نہ ہی ان کو یہ کہتے ہیں ع اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیئے۔ کیونکہ یہ مطالبہ ایسا ہی ہے جیسے بچھو یا سانپ سے مطالبہ کیا جائے کہ ڈنگ مارنے اور ڈسنے سے گریز کرنا اور شرفاء کی شرافت کو ملحوظ رکھنا حالانکہ وہ اپنی عادت اور تقاضائے طبع سے مجبور ہیں۔ جن لوگوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب ترین صحابہ اور آپ کے سسر اور داماد نبی اور داماد علی پر تنقید واعتراض کرتے وقت نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرم محسوس ہو۔ نہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے انہیں دوسرے لوگوں پر کیچڑ اچھالتے وقت اور بد زبانی سے کام لیتے وقت کیونکر شرم وحیاء دامنگیر ہو سکتی ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دامادِ علی مرتضیٰ ہونا

خلیفۂ ثانی سیدنا امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا رشتہ دینا اور ان کو شرفِ دامادی بخشنا کوئی کم مرتبہ دلیل نہیں۔ اعتبار کریں، ورنہ کتاب فروع کافی جلد ۲ صد۲۱۱ کی یہ عبارت بروایت امام ابو عبداللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ پڑھیں، عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال سألتہ عن المرءة المتوفی عنہا زوجہا أتعتد فی بیتہا او حیث شاءت قال ان علیاً علیہ السلام لما توفی عمر اتی ام کلثوم فانطلق بہا الی بیتہ

یعنی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مسئلہ دریافت کیا گیا جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے، تو وہ اپنے گھر (خاوند کے گھر) عدت بیٹھے یا جہاں مناسب خیال کرے وہاں بیٹھے؟ امام عالی مقام نے جواب دیا کہ جہاں چاہے عدت بیٹھے، کیونکہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فوت ہوئے، تو حضرت علی علیہ السلام اپنی بچی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر لے گئے۔

علیٰ ہٰذا القیاس کتاب طراز المذہب المظفری مصنفہ میرزا عباس قلی خاں وزیر مجلس شورائی کبریٰ سلطنت ایران جلد اول صد۴۷ تا صد۶۷ میں اس نکاح کے متعلق تمام

علماء شیعہ کا اتفاق اور اُن کی اس نکاح کے متعلق تصریحات ملاحظہ فرمائیں۔ یہ کتاب شاہِ ایران مظفر الدین قاچار کی زیرِ سرپرستی لکھی گئی ہے۔

اس نکاح کا ثبوت تقریباً شیعہ کی ہر کتاب میں موجود ہے، مگر جن الفاظ کے ساتھ اہلِ بیت کرام کی عقیدت کا دم بھرنے والوں نے اس نکاح کا اقرار کیا ہے، مجھے اللہ تعالیٰ کی قسم ہے کوئی ذلیل سے ذلیل انسان بھی اپنے متعلق ان الفاظ کو برداشت نہیں کر سکتا جن الفاظ کو اہلِ بیتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان مدعیانِ تولّی نے استعمال کیا ہے۔ کوئی شخص ان الفاظ کو دیکھ کر یہ بات تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس قسم کے الفاظ بدترین دشمن ہی مُنہ سے نکال سکتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے مقبولوں کے متعلق یہ الفاظ استعمال کرنے والا اسی دنیا میں غرق کیوں نہیں ہو جاتا۔

لہٰذا میں یہ جُرأت نہیں کرتا اور وہ الفاظ لکھ کر اپنی عاقبت تباہ نہیں کرتا۔

اہلِ تشیع کی ام الکتب فروعِ کافی جلد ثانی ص ۱۴۱ سطر ۲ مطبوعہ لکھنؤ کسی بڑے مدعی تولّا اور معتقد اہلِ بیت سے سُنیے۔ نیز ناسخ التواریخ جلد ۲ ص ۳۶۳ و ص ۳۶۴ سطر ۱ ملاحظہ فرمائیں اور میری تمام تر معروضات کی تصدیق کریں کہ شانِ حیدری میں کس قدر بکواس اور سب وشتم شیعانِ علی نے کیے ہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا بدبخت خارجی بھی ان کے حق میں اس قسم کے الفاظ لکھنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ بکواس صرف اس لئے کئے ہیں کہ آپ نے سیدنا امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کو رشتہ کیوں دیا ہے۔ کاش میرے بھولے بھالے برادرانِ وطن! شیعہ مذہب کی حقیقت سے واقف ہوتے۔

اے ساداتِ عظام! خدا کا واسطہ، کچھ سوچو اور ضرور سوچو۔ جس مذہب کی اس قدر معتبر کتاب میں حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شانِ اقدس میں اس قسم کے بکواس ہوں جو آپ کسی ذلیل سے ذلیل نوکر کو بھی نہیں کہہ سکتے، تو اس مذہب سے آپ نے کیا پھل پانا ہے؟ خدا را اپنی عاقبت تباہ نہ کرو۔ آئیے! ہم اہلِ سُنّت آپ کے بردے اور آپ کے گھرانے کے غلام ہیں۔ ہم سے اپنے خانوادہ کی عزت و ناموس کے متعلق صحیح روایات سنیے اور خانوادۂ نبوت کی شان کو ملاحظہ فرمائیے۔

یہی روایت جس کے لکھنے سے میرا دل لرز گیا اور میرے ہاتھ سے قلم گر گیا اور اللہ کی قسم میں لکھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اہلِ تشیع نے اپنی معتبر کتاب ناسخ التواریخ جلد دوم حصّہ ۲ ص ۲۶۳ سطر ۲۹ پر بڑے شدومد کے ساتھ اور ثبوتِ نکاح میں یہ تمام صفحہ اور ص ۳۶۴ علیٰ ہذا القیاس ص ۴۳۳ بھی ملاحظہ فرمائیے اور اس کے بعد اُور نہیں، تو شیعانِ حیدرِ کرار کو یہ ہی پڑھ کر سنا دیجئے کہ ؎

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

مگر درحقیقت دوست نما دشمن کے بغیر اہلِ تشیع کے مذہب کی بنیاد اور کوئی نہیں رکھ سکتا۔ مذکورہ بالا عبارات کو پڑھ کر یقیناً اہلِ انصاف میری تصدیق کریں گے

سینہ کوبی کا موجبِ اصلی

ممکن ہے کہ بھولے بھالے برادرانِ وطن کہیں جو لوگ سال بہ سال حضرت امام عالی مقام زندۂ جاوید کا ماتم کرتے ہیں اور اپنے سینوں کو پیٹ پیٹ کر خون خون کر دیتے ہیں، یہ کیسے کسی دشمن کی تقلید میں مذہبِ تشیع اختیار کر سکتے ہیں یا جس نے یہ مذہب گھڑا ہے، وہ کیونکر اور کیسے دشمنِ اہلِ بیت ہو سکتا ہے؟

اس کا فطرتی جواب صرف اتنا ہے کہ اس قسم کی روایات گھڑنے کی سزا یہی ہو سکتی ہے اور جن ہستیوں کو امام عالی مقام سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، امام الہدیٰ شیخ الاسلام، حبیب، مقتدا اور پیشوا فرمائیں، جن کے ہاتھ پر بیعت کریں، جن کو بطیب خاطر رشتے دیں، اُن کی شانِ اقدس میں علانیہ بکواس بکنے کی دُنیا میں یہی سزا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے منہ اور اپنے سینوں کو پیٹ پیٹ کر اڑا دیں۔

ورنہ محبت کے تقاضے پر یہ کارروائی مبنی ہوتی، تو اس کی ابتدا حیدرِ کرار رضی اللہ عنہ کرتے۔ ان کے بعد یازدہ ائمہ کرام اس پر عمل کرتے، مگر یاد رکھو یہ کسی زبردست مجرم خدا کی سزا اسے ہی شروع ہوتی ہے۔

اے آلِ حیدرِ کرار! آپ اپنے جدِ امجد کی سُنّت تلاش فرمائیں اور اپنے تمام اجدادِ طاہرین کی سُنّت کی پیروی اختیار کریں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی روایات

گھڑنے اور ان کو رائج کرنے کا یہ ایک سیاسی کرتب تھا تاکہ بیوقوف اور کم سمجھ لوگ اس قسم کی غلط روایات کے باوجود ہمیں محب سمجھتے رہیں گے اور ہم آسانی کے ساتھ اپنا مذہب رائج کرتے رہیں گے۔ آپ دعوئ محبّت کے کوٹ اور پردہ کے اندر دیکھئے اور اس زہر قند اندوز سے بچیئے۔ خیر یہ ایک مخلصانہ مشورہ تھا جو موضوع سے نکال کر لے گیا۔

اب ائمہ طاہرین معصومین کی روایات سے خود اہلِ تشیع کی کتابوں میں جب یہ بات مل گئی کہ ائمہ طاہرین نے خلفاء راشدین کو صدیق مانا، اُن کے ہاتھ پر بیعت کی، اُن کو امام الہدٰی، شیخ الاسلام، مقتداء اور پیشوا تسلیم کیا، اُن کے حق میں سب وشتم بکنے والوں کو قتل کیا، سزائیں دیں اور اپنی مجلس سے نکالا بلکہ خلفاء راشدین کی شان میں سب بکنے والوں کو مسلمانوں کی جماعت سے بھی نکالا اور یہ بھی مُسلّم ہے کہ ائمہ طاہرین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے پاک اور مقدّس دلوں میں غیر خدا کا خوف نہیں آسکتا تھا اور ارشادِ خداوندی: وَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ یعنی اگر تم مومن ہو تو میرے بغیر کسی سے مت ڈرو" پر اُن کا پورا پورا ایمان تھا اور میدانِ کربلا میں اپنے اس ایمان کا عملی ثبوت بھی فراہم کیا، تو پھر وہ تمام تر ارشادات جو ائمہ نے فرمائے اور وہ تمام تر اخوت اور مودّت کے عملی ثبوت جو انہوں نے بہم پہنچائے صرف صِدق وصفا اور ظاہری و باطنی صداقت ہی کی بناء پر فرمائے۔

خلافت خلفاء سابقین کے متعلق جن واضح اور غیر مبہم کلمات طیّبات کے ساتھ حضرت سیّدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم نے قطعی فیصلہ دیا ہے جو پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اس کے بعد فتنہ وفساد پیدا کرنا اور خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شانِ اقدس میں سب وشتم بکنا اور محبِّ علی کہلوانا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معاذ اللہ جھٹلانا اور پھر دعوئ محبّت وتولّٰی کرنا ایمان تو بجائے خود کسی معقولیت پر بھی مبنی نہیں ہو سکتا۔ تحفہ حسبنیہ: از ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی غفر لہ

تتمہ مبحث نکاح حضرت اُمِّ کلثوم رضی اللہ عنہا

یہ مسئلہ قدیم ایام سے محل نزاع اور معرکۃ الآراء بنا ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ

خوشی اور رضامندی سے اس نکاح کا انجام پذیر ہونا شیعہ مذہب کو بیخ وبُن سے اکھیڑنے والا ہے، اس لیے شیعہ حضرات اس میں ہزار تاویل کریں گے اور اس کو چھپانے یا ایسا رنگ دینے کی مقدور بھر سعی کریں گے کہ اس سے فاروقی اور مرتضوی تعلقات کی خوش گواری ثابت نہ ہو سکے اور اگر یہ نکاح ثابت ہوتا ہے تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی ناراضگی کے افسانے اور غصب فدک اور غصبِ خلافت کے افتراآت حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں، لہذا سبائی ذہنیت نے اس کو عجیب عجیب رنگ دینے کی کوشش کی ہے، لیکن حقیقت نہ چھپنی تھی اور نہ ہی چھپی اور اُن کی عام کتابوں سے لے کر صحاح اربعہ تک میں اس کا اعتراف موجود ہے۔ فروعِ کافی جلد ثانی میں یہ عنوان قائم کیا: باب فی تزویج امّ کلثوم اور پہلی روایت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ نقل کی ہے۔

۱۔ عن ابی عبد اللہ علیہ السلام ان ذالك فرج غصبناہ۔ فروعِ کافی جلد ثانی ص۱۴۱ بے شک یہ ایسا رشتہ ہے جو ہم سے غصب کر لیا گیا ہے العیاذ باللہ! وکذا فی الشافی لعلم الہدٰی۔

حضرات ذرا اپنے گریبان میں جھانکیں اور دل سے فیصلہ طلب کریں کہ اگر تمہارے ساتھ ایسا معاملہ پیش آئے، تو ایسے شخصِ غاصب کو نماز میں امام اور پیشوا بناؤ گے؟ اس کا وزیر اور مشیر بننا پسند کرو گے؟ اس کے ہاتھوں سے تحائف اور وظائف وصول کرو گے؟ اور اس کو اسلام میں بلند مرتبت شخص اور اس کی وفات کو اسلام کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان اور نہ مندمل ہونے والا زخم قرار دو گے؟ اور اس کو راست رو اور راہِ راست پر چلانے والا، بے عیب اور پاک دامنی کی حالت میں دنیا سے جانے والا، خیر اور بھلائی کو ذخیرہ کرنے والا اور شر وفساد سے دامن بچا کر نکل جانے والا وغیر ذالک من الاوصاف کا مالک قرار دے سکتے ہو؟ قطعاً نہیں، بلکہ جونہی موقعہ ملے گا، اس کے وجود کو لوحِ جہاں سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھو گے۔ تو اس روایت کے پس منظر میں مولا علی رضی اللہ عنہ بلکہ تمام بنو ہاشم اور تمام بنو عبد مناف کا کیا مقام رہ جاتا ہے؟ کیا اہل بیت کرام کی

اس سے بڑی دشمنی اور عداوت بھی کوئی ہو سکتی ہے جو دوستی اور محبت کی آڑ میں سر انجام دی گئی ہے۔

۲۔ عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال لما خطب الیہ قال انہا صبیۃ قال فلقی العباس فقال لہ مالی أبی باس فقال وماذاک قال خطبت الیٰ ابن اخیک فردنی اما واللہ لاعودن زمزم ولا ادع لکم مکرمۃ الاھدمتہا ولاقیمن علیہ شاھدین بانہ سرق ولاقطعن یمینہ فاتاہ العباس فاخبرہ وسألہ ان یجعل الامر الیہ فجعلہ الیہ۔

حضرت ابو عبد اللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی اور منقول ہے کہ جب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس نکاح کا پیغام بھجوایا تو انہوں نے فرمایا: ام کلثوم ابھی بچی ہے۔ تو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور فرمایا: مجھے کیا ہے؟ کیا مجھ میں کوئی عیب اور نقص ہے؟ آپ نے دریافت فرمایا، آپ کا مقصد کیا ہے؟ تو فرمایا میں نے آپ کے بھتیجے سے رشتہ طلب کیا ہے، لیکن انہوں نے میری التجا کو رد کر دیا ہے۔ بخدا! میں تم سے زمزم واپس لے لوں گا اور اس کے علاوہ تمہاری ہر مکرمت و بزرگی اور ساز و سامانِ فخر و ناز کو ختم کر دوں گا اور میں دو گواہ قائم کر کے کہ حضرت علی بن ابی طالب نے چوری کی ہے، اس کے دائیں ہاتھ کو کاٹ دوں گا۔ چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورتِ حال سے ان کو باخبر کیا اور اس نکاح کا معاملہ ان کے سپرد کرنے کا مطالبہ کیا؛ چنانچہ آپ نے حضرت ام کلثوم کا حضرت عمر کے ساتھ نکاح کا معاملہ حضرت عباس کے سپرد کر دیا اور انہوں نے زمزم کی سقایت اور یہ شرف برقرار رکھنے کے لیے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ کٹنے کے ڈر سے حضرت ام کلثوم کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نکاح کر دیا۔ وکذا فی الانوار النعمانیہ للعلامۃ الجزائری جلد اول ص۸۳ وکذا فی الشافی لعلم الہدیٰ ص۲۱۶)

اب اس افسانہ کو ملاحظہ کرنے کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق کیا تاثر قائم ہوتا ہے؟ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شیری اور دلیری اور اسد اللّٰہی شان کے متعلق کیا تاثر قائم ہوتا ہے؛ اور تمام بنو ہاشم اور بنو عبد مناف کے متعلق کیا تاثر قائم ہوتا ہے؟ امام حسین رضی اللہ عنہ کو ہر حیلہ و بہانہ کے باوجود بیعت کے لیے نہ جھکایا جا سکا اور شیر خدا رضی اللہ عنہ کو رشتہ دینے کے لیے خالی دھمکی دے کر جھکا لیا گیا اور آپ کے اس کے اس فرمان اُلمنیۃ ولاالدنیۃ کی دھجیاں اڑا دی گئیں کہ موت قبول کی جا سکتی ہے، مگر ذلت قبول نہیں کی جا سکتی۔ کوئی معقول شیعہ عالم ہے جو مظلومِ کربلا سید الشہدا کے عمل اور علی مرتضےٰ شیرِ خدا رضی اللہ عنہما کے اس عمل و کردار میں تطبیق دے سکے اور باپ بیٹے بلکہ امامِ اول اور امامِ ثالث میں وحدتِ فکر ثابت کر سکے۔

تزویجِ اُمِ کلثوم کی وجہ سے حضرت علی کی حضرت عباس پر ناراضگی

قاضی نور اللہ شوستری صاحب فروعِ کافی کی اس دوسری روایت میں مزید رنگ بھر کر اسے ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں؛

۳۔ در کتاب استغاثہ وغیرہ منقول است کہ چوں عمر بن الخطاب بجہت ترویج خلافت فاسدۂ خود داعیۂ تزویج امّ کلثوم دخترِ حضرت امیر نمود و آں حضرت جہت اقامتِ حجت امتناع نمود، آخر عمر عباس را نزدِ خود طلبید و سوگند خوردہ گفت اگر علی را بدامادیٔ من راضی نمے سازی آنچہ در دفع او ممکن باشد خواہم کرد و منصبِ سقایت حج و زمزم را از تو خواہم گرفت عباس ملاحظہ نمود کہ اگر ایں نسبت واقع نشود آں فظ غلیظ مرتکب چناں امر ناصواب خواہد شد۔ از حضرت امیر علیہ السلام التماس و الحاح نمود کہ ولایتِ نکاح آں مطہرۂ مظلومہ را باُو تفویض نماید و چوں مبالغۂ عباس در آں باب از حد گزشت۔ آں حضرت از روئے اکراہ ساکت شدند تا آں کہ عباس از خود ارتکابِ تزویج اُو نمود و جہت اطفاء نائرہ فتنۂ اُو را باں منافق ظاہر الاسلام عقد فرمود و ظاہرًا بواسطۂ ایں وکالت فضولی و امثال آں حضرت امیر علیہ السلام عباس را مانند دیگر یارانِ فدائی خود راسخ در محبت و اخلاص نمی دانست (مجالس المومنین جلد اول ص۱۸۲)

کتابِ استغاثہ وغیرہ میں منقول ہے کہ جب عمر بن الخطاب نے اپنی خلافت فاسدہ کی ترویج و ترقی کے لیے حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اُمِ کلثوم

رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کا پختہ ارادہ کرلیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اتمامِ حجت اور اقامتِ بُرہان کے لیے اس سے امتناع اور گریز ظاہر کیا، تو انہوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلایا اور کہا: میں نے قسم کھالی ہے کہ اگر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ مجھے اپنی دامادی کا شرف نہیں بخشیں گے اور تم اُن کو ہر قیمت پر راضی نہیں کروگے تو میں اس رکاوٹ کو دور کرنے میں ہر ضروری اقدام کروں گا اور تم سے حاجیوں کو آبِ زمزم پلانے کا منصب چھین لوں گا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ اگر یہ عقدِ نکاح نہ ہوا، تو وہ سخت مزاج اور تندخو ایسے ناصواب اور نامناسب امر کے ارتکاب سے گریز نہیں کرے گا، لہٰذا حضرت امیر علیہ السلام سے التماس اور زاری کی کہ اس مطہرہ و مظلومہ کا حقِ تزویج مجھے سونپ دو اور جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا اس مطالبہ میں مبالغہ اور التماس و الحاح انتہا کو پہنچ گیا تو حضرت امیر علیہ السلام مجبوری و بے بسی کی وجہ سے خاموش ہوگئے تاآنکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے طور پر اُن کا نکاح اور شادی کردی اور فتنہ کی آگ بجھانے کے لیے اس ظاہری اسلام والے منافق کو عقد کر کے دے دیا اور اس وکالتِ فضولی اور اس قسم کے دیگر معاملات کی وجہ سے حضرت علی، حضرت عباس (رضی اللہ عنہما) کو اپنے دوسرے فدائیوں اور جاں نثار یاروں کی طرح محبت و اخلاص میں راسخ اور ثابت قدم نہیں سمجھتے تھے۔

تنبیہ: قاضی نور اللہ شوستری کی اس عبارت سراپا ظلمت و شقاوت میں کئی امور قابلِ غور ہیں:

۱۔ اس عقدِ تزویج کا بنیادی مقصد اپنی خلافت کی ترویج و ترقی تھا اور لوگوں کے ذہنوں میں اس کی حقانیت کو راسخ کرنا تھا اور ہر شخص پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ مقصد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ام کلثوم کے ساتھ نکاح سے حاصل نہیں ہوسکتا تھا جو کہ بقول بعض شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ربیبہ تھیں، بلکہ صرف اور صرف آپ کی صلبی بیٹی سے ہی حاصل ہوسکتا تھا۔

نیز یہ اعلیٰ مقصد باہمی رضامندی اور صُلح و صفائی سے طے ہونے والے رشتے

کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتا تھا۔ جبر و اکراہ اور ظلم و تعدّی سے تو وہ مقصد بالکل فوت ہوجاتا، لہٰذا واضح ہوگیا کہ یار لوگوں نے یہاں سبائی ذہنیت کا کامل مظاہرہ کیا ہے، اور سنتِ اسلاف کو اپناتے ہوئے تحریف سے کام لیا ہے۔

۲۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے سقایتِ حج اور زمزم پر تصرّف و تسلّط برقرار رکھنے کے لیے حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا کو بھینٹ چڑھا دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے سامنے مجبور و بے بس ہوگئے۔

۳۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نکاح کی اجازت نہیں دی تھی اور یہ نکاح ولایت فضولی سے طے پایا، حالانکہ نکاحِ فضولی میں فریقین کی رضامندی ضروری ہے اور حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا بقولِ شیعہ نابالغہ بچی تھی جو کہ اذن دے ہی نہیں سکتی تھیں اور ولی اقرب کے ہوتے ہوئے بھی ولی ابعد کا نکاح بلا اجازت اس کے منعقد ہو ہی نہیں سکتا، تو اس عقد کے بعد رخصتی اور ازدواجی تعلقات قائم کرنے کا شرعی حکم اور حیثیت کیا ہوگی اور کوئی غیرت مند باپ خواہ عامی قسم کا ہی کیوں نہ ہو، وہ بھی ایسی حرکت برداشت نہیں کرسکتا، چہ جائیکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس اور آپ کے پیارے بھائی علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما ایسے غلط اور ناجائز امر کا ارتکاب کریں۔

۴۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس خبیث نے منافق ظاہر الاسلام کہا اور اگر حضرت عباس اور حضرت امیر رضی اللہ عنہما کی نظر میں بھی وہ ایسے ہی تھے، تو منافق جو کہ بباطن کافر ہوتا ہے، اس کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور بھائی نے آپ کی نواسی کا نکاح کیونکر کیا؟ اور عام اہلِ اسلام نے اس سے کیا تاثر لیا؟ کہ یہ رشتہ منافق کو دیا ہے یا کامل مومن کو؟ گویا دوہری خرابی اور فساد لازم آگیا۔ ایک تو کافر کے ساتھ دیدہ دانستہ رشتہ داری قائم کرنا، دوسرا لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنا کہ وہ مومن کامل اور مخلص مُسلمان ہیں اور دامادیٔ علی بلکہ دامادیٔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائق اور اہل ہیں۔ لاحول ولاقوۃ اِلّا باللہ العلیّ العظیم۔ کیا اہلِ بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مشعلِ راہِ ہدایت ہوا کرتا ہے یا ضلالت و غوایت کا سبب و ذریعہ؟

۵۔ علاوہ ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر دباؤ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو دھمکیاں (جیسا کہ شوستری کے قول میں آپ ملاحظہ فرما چکے اور فروع کافی کے حوالے سے بھی) اس امر کی بیّن دلیل ہیں کہ جن کا رشتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مطلوب تھا، وہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لختِ جگر اور نورِ نظر تھیں، ورنہ تو یہ دباؤ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اولاد پر ہونا چاہیئے تھا، کیونکہ شرعی طور پر وہی اولیاء اور ورثاء تھے، لہذا اس کے لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس تہدید و تشدید اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے لئے انذار و تخویف کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟

بیوہ کی عدّت کا حکم اور حضرت امّ کلثوم کا تذکرہ

بیوہ عورت کے مقامِ عدّت کے ضمن میں فروعِ کافی، الاستبصار، اور تہذیب الاحکام میں متعدد روایات اس مضمون کی مذکور ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد اپنی لختِ جگر ام کلثوم کو اپنے سسرال میں عدّت بٹھانے کی بجائے اپنے گھر لا کر عدّت بٹھایا، جس سے یہ مسئلہ ثابت کیا گیا کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے، وہ جہاں چاہے عدّت گزارے، اپنے فوت شدہ خاوند کے گھر اس کا عدّت گزارنا ضروری نہیں ہے۔ اس باب میں فروعِ کافی کے اندر مذکور دو روایات میں سے پہلی روایت حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز نے نقل فرمائی، جس کا یہ جملہ قابلِ غور ہے۔

۳۔ ان علیاً لما توفی عمر اتی ام کلثوم فانطلق بها الی بیته۔

یعنی جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور اُمِّ کلثوم رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر لے گئے۔ اگر وہ آپ کی صاحبزادی نہیں تھیں تو خود جانے کی بجائے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اولاد کو بھیجتے یا ان کو ہمراہ لے جاتے۔ نہ بوقتِ عقدِ نکاح اور تزویج ان کا ذکر اور نہ بوقتِ بیوگی ان کا ذکر۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے کہ اصلی ورثاء کا کہیں نام و نشان ہی مذکور نہ ہوا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہر جگہ ذکر ہو

جس سے صاف ظاہر ہوا اور دوپہر کے اُجالے سے بھی زیادہ روشن کہ اس امّ کلثوم کے اصل ولی اور وارث ہی آپ تھے نہ کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادگان۔ اور دوسری روایت میں یہ مضمون ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

۴۔ ثم قال ان علیاً صلوات اللہ علیہ لما مات عمر اتی ام کلثوم فاخذ بیدها فانطلق بها الی بیته۔ (فروع کافی جلد ثانی ص ۳۱۱/۳۱۲)

اور ہر دو روایت میں یہ فرمان حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور اسی طرح استبصار جلد ثانی میں بھی اسی عنوان کے تحت چند روایات درج ہیں اور تہذیب الاحکام جلد ۸ ص ۱۶۱ پر بھی دو روایات اسی مضمون کی درج کی گئی ہیں۔ اگر سب کو علیحدہ علیحدہ شمار کریں، تو چھ روایات بنتی ہیں۔

۵۔ عن جعفر بن محمد القمی عن القداح عن جعفر عن ابیه قال ماتت ام کلثوم بنت علی وابنها زید بن عمر بن الخطاب فی ساعة واحدة لا یدری ایهما هلك قبل فلم یورث احدهما من الآخر وصلی علیهما جمیعاً۔

یعنی جعفر بن محمد قمی نے قداح سے اور اُس نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت ام کلثوم بنت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے صاحبزادے حضرت زید بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کا ایک ہی وقت میں وصال ہو گیا اور یہ تحقیق نہ ہو سکی کہ کس کا وصال پہلے ہوا ہے، لہذا کسی کو دوسرے کا وارث نہ بنایا گیا اور ان دونوں پر اکٹھی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔

فائدہ: اس روایت میں بھی حضرت امّ کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما کا ذکر ہے اور ہر جگہ راوی امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں یا امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے لہذا اس کو مؤرخین کی غلطی تو نہیں کہہ سکتے۔ اگر یہ مجاز تھا تو کہیں حقیقت کا بھی ذکر ہونا چاہیے تھا اور ام کلثوم بنت ابی بکر یا ام کلثوم بنت اسماء کا بھی ذکر آ جاتا۔ جب اس طرح نہیں اور بالکل نہیں تو صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ حقیقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے بطنِ اقدس سے متولد ہونے والی تھیں۔

نکاحِ ام کلثوم بنتِ علی رضی اللہ عنہما کے متعلق شیعی تاویلات

تاویلِ اوّل: اس تاویل کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ نکاح جبر و اکراہ کے ساتھ ہوا لہٰذا کسی فضیلت اور رفعتِ مرتبت کا موجب نہیں ہے۔ سید نعمۃ اللہ موسوی جزائری نے انوارِ نعمانیہ میں اس عقد تزویج پر بحث کرتے ہوئے لکھا:

قد تفصّی الاصحاب عن ھٰذا بوجھین عامی وخاصی اما الاول فقد استفاض فی اخبارھم عن الصادق علیہ السّلام لما سئل عن ھٰذہ المناکحۃ فقال انہ اول فرج غصبناہ۔

یعنی حضرت اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا کے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آنے پر جو اشکال وارد ہوتا ہے کہ دینِ اسلام سے العیاذ باللہ ان کے مرتد ہونے کے باوجود یہ نکاح کیسے ہوگیا، تو علماء امامیہ نے اس سے خلاصی حاصل کرنے کے لیے دو توجیہیں ذکر کی ہیں۔ ایک جو سب کو معلوم ہے اور دوسری جو خواص تک محدود ہے۔ وجہ عام یہ ہے کہ شیعہ کی حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مستفیض و مشہور اور متواتر روایات سے ثابت ہے کہ جب آپ سے اس نکاح کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا یہ پہلا رشتہ ہے جو ہم سے غصب کیا گیا اور جبری طور پر لیا گیا۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

اس پر دلیل و بُرہان پیش کرتے ہوئے اور اس استبعاد بلکہ استحالہ کو زائل کرتے ہوئے جزائری صاحب نے کہا:

وتفصیل ھٰذا ان الخلافۃ قد کانت اعزّ علی امیرالمومنین من الاولاد والبنات والازواج والاموال (الی) فاذا لم یقدر علی الدفع عن مثل ھٰذا الامر الجلیل وقد کان معذورًا کما سیاتی الکلام فیہ عند ذکر اسباب التقاعد عن الحرب فی زمان الثلاثۃ انشاء اللہ والتقیۃ باب فتحہ اللہ سبحانہ للعباد وامرھم بارتکابہ والزمھم بہ کما اوجب علیھم الصلٰوۃ

والصیام حتّٰی انہ ورد عن الائمۃ الطاھرین علیھم السّلام لا دین لمن لا تقیۃ لہٗ نقبل عذرہ فی مثل ھٰذا الامر الجزئی وذلك انہٗ قد روی الکلینی الخ۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خلافت حضرت امیرالمومنین رضی اللہ عنہ کو اولاد، بنات، ازواج اور اموال سے زیادہ عزیز تھی، کیونکہ دین کا انتظام، سنّت کی تتمیم و تکمیل، دفع جور اور احیاء حق اور اماتتِ باطل، نیز تمام دنیوی اور اُخروی فوائد اس پر موقوف تھے، تو جب ایسے جلیل القدر اور عظیم الشان امر سے دفاع نہ کرسکے، جس طرح کہ معاویہ بن ابوسفیان کے دور میں کیا اور اس خلافت کی خاطر ساٹھ ہزار آدمی معاویہ کے لشکر سے قتل کیے اور بیس ہزار اپنے لشکر سے قتل کروائے۔ تو جب خلفاء ثلاثہ کے دور میں ہم نے ترکِ خلافت میں آپ کو معذور سمجھ لیا ہے اور واقعی آپ معذور بھی تھے جیسا کہ اس کے اسباب پر بعد میں روشنی ڈالیں گے اور پھر تقیہ کا دروازہ بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے کھول رکھا ہے، بلکہ اس پر عمل کا حکم دیا اور اس کو لازم و ضروری ٹھہرایا ہے جیسے کہ نماز اور روزہ کو فرض کیا ہے اور ائمہ طاہرین سے مروی و منقول ہے کہ جس کے لیے تقیہ نہیں، اس کے لیے دین نہیں ہے، لہٰذا ہم اس قسم کے جزوی اور انفرادی معاملہ میں بھی آپ کو معذور سمجھیں گے اور اس پر بطورِ استشہاد وہ روایت نقل کی ہے جو ہم قبل ازیں کلینی کے حوالے سے نقل کرچکے ہیں۔ یعنی باب تزویج ام کلثوم کے تحت مندرج دوسری روایت۔

سوال وجواب: اس تقریر کے بعد جزائری صاحب کو ایک سوال سوجھا اور اس کا جواب بھی لازمی اور ضروری سمجھا، لہٰذا اسی کی زبانی سوال و جواب ملاحظہ کریں۔

اما الشبھۃ الواردۃ علی ھذا وھی انہ یلزم ان یکون عمر زانیًا فی ذالك النکاح وھو مما لا یقبلہ العقل بالنظر الی ام کلثوم فالجواب عنھا بوجھین۔ رہا اس عقد پر وارد یہ شبہ کہ اس طرح تہدید و تشدید اور وعید و تکرار کے بعد ہونے والے نکاح میں عمر بن الخطاب کا زانی ہونا لازم آتا ہے حالانکہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے لحاظ سے عقل اس کو باور نہیں کرتی، تو اس کا جواب دو وجہ سے ہے۔

احدهما ان ام کلثوم لاحرج علیها فی مثله لاظاهراً ولا واقعا وهو ظاهر واما هو فلیس بزان فی ظاهر الشریعة لانه دخول ترتب علی عقد باذن الولی الشرعی واما فی الواقع وفی نفس الامر فعلیه مثل عذاب الزانی بل عذاب کل المساوی والقبائح۔ پہلی وجہ جواب کی یہ ہے کہ ایسے نکاح میں حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا پر تو ظاہر و باطن اور واقع وحقیقت کے لحاظ سے کوئی حرج نہیں ہے جیسے کہ ظاہر ہے رہے عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) تو وہ بھی ظاہر شرع کے لحاظ سے تو زنا کار نہیں ہیں، کیونکہ ان کے ازدواجی تعلقات تو ولی شرعی کے اذن کے بعد پائے گئے لیکن واقع اور نفس الامر میں ان پر زنا کا عذاب، بلکہ جملہ اہلِ کبائر اور اربابِ قبائح کی مانند عذاب ہوگا۔

الثانی، ان الحال لما آل الی ما ذکرنا من التقیة فیجوز ان یکون قد رضی علیه السلام بتلك المناکحة رفعا لدخوله فی سلك غیر الوطی المباح۔

یعنی دوسری وجہ جواب کی یہ ہے کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ عقد تزویج کا حال تقیہ کی طرف راجع ہے جیسے کہ ہم نے ذکر کیا، تو عین ممکن ہے کہ آپ کے اس عقد پر راضی ہوگئے ہوں تاکہ یہ ازدواجی تعلق حرام اور ناجائز مباشرت کے ضمن میں نہ آنے پائے۔ (انوارِ نعمانیہ جلد اول، ص۸۳)

الغرض اس عامی وجہ جواب ہیں مناکحت تسلیم ہوگئی اور اس کا شرعی جواز بھی ثابت ہوگیا اور حضرت امّ کلثوم رضی اللہ عنہا کے لیے ہر قسم کے حرج وغیرہ کی نفی بھی ثابت ہوگئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی ظاہر شرع کی رُو سے عقد صحیح کے ساتھ ازدواجی تعلقات استوار کرنا واضح ہوگیا اور یہی اس وقت ہمارا مدّعا اور مقصود ہے کہ یہ نکاح وقوع پذیر ہوا اور رخصتی بھی ہوئی۔ خواہ جبر و اکراہ اور تغلیظ و تشدید کے بعد بطورِ تقیہ جیسے کہ شیعہ صاحبان کا گمان ہے۔ خواہ باہمی رضامندی اور خوشنودی سے جیسے کہ اہل السنّت کا عقیدہ ہے لیکن یہ حقیقت محتاجِ وضاحت نہیں کہ اس تکلّف و تصنّع اور تقیہ وغیرہ کے

سہارے کی ضرورت اسی صورت میں پیش آسکتی ہے، جبکہ یہ امّ کلثوم رضی اللہ عنہا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی لختِ جگر ہوں، ورنہ نہیں۔

عقد امِّ کلثوم اور سیّد مُرتضےٰ علمُ الہدیٰ

اہلِ تشیع کے مُسلّم متکلّم اور فاضل سیّد مرتضےٰ علم الہدیٰ ابوالقاسم علی بن الحسین جو کہ امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے پانچ واسطوں سے فرزند ہیں اور گویا یہ مسئلہ اُن کے ہی گھر کا ہے، اس لیے ان کا قول اس معاملہ میں حرفِ آخر سمجھا جانا چاہیئے اور اس کے بعد چوں و چرا کی گنجائش شیعہ کے لیے نہیں رہنی چاہیے۔ علی الخصوص جبکہ شیعہ اس کو علم الہدیٰ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ قاضی عبدالجبار نے مغنی میں یہ طرزِ استدلال اختیار کیا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اپنی لختِ جگر اور حضرت زہرا۔ کی نورِ نظر حضرت ام کلثوم (رضی اللہ عنہا) کا حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سے نکاح کرنا اس امر کی بیّن اور واضح دلیل ہے کہ ان میں باہمی محبت اور مودت تھی اور کسی قسم کی مخالفت اور عداوت نہیں تھی اور نہ ہی نگاہِ مرتضوی میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مرتد تھے، ورنہ مرتد کے ساتھ اپنی صاحبزادی کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ کیونکر کرتے۔

زوج ابنته من فاطمة بعضهم ویقولون کل ذالك دال علی الولایة وخلاف العداوة (الی)، وکیف یزوج مرتداً ابنته

تو اس کا جواب دیتے ہوئے شیعی فاضل سید مرتضیٰ نے اپنی معروف و مشہور کتاب شافی میں کہا،

فاما تزویجه بنته فلم یکن ذالك عن اختیار والخلاف فیه مشهور فان الروایة وردت بان عمر خطبها الی امیر المومنین علیه السلام فدافعه وماطله فاستدعی عمر العباس (الی)، فقال له رد امرها الیّ ففعل فزوجه العباس ایاها ویبین ان الامر جری علی اکراه ماروی عن ابی عبد الله جعفر بن محمد من قوله ذالك غُصِبناه علیه علی انه لو لم یجز ما ذکرناه لم یمتنع ان یزوجه

علیہ السلام لانہ کان علی ظاهر الاسلام والتمسک بشرائعہ
واظهار الاسلام۔ شافی ص۲۱۶

رہا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اپنی صاحبزادی کا نکاح ان سے کرنا تو وہ اختیار اور رضامندی سے نہیں ہوا تھا اور اس میں اختلاف مشہور ہے، کیونکہ روایت میں وارد ہے کہ عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کے مطالبہ پر آپ نے جواب دے دیا تو انہوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بلا کر زمزم کی سقایت اور اسباب مکرمت چھین لینے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر چوری کی شہادت قائم کر کے ہاتھ کاٹ ڈالنے کی دھمکی دی، تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس نکاح کا معاملہ اپنے ہاتھ میں دیئے جانے کا مطالبہ کیا جس کو حضرت امیر علیہ السلام نے قبول کیا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہ نکاح پڑھا دیا اور اس جبر و اکراہ کی وضاحت اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ رشتہ ہم سے غصب کیا گیا اور اگر یہ درست نہ بھی ہو جو وجہ ہم نے ذکر کی ہے، تو پھر بھی حضرت امیر علیہ السلام کے نکاح کر دینے میں کوئی وجہ امتناع و استحالہ نہیں ہے، کیونکہ عمر (رضی اللہ عنہ) بظاہر اسلام پر تھے اور احکامِ اسلام کے ساتھ متمسک تھے، بلکہ اسلام کو ظاہر اور غالب کرنے والے تھے۔

عقدِ امّ کلثوم اور ابو جعفر طوسی

سید مرتضیٰ کی کتاب شافی کی تلخیص طوسی صاحب نے کی جس کا نام تلخیص الشافی رکھا اور طوسی صاحب شیعہ کے عظیم محدث بھی ہیں اور ان کی صحاح اربعہ میں سے دو کتابیں یعنی الاستبصار اور تہذیب الاحکام اسی کی ہیں، لہذا اس مسئلہ میں اس کا قول بھی ملاحظہ کرتے چلیں، کیونکہ اس کا قول شیعی عقائد اور احادیث کا مغز اور جوہر ہوگا اور سید مرتضیٰ کے جواب کا ماحصل، لہذا اسی کی زبان قلم سے اس عقد نکاح کا ثبوت بھی ملاحظہ کریں اور اس کے جواز اور صحت و درستگی کے لیے توجیہات و تاویلات بھی مشاہدہ کریں اور اس نکاح کے ناقابلِ انکار و تردید حقیقت ہونے کا اندازہ کریں اور علی الخصوص قاضی عبدالجبار

کی اس تصریح کے بعد کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا جس کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا، وہ آپ کی صاحبزادی تھیں اور حضرت سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے بطنِ اقدس سے پیدا ہونے والی لختِ جگر تھیں، مگر نہ سید مرتضیٰ اس کا انکار کر سکا اور نہ ہی ابو جعفر طوسی بلکہ جوازِ نکاح کے لیے مختلف تاویلات و توجیہات ذکر کیں، جن کا بطور اختصار کتاب الشافی سے ذکر کیا جا چکا ہے، اب اس کی تفصیل تلخیص الشافی سے پیشِ خدمت ہے ابو جعفر طوسی صاحب نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق نہیں تھے اور غاصب و ظالم تھے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن کو اپنی دامادی کا شرف کیوں بخشا؟

اما انکاحہ بنتہ عمر لم یکن الا بعد توعد و تهدد ومراجعة ومنازعة وکلام طویل معروف اشفق منه من شروق الحال وظهور ما لا یزال یخفیه وان العباس لما رأی ان الامر یفضی الی الوحشة ووقوع الفرقة سأله علیه السلام رد الامر الیه ففعل فزوجها منه وما یجری هذا المجری معلوم انه علی غیر الاختیار علی انه لا یمتنع ان یبیح الشرع ان یناکح بالاکراه من لا یجوز مناکحته مع الاختیار لاسیما اذا کان المنکح مظهر الاسلام والتمسک بظاهر الشریعة ولا یمتنع ایضا من مناکحة الکفار علی سائر انواع الکفر وانما المرجع فیما یحل من ذالک الی الشریعة وفعل امیر المومنین اقوی حجة من احکام الشریعة۔
(تلخیص الشافی ص۳۵۴)

لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنی صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ کرنا تو یہ وعید و تہدید اور نزاع و اختلاف اور طویل گفتگو کے بعد پایا گیا، جس سے اُس حقیقت کے روشن ہونے اور اس امر کے ظاہر ہونے کا اندیشہ تھا جس کو آپ ہمیشہ چھپاتے تھے اور جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا

کہ عقدِ نکاح و تزویج کا معاملہ وحشت و افتراق کا موجب بن رہا ہے، تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت امِ کلثوم کا معاملہ اُن کے سپرد کرنے کو کہا، چنانچہ آپ نے یہ معاملہ اُن کے سپرد کر دیا، تو انہوں نے آپ کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ (۱) اور جس عقدِ نکاح اور تزویج کا حال یہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اختیار اور رضامندی کے ساتھ نہیں ہے۔

(۲) علاوہ ازیں شریعتِ مطہرہ میں یہ امر ممتنع اور محال نہیں ہے کہ اکراہ و اجبار کی صورت میں ایسے شخص کو نکاح کر کے دینا جائز ہو، جس کے ساتھ اختیار و قدرت کے ہوتے ہوئے نکاح کر دینا درست نہ ہو۔

(۳) علی الخصوص جبکہ نکاح کیے جانے والا شخص اسلام کا ظاہر کرنے والا ہو اور ظاہر شرع پر عامل اور کاربند ہو۔

(۴) مزید یہ کہ تمام قسم کے کفار کے ساتھ نکاح کی ممنوعیت بھی ثابت نہیں اور نہ یہ نکاح ممنوع و محال ہے۔ اس ضمن میں حلت اور حرمت کا دار و مدار شرع پر ہے اور حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا فعل احکامِ شرع کے لیے ایک اہم دلیل و حجت ہے۔

(کذا فی تنزیہ الانبیاء للعلامہ سید مرتضیٰ ص۱۴۱ و طراز المذہب المظفری ص۵۹)

فائدہ: طوسی صاحب نے قاضی نور اللہ صاحب سے اس معاملہ میں اختلاف کیا ہے کہ نکاح حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اختیار ملنے کے بعد پڑھا، جبکہ قاضی شوستری اس کا قائل تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سکوت فرمایا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بلا اجازت آپ کے ساتھ نکاح کر دیا، جس سے بھانت بھانت کی بولیاں بالکل واضح ہو جاتی ہیں اور دل کا اضطراب اور بے چینی صاف نظر آتی ہے۔

دوسرا اضافہ طوسی صاحب نے یہ کیا کہ کفار کی تمام انواع و اقسام کے ساتھ بچیوں کا نکاح کرنا حرام نہیں ہے، بلکہ اس حلت و حرمت کا دار و مدار شریعت پر ہے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ خود شریعت کی سند اور معیار ہیں، لہذا آپ کا فعل ہی حجت شرع ہے۔

سبحان اللہ! حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عمل کتاب و سنت کے برعکس کیونکر ہو سکتا ہے، لہذا آپ کی طرف منسوب عمل کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے، کیونکہ ائمہ اہل بیت پر بہت زیادہ افترا پردازی اور بہتان تراشی سے کام لیا گیا ہے جیسے کہ خود امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا فرمان رجال کشی میں متعدد جگہوں پر موجود ہے۔

قابلِ غور

ہر شیعی محدث اور عالم اس بات پر مُصر نظر آتا ہے کہ براہِ راست حضرت علی نے نکاح نہیں کر دیا، بلکہ سیدنا حضرت عباس رضی اللہ عنہ درمیان میں آ گئے، لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس سے کونسی منفعت اور بچت تلاش کی جاتی ہے۔ اگر آپ اجازت نہ دیتے تو نکاح ہی درست نہ ہوتا اور جب آپ کی اجازت سے ہوا، تو وہ آپ ہی کا پڑھایا ہوا نکاح سمجھا جائے گا، لہذا اس ہیرا پھیری کا کوئی فائدہ شیعہ حضرات کو نہیں پہنچ سکتا۔ الغرض ابو جعفر طوسی صاحب کے ان جوابات سے واضح ہو گیا کہ ان کے نزدیک اس ام کلثوم کو بنتِ علی رضی اللہ عنہما تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ علی الخصوص جبکہ قاضی عبد الجبار نے ان کو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا بھی لختِ جگر قرار دیا، لیکن نہ علم الہدیٰ سید مرتضیٰ صاحبِ شافی نے اس کا انکار کیا اور نہ ہی طوسی صاحب نے تلخیص میں اس کا انکار کیا، جس کے بعد شک و شبہ کا امکان ہی ختم ہو گیا۔

دوسری تاویل: (از علی بن اسماعیل ابو الحسن التمار الاسدی)

دیگرے پرسید کہ چرا آنحضرت دخترِ خود را بعمر بن الخطاب داد گفت بواسطہ آنکہ اظہار شہادتین مینمود بزبان و اقرار بفضلِ حضرتِ امیر میکرد و در آں باب اصلاح غلظت و فظاظت اُو نیز منظور بود و ایں معاملہ دشوار تر از آں نبود کہ حضرت لوط پیغمبر عرض دختران خود بر قوم کفار مے نمود و بمضمون آیتِ کریمہ هٰؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ الآیۃ زبانِ مبارک مے کشود۔ (مجالس المومنین جلد اوّل ص۲۵۱)

یعنی ابو الحسن علی بن اسماعیل التمار الکوفی الاسدی سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی لختِ جگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کیوں نکاح کر دی؟

توانہوں نے کہا چونکہ وہ زبان سے توحید و رسالت کا اقرار کرتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا بھی اعتراف کرتے تھے اور اس رشتہ داری کے ذریعے ان کی طبعی شدت اور سختی کو کم کرنا مقصود تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کا اس مصلحت کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں چلے جانا اس سے زیادہ دشوار تو نہیں جو کہ حضرت لوط علیہ السلام سے مروی و منقول ہے کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو قوم کفار پر پیش فرمایا اور زبانِ مبارک پر یہ مضمون اور کلام جاری فرمایا: یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں، وہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہیں۔

تنبیہ: ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ اس مقتدا۔ اہلِ تشیع نے کتنی دُور سے یہ کوڑی لاکر اپنی برادری کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کی ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام اپنی صاحبزادیوں کا نکاح کر کے دینے کو تیار تھے، حالانکہ قوم کافر تھی اور بیٹیاں مسلمان تھیں۔ اگر پیغمبر کے اس اقدام پر اعتراض نہیں اور اس واقعہ کو سُن کر کوئی اُلجھن پیدا نہیں ہوتی، تو حضرت ام کلثوم کے عمر بن خطاب کے ساتھ نکاح میں کونسی اُلجھن ہے جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ زبانی توحید و رسالت کا اعتراف کرتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کا بھی اقرار کرتے تھے، لہٰذا اس رشتہ داری میں کوئی حرج نہیں اور نہ ہی کوئی قابلِ اعتراض پہلو ہے۔

مقامِ حیرت و استعجاب ہے کہ وہ اسلام جو منافقین کے ساتھ جہاد اور تغلیظ و تشدید کا حکم دے۔ کما قال تعالیٰ: "یاایہا النبی جاھد الکفار و المنافقین واغلظ علیھم" وہ اسلام جو ظالموں کی طرف معمولی میلان اور رغبت کو جہنم کی دہکتی آگ کا ایندھن بننے کا سبب قرار دے۔ کما قال اللہ تعالیٰ "ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار" وہ اسلام جو کفار کے ساتھ شادی بیاہ کو حرام قرار دے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ۔ صرف بُغضِ فاروق (رضی اللہ عنہ) کی وجہ سے اب اس میں ترمیم و تنسیخ فرما کر اسے حضرتِ لوط علیہ السلام کے دین کے مطابق ڈھالا جا رہا ہے۔

بہرحال شیعہ حضرات اس امر پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اسلام بدلا جاسکے، تو بدل دو، لیکن حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان باہمی محبت و اُلفت، بھائی چارہ اور برادرانہ روابط اور اخلاص و ہمدردی کسی قیمت پر ثابت نہیں ہونی چاہیئے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

الغرض یہ ثابت ہوگیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ رشتہ اس غرض اور مصلحت کے تحت دیا گیا تھا کہ آپ کی طبیعت میں جو شدت و صلابت ہے، وہ کم ہو جائے، جبکہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و کمالات کے معترف بھی تھے اور یہ مطلوب و مقصود اور سبب و موجب بیان کرنا اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے جبکہ یہ ام کلثوم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہوں۔ اگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی ہوتیں، تو یار لوگوں کے لیے جواب دینا بڑا سہل اور آسان تھا کہ جیسا خلیفۂ اوّل، ویسا ہی خلیفہ ثانی اور لڑکی بھی خلیفہ اوّل کی، لہٰذا کیا ہوا جو یہ رشتہ طے ہوگیا۔

تیسری تاویل: حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے جملہ امور میں حضور نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدار کرتے رہے اور منجملہ ان امور کے رشتہ دینا بھی تھا، جیسے کہ قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین حصہ اول صہ ۲۰۴ پر بیان کیا ہے:

امیر المومنین بعد از وفات سید المرسلین در سائر امور خود تاسی بہ آنحضرت می فرمود و اقتدار بوصایائے اُو میفرمود (تا) اگر او در ابتدار امر لکم دینکم ولی دین می فرمود۔ ایں نیز ترک ریاست قوم بے دین نمود، اگر او بوقتِ عجز بغار فرار نمود ایں بوقتِ عجز درخانہ بروئے خود فراز کرد۔ اگر مصطفیٰ در اوّل صلح نمود مرتضیٰ نیز در اول اصلاح نمود و اگر تپی دختر بعثمان داد ولی دختر بعمر فرستاد اگر پیغمبر بآخر قتال کرد، علی نیز بآخر قتال کرد۔ (مجالس المومنین جلد اوّل صہ ۲۰۴)

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات شریف کے بعد تمام امور میں آپ کی اقتدار کرتے رہے اور آپ کی وصیتوں پر عمل فرماتے رہے اگر ابتدار حال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کفار کو فرمایا: تمہارے لیے تمہارا

دین ہے اور میرے لیے میرا دین، یعنی تم مجھے نہ چھیڑو، میں تم سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی بے دین قوم کے لیے اپنا حق ریاست وحکومت ترک کر دیا۔ اور اگر حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے بوقت عجز غار کی طرف فرار اختیار فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی بوقت عجز وناتوانی اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا اور اندر بیٹھ گئے۔ اگر مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء و آغاز میں قوم کفار کے ساتھ صلح فرمائی، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی صلح و آشتی کا اظہار کیا اور اگر نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دامادی کا شرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بخشا تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنی دامادی کا شرف بخشا۔ اگر پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آخر میں حرب و قتال فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی آخر کار جنگ اور جدال فرمایا۔

تنبیہ: اقول، گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلام پھر از سر نو شروع ہوا اور جس طرح اس نے دور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں مکی اور مدنی زندگی میں زندگی میں مرحلہ وار ترقی پائی۔ اسی طرح وصال نبوی کے بعد پھر اس کا آغاز ہوا اور جو کیفیت وصورت کمال اور تکمیل دین کی آپ کے وقت وصال میں تھی، والعیاذ باللہ ختم ہو گئی اور اس تدریج اور آہستہ روی کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ ترویج اسلام کی خاطر حضور نبی اکرم، رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی لخت جگر کا نکاح حضرت امیر عثمان رضی اللہ عنہ سے کرنا پڑا اور بالکل اسی مقصد کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اپنی لخت جگر کا عقد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے کرنا پڑا۔ بہر حال اس تقریر بہو دلپذیر سے یہ واضح ہو گیا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی کا نکاح حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے کر دیا تھا نہ کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کا، کیونکہ اس صورت میں تو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت امیر علیہ السلام کے عمل میں بالکل مطابقت پیدا نہیں ہو سکتی نہ حضرت امیر کی آپ کے ساتھ متابعت متحقق ہو سکتی ہے۔

چوتھی تاویل: سید نعمت اللہ جزائری نے ایک عامی وجہ اس نکاح اور عقد تزویج کی بیان کی، جو پہلے ذکر ہو چکی، اب خاصی وجہ یعنی جو صرف خواص شیعہ کو معلوم تھی اور عوام شیعہ سے بھی اس کو مخفی رکھا گیا تھا، وہ وجہ ملاحظہ فرمائیں۔ اور اس میں وہ خود منفرد نہیں ہیں، بلکہ آپ نے اس کو بہاء الدین علی بن عبد الحمید الحسینی النجفی کی کتاب "انوار مضیئہ" کی جلد اول سے نقل کیا ہے اور انہوں نے اس کو شیخ مفید سے نقل کیا ہے، عبارت ملاحظہ ہو:

الوجه الخاص فقد رواه السيد عالم بهاء الدين علي بن عبد الحميد الحسيني النجفي في المجلد الاول من كتابه المسمى بالانوار المضيئة قال مما جاز لي روايته عن الشيخ السعيد محمد بن محمد بن النعمان المفيد۔ گویا متفق گردید رائے بوعلی با رائے من بلکہ شیخ مفید نے اس کو عمر بن اذینہ کے واسطہ سے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ تک پہنچا دیا ہے۔ اس توجیہ و تاویل کا ملخص یہ ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ اصلی ام کلثوم کا عقد تزویج نہیں ہوا، بلکہ ایک جن عورت ان کی شکل میں ڈھل کر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی دلہن بنی رہی۔

اب روایت ملاحظہ فرمائیں: قال عمر بن اذينة لابي عبد الله عليه السلام ان الناس يحتجون علينا ان امير المومنين زوج فلانا ابنته ام كلثوم وكان متكيا فجلس وقال أتقبلون ان عليًّا عليه السلام نكح فلانا ابنته؟ ان قوما يزعمون ذالك ما يهتدون الى سواء السبيل ولا الرشاد ثم صفق بيده وقال ما كان امير المومنين عليه السلام يقدر ان يحول بينه وبينها كذبوا لم يكن ما قالوا۔ ان فلانا خطب الى علي عليه السلام ابنته ام كلثوم فابى فقال للعباس والله لئن لم يزوجني لانزعن منك السقاية وزمزم فاتى العباس عليًّا عليه السلام فكلمه

فابیٰ فالح علیہ العباس فلما رأی امیرالمومنین علیہ السلام
مشقۃ کلام الرجل علی العباس وانہ سیفعل معہ ما قال
ارسل الی جنیۃ من اھل نجران یھودیۃ یقال سحیفۃ بنت
حریریۃ فامرھا فتمثلت فی مثال ام کلثوم وحجبت الابصار
عن ام کلثوم بھا وبعث بھا الی الرجل فلم تزل عندہ
(الی) فقتل فاخذت المیراث وانصرفت الی نجران واظھر
امیرالمومنین ام کلثوم۔ (انوار نعمانیہ جلد اول ص۸۳)

عمر بن اذینہ کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ لوگ ہمارے خلاف یہ حجت اور دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت امیر علیہ السلام نے فلاں کو اپنی بیٹی ام کلثوم نکاح کر دی۔ آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے، میری بات سن کر اٹھ بیٹھے اور کہا کیا تم اس کو قبول کرتے ہو کہ آپ نے اپنی لڑکی اس سے نکاح کر دی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں، وہ راہ راست اور ہدایت پر نہیں ہیں۔ پھر آپ نے تعجب سے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مارا اور فرمایا کیا امیرالمومنین میں اتنی قوت نہیں تھی کہ آپ ام کلثوم اور عمر (رضی اللہ عنہما) کے درمیان حائل ہو سکتے؟ یہ نکاح نہیں ہوا انہوں نے جھوٹ بولا (بلکہ حقیقت حال یہ تھی) کہ فلاں (عمر فاروق رضی اللہ عنہ) نے حضرت امیر علیہ السلام سے یہ رشتہ طلب کیا تو آپ نے انکار فرمایا، تو انہوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ مجھے یہ رشتہ نہیں دیں گے، تو میں تم سے زمزم اور سقایت کا منصب چھین لوں گا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے انکار فرمایا تو انہوں نے الحاح وزاری سے کام لیا۔ جب آپ نے اس شخص کے کلام کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر گراں بار ہونا مشاہدہ کیا اور سمجھ لیا کہ اس نے جو کہا ہے کر گزرے گا، تو آپ نے اہل نجران سے ایک یہودی عورت کو بلایا، جس کا نام سحیفہ بنت حریریہ تھا اور اسے ام کلثوم کی صورت میں ڈھلنے کا حکم دیا؛ چنانچہ وہ آپ کی صورت میں ڈھل گئی اور اس کی وجہ سے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو گئیں۔ چنانچہ آپ نے اس کو حضرت عمر

بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے گھر بھیج دیا اور وہ آپ کے قتل ہونے تک وہاں رہی اور اس کے بعد اپنا وراثت کا حصہ لے کر نجران چلی گئی، تو آپ نے ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو ظاہر فرمایا۔

دِل کا چور

چونکہ یہ امر واضح تھا کہ جن وانس میں باہم مماثلت نہیں اور میاں بیوی والے تعلق کے باوجود یہ راز فاش نہ ہونا اور شک وتردد بھی پیدا نہ ہونا بعید از فہم و قیاس تھا، تو اس کا جواب دیتے ہوئے اس روایت میں یہ اضافہ کر دیا:

فلم تزل عندہ حتی استراب بھا یوما وقال ما فی الارض
اھل بیت اسحر من بنی ھاشم ثم اراد ان یظھر للناس فقتل (انوار نعمانیہ جلد ۱ ص۸۴)

وہی سحیفہ بنت حریریہ یہودیہ آپ کے پاس بطور بیوی رہی، حتیٰ کہ ایک دن حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو اس کے متعلق شک وتردد ہوا اور کہا کہ تمام روئے زمین پر کوئی گھرانہ بنو ہاشم سے زیادہ جادوگر نہیں ہے۔ پھر لوگوں پر اس امر کے اظہار کا ارادہ کیا، مگر قتل ہو گئے۔ (اور یہ راز طشت از بام نہ ہوا اور مخفی ومستور رہ گیا)

عُذرِ ناتمام

۱۔ اس خدشہ کے ازالہ کا خیال تو آیا مگر ان روایات کے متعلق جواب کی نہ سوجھی، جن میں ولایتِ فضولی کے تحت حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے نکاح کر دینے کا اقرار ہے یا جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس ام کلثوم سے اولاد پیدا ہونے کا بھی ذکر ہے اور ماں بیٹے کا اکٹھا وفات پانا بھی منقول ہے۔

۲۔ نیز یہ بھی خیال نہ آیا کہ اتنی دور سے جنیہ عورت کو بلانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ مدینہ منورہ میں جن نہیں بستے تھے، یا وہ آپ کا حکم تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔

۳۔ نیز یہ بھی وجہ نہ سمجھ آئی کہ ایک طرف تو سحیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اتنی فرماں بردار اور تابع فرمان کہ ان کی خاطر عرصہ دراز تک فاروقی بوجھ برداشت

کرتی رہی، مگر دوسری جانب سے اس قدر سیاہ دل کہ رہی یہودیہ ہی، اسلام قبول نہ کیا اور نہ امامتِ علی پر ایمان لائی۔

۴۔ پھر سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ شیعہ مذہب میں اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کی عورتوں سے متعہ جائز ہے، مگر نکاحِ دوام جائز نہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو متعہ کو جائز ہی نہیں سمجھتے تھے۔ آپ کا مقصد نکاح دوام تھا اور تعیینِ مدت عقد میں نہ ہو تو نکاح دوام بن جاتا ہے اور شیعی شریعت یہودیہ عورت کے ساتھ نکاحِ دوام کو حرام ٹھہراتی ہے، تو اس حرام کے ارتکاب کا ذمہ دار کون ہوگا؟ کیا حضرت علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہ اس سے بری الذمہ ہو سکتے ہیں؟

۵۔ علاوہ ازیں انسانوں اور جنوں کے درمیان باہمی مناکحت اور ازدواجی تعلقات کے جواز کی کونسی دلیل شرعی ہے۔ یہ بھی بذاتِ خود جائز اور حلال نہیں ہے، تو کیا اس جرم سے حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کا دامن بچ سکتا ہے؟ ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟

الغرض صاف ظاہر ہو گیا کہ یار لوگوں نے یہ ساری کہانی اس لیے گھڑی کہ کہیں ان حضرات کے باہمی تعلقات کی خوشگواری ثابت نہ ہو جائے اور شیعی مذہب کی بیخ و بُن ہی نہ اُکھڑ کر رہ جائے اور جھوٹ کے پاؤں ہوتے نہیں، اس لیے دیگر مفاسد کی طرف توجہ دینے اور ان کا سدِ باب کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا کہ وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس کی سیاست اور دُور بین نگاہ نے قیصر و کسریٰ بلکہ عالمِ کفر کو عاجز و بے بس اور مقہور و مغلوب کر کے رکھ دیا تھا۔ اُن کے پہلو میں اور قریب ترین مکان میں اصل اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا موجود رہے اور اُنہیں خبر ہی نہ ہو سکے، یہ کیسے ممکن ہے؟ اور کون صاحبِ عقلِ سلیم اس کو باور کر سکتا ہے؟

شیعہ کے لیے دُوسری اُلجھن

اس روایت نے ایک اور اُلجھن پیدا کر دی کہ اگر صورتِ حال واقعی یہ تھی،

تو پھر انہیں امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا حضرت اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح کے متعلق فرمانا "اول فرج غصبناہ" کیونکر درست ہوگا کہ العیاذ باللہ یہ پہلا رشتہ ہے جو ہم سے غصب کر لیا گیا۔ تو اس کے جواب میں اکابرینِ شیعہ کی منطق ملاحظہ فرمائیں اور ابن سبا کی چالاکیوں کی داد دیں۔

نعمت اللہ جزائری نے کہا: اقول وعلیٰ ھذا فحدیث اول فرج غصبناہ محمول علی التقیۃ والاخفاء من عوام الشیعۃ کما لا یخفیٰ۔

(انوار نعمانیہ جلد اول، ص۸۴)

یعنی اس روایت کے پیش نظر غصب والی روایت تقیہ پر محمول ہے اور عوامِ شیعہ سے اخفاء پر گویا حقیقت میں تو رشتہ غصب نہیں کیا گیا تھا مگر زبانی اس کا اظہار ائمہ کرام بھی کرتے رہے اور عوامِ شیعہ کو یہی تاثر دیتے رہے تاکہ حقیقتِ حال ظاہر ہونے پر انتقامی کارروائی کا نشانہ نہ بننا پڑے۔

۲۔ ملا باقر مجلسی صاحب نے "بحار الانوار" میں اس تعارض کو دُور کرتے ہوئے کہا:

ایں اخبار با حکایت جنیہ منافات ندارد چہ آں حکایتے است مکتوم کہ جز بر خواص اصحاب خویش معلوم نداشتہ اند و معنی ایں حدیث چنیں است کہ غصبناہ ظاہراً۔

(طراز المذہب المظفری ص۵۹) یعنی وہ روایات جن میں حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح کا اثبات ہے، وہ جن عورت والی حکایت کے ساتھ منافات نہیں رکھتیں، کیونکہ وہ ایک پوشیدہ حکایت ہے، جس کا سوائے مخصوص اصحاب و احباب کے کسی پر اظہار نہیں کیا گیا، لہٰذا غصب والی روایت کا مطلب یہ ہوا کہ ہم سے بظاہر یہ رشتہ غصب کیا گیا، بلکہ ہم نے صرف ظاہر یہ کیا ہے کہ یہ رشتہ غصب کیا گیا، کیونکہ درحقیقت وہ جنیہ تھی۔ نہ وہ اپنا رشتہ تھا اور نہ ہی غصب کیا گیا، صرف واویلا کرتے رہے۔

حضرت اُمِ کلثوم کے عقدِ تزویج کے قائل جھوٹے کیوں؟

آپ نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب جنیہ عورت والی

روایت میں ملاحظہ فرمایا کہ حضرت امِ کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح سے تعلقاتِ فاروقی اور مرتضوی میں خوشگواری ثابت کرنے والوں کو جھوٹا، گمراہ اور راہِ راست سے بھٹکا ہوا قرار دیا گیا ہے اور علامہ جزائری اور علامہ مجلسی کے جوابات سے یہ حقیقت بھی معلوم ہو چکی کہ بطورِ تقیہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ یہی کہتے رہتے تھے کہ یہ رشتہ ہم سے غصب کیا گیا ہے اور عوامِ شیعہ سے بھی یہ راز پوشیدہ رہا اور صرف اخص الخواص اصحاب کو اس کا علم تھا اور جب تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید نہ ہو گئے، اصلی امِ کلثوم روپوش رہی اور جنیہ عورت اس روپ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے گھر آباد رہی۔ جب اس کی رخصتی بھی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے گھر سے ہوئی اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت امیر علیہ السلام اس کو اپنے گھر بھی لائے اور عام اہلِ اسلام پر یہ راز منکشف بھی نہ ہونے دیا گیا اور بطورِ تقیہ اس کو اپنی بیٹی ہی کہا، تو ایسی صورت میں عام اہلِ اسلام جھوٹے کیسے ہو گئے اور اگر وہ سچ بولتے تو کیا کہتے اور اس کی صورت کیا ہوتی؟ ہے کوئی صاحبِ عقل شیعہ جو ان حالات میں یہ حجت و دلیل پیش کرنے والوں کو جھوٹا ثابت کر سکے اور ان کے مقابل ائمہ کرام کو سچا ثابت کر سکے ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

جو جنیہ عورت کو اپنی بیٹی کہیں اور اس کو اپنی بیٹی ظاہر کریں، وہ سچے اور جو اُن کی زبان اور اُن کے اعلان پر اعتبار کریں اور اس کی روایت و حکایت کریں، وہ جھوٹے ع

ہر چیز یہاں کی اُلٹی ہے، یاں اُلٹی گنگا بہتی ہے

علاوہ ازیں حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ جس دور میں بطورِ تقیہ اور عوام شیعہ سے اخفاء کے لیے یہ کہتے رہتے تھے کہ یہ رشتہ ہم سے غصب کر لیا گیا تھا۔ اس دور میں نہ تو فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی حکومت تھی اور نہ امیر عثمان رضی اللہ عنہ کی اور نہ بنو امیہ کی، وہ تو بنو عباس کا دورِ حکومت تھا اور انہیں بہرحال حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی عزت و حرمت بہ نسبت حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زیادہ ملحوظ و مرغوب تھی، تو اُس وقت اس راز کو عام کرنے میں حرج کیا تھا اور اس تقیہ اور اخفاء کی ضرورت ہی کیا

تھی، بلکہ سجیفہ کو اسی شکل و صورت میں متمثل کر کے اس کی گواہی بھی دلوائی جا سکتی تھی اور وراثت کا حصہ بھی بطورِ شہادت پیش کیا جا سکتا تھا اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے بہی خواہوں کا ہمیشہ کے لیے ناطقہ بند کیا جا سکتا تھا، مگر اسے کیا کہیے کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے وصال اور حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے وصال کے درمیان ایک سو پچیس سال کے قریب فاصلہ ہے، مگر اتنے عرصے کے بعد بھی علی الاعلان اس مناکحت اور عقدِ تزویج کا انکار نہیں ہو سکا اور اہل السنت سے ہی نہیں، بلکہ عوامِ شیعہ سے بھی تقیہ اور اخفاء جاری رہا، تو پھر اہل السنت کی اس حجت و دلیل کی صداقت میں شکوک و شبہات کی کیا گنجائش ہے اور اس توجیہ و تاویل کے فساد و بطلان میں کیا ریب و تردد ہو سکتا ہے جو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔

اعترافِ حقیقت اور اقرارِ تزویج

ان بھونڈی حرکات اور مضحکہ خیز تاویلات میں ظاہر و باہر وجوہِ سقم و بطلان دیکھ کر شیعی علماء کو حقیقی اور اصلی امِ کلثوم رضی اللہ عنہا کا عقدِ تزویج تسلیم کرنا ہی پڑا، اسی لیے صاحبِ ناسخ التواریخ نے کہا:

بعضے از مردم شیعی گویند کہ ام کلثوم بخانۂ عمر نرفت بلکہ یکتن جنیہ بصورتِ ام کلثوم بر آمد و با عمر ہمبستر گشت، لیکن مردم شیعی را واجب نیفتادہ کہ حمل چندیں مصائب کنند چہ در نزد ایشاں خطبہ کردن ام کلثوم بیروں از شریعت از غصب خلافت کہ فتنۂ او تا قیامت باقی است بزیادت نیست از حضرت صادق روایت کردہ اند کہ فرمود اول فرج غصب منا ام کلثوم پس لازم پس لازم نیست جنیہ بصورتِ ام کلثوم در آید (ناسخ التواریخ، جلد دوم ص ۳۶۳)

بعض شیعہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے گھر بطورِ زوجہ نہیں گئی تھیں، بلکہ ایک جنیہ عورت ان کی صورت میں متمثل ہو کر آپ

کے گھر گئی تھی اور ان سے ہمبستر ہوئی تھی، لیکن شیعہ لوگوں کے لیے واجب و لازم نہیں کہ اس قسم کے مصائب (تاویلات و تسویلات کے) برداشت کریں، کیونکہ ان کے نزدیک حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا خلاف شرع نکاح خلافت کے غصب ہو جانے سے زیادہ عظیم معاملہ تو نہیں، جس کا فتنہ قیامت تک باقی ہے اور حضرت صادق رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا رشتہ ہم سے غصب کیا گیا ہے، لہذا ضروری نہیں کہ جن عورت حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا کی صورت و شکل میں متمثل و متشکل ہو کر آئے

شرم تم کو مگر نہیں آتی

صاحب ناسخ نے بالآخر وہی حل اور مشکل کشا صورت اختیار کی، جس کو نعمت اللہ الجزائری نے وجہ عامی کے عنوان سے ذکر کیا تھا اور وہ خاص وجہ جس کو علامہ بہاء الدین اور شیخ مفید نے ذکر کیا تھا، اس کو رد کر دیا، لیکن سب علماء اسلاف کے برعکس اس عقد کو خارج از شریعت قرار دے دیا، مگر سوال یہ ہے کہ اس غیر شرعی عقد کا ذمہ دار کون ہوگا اور اس کا گناہ کس کے سر پر ہوگا؟ کیا حضرت امیر رضی اللہ عنہ کمان کو اژدہا بنا کر شیعوں کی حفاظت کر سکتے تھے اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مرعوب بلکہ لرزہ براندام کر سکتے تھے، لیکن اس غیر شرعی عقد کو روکنے کے لیے اور حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ڈر اور خوف اور خوف کو دُور کرنے کے لیے وہ معجزہ بروئے کار نہیں لایا جا سکتا تھا؟ کیا عوام شیعہ کی عزت و حرمت حضرات اہل بیت سے بھی زیادہ ہے۔

علاوہ ازیں علامہ جزائری صاحب اور صاحب ناسخ نے اس عقد کو خلافت پر قیاس کیا اور کہا وہ غصب ہو گئی، تو اس غصب میں کونسی چونکا دینے والی بات ہے۔ تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ رافضی علماء کے نزدیک ملک و سلطنت اور عزت و ناموس کے معاملات یکساں ہیں کہ اگر ملک و سلطنت نہ بچے تو عزت و ناموس بھی بے شک برباد ہو جائے اور ملک و سلطنت ہاتھ آ جائے، تو پھر عزت و حرمت اور ناموس و عصمت بھی برقرار رہنی چاہیے
لعنت بریں عقیدہ باد۔

تاویلات کی ضرورت کیوں؟

شیعی علماء کا اضطراب دیکھ کر اور بھانت بھانت کی بولیاں سُن کر آپ نے یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ اگر یہ ام کلثوم (رضی اللہ عنہا) حضرت علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہ کی لخت جگر اور نور نظر نہ ہوتیں، تو شیعی علماء پر مصائب و متاعب اور شدائد و مشکلات و نوائب کے پہاڑ نہ ٹوٹتے اور انہیں اس قسم کی بیہودہ اور لغو تاویلات کا سہارا نہ لینا پڑتا کبھی جبر و اکراہ کی آڑ، کبھی تقیہ اور اخفائے حال کا بہانہ، کبھی فاروقی شدت و صلابت کو ملحوظ رکھنے کا عذر، کسی وقت اسلام کی ترویج و اشاعت کا پاس و لحاظ اور کبھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت و مطاوعت میں سعی و کوشش، کہیں حضرت لوط علیہ السلام کے ساتھ موافقت و مطابقت کا اختراع، کسی وقت غصب خلافت پر اس رشتہ کے غصب کا قیاس کر کے خلاصی کی جدوجہد اور کبھی نجران سے منگوائی جانے والی جنی عورت کو ام کلثوم کی ہم شکل قرار دے کر اس کی شادی اور عقد تزویج کا مفروضہ قائم کرنا، اس امر کی بین برہان اور ناقابل تردید دلیل ہیں کہ یہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لخت جگر ہی ہیں اور آپ کی ہی نورِ نظر، ورنہ علماء شیعہ کے لئے اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا کہ بیٹی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تھی اور خاوند عمر فاروق رضی اللہ عنہ بن گیا، جیسا باپ ویسا خاوند، مگر یہ جواب نہیں دیا جا سکا، بلکہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے منقول تمام روایات باہمی تخالف و تعارض کے باوجود صرف اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ ام کلثوم حضرت امیر (رضی اللہ عنہا) کی نورِ چشم تھیں نہ کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی۔

نیز یہ بھی واضح ہو گیا کہ صرف ڈھکو صاحب تو کیا، ان کے عمر بن اذنیہ جیسے اسلاف اور قدیم شیعہ بھی اس دلیل و برہان کا جواب نہ دے سکے اور حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی بارگاہ سے اس اشکال کو حل کرانے کی کوشش کی، لیکن وہ تریاق بھی کارآمد ثابت نہ ہو سکا اور عوام اہل اسلام بلکہ عوام شیعہ کے سامنے بھی جو حقیقت ظاہر کی گئی وہ بھی یہی تھی کہ یہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا ہماری تھی اور ہم سے جبر و اکراہ کے ساتھ اس کا رشتہ لے لیا گیا۔ العیاذ باللہ!

عقدِ نکاح کی روایات کو موضوع کہنے کی لغویت

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کی اور ہماری نقل کردہ روایات اور حوالہ جات سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ محمد بن یعقوب کلینی المتوفی ۳۲۸ھ سے لے کر صاحبِ ناسخ التواریخ اور صاحبِ طراز المذہب المظفری تک شیعی محدثین، متکلمین، مورخین اور دیگر علماء اس عقد کا ذکر کرتے چلے آئے ہیں اور اس کی مختلف توجیہات اور تاویلات بھی بیان کرتے چلے آئے ہیں اور ان کی کتبِ صحاح میں بھی اس عقد کے ثبوت و تحقق اور وقوع پر دلالت کرنے والی متعدد روایات موجود ہیں، بلکہ باب تزویج ام کلثوم کا مخصوص عنوان قائم کرکے ان کو ذکر کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ان تمام روایات کو موضوع اور من گھڑت قرار دینا خود شیعہ مذہب کو ہی اختراعی اور افترائی مذہب قرار دینے کے مترادف ہے، کیونکہ مذہب کا دارومدار مذہبی کتابوں پر ہی ہوتا ہے اور وہ سب موضوع اور من گھڑت روایات پر مشتمل ہوں، تو پھر مذہب کا اثبات کس طرح ہوسکتا ہے؟

ہم تو بڑی فراخ دلی سے ان کی تمام تر روایات کو موضوع اور اختراعی اور افترائی ماننے کو تیار ہیں، مگر وہ خود سوچیں کہ کہیں مذہب کی بنیاد ہی تو ختم نہیں کر رہے؟ تحریفِ قرآن کی متواتر روایات جو دو ہزار سے زائد وہ بھی موضوع۔ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عقدِ نکاح پر دلالت کرنے والی مستفیض اور مشہور روایات بھی سبھی موضوع صحابہ کرام علیہم الرضوان کے فضائل پر دلالت کرنے والی روایات بھی موضوع اور ناقابلِ اعتبار ہوں اور علیٰ ہذا القیاس تو پھر ان روایات پر محیط اور مشتمل مذہبی کتابوں پر کیا اعتماد و اعتبار ہوسکتا ہے اور جب مذہب کی بنیاد ان پر قائم ہوئی تھی اور وہ بنیاد ہی منہدم اور معدوم ہوگئی، تو اس پر شیعہ مذہب کا تعمیر شدہ سارا محل ہی مسمار اور زمیں بوس ہوجائے گا، لہٰذا ان کو موضوع اور ناقابلِ اعتنا کہہ کر گلو خلاصی اور جان چھڑانے کی سعی اور کوشش بے سود اور بے ثمر و بے نتیجہ ہے۔

رسالہ تنزیہ الامامیہ ص۱۳۳ تا ۱۳۸ علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

پیر صاحب آف سیال شریف نے اپنے رسالہ کے ص۵۷ پر دامادیٔ عمر (رضی اللہ عنہ) کے افسانہ کا تذکرہ کرکے حضرت علی اور عمر فاروق (رضی اللہ عنہما) کے باہمی خوشگوار تعلقات ثابت کرنے کی سعیٔ لاحاصل کی ہے، لیکن بچند وجہ اس مفروضہ عقد سے عمر کی فضیلت یا علی و عمر (رضی اللہ عنہما) کے باہمی تعلقات کے خوش گوار ہونے پر استدلال درست نہیں ہے:

۱۔ اس سلسلہ کی جتنی روایات موجود ہیں، بتصریح علماء محدثین و محققین ان میں سے کوئی ایک روایت بھی صحیح السند نہیں ہے، جس سے یہ بات واضح اور عیاں ہوجاتی ہے کہ اس قسم کا کوئی عقد نہیں ہوا۔ یہ محض بہی خواہانِ خلیفہ کا طبع زاد افسانہ ہے۔ ملاحظہ ہو: مرآۃ العقول۔

۲۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت فاطمۃ الزہرا (رضی اللہ عنہا) کا رشتہ طلب کیا، تو آپ نے فرمایا: (انہا صغیرۃ) یعنی وہ چھوٹی ہیں اور ان کی درخواست رد کر دی۔ کیا کوئی صاحبِ عقلِ سلیم ایک لمحہ کے لیے باور کرسکتا ہے کہ اسی صغیرۃ السن شاہزادیٔ کونین کی شادی بڑے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوئی ہو اور ان کے بطنِ اقدس سے ایک بچی پیدا ہوئی ہو اور وہ بھی چوتھی جگہ، جن کے بڑے ہونے پر ان کا رشتہ ساٹھ سالہ بوڑھے شخص عمر کو دے دیا جائے جو نسبی رشتے میں ان کا پڑنانا ہوتا ہو؟

۳۔ تمام شیعی کتبِ معتبرہ اور کتبِ معتمدہ میں مذکور ہے کہ جناب ام کلثوم دخترِ جناب امیر کا پہلا نکاح اپنے چچازاد بھائی عون بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے ہوا۔

۴۔ پیغمبرِ اسلام کی وفات حسرت آیات کے بعد حضرت علی اور حضرت بتول رضی اللہ عنہا کو بالخصوص ظلم و استبداد کا نشانہ بنایا گیا اور ان مصائب و آلام کے ڈھانے میں عمر بن خطاب پیش پیش تھے، حتیٰ کہ انہی مصائب و نوائب کی تاب

نہ لاکر خاتونِ جنت وفاتِ پیغمبر کے پچھتر یا پچانوے دن بعد انتقال فرما گئیں، لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ اسی زہرا (رضی اللہ عنہا) کی لختِ جگر کا رشتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ عمر بن الخطاب کو دیں :

۵ - اگر جناب عمر بن الخطاب کا رشتہ کسی ام کلثوم سے ہوا تھا تو وہ ام کلثوم یقیناً علی و بتول (رضی اللہ عنہما) کی لختِ جگر نہیں تھی، بلکہ دخترِ ابوبکر تھیں جو اسماء بنت عمیس کے بطن سے تھیں اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ربیبہ تھیں، لہٰذا مجازاً بیٹی کہلائیں اور بعض مورخین حقیقت و مجاز میں فرق نہ کرتے ہوئے مغالطہ کا شکار ہو گئے۔ حالانکہ وہ اصولِ روایت اور درایت کے خلاف ہے، اسی لیے کسی روایت میں اُم کلثوم کے نام کے ساتھ "مِنْ بَطْنِ فَاطِمَةَ" مذکور نہیں۔

۶- پیر صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اُخروی فوز و فلاح اور نجات کا دارومدار ایمانداری پر ہے نہ کہ رشتہ داری پر۔

۷ - پیر صاحب کو فروعِ کافی کی روایت میں مذکور لفظ "فرج" سے جو غصہ آیا ہے تو پیر صاحب کی کوتاہ اندیشی ہے۔ اس کو اگر فتح را سے پڑھ لیتے، تو ان کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا اور اگر سکون را سے پڑھنے پر اصرار ہے، تو یہ لفظ متعدد جگہ قرآن مجید میں وارد ہے، لہٰذا جو فتویٰ ہم پر لگا رہے ہیں، وہ پہلے خداوند کی ذات پر لگائیں۔

تحفۂ حسینیہ

از ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی

جواب الاوّل : علامہ ڈھکو صاحب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دامادِ مرتضیٰ ہونے پر پیش کردہ روایات کا پہلا جواب یہ دیا کہ اس مضمون کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے، خواہ کتبِ سُنیہ میں مذکور ہو یا کتبِ شیعہ میں اور یہ ایک افسانہ ہے، جس کو بہی خواہانِ خلیفہ نے اختراع کیا ہے، لیکن اس جواب میں چند امور غور طلب ہیں :

۱- علامہ موصوف کو یہاں اہل السنّت کی کتابوں کے نام لینے کا کوئی حق نہیں تھا، اُن کی صحت کے ذمہ دار وہ خود ہیں، ڈھکو صاحب کو صرف اپنا دامن صاف کرنا

چاہیے تھا، لیکن انہوں نے محض یہ دعویٰ کر کے ان روایات کا جواب دیا جو حضرت شیخ الاسلام نے ذکر فرمائی تھیں کہ اس مضمون کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے اور کوئی حوالہ اور عبارت اس ضمن میں ذکر نہیں کی، حالانکہ محلِ نزاع اور مقامِ اختلاف میں اس قسم کے دعویٰ کا قطعاً اعتبار نہیں ہوتا، بلکہ اس قسم کے کھلے دعوے کو عاجزی اور بے بسی کی دلیل تصور کیا جاتا ہے، جبکہ سابقہ صفحات میں ہم نے شیعی کتبِ معتبرہ سے اور مستند علماء کے حوالہ جات سے اس عقدِ نکاح کو مدلل انداز میں بیان کر دیا ہے

۲ - ملا باقر مجلسی کی کتاب مرآۃ العقول کے نام کا حوالہ دے کر اور اس کی عبارت ذکر کیے بغیر اس فریضہ سے سبکدوش ہونے کی سعی فرمائی ہے، لیکن اسی علامہ مجلسی نے بناتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چار ہونے کی تصریح کی ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عقد میں یکے بعد دیگرے دو صاحبزادیاں آنے کی تصریح کی ہے، ڈھکو صاحب اور اُن کی روحانی برادری اس کی بروایاتِ معتبرہ بیان کردہ اس تحقیق کے قائل نہیں ہیں تو اس کی تحقیق اس مسئلہ میں کیوں حرفِ آخر ثابت ہو گئی ؟ یہ صرف میٹھا میٹھا ہڑپ اور کڑوا تھوتھو والی بات ہے، ورنہ اس بے چارے کو علماء محققین میں کون شمار کرتا ہے ؟

۳ - اہل السنت تو بہی خواہانِ خلیفہ، بلکہ بہی خواہانِ خلفاء راشدین اور صحابہ کرام و اہل بیت عظام کے بھی بہی خواہ ہیں اور انہیں اس پر فخر ہے، لیکن آپ کے مذہب کی تو بنیاد ہی صحابہ کرام کے ساتھ بغض و عداوتِ شیخین اور کینۂ ذی النورین پر ہے، لہٰذا تمہاری کتابوں میں یہ افسانے کیسے اور کیونکر مذکور ہو گئے اور جنہوں نے انہیں ذکر کیا وہ علماء محدثین ہیں یا نہیں ؟ اور تحقیق و تدقیق سے انہیں بھی کوئی تعلق ہے یا نہیں ؟ کیا "کافی"، "استبصار" اور "تہذیب الاحکام" شیعہ کی صحاح اربعہ میں داخل نہیں ہیں ؟ کیا ان کے لکھنے والے اہل سنت ہیں یا شیعہ کے اکابر محدثین ؟

۴ - اگر یہ روایات جن کو ایک مسئلہ پر بطورِ دلیل پیش کیا گیا ہے صحیح نہیں ہیں تو اس مسئلہ کا اثبات کیونکر ممکن ہو گا اور اس پر دوسری دلیل کونسی قائم کی گئی ہے ؟ علامہ صاحب اگر صحاحِ اربعہ میں درج وہ روایات درست نہیں ہیں جن سے خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کی باہمی

محبت اور پیار ثابت ہوتا ہے، تو ان میں بلکہ ان سے بھی کمتر درجہ کی کتابوں میں مذکور عداوت اور دشمنی پر مشتمل روایات کیونکر صحیح ہو سکتی ہیں؟

کیا یہ امر عجائبِ روزگار سے نہیں کہ قول باری تعالیٰ "رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" کے مطابق جو روایات ہیں، وہ تو جھوٹی ہوں اور جو اس کے خلاف ہوں وہ سچی ہوں! کیا تمہارے پاس روایات کی صحت کا ضابطہ اور معیار یہی ہے کہ جو قرآن مجید کے خلاف ہوگی وہ سچی اور صحیح ہوگی اور جو اس کے مطابق اور موافق ہوگی وہ موضوع اور من گھڑت ہوگی؟ تو آپ کی زبان میں ہی کیوں نہ کہوں

نے اصولت محکم آید نے فروع شرم باید از خدا و از رسول

آخر آپ کے اتنے بڑے محدث، اصولی اور متکلم ان روایات کی صحت اور درستگی سے بے خبر کیسے رہے؟ کہ انہوں نے دُور از کار تاویلات و تسویلات کے ذریعے اس عقد و نکاح کی صحت تسلیم کرنے کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت تسلیم کرنے سے انکار تو کیا، مگر یہ آسان طریقہ یعنی روایات کی صحت کے انکار والا اختیار نہ کیا، لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ ان کے لیے روایات کی صحت اور درستگی میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

جواب الثانی: علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا رشتہ اس لیے نہ ملا کہ ان کی عمر شریف چھوٹی تھی، تو ان کی لختِ جگر ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا رشتہ کیسے مل گیا؟ جبکہ خاوند ساٹھ سالہ بوڑھا بھی ہو، اور رشتہ سببی میں حضرت ام کلثوم کا پڑنانا بھی ہو؟

۱۔ ماشاء اللہ! یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی نہ کسی پہلو سے حضرت ام کلثوم کا پڑنانا تسلیم کر لیا گیا اور وہ پڑنانا نے اس صورت میں بنے، جب انہیں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا نانا تسلیم کرایا جائے اور ان کے نانے تب بن سکتے ہیں، جب انہیں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی تسلیم کیا جائے اور قول باری تعالیٰ "وَاَزْوَاجُہٗ اُمَّھَاتُھُمْ" میں دیگر مومنین کے ساتھ انہیں بھی شامل کیا جائے اور جب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے لئے ازواجِ مطہرات کا مائیں ہونا تسلیم ہو گیا، تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ کرام کے لیے بھی انہیں امہات تسلیم کرنا لازم تھا اور حضرت عمر بلکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما کو ان سب کا نانا تسلیم کرنا لازم

ٹھہرا۔ الغرض جب حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عقدِ نکاح کا سوال سامنے آیا تو یہ سب رشتے اور نسبتیں سمجھ میں آگئیں اور واجب التسلیم بھی ٹھہریں؛ لیکن خلافت اور فدک وغیرہ کا سوال سامنے آئے، تو یہ تعلقات اور رشتہ داریاں نظروں سے فوری طور پر اوجھل ہو جاتی ہیں ع نا طقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے ـــــــ مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ سببی رشتے اس عقدِ نکاح میں مانع ہو سکتے ہیں؟

۲۔ نیز کیا عمر کا تفاوت نکاح کے جائز ہونے میں مانع ہے۔ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ہوئی تھی تو اُس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر کتنی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کتنی تھی؟ اگر وہاں پر چھ گنا عمر زیادہ ہونے کے باوجود ازدواجی تعلقات درست تھے تو یہاں کیونکر درست نہیں ہو سکتے؟ کیونکہ امّ کلثوم رضی اللہ عنہا کا تولد دس ہجری سے قبل تسلیم کرنا ضروری ہے، کیونکہ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے وقت بقولِ شیعہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے بطنِ اقدس میں حضرت محسن رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ اور بقول ڈھکو صاحب جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کا رشتہ طلب کیا تو اس وقت اُن کی عمر ساٹھ سال تھی، تو اس طرح حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا کی عمر شریف اُس وقت کم از کم گیارہ سال ضرور ہوگی، جس کا تناسب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی عمر سے اس سے بھی کم ہے جو کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وازواجہ واصحابہ وبارک وسلم کی عمر شریف میں تھا، لہٰذا اس کو از روئے عقل و درایت رد کرنا اپنی بے عقلی اور درایت سے محرومی کو ثابت کرنا ہے۔

۳۔ نیز حقیقت یہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ رشتہ طلب کیا۔ اس وقت آپ کی عمر چوراون ۵۴ سال تھی، کیونکہ آپ کا عقدِ نکاح سترہ ہجری کو حضرت ام کلثوم کے ساتھ ہوا تھا اور ام کلثوم کے لیے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی وفات کی صورت میں دوسری جگہ نکاح کرنا جائز بھی تھا، جبکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے لیے یہ جواز بھی موجود نہیں تھا کما قال اللہ تعالیٰ: ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابداً۔

ابدًا۔ لہذا عقلی یا شرعی لحاظ سے کوئی وجہ اس نکاح کے ناجائز ہونے کی موجود نہیں تھی۔

۴۔ بحوالہ مشکواۃ شریف حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے صغیرہ ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری نسبت بہت چھوٹی ہیں نہ کہ یہ ابھی آپ بالغ نہیں ہوئیں، جیسے کہ ڈھکو صاحب نے سمجھا اور کہا اسی صغیر السن شہزادی کی شادی بڑے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوئی، کیونکہ یہ عرضداشت ان حضرات کی طرف سے مدینہ منورہ میں کی گئی تھی اور بوقتِ وصال آپ کی عمر مبارک اٹھائیس سال تھی، اور صرف چھ ماہ تک وصالِ نبوی کے بعد بقیدِ حیات رہیں اور دو ہجری میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شادی بھی ہو چکی، تو اس طرح صغیرہ ہونے کا مطلب نابالغہ ہونا کیونکر ہو سکتا ہے؟ بلکہ حقیقتِ حال یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا رشتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دینا چاہتے تھے اور ان حضرات نے بھی آپ کی مرضی معلوم کر لی تھی۔ اس لیے انہوں نے آپ کو ہر قسم کے مالی تعاون کی پیشکش کر کے بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں بھیجا اور رشتہ کے لیے عرض کرنے پر مجبور کیا، تو آپ انہیں کے مشورہ پر حاضر بارگاہ ہوئے اور اس سعادت سے بہرہ ور ہو گئے اور اس کی تائید ان روایات سے ہوتی ہے، جن میں ان حضرات کے عرض کرنے پر آپ کا جواب اس طرح منقول ہے کہ ابھی اللہ تعالیٰ کی قضا اور حکم نازل نہیں ہوا۔ الغرض اس روایت کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ از روئے عقل یا شرع یہ ازدواجی تعلق جائز نہیں تھا۔ ہاں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مرضی معلوم کرنے کے بعد اصرار کی گنجائش نہیں تھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ برادرانہ روابط کی وجہ سے بے تکلفی تھی، لہذا اس اعزاز کے حصول پر بہت زیادہ رغبت اور دلچسپی کا اظہار کیا اور آپ نے بھی حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو اس شرف سے مشرف فرمایا۔ ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

جواب الثالث: علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ تمام شیعی کتبِ معتبرہ میں ہے کہ پہلا عقد حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا حضرت عون بن جعفر رضی اللہ عنہما سے ہوا تھا

۱۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ کونسی معتبر کتابیں ہیں اور نہ ہی علامہ موصوف نے ان کا نام بتانے کی زحمت گوارا کی ہے، حسبِ عادت مقامِ نزاع میں صرف دعویٰ پر اکتفا کر دیا ہے جو قطعاً قابلِ التفات نہیں۔ جب ان کی صحاحِ اربعہ ان کے نزدیک معتبر نہیں، تو دوسری کیسے معتبر ہو گئیں؟

۲۔ نیز اس پر کیا دلیل ہے کہ ان فرضی معتبر کتابوں میں عقدِ اول کے الفاظ سے مراد اولیتِ حقیقیہ ہے؟ اولیت اضافی کیونکر مراد نہیں ہو سکتی؟ جبکہ لفظِ اول کا اس معنی میں استعمال بھی معروف و مشہور ہے، لہذا اول حقیقی وہ نکاح ہو جو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا اور اول اضافی وہ ہو جو کہ حضرت عون بن جعفر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا، بشرطیکہ وہ ثابت بھی ہو۔

۳۔ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ آپ کا پہلا عقد حضرت عون بن جعفر سے ہوا تھا، جبکہ قاضی القضاۃ نور اللہ شوستری صاحب "مجالس المومنین" میں تصریح کرتے ہیں کہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا تھا اور ان کے وصال کے بعد پہلا نکاح حضرت محمد بن جعفر کے ساتھ ہوا تھا، لکھتے ہیں:

محمد بن جعفر بعد از فوت عمر بن الخطاب بشرف مصاہرت امیر المومنین علیہ السلام مشرف گشتہ ام کلثوم را کہ باعدم کفارت از روئے اکراہ در حبالۂ عمر بود تزویج نمود۔ یعنی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد محمد بن جعفر رضی اللہ عنہما حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی کر کے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے شرفِ دامادی سے مشرف ہوئے جو کہ قبل ازیں باوجود کفو نہ ہونے کے محض اکراہ و اجبار کی وجہ سے عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کے عقدِ نکاح میں تھیں۔ (مجالس المومنین جلد اول ص۱۹۵)

الغرض واضح ہو گیا کہ اول حقیقی وہ عقدِ نکاح ہے جو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوا اور اس کے بعد اوّل عقد محمد بن جعفر والا ہے جیسے کہ قاضی نے کہا یا حضرت عون والا، جیسے ڈھکو نے دعویٰ کیا، اس لیے اس جواب سے حضرت عمر اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما کے عقد کی نفی نہیں ہو سکتی اور نہ اس کے انکار کی کوئی

صورت نکل سکتی ہے اور تمام کتبِ معتبرہ کا لفظ ذکر کر کے علامہ ڈھکو صاحب نے اپنی روایتی خیانت اور فریب کاری کا مظاہرہ کیا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شیعی کتبِ معتبرہ میں اس کے سراسر خلاف اور برعکس مذکور ہے جیسے ہم نے قاضی نور اللہ کی کتاب سے ثابت کیا ہے

جواب الرابع ؛ علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ حضرت علی اور حضرت بتول پر بے شمار ظلم و ستم ڈھائے گئے، جن میں عمر بن الخطاب پیش پیش تھے، لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اسی زہرا رضی اللہ عنہا کی لختِ جگر کا رشتہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو دیں؟ تو جواباً گزارش ہے کہ ہم اس عقدِ تزویج اور نکاح و شادی کو پیش ہی اس لیے کرتے ہیں کہ تمہارے ظلم و ستم اور تعدی و استبداد کے متعلق تراشے ہوئے سارے افسانے اور داستانیں بے بنیاد اور لغو و بیہودہ ثابت ہوں کہ اگر ان میں کوئی صداقت ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی لختِ جگر کا رشتہ کیونکر دیتے، لہذا یہ عمل اور اس قدر قریبی تعلق، بلکہ تعلقات کی سب سے اعلیٰ صورت اور نوعیت اس امر کی بین دلیل اور ناقابلِ تردید برہان ہے کہ وہ افسانے جناب کے طبع زاد اور خود ساختہ ہیں اور صرف عبداللہ بن سبا یہودی کی فتنہ پردازی کے ثمرات و نتائج ہیں۔

قبل ازیں ابن ابی الحدید شیعی معتزلی شارح نہج البلاغۃ کے حوالہ جات سے یہ تصریح نظر نواز ہو چکی ہے کہ اس قسم کی روایات کے ساتھ صرف شیعہ منفرد ہیں۔ دوسرے تمام اسلامی فرقے ایسی روایات کو نہ ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے قائل اور معترف ہیں اور شیعہ کی ان مقدس ہستیوں کے ساتھ عداوت اور کینہ وری روشن اور واضح ہے، لہذا کلام العدیٰ ضرب من الھذیان کے مطابق وہ سب ناقابلِ اعتبار اور نالائق اعتماد ہیں، اس لیے ان طبع زاد اور خود تراشیدہ افسانوں کو یہاں پیش کر کے شیعی علماء کا ان روایات اور تصریحات کو غلط اور موضوع قرار دینے کی کوشش کرنا جو اُن کی انتہائی معتمد علیہ اور صحاح میں موجود ہیں بالکل بے جواز ہے اور اس عقدِ تزویج کا اس حیلے بہانے سے انکار کرنا بالکل غلط اور بے سود ہے، بلکہ جب شیعہ کی معتبر کتابوں سے اس کا ثبوت مل گیا اور جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک

صحابہ کرام کے بالعموم اور حضرت عمر اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما کے بالخصوص برادرانہ اور دوستانہ تعلقات ایک مسلّمہ حقیقت قرار پائے، تو اس عقد کا سراسر حقیقت ہونا اور ظلم و تعدی کا سراسر افسانہ بلکہ بہتان ہونا واضح طور پر ثابت ہو گیا۔

۲۔ نیز علامہ موصوف نے فرمایا کہ انہیں مصائب و نوائب کی تاب نہ لا کر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا وصال فرما گئیں، یہ کس قدر بے عقلی اور کج فہمی کا مظاہرہ ہے کہ سید العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا صدمہ تو آپ کے لیے جان لیوا ثابت نہ ہوا، صرف فدک (جس کے نہ ملنے کے باوجود اموالِ غنیمت وغیرہ سے خمس اور معقول وظائف ملتے رہے) ان کے حاصل نہ ہونے کا غم اس قدر ناقابلِ برداشت ہو گیا کہ اسی وجہ سے آپ کا وصال ہو گیا، حالانکہ فدک بھی دنیوی معاملہ اور جو خلافت بقول شیعہ غصب ہوئی وہ بھی دنیوی معاملہ تھا۔ علاوہ ازیں اس کا تعلق بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذاتِ مقدسہ سے تھا نہ کہ آپ سے، لیکن اس فانی دنیا کے ہاتھ سے نکل جانے پر آپ اس جہان سے بھی بیزار ہو کر دوسرے جہان کو سفر کر جائیں ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے

جن کے غلاموں کے غلام تخت و تاج چھوڑ کر اور آبائی ورثہ کو ترک کر کے خلوتوں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے میں مسرت و فرحت و مشغولیت کو سعادتِ دارین سمجھیں جیسے کہ حضرت ابراہیم بن ادھم رضی اللہ عنہ بلکہ آپ کے لختِ جگر و نورِ نظر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اتنی عظیم سلطنت کو چھوڑ کر امت میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی سعی فرمائیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیبی خبر کو سچا کر دکھائیں: "ان ابنی ھٰذا سید، لعل اللہ ان یصلح بہ بین فئتین من المسلمین عظیمتین" ان کی امی جان اس قدر محدود مال اور محدود حکومت ہاتھ سے نکل جانے پر اس قدر اندوہناک ہو جائیں کہ آپ کی موت واقع ہو جائے ـــ لعنت بریں عقیدہ باد!

ڈھکو صاحب! بغضِ صحابہ کرام تو تمہاری مجبوری ہے مگر اہلِ بیت کرام کو اس قدر عبدِ دنیا بنا ڈالنے میں اہلِ بیت کرام کے ساتھ کونسی محبت اور مودت اور اخلاص و ہمدردی کا اظہار ہے؟ جن کے ابا جان کو کونین کی حکومت و سلطنت پیش کی جا رہی ہو

وہ فقر و مسکنت کو ترجیح دیں اور اسے اختیار فرمائیں۔ ان کے مقدس خمیر سے پیدا ہونے والی بتول اور ان کے انوارِ علم اور تجلیاتِ عرفان کی امین فاطمہ میں دُنیا کی محبت کا کوئی امکان ہو سکتا ہے؟ اور کچھ فاطمہ اور بتول کے معنی پر ہی غور کر لیتے۔ وہ ان القاب اور اسماء سے موسوم ہیں تو دنیوی بے رغبتی اور دُنیا سے بے تعلقی کی وجہ سے ہی تو پھر دنیوی محبت اور محبّت اور حرص اور یہ القاب و اسماء جمع کیونکر ہو سکتے ہیں؟

۳۔ نیز علامہ ڈھکو صاحب کا اس عقدِ نکاح کو اس دلیل و بُرہان سے رد کرنا ان کی درایت ہے، جبکہ شیعی علماء نے اپنی درایت کے مطابق اس عقدِ نکاح کو بھی ظُلم و استبداد کی اسی لڑی میں پرو دیا اور اسے بھی غصبِ خلافت پر قیاس کر لیا تو فرمائیں ڈھکو صاحب کی درایت قابلِ قبول ہے جو اپنی تمام معتبر مذہبی کتابوں میں مندرج اور مُسلّم روایات کے انکار پر مبنی ہے یا دیگر علماء شیعہ کی درایت جو ان روایات کی صحت اور درستگی تسلیم کرنے پر مبنی ہے۔ الغرض ڈھکو صاحب کا یہ جواب سراسر تحکم اور سینہ زوری ہے اور اپنے علماء کو بلکہ ائمہ کرام کو جھٹلانے کی مذموم سعی اور جدوجہد ہے۔

جواب الخامس: علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں جس ام کلثوم نامی عورت کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نکاح ہوا، وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں جو کہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ربیبہ تھیں اور اُن کے زیرِ تربیت رہیں، اس لیے مجازی طور پر بیٹی کہلائیں، کیونکہ انہی حضرت اسماء کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نکاح کر لیا تھا۔ لیکن یہ جواب بھی بوجوہ غلط اور بیہودہ ہے۔

۱۔ علامہ موصوف کو یہ خیال نہ رہا کہ حضرت امِ کلثوم بنتِ علی (رضی اللہ عنہما) کا تولد دس ہجری سے قبل تسلیم کرنا ضروری ہے کیونکہ علماء شیعہ اس پر متفق ہیں کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے بطنِ اقدس میں حضرت محسن اس وقت موجود تھے، جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تھا، جبکہ امِ کلثوم بنتِ ابوبکر رضی اللہ عنہما کی ولادت تیرہ ہجری میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی، تو اندریں صورت

جو اُمِ کلثوم چار پانچ سال کم از کم بڑی ہیں، جب اُن کا نکاح ساٹھ سالہ بوڑھے عمر (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ از رُوئے درایت جائز نہیں تھا، تو اس سے کم از کم چار پانچ سال چھوٹی ام کلثوم کا نکاح اس بوڑھے شخص کے ساتھ کیونکر جائز ہو گیا؟ ڈھکو صاحب یہ جواب دیتے وقت آپ کی درایت کدھر گئی جو بنتِ علی رضی اللہ عنہما کے نکاح کو محال اور ناممکن بنا رہی تھی؟ أَفَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ۔

۲۔ اگر حضرت عمر کی منکوحہ ام کلثوم حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہم) کی صاحبزادی تھیں تو شیعہ علماء کو یہ تاویلات و تسویلات گھڑنے کی کیا ضرورت تھی کہ اُم کلثوم بنت علی حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہم) کے گھر نہیں گئی تھیں، بلکہ ان کی ہم شکل سحیقہ جنیہ عورت گئی تھی۔ حضرت امیر علیہ السلام نے محض ظاہری اسلام کی وجہ سے ان کو یہ رشتہ دے دیا تھا، اگرچہ حقیقت میں ان کو مومن نہیں سمجھتے تھے۔ اگر خلافت جیسا اہم منصب آپ سے غصب ہو گیا اور آپ مجبوراً خاموش رہے تو اس رشتہ کے غصب ہو جانے میں کونسی تعجب کی بات ہے وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا روزِ روشن کی طرح ظاہر ہوا کہ وہ ام کلثوم بنت علی ہی تھیں نہ کہ بنتِ ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہم)

۳۔ اگر وہ اُمِ کلثوم بنت صدیق (رضی اللہ عنہما) تھیں تو پھر اہل السنّت کے جواب میں سید مرتضیٰ اور ابوجعفر طوسی جیسے شیعی متکلم اور محدّث ایڑی چوٹی کا زور کیوں لگاتے ہیں اور قرآن و سنّت کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس فعل کو دلیل بنانے ہوئے کفار کے ساتھ نکاح کو کیوں جائز قرار دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سیدھی سی بات تھی کہ جیسا اُس کا باپ ویسا ہی اُس کا خاوند، لہٰذا حضرت امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟

۴۔ علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں بعض مورخین مغالطہ کا شکار ہو گئے اور ام کلثوم بنتِ ابوبکر کو حضرت علی (رضی اللہ عنہم) کے ہاں تربیت پانے کی وجہ سے بنتِ علی سمجھ لیا، مگر یہ سراسر دھوکہ بازی اور فریب کاری ہے۔ کیا محمد بن یعقوب کلینی صاحب بھی مؤرخ ہیں اور ابوجعفر طوسی صاحب بھی۔ کیا حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ بھی انہیں

مغالطہ کا شکار ہونے والے مؤرخین میں شامل ہیں، جنہوں نے اس رشتہ کے غصب کیے جانے کا بقول شیعہ اقرار فرمایا ہے۔

از روئے درایت و روایت اُمِ کلثوم بنتِ علی کے نکاح کا ثبوت

ڈھکو صاحب! آپ فراڈ بازی اور مکاری سے کام نہ لیں، اپنی کتب حدیث میں سے صحاح کو چھوڑ کر دوسری طرف کیوں بھاگتے ہو، جبکہ کافی تمہارے نزدیک مسلّم ہے اور تمہارے محدّث کلینی کا دعویٰ ہے کہ اس پر مُہرِ تصدیق لگاتے ہوئے امام غائب حجۃ اللہ المنتظر نے فرمایا: ھٰذا کاف لشیعتنا۔ الغرض از روئے روایت و درایت یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ حضرت عمر کی منکوحہ ام کلثوم حضرت علی (رضی اللہ عنہم) کی ہی لختِ جگر اور نورِ نظر تھیں، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اگر رغبت اور دلچسپی ہو سکتی تھی، تو دینی لحاظ سے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رشتہ داری میں ہی ہو سکتی تھی جیسے کہ طراز المذہب المظفری میں صفحہ ۴۰۱ تا ۶۴۰ پر مذکور و منقول ہے کہ انہوں نے کہا میں نے رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: کل حسب و نسب ینقطع یوم القیامۃ الا حسبی ونسبی۔ یعنی قیامت کے دن تمام حسبی اور نسبی رشتے منقطع ہو جائیں گے سوائے میرے حسبی اور نسبی تعلق کے۔ اور حسبی تعلق میں تو پہلے سے شامل ہوں، لہٰذا نسبی تعلق میں بھی مجھے شریک کر لو تاکہ قیامت کے دن مجھے اس سے فائدہ پہنچ سکے اور دنیوی لحاظ سے رغبت ہو سکتی تھی تو بھی آپ کے ہی رشتہ میں تاکہ بنو ہاشم اور بنو عبد مناف کا تعاون حاصل ہو جائے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس رشتہ کے حاصل ہو جانے کے بعد خلافت پر مہرِ تصدیق بھی لگ جائے اور کسی کو تنقید و اعتراض کا موقعہ ہی نہ مل سکے۔ نیز حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی کبیدگی اور ناراضگی وغیرہ کے افسانے بھی اس صورت میں ختم ہو کر رہ جاتے تھے، لہٰذا از روئے روایات اور درایت و قیاس یہ رشتہ یقیناً ام کلثوم بنت حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کا ہے نہ کہ ام کلثوم بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما کا۔

۵۔ علامہ موصوف نے اپنے مفروضہ پر یہ قرینہ قائم فرمایا کہ بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما ہونے کی دلیل یہ ہے کہ کہیں بھی ام کلثوم کے نام کے ساتھ بنتِ فاطمہ یا من بطن فاطمہ موجود نہیں ہے، مگر یہ بھی جناب والا کی دھوکہ بازی اور فریب کاری ہے، کیونکہ اگر بنت فاطمہ رضی اللہ عنہا وغیرہ اس نام کے ساتھ مذکور نہیں تو بنتِ اسماء وغیرہ بھی کہیں مذکور نہیں ہے تاکہ اس کو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہونے والی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی تسلیم کیا جائے۔ جو جوابِ باصواب اس لفظ کے نہ ہونے کے باوجود ام کلثوم بنت اسماء رضی اللہ عنہا کی طرف سے ہوگا، وہی جواب ام کلثوم بنت فاطمہ رضی اللہ عنہا مذکور نہ ہونے کا بھی ہوگا۔ لہٰذا علامہ صاحب کے ایسے بے ہودہ اور بے وزن اور بے مقدار بے اعتبار قرائن کے ذریعے حقائق اور حقیقت کو چھوڑ کر مجازی طرف رجوع کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ نیز اگر اس قسم کے بے بنیاد توہمات کی بنا پر حقیقت کو کے اثبات کا امکان ہی نہیں رہے گا، ہر مخالف کوئی نہ کوئی عقلی یا نقلی قرینہ بزعمِ خویش تیار کر ہی لے گا۔

الحاصل عبارات کے صریح مفہوم اور نصوص کے متبادر الی الفہم معانی و مفاہیم پر ہی دار و مدار ہوگا اور بلا دلیل قطعی اور بغیر احتمال ناشی عن الدلیل کے حقیقت سے عدول و انحراف کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اور طراز المذہب المظفری میں بیس صفحات پر پھیلی ہوئی ام کلثوم کے نکاح کی بحث میں شیعی اور سُنّی کتابوں کے حوالہ جات سے اس امر کی تصریح کی ہے اور اس تصریح و توضیح پر مشتمل متعدد روایات نقل کی ہیں کہ حضرت عمر کی منکوحہ ام کلثوم حضرت علی (رضی اللہ عنہم) کی ہی لختِ جگر تھیں، مگر ڈھکو صاحب نے نہ اس کو دیکھنے کی زحمت گوارا کی ہے اور نہ اس میں مندرج حوالہ جات کے جواب کی۔

۶۔ نیز حقیقتِ واقعیہ یہ ہے کہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کوئی بیٹی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ صرف و صرف ایک بیٹا محمد بن ابی بکر پیدا ہوا تھا، تو وہ ام کلثوم جو حضرت اسماء کے بطن سے پیدا ہی نہیں ہوئی تھی وہ حضرت اسماء کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح کے بعد

اُن کی ربیبہ کیسے بن گئیں اور بطورِ مجاز ان کو بیٹی کیسے کہہ دیا گیا اور مغالطہ کیسے لگ گیا۔ کیا عقل و خرد کی دنیا میں اس اندھیر گردی اور فریب کاری کی کوئی مثال مل سکتی ہے؟

اسلام میں رشتہ داری کا دار و مدار ایمانداری پر ہے

جواب السادس، علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ پیر صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اخروی فوز و فلاح اور نجات کا دار و مدار ایمان داری پر ہے نہ کہ رشتہ داری پر۔ یہ بھی علامہ موصوف کی کوتاہ اندیشی یا بدباطنی پر مبنی جواب ہے، بلکہ مغالطہ دینے کی کوشش۔ پیر صاحب کو تو معلوم تھا اور ان کے مریدین کو بھی، مگر تمہیں اور تمہاری قوم کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجوسی اور یہودی مذہب کے احکام اب لاگو نہیں ہو سکتے۔ اسلام میں جنگِ بدر کے بعد سے کفار کے ساتھ باہمی نکاح کو ناجائز قرار دے دیا گیا تھا — کما قال اللہ تعالیٰ، لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ "یعنی مشرکین اور کفار مردوں کے لیے مومن عورتیں حلال نہیں اور نہ مشرک اور کافرہ عورتوں کے لیے مومن مرد حلال ہیں" نیز فرمایا: وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ۔ کافر عورتوں کو اپنے عقدِ زوجیت میں نہ رکھو اور اہلِ کتاب لوگوں کے ساتھ بھی رشتہ داری کی فقط یہ صورت جائز اور مباح رکھی گئی کہ ان کی عورتوں سے مسلمان مرد نکاح کر سکتے ہیں، لیکن اہلِ کتاب مردوں کے ساتھ مسلم عورتوں کا نکاح جائز نہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ "وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ" لہٰذا ثابت ہو گیا کہ مومنہ عورت کے لیے مومن مرد ہی خاوند بننے کا حق رکھتا ہے اور ایسے رشتہ کا دار و مدار صرف اور صرف ایمان داری پر ہے اور جہاں پر ایمان داری نہیں ہو گی، وہاں پر رشتہ داری بھی نہیں ہو سکتی بالخصوص جہاں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ جیسا عظیم المرتبت انسان اور مقتدا و پیشوائے خلق رشتہ داری قائم کر رہا ہو، تو اس جگہ ایمان داری کو تسلیم نہ کرنا بے ایمان اور بے دین شخص کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی ایماندار شخص ایسی بات زبان پر نہیں لا سکتا۔

اور تعجب کی بات یہ ہے کہ شیعہ مذہب میں شراب خور کے ساتھ مومنہ عورت کا

نکاح درست نہیں ہے جیسا کہ ان کی صحاح میں اس کی تصریح موجود ہے تو کیا غصبِ خلافت اور غصبِ فدک بلکہ نفاق اور ارتداد کو شراب جتنی اہمیت بھی نہیں دیتے تھے؟ کہ شرابی کے ساتھ نکاح تو حرام ہو، مگر غاصبِ خلافت و فدک اور منافق و مرتد کے ساتھ مناکحت اور رشتہ داری جائز ہو۔ باوجود اس منافقت اور ارتداد کا قطعی علم ہونے کے۔ حاشاہم اللہ تعالیٰ عن ذالک۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان کو صرف مخلص مومن ہی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس امت سے افضل ترین اور اپنے لیے قابلِ رشک اعمال نامے والی شخصیت تسلیم کرتے تھے۔ کما سبق۔

جواب السابع، علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں: پیر صاحب کو فروعِ کافی میں منقول لفظ فرج پر بہت غصہ آیا ہے، لیکن یہ اُن کی کوتاہ اندیشی ہے، اس کا معنی کشائش اور فراخی ہے اور اس کو راء کی زبر کے ساتھ پڑھا جانا چاہیے۔ مگر اس میں بھی علامہ صاحب نے محض ہیرا پھیری سے کام لیا ہے۔

۱۔ سُبحان اللہ العظیم! جب عنوان ہے: "باب تزویج ام کلثوم" تو اس جگہ کشائش اور فراخی کا معنی کیونکر مراد ہو سکتا ہے اور سکون راء کی بجائے فتح راء کے ساتھ پڑھنے کا امکان کیا ہے، کیونکہ آپ اس رشتہ کے بخوشی اور برضا و رغبت ہونے یا جبر و اکراہ کے ساتھ اس کے وقوع پذیر ہونے کو بیان کرنا چاہتے تھے، دوسری کسی فراخی عیش اور کشائشِ رزق کے چھن جانے کا تذکرہ ہی بے محل اور نامناسب تھا۔

۲۔ نیز خلافت اور فدک وغیرہ بقولِ شیعہ پہلے غصب ہو چکے تھے اور اس غم اور رنج و الم کی وجہ سے بقول ڈھکو صاحب حضرت سیدہ زہرا طاہرہ رضی اللہ عنہا اس جہان کو بھی الوداع فرما گئی تھیں اور یہ رشتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سترہ ہجری میں یعنی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے بعد ساتویں سال طے ہوا، تو اتنے عرصہ بعد کہنا کہ یہ پہلی فراخی اور کشائش تھی جو ہم سے غصب کر لی گئی، سارے شیعی مذہب پر پانی پھیرنے کے مترادف ہے، کیونکہ اس طرح غصبِ خلافت و فدک کا دعویٰ بھی غلط ہو گیا اور حضرت زہرا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر ظلم و ستم اور جبر و استبداد کے افسانے بھی بے بنیاد

ہوکر رہ گئے۔ علامہ صاحب کی درایت ودانش اور فہم وفراست کا بھانڈا ابھی چوراہے میں پھوٹ گیا کہ چند سطر قبل جو کچھ ظلم وستم اور غصب وغیرہ کے دعوے کیے تھے، وہ یہاں پہنچنے تک فراموش ہو گئے ؏ بریں عقل ودانش بباید گریست

الغرض یہ تاویل سراسر بے جوڑ اور بے محل ہے، بلکہ صرف اور صرف وہی معنی متعین ہے، جس پر حضرت شیخ الاسلام کو اعتراض ہے اور علامہ ڈھکو صاحب جیسے علماء کی تاویلات کو دیکھ کر اور سُن کر علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے فرمایا ؎

وکلے تاویل شاں در حیرت انداخت خُدا و جبریل و مُصطفےٰ را!

۳۔ نیز علامہ صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ پیر صاحب قدس سرہ کو ناراضگی غصب کے لفظ سے بھی ہے کہ یہ وہ رشتہ ہے جو ہم سے غصب کر لیا گیا ہے، کیونکہ رشتے غصب کرا کر خاموش ہو کر بیٹھ رہنا غیرت مند لوگوں کا کام نہیں ہوتا، لہٰذا ایسی مقدس ہستیوں اور بلند وبالا مراتب ودرجات پر فائز حضرات کے متعلق اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے والا یقیناً محبّت ومودت سے ہی نہیں، بلکہ ایمان واسلام سے بھی محروم ہے اور وہ شخص اہل بیت کرام کا بدترین دشمن ہے، مگر لباسِ محبّت میں۔ اور ایسا دشمن سب دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

۴۔ نیز محض فرج کے لفظ استعمال کرنے پر غصّہ ہو تو بھی بجا ہے۔ رہا قرآن مجید میں اس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے استعمال تو اس کو وجہِ جواز بنانا قطعاً درست نہیں کیونکہ عمومی تعبیر میں اس کا استعمال علیحدہ امر ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: والذین هم لفروجهم حافظون ۵ اور بالخصوص اہل بیت کرام میں اس کو استعمال کرنا اور وہ بھی بروایتِ شیعہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی طرف سے اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی لختِ جگر کے حق میں اور اپنے پردادے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ کے حق میں قطعاً قابلِ قبول اور لائقِ تسلیم نہیں ہے اور اگر قرآن مجید میں حضرت مریم علیہا السلام کے حق میں اس کو استعمال کیا گیا ہے تو وہ مقام ضرورت میں ہے اور کچھ بھی ہو، بندے کو اپنی سطح پر رہ کر سوچنا لازم ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے مقام پر اپنے

آپ کو پہنچا کر۔

اللہ تعالیٰ انبیاءِ کرام علیہم السلام کے حق میں اپنی شانِ الوہیت وصمدیت کے تحت اگر ایسے کلمات استعمال فرما دے جو اُس کی شانِ بے نیازی کے لائق ہوں تو ہمارے لیے ان کو سندِ جواز بنا لینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ ایک ہمارا خدا دوسرے ہمارے نبی ورسول، ہم پر دونوں کی تعظیم وتکریم فرض ہے، لہٰذا ہمیں اپنے حدود میں رہ کر الفاظ استعمال کرنا لازم ہے۔ الغرض اول فرج غصبناہ کا جملہ غصب اور فرج دونوں کے لحاظ سے سخت بے ادبی ہے اور انتہائی قابلِ اعتراض اور ناقابلِ برداشت، لیکن اہلِ ایمان، اہلِ ادب اور اربابِ نیاز کے لیے اور جو لوگ محبّت کے دعوٰی کی آڑ میں بے ادبی اور گستاخی کرنے پر تلے ہوئے ہوں، بلکہ ادھار کھائے بیٹھے ہوں، اُن کے لیے ایسے جُملوں میں کیا خرابی اور سقم اور اسارت وبے ادبی ہو سکتی ہے؟ بلکہ انہیں تو شادمانی اور فرحت بھی اسی وقت حاصل ہوتی ہو گی، جب اس طرح کے وہ الفاظ استعمال کرتے ہوں گے۔

علامہ مجلسی کا مذہب اور ڈھکو صاحب کا کِذب

علامہ ڈھکو صاحب نے ان روایات کو موضوع اور من گھڑت کہہ دیا، جن سے حضرت اُم کلثوم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا عقدِ تزویج ثابت ہوتا تھا اور حوالہ علاّمہ مجلسی صاحب کا دے دیا۔ ہم اسی مجلسی صاحب کے حوالے سے ڈھکو صاحب کے اس دعوٰی کی لغویت اور بطلان ثابت کیے دیتے ہیں اور اس دروغ بے فروغ کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ صاحب طراز المذہب المظفری میرزا عباس قلی خاں سپہر اس عنوان پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"مجلسی در بحار الانوار بعد از نگارش برخے اخبار می نویسد کہ از زرارہ از ابی عبداللہ مرویست کہ در باب تزویج ام کلثوم فرمود انّ ذالک فرج غصبناہ و بروایتے فرمود اول فرج غصب منّا ام کلثوم (زنا) شیخ مفید در جواب مسائل سرویہ

می فرماید۔ خبریکہ بتزویج نمودن امیر المومنین دختر خود را با عمر وارد است ثابت نیست (زنا) بعد انکار نمودن عمر نص را و ظہور عداوت او با اہل بیت علیہم السلام قول بجواز مناکحت او بدون ضرورت یا حصول تقیہ مشکل مینماید و اینکہ شیخ مفید اصل این واقعہ را انکار نماید برائے بیان آنست کہ از طرق اہل بیت بعید است، ورنہ بعد از ورود این جملہ اخبار در وجود این مناکحت انکارش عجیب مینماید و ہم از حضرت ابی عبداللہ علیہ السلام مروی است اَنَّ علیاً علیہ السلام لما توفّی عمر اتی ام کلثوم فانطلق بہا الٰی بیتہٖ و این حدیث بر وقوع این قضیہ تصریح مینماید۔

واصل در جواب این است کہ این مناکحت از روئے تقیہ و اضطرار روئے داد و استبعادی درین نیست چہ در مقام ضرورت بسیارے از محرمات در جملہ واجبات می آید۔ علاوہ بر این بدستیاری اخبار صحیحہ ثابت شدہ است کہ امیر المومنین و سائر ائمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین را از رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم از آن ظلم و ستم ہا کہ بر آن ہا روئے دادہ و بر آنچہ واجب می شود بر ایشان کہ درین مقام بجائے بیاورند خبر رسیدہ بود، خدائے تعالیٰ آن امر را بر ایشان مباح فرمود و رسول خدا تنصیص نمود باین صورت رفع و تسکین استبعاد حاصل شد۔ طراز المذہب المظفری ص ۵۹ تا ۶۱

علامہ مجلسی بحار الانوار میں چند روایات ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عقد نکاح کے ثبوت میں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ زرارہ نے حضرت ابو عبداللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے نقل ہے کہ آپ نے حضرت امّ کلثوم رضی اللہ عنہا کے عقد تزویج کے متعلق فرمایا بے شک یہ وہ رشتہ ہے جو ہم سے غصب کر لیا گیا ہے اور دوسری روایت میں ہے کہ پہلا رشتہ جو ہم سے غصب کیا گیا ہے، وہ ام کلثوم کا ہے اور شیخ مفید نے مسائل سرویہ کے جواب میں کہا کہ وہ تمام روایات جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ام کلثوم کا حضرت عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ نکاح اور شادی کر دینے کا ذکر ہے، وہ ثابت نہیں ہیں (زنا) عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کے نص خلافت کا انکار کرنے کے بعد اور اُن کی اہل بیت کے ساتھ بغض و عداوت ظاہر ہونے کے باوجود بغیر ضرورت اور مجبوری

کے یا تقیہ و کتمان کے یہ عقد مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اور یہ جو شیخ مفید نے اصل واقعہ کا ہی انکار کر دیا ہے تو وہ اس امر کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ اہل بیت کے طرز و طریق اور روش و کردار کے پیشِ نظر بعید ہے، ورنہ ان تمام روایات کے وارد ہونے کے بعد شیخ مفید کا اس مناکحت اور عقدِ تزویج کا انکار کرنا عجیب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہ روایت بھی حضرت امام ابو عبداللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے ہی مروی و منقول ہے کہ جب حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کا وصال ہو گیا تو حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور انہیں اپنے گھر لے گئے اور یہ روایت عقدِ تزویج کے وقوع و تحقق پر بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ دلالت کر رہی ہے (لہٰذا اصل واقعہ کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے کوئی نئی تاویل و توجیہ ضروری ہے)

تو اس عقدِ تزویج کے متعلق اصل جواب یہ ہے کہ عقدِ تزویج تقیہ و اضطرار کی وجہ سے رونما ہوا اور اس امر کو بعید سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ ضرورت اور مجبوری کے تحت بہت سی حرام چیزیں صرف حلال ہی نہیں، بلکہ واجب ہو جایا کرتی ہیں دوسرا جواب یہ ہے کہ صحیح اخبار و روایات کے ذریعے ثابت ہو چکا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور دوسرے ائمہ کرام کو ان تمام مظالم اور جور و ستم کی خبر دی جا چکی تھی جو ان کو پیش آنے والے تھے اور جو کچھ اس دوران ان پر واجب و لازم تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وہ امور ان کے لئے مباح کر دیئے تھے اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی وضاحت و صراحت کر دی تھی۔ لہٰذا اس جواب سے یہ استبعاد دُور ہو گیا اور تسکین قلب حاصل ہو گئی۔

اس طویل اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ علامہ مجلسی اس عقد کو درست اور محقق تسلیم کرتا ہے، بلکہ اُس نے اس عقد کے منکرین کا صحیح روایات پیش کر کے رد کیا ہے لہٰذا اس کا حوالہ دے کر ڈھکو صاحب کا اس مضمون کی جملہ روایات کو موضوع اور بے بنیاد کہنا سفید جھوٹ ہے اور بدترین علمی خیانت اور اگر بالفرض بحار الانوار میں اس عقد کا

اثبات اور منکرین کا رد ہے مگر مرآۃ العقول میں اس کے برعکس ہے تو پھر تضاد و تناقض کے شکار شخص کو علمائے محققین میں شمار کرنے کا کیا جواز ہے اور اس کے قول کو صحاحِ اربعہ کی روایات جو امام جعفر صادق سے منقول ہیں اور ان میں سے بعض کی تصدیق امام غائب حجۃ اللہ المنتظر کی طرف سے بھی ہو چکی ہے، ان کے مقابل کیا اہمیت و قعت دی جا سکتی ہے؟

تلبیس ہی تلبیس

ڈھکو صاحب نے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عقدِ نکاح کے متعلق کوئی علمی بات کرنے کی بجائے فریب کاری اور دھوکہ دہی کے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں اور سراسر تلبیس سے کام لیا ہے، چند نمونے ملاحظہ ہوں:

تلبیس اوّل: جس ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا، وہ اسماء بنتِ عمیس رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہونے والی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھی اور بطورِ مجاز اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹی کہہ دیا گیا، کیونکہ حضرت اسماء کے ساتھ نکاح کر لینے کے بعد وہ آپ کے ہاں تربیت پاتی رہی تھیں حالانکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ حضرت اسماء سے ام کلثوم نام کی کوئی لڑکی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں تربیت پائی، لہٰذا اس مجاز کی کوئی وجہِ جواز نہیں ہو سکتی۔ آپ کی اس نام والی صاحبزادی حضرت ام حبیبہ بنت خارجہ بن زید کے بطن سے پیدا ہوئیں اور وہ بھی آپ کے وصال کے بعد ۱۳ھ میں جبکہ عدتِ وفات گزار کر حضرت حبیبہ نے حضرت حبیب بن یسار (رضی اللہ عنہما) کے ساتھ نکاح کر لیا، لہٰذا اگر یہ ام کلثوم ربیبہ ہیں، تو حبیب بن یسار کی، نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی، لہٰذا اندریں صورت اس کے نکاح کا متولی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تسلیم کرنا درست نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ان کو مجازی باپ تسلیم کرنا اور نہ ہی ام کلثوم کو دورانِ عدت حضرت علی رضی اللہ عنہ

کا اپنے گھر لانے کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو: الاستیعاب لابن عبدالبر جزو ثانی ص۷۲۵۔ تجرید اسماء الصحابہ للذہبی۔

بلکہ استیعاب میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے صرف محمد بن ابی بکر کے متولد ہونے کی تصریح موجود ہے اور سوائے ان کے دوسری کوئی اولاد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ان سے متولد نہ ہونے کی وضاحت و صراحت موجود ہے اور اسی طرح "الاصابہ فی تمییز الصحابہ لابن حجر عسقلانی میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے متعلق مذکور ہے:

تزوجها جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فولدت لہ هناك اولادًا فلما قتل جعفر تزوجها ابوبکر فولدت محمدًا ثم تزوجها علی فیقال ولدت لہ ابنه عونًا قال ابوعمر تفرد بذالك ابن الكلبي۔ الاصابہ جلد ۴ ص۲۳۱

ان کے ساتھ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے نکاح فرمایا تو انہوں نے ان کے ہاں کئی بچوں کو جنم دیا، جب ان کی شہادت واقع ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ نکاح کیا تو آپ کے فرزند محمد ان سے متولد ہوئے۔ پھر آپ کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو اپنی زوجیت میں لیا اور کہا جاتا ہے کہ آپ کے لیے ان سے عون کا تولد ہوا۔

الغرض حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے بطنِ مبارک سے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے صرف ایک بیٹے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے اور کوئی بیٹی متولد ہی نہیں ہوئی۔

شیعی مؤرخ کی طرف سے ڈھکو صاحب کی تکذیب

ناسخ التواریخ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق "ازواج و اولاد ابوبکر" کا عنوان قائم کر کے لکھا ہے:

ابوبکر را چہار زن بود دو تن را در جاہلیت نکاح بست (زنا) و دو زن، در

اسلام آورد یکے اسماء بنت عمیس واز و محمد ربیب علی علیہ السلام متولد شد و آں دیگر حبیبہ دختر حارثہ بن زید انصاری واُو در وقت وفات ابوبکر حاملہ بود پس ازاُو دخترے آورد نام او اُمِّ کلثوم ۔ ناسخ التواریخ جلد دوم از کتاب دوم ص۲۱۵

یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی چار بیویاں تھیں۔ دو کے ساتھ قبل از اسلام میں نکاح کیا۔ پہلی قتیلہ اور بروایتِ دیگر اسماء دختر عبد العزیٰ تھی، جس سے عبداللہ اور اسماء ذات نطاقین رضی اللہ عنہما کا تولد ہوا اور دوسری حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا جن سے حضرت عبد الرحمٰن اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما کا تولد ہوا۔ اور دو کے ساتھ دورِ اسلام میں نکاح کیا جن میں ایک حضرت اسماء بنت عمیس ہیں، جن سے محمد بن ابی بکر کا تولد ہوا جو کہ حضرت علی کے ربیب بھی تھے (رضی اللہ عنہما) اور دوسری حبیبہ بنت حارثہ بن زید انصاری ہیں جو کہ حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہم) کی وفات کے وقت حاملہ تھیں اور بعد از وصال آپ کی ان سے ام کلثوم نام والی صاحبزادی پیدا ہوئی۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ علامہ ڈھکو صاحب نے بالکل سفید جھوٹ بولا ہے اور ایسا جھوٹ جو اس سے پہلے اُستادانِ فن کو بھی نہیں سُوجھا تھا۔ الغرض اس ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ربیبہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے، لہٰذا شیعی روایات کی روشنی میں اہل سنت کا استدلال بالکل برحق ہے اور ڈھکو صاحب کی تاویلات و تسویلات لغو و بیہودہ اور صرف فریب کاری اور دھوکہ دہی کی ناکام کوشش ہے۔

اور اگر ڈھکو صاحب کی تحقیق ہی صحیح ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان سے پہلے تمام محدث اور متکلم اور اصولی و فقہاء اور مؤرخ و سیرت نگار جاہل بے خبر اور مُور کھ تھے اور فنِ حدیث اور تاریخ سے کورے، جاہل اور ان پڑھ۔ بس صرف پندرھویں صدی میں ایک صاحبِ علم و بصیرت اور ماہرِ حدیث اور ناقدِ سیرت و تاریخ پیدا ہوا۔ فیا للخسران ولضیعۃ الدرایۃ والادب۔

تلبیس دوم: علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی زوجہ حضرت ام کلثوم اور اُن کے بیٹے حضرت زید رضی اللہ عنہم کا انتقال تقریباً انچاس یا پچاس ہجری میں مدینہ منورہ کے اندر تسلیم کیا جاتا ہے اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا ان پر نمازِ جنازہ پڑھنا بیان کیا جاتا ہے، جبکہ حضرت ام کلثوم بنتِ علی رضی اللہ عنہما کا میدانِ کربلا میں موجود ہونا ثابت ہے۔ حالانکہ طراز المذہب المظفری ص۵۲ پر امِ کلثوم کبریٰ بنتِ زہرا اور اُمّ کلثوم بنتِ ام سعید بنت عروہ دو صاحبزادیاں حضرت علی (رضی اللہ عنہم) کی مذکور ہیں، لہٰذا حضرت علی کی صاحبزادی ام کلثوم کبریٰ (رضی اللہ عنہما) کا وصال ۵۰ھ میں ہو گیا ہو اور دوسری صاحبزادی ام کلثوم صغریٰ رضی اللہ عنہا واقعہ کربلا کے بعد تک بقیدِ حیات رہی ہوں تو اس میں کونسا استبعاد ہے اور اس قول سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی منکوحہ ام کلثوم کا ہی میدانِ کربلا میں موجود ہونا کیسے لازم آ گیا، کیونکہ ام کلثوم بنتِ علی رضی اللہ عنہما جس طرح کبریٰ ہے، اسی طرح صغریٰ بھی ہے اور اگر بالفرض کسی نے امِ کلثوم بنتِ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کہہ دیا ہو تو یہ نام کے اشتراک کی وجہ سے لازم آنے والا مغالطہ ہے۔

نیز اس قول سے حضرت امِ کلثوم کے حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ عقدِ تزویج میں منسلک ہونے کی نفی کیونکر ہو سکتی ہے؟ کیونکہ آپ کا وصال پہلے ہو چکا اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا وصال بعد میں ہوا اور اس کی تاریخ میں مؤرخین کا اختلاف ہو گیا، لہٰذا بعد والے وصال کی تاریخ کا اختلاف اس سے کافی عرصہ پہلے وقوع پذیر عقدِ تزویج کو کیسے باطل کر سکتا ہے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپ کا نکاح یقیناً ثابت ہوا اور آپ کے وصال کی تاریخ میں وارد روایات میں سے صرف ایک قسم کی صحیح ہوں اور دوسری غلط ہو اور دوسری غلط ہوں، لہٰذا صحتِ عقد پر اس سے کیا اثر پڑ سکتا ہے؟

تلبیس سوم: علامہ ڈھکو صاحب نے حضرت ام کلثوم بنتِ علی مرتضیٰ و فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہم کو صغیرہ ثابت کر کے عقدِ تزویج ناممکن قرار دینے کی کوشش

کی ہے، حالانکہ اُن کا شمار صحابیات میں ہوتا ہے، جبکہ حضرت زینب بنت زہرا رضی اللہ عنہا کو صحابیات میں شمار نہیں کیا گیا اور ظاہر ہے کہ صرف زمانہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں پیدائش صحابی ہونے کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ سن تمیز کا ہونا بھی ضروری ہے اور یہ قول شیعی مؤرخ صاحب ناسخ التواریخ نے بھی ذکر کیا ہے اور عظیم سُنّی فاضل علامہ ابن عبد البر نے بھی "استیعاب" میں ذکر کیا ہے، جبکہ مرزا عباس قلی خاں اس کی صحت و صداقت پر یوں استدلال پیش کرتا ہے کہ اگر حضرت زینب رضی اللہ عنہا بڑی ہوتیں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ نکاح کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے درخواست کرتے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ام کلثوم عمر میں حضرت زینب (رضی اللہ عنہما) سے بڑی ہیں۔ ملاحظہ ہو: طراز المذہب المظفری ص۴۸

نیز حضرت ام کلثوم کے حضرت زینب (رضی اللہ عنہما) سے بڑے ہونے کی دلیل اور بُرہان وہ روایت ہے جس کو شیخ صدوق نے اپنی سند کے ساتھ ابن ابی المقدام اور زیاد بن عبید اللہ سے نقل کیا ہے کہ ایک شقی اور بدبخت نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو اطلاع دی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ شادی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ نے اس سے بتکرار اس کی تصدیق کرلی، تو آپ سخت کبیدہ خاطر ہوئیں۔ جب رات ہو گئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے روانہ ہوئیں، جس کی کیفیت بقولِ شیخ صدوق یہ تھی:

فحملت الحسن علیٰ عاتقها الایمن والحسین علیٰ عاتقها الایسر واخذت بید ام کلثوم الیسریٰ بیدها الیمنیٰ ثمّ حولت الیٰ حجرة ابیها۔ آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دائیں کندھے پر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بائیں کندھے پر اٹھایا اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے بائیں ہاتھ کو اپنے دائیں ہاتھ سے پکڑا اور والدِ گرامی کے حجرۂ مبارکہ کی طرف منتقل ہو گئیں۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے گھر کی

طرف لے چلے، تو اُس وقت بھی صورتِ حال بقولِ صدوق یہ تھی:

حمل النبی صلی اللہ علیه وسلم الحسن وحملت فاطمة علیها السلام الحسین واخذت بید ام کلثوم فانتهیٰ الیٰ علی وهو نائم فی المسجد۔ (انوارِ نعمانیہ جلد اوّل ص۷۳)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کو اُٹھا لیا، جبکہ حضرت زہرا نے حضرت حسین کو اٹھا لیا اور حضرت ام کلثوم کا ہاتھ پکڑا۔ رضی اللہ عنہم۔

شیخ صدوق کی بیان کردہ اور سیّد نعمت اللہ الموسوی کی نقل کردہ اس روایت میں اگر کوئی صداقت ہے، تو پھر یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ولادت سے قبل حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا تولّد ہوا اور آپ اس وقت اتنی بڑی ہو چکی تھیں کہ چل پھر سکتی تھیں اور حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کو اِدھر اُدھر لے جایا کرتی تھیں۔

اندریں صورت صدوق صاحب سچے ہیں تو ڈھکو صاحب جھوٹے ہیں اور اگر ڈھکو صاحب سچے ہیں، تو صدوق صاحب کا معاملہ برعکس، بہند نام زنگی کافور والا ہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ صدوق صاحب کے صدق میں کسی کو کلام نہیں ہے، اسی لیے جزائری صاحب نے "تاویلات و تسویلات" کے ذریعے ناراضگی اور عصمت میں تطبیق کی سعی اور جد و جہد کی، لیکن روایت سے انکار نہیں کیا اور صاحب ناسخ کو بھی اپنے عقل و فکر کو یہاں لگام دینے میں ہی عافیت نظر آئی، لہٰذا ڈھکو صاحب کا صغرسنی والا عذر اور اس عقد و تزویج کے عقلاً ناممکن ہونے کا دعویٰ لغو اور باطل ہو گیا۔

اس کے علاوہ بعض تلبیسات کا ذکر پہلے آچکا ہے اور کنز مکتوم وغیرہ کے جو حوالے دیئے ہیں کہ ان میں اس مسئلہ کی تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہے، تو اس کا رد بھی بالحسن وجوہ حضرت علامہ نور بخش توکلی صاحب کے قلم حقیقت سے تحفہ شیعہ جلد دوم ص۲۱۴ تا ۲۱۸ پر ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ کریں کہ ڈھکو صاحب نے یہ تلبیسات کن ماہرین سے سیکھی ہیں اور کس قدر غلط اور خلافِ تحقیق کتبِ مناظرہ پر اپنی اس جوابی کارروائی

ظاہری طور پر لہٰذا اس کی پابندی لازم ہے اور خروج و بغاوت اور نقض عہد کا کوئی جواز نہیں ہے؟

نیز بیعت مرتضوی اور بیعت صدیق میں فرق بھی ہے وہ یہ کہ حضرت صدیق کی بیعت مہاجرین و انصار نے پہلے کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بعد میں بیعت کرنے کے لیے کہا گیا جبکہ جناب اشتر نخعی نے پہلے ہی زور شمشیر سے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کو بیعت پر مجبور کر دیا اور بعد میں دوسرے حضرات نے بیعت کی۔

ہمارا مقصد حاشا و کلا یہ نہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق نہیں ہیں۔ آپ کی حقانیت خلافت ظاہرہ بھی ہمارا دین و ایمان ہے اور ہمارے نزدیک باطنی اور روحانی خلافت و امامت قیامت تک کے لیے آپ کو حاصل ہے اور کوئی ولی اس وقت تک ولی نہیں ہو سکتا اور اسے ارشاد و ہدایت کا حق نہیں ملتا جب تک بارگاہ مرتضوی سے اس کی منظوری نہ ہو بلکہ ہمارا کلام صرف اور صرف اس میں ہے کہ ادھر ادھر کی روایات کو سامنے رکھ کر اور ان کی حقیقت اور اصلیت معلوم کئے بغیر کسی ایسی ہستی کو طعن و تشنیع کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے جن کی دیانت، نیک نیتی اور تقویٰ و پرہیزگاری اور اسلام و اہل اسلام کی ہمدردی اور خیر خواہی ظاہر ہو بلکہ قطعی ادلہ سے ثابت ہو۔

رہا صحابہ کرام علیہ الرضوان کا حرب و قتال کا معاملہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور وہ حضرات غلط فہمی کا شکار اور خطا کے مرتکب لیکن خطا اجتہادی پر عذاب و عقاب اور اخروی مواخذہ نہیں ہوتا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ معاملہ، لہٰذا اہل تشیع کی طرح نہ ہم ان کو کافر و منافق کہتے ہیں اور نہ فاسق و فاجر اور جہنمی بلکہ مرتکب خطا اور سابقہ خدمات اسلام اور بانی اسلام کی وجہ سے قابل عفو و لائق مغفرت جیسے کہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے "لاکفرن عنهم سیاتهم ولا دخلنهم جناتٍ تجری من تحتها الانهار۔ الآیة (سورہ آل عمران پ۴) کہ میں ضرور بالضرور ان کے گناہ اور خطائیں ان سے دور کروں گا اور انہیں جنتوں میں داخل کروں گا اور وہ ایسے خون ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہمارے

ہاتھوں کو محفوظ رکھا لہٰذا ہم اپنی زبانوں کو ان کے ساتھ آلودہ کرنا جائز اور مناسب نہیں سمجھتے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ہم ان کے دلوں سے رنجش اور کدورت دور کر دیں گے۔ قال تعالیٰ: ونزعنا ما فی صدورهم من غل اخوانا علیٰ سررٍ متقابلین۔ تو ان ارشادات کے پیش نظر بارگاہ خداوندی اور حضرت رسالت پناہ اور حضرت علیؓ کی طرف سے ان سے درگزر ہو جائے گا اور ہم اپنی بدزبانی اور بدکلامی اور گستاخی و بے ادبی کی وجہ سے قابل مواخذہ ٹھہریں گے۔ دیکھیے اہل جمل پر غلبہ حاصل ہونے کے بعد آپ نے سب سے درگزر کیا بلکہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اسی احترام و اکرام کے ساتھ پیش آئے جیسے کہ قبل ازیں پیش آیا کرتے تھے اور اصحاب صفین کے ساتھ تحکیم اور ثالثی قبول فرمائی اور انہیں برابر کی سطح پر رکھ لیا اگر وہ العیاذ باللہ اسلام و ایمان سے خارج ہو چکے تھے تو ثالثی فیصلہ پر رضامندی کا کیا مطلب؟ اور جنگ و جدال سے ہاتھ روکنے کا کیا محل و موقع تھا؟ اسی لیے اہل السنت کا موقف یہ ہے:

ونکف عن ذکر الصحابة إلا بخیر (شرح عقائد نسفی) کہ ہم ذکر صحابہ علیہم الرضوان سے کف لسان اور سکوت اختیار کریں گے مگر خیر اور بھلائی کے ساتھ اور ان کے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں گے اور یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے۔

"اقیلوا ذوی الهیئات عثراتهم فما یعثر منهم عاثر إلا وید الله بیده یرفعه" (نہج مع شرح ابن میثم ص۲۲۸ جلد خامس) بزرگ لوگوں کی لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر کرو کیونکہ ان میں سے جو بھی لغزش اور ٹھوکر کھاتا ہے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ اس کو اٹھاتا اور بلند فرماتا ہے۔

خطا بزرگاں گرفتن خطاست

نیز خدائے عادل کی بارگاہ میں میزان عدالت کے ذریعے ہی فیصلے ہوں گے تو ان حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان کی ہجرتوں، راہِ خدا اور رضا رسول میں پانیوالی ایذاؤں اور جہاد و قتال اور عقائد صحیحہ و اعمال صالحہ کو کیونکر نظر انداز کیا جائیگا۔ کما قال تعالیٰ: فمن یعمل مثقال ذرة خیرا یره، جو شخص بھی ذرہ بھر مقدار کی مانند بھی نیکی کریگا وہ اس کی جزا اور ثواب ضرور پائے گا۔

تتمۂ مبحث قرطاس

پہلے قرطاس طلب کئے جانے کے متعلق اہل السنت کی انتہائی معتبر اور مستند کتب میں مروی و منقول روایات ملاحظہ فرمائیں:

۱- قلت یا ابن عباس ما یوم الخمیس قال اشتد برسول الله صلی الله علیه وسلم وجعه فقال ایتونی بکتف اکتب لکم کتابًا لن تضلوا بعده ابدًا فتنازعوا ولا ینبغی عند نبی تنازع فقالوا ما شانه أهجر استفهموه فذهبوا یردون علیه فقال دعونی ذرونی فالذی انا فیه خیر مما تدعونی الیه فامرهم بثلاث فقال اخرجوا المشرکین من جزیرة العرب واجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزهم فسکت عن الثالثة او قالها فنسیتها قال سفیان هذا من قول سلیمان (متفق علیه مشکوٰة باب وفات النبی صلی الله علیه وسلّم)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: خمیس کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درد سخت ہوگیا، تو آپ نے فرمایا کہ میرے پاس شانہ کی ہڈی لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایسی تحریر لکھوں، جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہیں ہوگے، تو - صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے ہوئے یہ مناسب نہیں ہوتا، تو انہوں نے حجرۂ مبارکہ میں موجود حضرات باہم نزاع و اختلاف کرنے لگے، جبکہ حضور نبی اکرم کہا: آپ کا کیا حال ہے، کیا آپ بے مقصد اور غیر ضروری گفتگو فرما رہے ہیں -؟ آپ سے اس کو سمجھ لو- وہ جب آپ سے دوبارہ پوچھنے لگے، تو آپ نے فرمایا مجھے چھوڑ دو اور اپنے حال پر رہنے دو، کیونکہ میں جس حال میں ہوں، وہ اس سے بہتر ہے، جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو، تو آپ نے انہیں تین امور کا حکم دیا: مشرکین کو

جزیرۂ عرب سے نکال دینا، آنے والے وفود کو اسی طرح انعامات اور تحائف دے کر رخصت کرنا جیسے کہ میں دیا کرتا تھا- تیسری بات سے سکوت فرمایا یا میں اس کو بھول گیا- سفیان فرماتے ہیں کہ یہ قول سلیمان ابن احول کا ہے جس نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے) متفق علیہ-

۲- عن بن عباس قال لما حضر رسول الله صلی الله علیه وسلم وفی البیت رجال فیهم عمر بن الخطاب قال النبی صلی الله علیه وسلم هلموا اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعده فقال عمر قد غلب علیه الوجع وعندکم القرآن حسبکم کتاب الله فاختلف اهل البیت واختصموا فمنهم من یقول قربوا یکتب لکم رسول الله صلی الله علیه وسلّم ومنهم من یقول ما قال عمر فلما اکثروا اللغط والاختلاف قال رسول الله صلی الله علیه وسلّم قوموا عنّی قال عبید الله وکان بن عباس یقول ان الرزیة کل الرزیة ما حال بین رسول الله صلی الله علیه وسلم وبین ان یکتب لهم ذالک الکتاب لاختلافهم ولغطهم- متفق علیہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وقتِ وصال قریب آگیا اور حجرۂ مبارکہ میں چند آدمی موجود تھے، جن میں - حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس (لکھنے کا سامان) لے آؤ، میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھوں، جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہیں ہوگے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بتحقیق آپ پر درد کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن مجید ہے، لہذا تمہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے تو گھر میں موجود لوگوں نے باہم اختلاف کیا اور جھگڑنے لگے- بعض کہتے تھے لکھنے کے لیے ضروری اشیاء مہیا کرو- آپ تمہارے لیے لکھیں اور بعض اس طرح کہتے تھے جیسے حضرت عمر

رضی اللہ عنہ نے کہا تھا۔ جب ان کا اختلاف و نزاع زیادہ ہوگیا اور شور بڑھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس سے اٹھ جاؤ اور دور جا کر بحث و مباحثہ کرو، عبید اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے، بہت بڑی مصیبت اور پریشان کن بات ہے، وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس تحریر کے درمیان حائل ہوگئی بسبب ان کے اختلاف اور شور کے۔

اقول: بخاری شریف اور مسلم شریف کی متفق علیہ روایات سے چند امور واضح ہو جاتے ہیں، جن کا ذہن نشین رکھنا از بس ضروری ہے۔

۱۔ یہ واقعہ خمیس کا ہے اور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال شریف سوموار کو ہوا، گویا تین دن رات مکمل درمیان میں گزرے اور خمیس کا بقیہ حصہ اور سوموار کی رات اور دن کا کچھ حصہ، لیکن پھر آپ نے اس حکم کا اعادہ نہ فرمایا اور کسی قریبی رشتہ دار کو بھی سامانِ کتابت لانے کا حکم نہ دیا اور نہ ہی انصار کو جو فی الواقع کامل انصار تھے اور صاحب ایثار اور جاں نثار غلام۔

۲۔ جب صحابہ کرام علیہم الرضوان نے تحقیق کے لیے اور حتمی ارادہ معلوم کرنے کے لیے دوبارہ عرض کیا، تو فرمایا: مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، میں جس حال میں ہوں، وہ اس سے بہتر ہے، جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔ اگر اس امر کا تعلق فرائضِ رسالت سے تھا، تو اس کا بیان نہ فرمانا اور لکھنا فرائضِ رسالت میں العیاذ باللہ تقصیر اور کوتاہی کا موجب ہوگا جو قطعاً درست نہیں۔

۳۔ آپ نے زبانی تین چیزوں کا ذکر فرمایا، جن میں سے دو تو صراحت کے طور پر مذکور ہیں اور تیسری چیز سلیمان بن احول کو یاد نہ رہی یا حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر نہ فرمائی، لیکن وہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی روانگی کی تاکید ہے جیسے کہ محدثین نے تصریح فرمائی، ان میں بھی خلافت بالفصل یا بلا فصل کا کہیں نام و نشان نہیں، جس کے گمان پر صحابہ کرام علیہم الرضوان کو موردِ طعن و تشنیع بنایا گیا ہے۔ اگر تحریر بھی ان کی فرمانی تھی تو زبانی ان امور

کی وضاحت ہوگئی جس طرح نبوت کے تئیس سال کا معمول تھا کہ جملہ عقائد و اعمال زبانی ہی بتلائے جاتے رہے۔ اور اگر وہ ان امور کے علاوہ کوئی چیز تھی تو امت کی ہدایت کی ضامن اور موجب تحریر کو نظر انداز کرنا صرف چند حاضرین میں سے بعض آدمیوں کے اختلاف کی وجہ سے اور قیامت تک آنے والی امت کی بہتری کو نظر انداز فرمانا رحمۃ للعالمین اور بالمؤمنین رؤف و رحیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شان والے نبی سے بعید تر ہے۔

۴۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خالص ہمدردی اور نیازمندی پر مشتمل مشورہ دیا کہ آپ پر درد کا شدید دورہ ہے اور تمہارے پاس قرآنِ حکیم ہے جو ہدایت کے لیے کافی ہے۔ اس میں آپ کی طرف کس طرح بے ادبی اور جرأت و جسارت کی نسبت کی جا سکتی ہے؟ جبکہ آپ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وزراء میں داخل اور مشیروں میں شامل تھے، جن کے ساتھ مشورہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ اور متعدد مقامات پر ان کا مشورہ قبول کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے مشورہ کے مطابق وحی نازل فرمائی، لہٰذا مشورہ دینے میں تو کوئی حرج نہیں تھا، عمل کے معاملہ میں آپ مالک تھے، مشورہ قبول نہ فرماتے اور اپنے عزم اور حتمی ارادہ کے مطابق عمل فرماتے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ۔ یعنی جب آپ کا پختہ ارادہ بن جائے، تو اللہ تعالیٰ پر توکل کرو اور اس کام کو کر لو۔ جب آپ نے وہ تحریر نہ لکھی، تو معلوم ہوا کہ آپ کا ارادہ ہی بدل گیا تھا، ورنہ اس حکمِ خداوندی کی خلاف ورزی لازم آئے گی اور ترکِ توکل جو کہ قطعاً درست نہیں ہے۔

۵۔ جب اتنا طویل وقت درمیان میں ہونے کے باوجود دوبارہ اس ارادہ کو ظاہر نہ کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے کو قبول فرما لیا اور اسی کے مطابق عمل ہوا، لہٰذا یہ چیز آپ کے عظیم مناقب میں داخل ہوگئی کہ آخری لمحے میں بھی آپ کے ہی مشورہ کے مطابق عمل ہوا نہ کہ باعثِ طعن و تشنیع اور موجبِ جرح و قدح۔

٦- جن لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف اس واقعہ کو بطور حربہ استعمال کیا ہے، ان سے دریافت طلب امر یہ ہے کہ قرآن مجید میں وہ امر تھا یا نہیں تھا جس کی تحریر کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارادہ رکھتے تھے۔ اگر نہیں تھا تو دین کامل نہ ہوا اور قرآن مجید کا یہ اعلان اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ نعوذ باللہ غلط ہو کر رہ گیا، کیونکہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر تو دین کے اکمال اور نعمت کے اتمام کی خوشخبری سنائی گئی تھی اور ربیع الاول شریف میں یعنی صرف دو ماہ درمیان میں گزرتے پر وہ دین پھر ناقص ہو جاتے اور ہدایت کا دارومدار اور گمراہی سے تحفظ کا ضامن امر ابھی پایا ہی نہ گیا ہو تو اس قدر اہم اور ضروری امر کے اعلان و اظہار کے بغیر دین کامل کیسے ہو گیا اور تکمیل نعمت کیونکر ہو گئی اور اگر اس اہم امر کا بیان قرآن مجید میں تھا تو اب اس کا لکھوانا یا لکھنا تکرار اور تاکید کے زمرہ میں آتا تھا جو بہر حال اس شدید تکلیف کے دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے ہمدرد اور خیر خواہ کے لئے قابل برداشت نہیں تھا، لہٰذا یہ مشورہ عرض کرنا آپ کا فرض تھا اور آپ نے اپنی طرف سے ہمدردی اور اخلاص کا حق ادا کیا۔ جس پر آپ لائق صد تحسین تھے نہ کہ قابل تنقید و تنقیص کما قال اللہ تعالیٰ، فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ
یعنی قرآن مجید کے علاوہ، وہ کس بات سے صاحب ایمان ہو سکتے ہیں؟

٧- اگر قرآن مجید میں خلافت اور امامت کا مسئلہ حل کیا جا چکا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت بلافصل کی تصریح موجود تھی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خلافت مرتضوی میں روڑے اٹکانے والا الزام غلط ہو گیا اور آپ کا حسبنا کتاب اللہ کہنا خلافت مرتضوی کا انکار نہ ہوا بلکہ اقرار۔ اور اگر اس خلافت و امامت کا قرآن مجید میں ذکر نہیں تھا، تو آج وہ آیات شیعہ حضرات کو کہاں سے مل گئیں جو صحابہ کرام کو نہ مل سکیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفسیر اور تشریح کے باوجود مہاجرین و انصار سبھی ان سے بے خبر رہے اور صرف شوریٰ پر ہی دارومدار سمجھ لیا اور اپنا دین و مذہب اور دنیا سب کچھ نعوذ باللہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خاطر برباد کر

بیٹھے اور قرآن مجید کو بھی چھوڑ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی چھوڑا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بھی۔ آخر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں وہ کونسی جاذبیت اور مقناطیسی قوت تھی، جس نے سب کو غافل اور بے خبر کر کے رکھ دیا؟ نعوذ باللہ من سوء الفہم وزیغ القلب۔

٨- اگر حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم مسئلہ خلافت کے متعلق ہی اپنا فیصلہ لکھنا چاہتے تھے، تو وہ کس کی خلافت تھی؟ اس پر کیا دلیل ہے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق خلافت کی تحریر کا احتمال تھا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی یہ احتمال موجود تھا۔ تحریر ہو جاتی، تو ایک صورت متعین ہو جاتی اور جب تحریر نہیں پائی گئی تو محض احتمال کی بنا پر ان مقدس ہستیوں کو مورد الزام و اتہام ٹھہرانا جن کے فضائل و کمالات اور اخروی نعمتوں اور بلند درجات اور ان سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی وغیرہ کا بیسیوں جگہ قرآن مجید میں اعلان ہے کونسی دینداری اور دیانتداری ہے۔ کیا یہ مسلم عقلائی قاعدہ نہیں ہے (اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال) بلکہ اہل السنت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر دلیل ترجیح پیش کر سکتے ہیں، کیونکہ جہاں یہ روایت بخاری شریف اور مسلم شریف میں ہے۔ دوسری روایت جو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت سے متعلق ہے، وہ بھی انہیں میں موجود ہے اور تمام روایات کو سامنے رکھ کر معنیٰ کا تعین ضروری ہوتا ہے نہ کہ صرف اپنی پسندیدہ اور مرضی کی روایت لے کر مخالف فریق کے خلاف جدلی اور الزامی طریقہ اپنا لیا جائے۔ روایت ملاحظہ ہو:

١- عن عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنها (الی) ولقد هممت او اردت ان ارسل الی ابی بکر وابنه واعهد ان یقول القائلون او یتمنی المتمنون ثم قلت یابی اللہ و یدفع المؤمنون او یدفع اللہ ویابی المؤمنون۔ رواہ البخاری باب وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: البتہ تحقیق میں نے پختہ ارادہ کیا ہے کہ ابوبکر اور اُن کے بیٹے کی طرف آدمی بھیجوں اور اُن کی طرف عہد کروں تاکہ کہنے والے نہ کہیں یا تمنا و آرزو کرنیوالے تمنا و آرزو نہ کریں۔ پھر میں نے کہا: اللہ تعالیٰ انکار کرے گا اور مومن ان کو دُور کردیں گے یا اللہ تعالیٰ دوسروں کو دُور کردے گا اور مومن ان کے ماسوا کی خلافت سے انکار کردیں گے۔

۲۔ عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ ادعی لی ابا بکر اباک واخاک حتّٰی اکتب کتابا فانی اخاف ان یتمنّٰی متمن ویقول قائل انا ولاو یابی اللہ والمومنون الا ابا بکر رواہ مسلم۔

اس روایت کا بھی معنی و مفہوم وہی ہے جو پہلی روایت کا ہے اور جو ذکر کیا جاچکا ہے اور یہ روایت مشکوٰۃ باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ میں موجود ہے۔ لہٰذا بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایات کی تائید سے اس روایت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت تحریر کرنے کا احتمال متعین ہوگیا، لہٰذا صدیقی خلافت کے لیے عہد نامہ لکھنے میں اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رکاوٹ ڈالی بھی ہے تو اس سے شیعہ حضرات کو کونسی شکایت ہوسکتی ہے اور اگر کہا جائے کہ یہ روایتیں موضوع اور من گھڑت ہیں، تو دوسری روایات کی صحت کی کیا ضمانت ہے؟ کیا جس میں اعتراض کی گنجائش نکلے اور صحابہ کرام بالعموم اور شیخین بالخصوص تنقید و تنقیص کا نشانہ بن سکتے ہوں صرف وہی صحیح ہوا کرتی ہے؟ اور جو روایت ابہام و اجمال کو دور کردے، وہ غلط ہوا کرتی ہے (مالکم کیف تحکمون)

۹۔ جس علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل کے لیے سب صحابہ کرام علیہم الرضوان کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے، خود ان سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وقتِ وصال آچکا ہے، لہٰذا دریافت کرلو کہ آپ کے بعد امرِ خلافت و امارت کس کے لیے ہے" ہمارے لیے ہے یا دوسروں کے لیے؟

تو انہوں نے فرمایا: میں تو دریافت نہیں کرتا، اگر آپ نے اس وقت انکار کردیا تو لوگ کبھی بھی ہمیں خلافت نہیں دیں گے۔ یہ روایت بھی بخاری شریف باب وفات النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں موجود ہے اور اس پر متعدد حوالے شرح حدیدی سے ذکر بھی کیے جاچکے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ کبھی بھی خلافت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ذکر اور اعلان نہ پہلے ہوا اور نہ اس وقت اس پر کوئی علامت کوئی دلیل موجود تھی اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اس مسئلہ کو چھیڑنا چاہتے تھے۔ جب آپ کا طرز عمل یہ ہے تو محض احتمالات کو مدنظر رکھتے ہوئے امتِ مسلمہ کے محسنین اور اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو موردِ طعن و تشنیع بنانا قطعاً غلط اور ناروا ہے۔

۱۰۔ بعینہٖ یہی مضمون شیعی کتب میں بھی موجود ہے کہ سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالخصوص حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو فرمایا کاغذ اور قلم لاؤ، میں تمہیں وہ چیز لکھ دوں، جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوسکو۔ جب انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم) میرے کاغذ اور قلم لانے تک اگر آپ کا وصال ہوجائے تو پھر کیا ہوگا؟ آپ زبانی فرمائیں، میں یاد رکھوں گا۔ تو آپ نے فرمایا: اَلصَّلٰوۃُ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ۔ نماز کا خاص خیال رکھنا اور مملوک غلاموں اور لونڈیوں کا۔ ملاحظہ ہو۔ ناسخ التواریخ، جلد ۲۔ ص ۵۵۵

لہٰذا اس قسم کے توہمات کو بنیاد بنا کر ان مقدس ہستیوں کو نشانہ بنانا مومنین کے لیے قطعاً درست نہیں ہے اور یہ اقدام عقل و خرد اور دین و ایمان کا دشمن ہی کرسکتا ہے۔ ابھی مزید بہت کچھ کہنا باقی ہے، مگر بخوفِ طوالت اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ وَاللہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

فائدہ: بخاری و مسلم شریف کی ان روایات سے جن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے علاوہ کسی کی خلافت پر اللہ تعالیٰ اور مومنین کا راضی نہ ہونا بلکہ اس کو دور کرنا اور دوسری خلافت کا انکار کرنا ثابت ہے اور شیعی تفاسیر میں مندرج روایات جن سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق

رضی اللہ عنہ کا خلیفہ بننا ثابت ہے۔ ان دونوں قسم کی روایات سے واضح ہوگیا کہ یہ خلافت ظالمانہ اور غاصبانہ نہیں تھی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشاء کے عین مطابق تھی اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ نامزد نہ کر کے اپنی اُمّت کو بغیر نگران کے نہ چھوڑا اور نہ انہیں اختلاف و انتشار کے حوالے کیا، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ اس کا کفیل ہو چکا تھا اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا چکا تھا کہ میرا فیصلہ اور میری قضاء و تقدیر کیا ہے اور میں نے کس شخص کو یہ ذمہ داری سنبھالنے کے لیے منتخب کر رکھا ہے اور یہی قرآن مجید کا مقتضیٰ و مدلول ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: یستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم (الآیۃ) یعنی اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان اور صالحین کے ساتھ خلیفہ بنانے کا حتمی وعدہ کر رکھا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اس امر کا ضامن اور کفیل ہو چکا تھا، تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے اندیشہ اور تفکّر کی کیا ضرورت تھی؟

رسالہ تنزیہ الامامیہ

از علامہ ڈھکو صاحب

پیر صاحب سیالوی نے اس روایت کے وجود کا انکار نہیں کیا بلکہ اشارۃً یہ تسلیم کیا ہے کہ شیعہ و سُنّی ہر دو فریق کی کتابوں میں موجود ہے۔ ہاں بزعمِ خویش چار درایتی ایراد وارد کر کے اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۔ **پہلے اعتراض کا جواب**: پہلا ایراد کہ بمطابق آیۂ کریمہ: وَلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے ہاتھ سے لکھنا محال ہے اور اس روایت میں ہے کہ میں لکھوں۔ خلاصہ یہ کہ اُمّت تو عالم و فاضل، ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی اور نبیِ اُمّت اور وہ بھی خواجۂ کائنات اور علّتِ غائی ممکنات ان پڑھ محض کہ جس کے لیے لکھنا محال ہے ـــ ہزار لعنت بریں عقیدہ باد

۲۔ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ شیخ الاسلامی کے دعویدار کو لائے نافیہ اور

لائے نہی اور کسی کام کے نہ کرنے اور نہ کر سکنے میں جو نمایاں فرق ہے وہ بھی معلوم نہیں۔ قول باری تعالیٰ: "وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ" سورۂ عنکبوت کا مفہوم یہ ہے کہ اعلانِ نبوّت سے قبل پیغمبر علیہ السلام لکھتے پڑھتے نہ تھے، ورنہ باطل پرستوں کو شک کرنے کا موقعہ مل جاتا۔ یہ جملہ خبریہ ہے انشائیہ نہیں، لہٰذا یہ ترجمہ کہ اپنے ہاتھ سے کبھی نہ لکھنا پیر صاحب کا وہ علمی شاہکار ہے جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔

۳۔ اعلانِ نبوّت سے قبل نہ لکھنے اور لکھا ہوا نہ پڑھنے میں جو مصلحت ملحوظ تھی، وہ اعلانِ نبوّت کے بعد ختم ہوگئی، کیونکہ معترضین کو یہ کہہ کر خاموش کیا جا سکتا تھا کہ جس خدا نے نبوّت و رسالت عطا فرمائی، اُسی نے لکھنا پڑھنا سکھا دیا۔ خاندانِ نبوّت سے مروی ہے کہ آپ تہتّر زبانوں میں گفتگو کر سکتے تھے اور اتنی ہی زبانوں میں لکھ سکتے تھے اور اسی طرح اہل السُنّت کی کتابوں میں بھی آپ کا اپنے ہاتھ مبارک سے لکھنا ثابت ہے (تا) کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جناب عمر (رضی اللہ عنہ) کی پوزیشن بچانے کے لیے پیغمبرِ خدا تعالیٰ کی توہین کی پرواہ نہیں کی جاتی۔

دُوسرے اعتراض کا جواب: ۱۔ بفرضِ تسلیم اس روایت میں خلافت کا ذکر تک نہیں، تنگ نظری اور کوتاہ اندیشی ہے، ورنہ معمولی سی دینی اور سیاسی بصیرت رکھنے والا بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ رحمۃ للعالمین نبی اپنی امت کو ابدی ضلالت سے بچانے کے لیے اپنے آخری لمحاتِ حیات میں وہی چیز تحریر فرمانا چاہتے تھے، جو بذریعہ تقریر اور بعثت سے لے کر دوات قلم طلب فرمانے تک مختلف اوقات میں مختلف اسالیب و عناوین سے برابر بیان کرتے رہے تھے تاکہ اتمامِ حجت کی آخری منزل طے ہو جائے اور وہ سوائے خلافت و امامت مطلقہ حضرت علی کے اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی۔

۲۔ علمائے اہل سنّت مثلاً علامہ شہاب خفاجی نے نسیم الریاض میں علامہ عسقلانی نے فتح الباری میں، نودی نے شرح المسلم میں اور محدّث دہلوی نے شرح

مشکوٰۃ میں بھی کہا ہے، اراد ان یبین امر الخلافۃ لئلا یختلفوا۔ ھو تعیین الخلیفۃ بعدہ وغیرہ۔

۳۔ امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس اجمال کا پردہ ہی چاک کر دیا ہے لکھتے ہیں: رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی وفات سے قبل فرمایا مجھے کاغذ و دوات لا کر دو تا کہ میں ہر قسم کے اجمال و اشکال کو دُور کر دوں اور بتا دوں کہ میرے بعد خلافت کا حق دار کون ہے؟ اس پر حضرت عمر نے کہا کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو کہ وہ بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ ان حقائق کے بعد کوئی شک و شبہ رہ جاتا ہے کہ آپ اپنے حقیقی جانشین کے نام کو ضبطِ تحریر میں لانا چاہتے تھے، لیکن تاڑنے والے تاڑ گئے کہ نام انہیں کا لکھیں گے جن کا نام بیسیوں بار زبانی بتلا چکے ہیں، لہٰذا دیرینہ اُمیدوں پر پانی پھرتا دیکھ کر دماغِ رسول پر اعتراض کر دیا۔

تیسرے اعتراض کا جواب: پیر صاحب کے تیسرے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ ائتونی جمع مذکر کا صیغہ ہے، لہٰذا بالفرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قلم دوات پیش نہیں کی تھی، تو حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے تعمیلِ حکم کر کے وہ تحریر کیوں نہ لکھوالی۔ ہم اس کے جواب میں یہی کہیں گے ع

سخن شناس نۂ دلبرا خطا ایں جاست

۱۔ یہ مانا کہ روایت میں حکم عام ہے، مگر یہ خطاب انہیں لوگوں کے لیے ہے جن کے گمراہ ہونے کا خدشہ تھا، لیکن وہ بزرگوار جو ہادی و مہدی ہو اور کائنات کو صراطِ مستقیم پر چلانے والا ہو، اسے تحریر لکھوانے کی کیا ضرورت تھی؟ (گویا یہ تحریر حاصل کرنا حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے علاوہ دوسرے صحابہ کرام پر فرض تھا، آپ اس حکم سے مستثنیٰ تھے) (محمد اشرف سیالوی)

۲۔ علاوہ بریں جب برادرانِ اسلامی کے بقول شمعِ رسالت کے بڑے پروانے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہذیان کی تہمت لگا دی اور اکثریت نے ان کی ہاں میں ہاں ملا دی، تو بعد ازاں حضرتِ امیر یا کوئی دوسرا شخص وہ تحریر لکھوا بھی لیتا، تو

اُس کا وزن کیا ہوتا، وہی جو ایک دیوانے کی بڑ کا ہوتا ہے۔

چوتھے اعتراض کا جواب: پیر صاحب کا یہ کہنا کہ فرض کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خلافت ہی لکھنا چاہتے تھے، مگر جب حضور خود فرماتے ہیں کہ میرے بعد خلیفہ ابوبکر ہوگا اور اس کے بعد عمر (رضی اللہ عنہما) تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارشاد کے خلاف دوسری خلافت لکھنا چاہتے تھے؟

۱۔ پیر صاحب کا یہ کہنا (کلمۃ حق ارید بہا الباطل) کے ضمن میں آتا ہے اور پیر صاحب اس سے جو نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں، وہ قیامت تک دُرست ثابت نہیں ہو سکتا۔

۲۔ تفسیر صافی وغیرہ کے جو حوالے ہیں، اُن کا صرف اور صرف یہ مطلب ہے کہ وہ خود بخود خلافت اور بادشاہی حاصل کر لیں گے اور یہ خبر اسی طرح کی ہے جس طرح دیگر قیامت تک پیش آنے والے اشراط و علامات۔ اگر یہ نصوصِ خلافت تھیں، تو اُمت کے سامنے اس کا اعلان ہونا چاہیے اور اس کو صیغۂ راز میں رکھنے کی تاکید نہیں ہونی چاہیے تھی۔ بلکہ یہ ایک پیشگوئی تھی مثل خروجِ دجال کے جو حرف بحرف پوری ہوئی۔

۳۔ پھر اہل السنت ان خلافتوں کو اجماعی اور شورائی کیوں قرار دیتے ہیں، نصی کیوں نہیں سمجھتے؟

۴۔ اعلانِ خلافت تو اس قدر ضروری تھا کہ بمطابق ارشادِ خداوندی وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ تمام کارِ رسالت کے اکارت ہونے کا اندیشہ تھا، مگر یہاں اس راز کے افشاء پر دل ٹیڑھے ہو رہے ہیں۔ کیا ہے کسی معقول آدمی کے پاس کوئی معقول جواب، ان سوالات کا؟

(رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۱۳۹ تا ۱۴۷)

نوٹ: پیر صاحب نے آیتِ مبارکہ ولا تخطہ کو ہر جگہ ولا تخطوہ لکھا ہے، جس سے اُن کی قرآن دانی پر تیز روشنی پڑتی ہے۔

تحفۂ حسینیہ

از ابو الحسنات محمد اشرف سیالوی

علامہ ڈھکو صاحب کے اعتراضات آپ نے ملاحظہ فرمائے اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کے جوابات پر تنقید اور جرح و قدح کا آپ نے مطالعہ فرما لیا، لیکن ایک دفعہ پھر رسالہ "مذہب شیعہ" کا متعلقہ مقام پڑھنے کی تکلیف فرما دیں اور آپ کی طرف سے پیش کیے گئے نہج البلاغہ کے اقتباسات پڑھیں، جن سے آپ نے یہ ثابت کیا تھا کہ خود امیر المؤمنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ میرا اس وقت خلافت کی بیعت لینا قبل از وقت ہے اور کچا پھل توڑنے کے مترادف اور غیر کی زمین میں کھیتی باڑی کرنے کے حکم میں ہے۔ نیز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خلفاء کی اطاعت کا پابند ہوں، لہذا میرے لیے ناممکن ہے کہ میں ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی خلافت کی مخالفت کروں اور پھر خود آپ کا ان کے ہاتھ پر بیعت کرنا، یہ تمام تر روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تحریر کے منافی بلکہ مناقض ہیں۔
(مذہب شیعہ ص۷۹ و ۸۰)

حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ نے قبل ازیں مفصل روایات، عبارات اور حوالہ جات ذکر فرمائے ہیں، وہاں بھی ڈھکو صاحب نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہ کی اور یہاں پھر ان کا اجمالی طور پر اعادہ فرما کر حدیث قرطاس کا جواب دیا تو پھر بھی علامہ موصوف نے ان کا جواب نہ دیا، جس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہوا کہ وہ بےبس اور عاجز ہیں اور ان روایات و عبارات کے جواب سے بالکل قاصر، جب اس کے اپنے مذہب کی مستند کتابیں اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات ہی خلافت بلا فصل کے دعویٰ کو سراسر غلط اور بے بنیاد ٹھہراتے ہیں، تو ادھر ادھر بھاگنے اور دُور دُور کی کوڑیاں لانے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

بہر حال ڈھکو صاحب کے ذمے نہج البلاغہ اور بہت سی دوسری کتابوں کے

حوالہ جات کے جوابات باقی ہیں اور اس چوری اور فراڈ کی ناکام کوشش نے ان کی اجتہادی صلاحیت اور حجۃ الاسلامی کو نیست و نابود کر دیا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ ان دلائل کا پوری قوم کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے اور اب ہم ڈھکو صاحب کے ذکر کردہ جوابات کی حقیقت قارئین پر واضح کرتے ہیں۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا لکھنا محال ہے اور اس کا مطلب

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے حدیث قرطاس کے متعلق پہلا قابل غور امر یہ پیش کیا تھا کہ اس میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے لکھنے کا ذکر ہے اور آپ کے لئے بذاتِ خود لکھنا محال ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ولا تخطہ بیمینک فرما کر آپ کے نہ لکھنے کی خبر دی ہے اور یہ لائے نافیہ ہے اور یا آپ کو لکھنے سے منع فرمایا ہے اور یہ لائے نہی ہے، لہذا ہر دو صورت میں آپ کا لکھنا محال ہے۔ اس تقریر پر شیعی فاضل نے تین طرح سے مؤاخذہ کی سعی لاحاصل فرمائی ہے، جو آپ ملاحظہ فرما چکے، مگر ان کی ساری کاوش میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ انہوں نے ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لحاظ سے لکھنا محال سمجھ لیا ہے اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی ایم اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی ہونے کا عقیدہ لازم اور ضروری قرار دے دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ وہ اگر غور کرتے اور تعصب و عناد نے ان کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج نہ کر دیا ہوتا، تو بات بالکل صاف اور واضح سی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی خبر کے خلاف کرنا یا اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ممکن نہیں تھا، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھنے کو محال بالذات نہیں کہا گیا، بلکہ محال بالغیر کہا گیا ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نہ لکھنے کی خبر کے لحاظ سے اور آپ کی شانِ اطاعت و فرمانبرداری کے لحاظ سے۔

مثلاً تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور ملائکہ معصوم ہیں اور ان سے کفر و کبائر کا سرزد ہونا محال ہے، لیکن علامہ ڈھکو صاحب جیسا محقق اس عبارت کو دیکھ کر کہہ دے؛

واہ رے سُنی علماء! اُمتی تو ایسے کام کریں اور جن و شیاطین بھی کر سکیں، مگر اُولو العزم مقتدر رُسل کرام نہ کر سکیں اور عظیم قوتوں اور قدرتوں کے مالک ملائکہ نہ کر سکیں، یہ کیسے ممکن ہے؟ لیکن آپ کا یہ دعویٰ سراسر تحکم اور سینہ زوری ہوگا، بلکہ حماقت؛ کیونکہ انہوں نے اس قول میں انبیاء و رُسل اور ملائکہ کرام کی شانِ عصمت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بالکل اور بعینہٖ اسی طرح لکھنے کے معاملہ میں بھی ڈھکو صاحب نے سینہ زوری سے کام لیا ہے۔ بطریقِ اعجاز اور خرقِ عادت لکھ سکنے کی نفی نہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے فرمائی نہ ہی وہ محلِ بحث ہے، بلکہ کلام عملی طور پر لکھنے میں ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ لکھنے کی خبر یا لکھنے سے نہی کے پیشِ نظر اور محال بالعرض اور ممتنع بالغیر کے طریقہ پر اور اگر آپ کا یہ مقصد نہ ہوتا، تو لائے نفی یا لائے نہی کو ذکر ہی کیوں فرماتے آپ کا قولِ باری تعالیٰ؛ وَلا تخطّہٗ میں لائے نفی اور لائے نہی کو ذکر فرما کر نبی الانبیاء محبوبِ کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھنے کو محال قرار دینا، اسی حقیقت کا واضح بیان ہے؛ مگر اہلِ البصار و بصائر کے لیے۔

شق ۲: دوسری شق میں ڈھکو صاحب نے فرمایا کہ شیخ الاسلامی کے دعوے دار کو نہ کرنے اور نہ کر سکنے کا فرق معلوم نہیں۔ نیز لائے نفی اور لائے نہی کا فرق بھی معلوم نہیں اور "ولا تخطّہٗ" جملہ خبریہ ہے انشائیہ نہیں ہے الخ قبل ازیں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کا مطلب انہیں کی عبارت کے سیاق و سباق کی رُو سے عرض کیا جا چکا ہے اور نہ کر سکنے کی حقیقت واضح ہو چکی ہے، مگر بدقسمتی سے علامہ صاحب نے خود عبارت سمجھی ہی نہیں تھی۔ نیز لائے نفی اور لائے نہی میں فرق نہ سمجھتے تو دونوں کو بطورِ تقابل ذکر ہی کیوں فرماتے اور لائے نہی ہونے کی صورت میں ترجمہ بالکل وہی ہے جو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ذکر فرمایا۔ ہاں البتہ اس پر اعتراض کرنا جہالت کا ایسا شاہکار ہے جو رہتی دُنیا تک یادگار رہے گا، بلکہ نفی کی صورت میں بھی معنی نہی والا ہی ہوگا اور اس کو صورتِ خبر میں ذکر کرنا مزید تاکید، حکم اور مبالغہ کے لیے ہوگا جیسے کہ کتبِ معانی و بیان میں اس کی تفصیل موجود ہے اور یہ دعویٰ کہ ولا تخطّہٗ فقط جملہ

خبریہ ہے اور اس میں انشائیت کا احتمال بھی نہیں ہے، محض دعویٰ ہی ہے جو محلِ نزاع میں غیر مسموع ہے۔

شق ۳: تیسری شق میں ڈھکو صاحب نے فرمایا کہ جو مصلحت اعلانِ نبوت سے قبل نہ لکھنے اور لکھا ہوا نہ پڑھنے میں تھی، وہ اعلانِ نبوت کے بعد ختم ہو گئی، تو ہم ڈھکو صاحب سے دریافت کرتے ہیں کہ اعلانِ نبوت کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات و انجیل، زبور اور دیگر صحفِ سماویہ کا مطالعہ شروع فرما دیا تھا؟ یا قرآن مجید اپنے ہاتھ مبارک سے لکھنا شروع کر دیا تھا اور کسی کاتب کو کتابتِ وحی کی تکلیف نہیں دیا کرتے تھے؟ جب آپ نے کتبِ سابقہ کا مطالعہ بھی کبھی نہ فرمایا اور قرآن مجید کی کوئی آیت بھی اپنے ہاتھ مبارک سے نہ لکھی اور اعلانِ نبوت کے بعد کتابوں کے مطالعہ اور قرآن کریم کی کتابت والا معجزہ ظاہر کر کے اپنی حقانیت و صداقتِ نبوت پر اس کو دلیل نہ بنایا تو ثابت ہو گیا کہ یہ قولِ مبارک صرف قبل از اعلانِ نبوت کی حالت کو نہیں بتلا رہا اور نہ مصلحتِ سابقہ پر دلالت کر رہا ہے، بلکہ آئندہ کے لیے بھی وہی حکم تھا اور اسی پر آپ نے زندگی بھر عمل فرمایا اور اس مصلحت کو اعلانِ نبوت کے بعد بھی ملحوظ رکھا، لہٰذا علامہ موصوف کا یہ دعویٰ کہ اعلانِ نبوت کے فوراً بعد وہ مصلحت ختم ہو گئی، سراسر لغو اور بیہودہ ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وصفِ اُمیت کی بقا اعلانِ نبوت کے بعد بھی بہت ضروری تھی جو شخص اہلِ کتاب وغیرہ سے مشرف باسلام ہونے کے لیے آتا، جن کو معلوم تھا کہ پیغمبرِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اُمی ہوں گے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: الذین یتبعون النبی الامی الذی یجدونہ مکتوباً عندھم فی التوراۃ والانجیل۔ اور وہ آپ کو کتابت کرتے دیکھتا یا کتبِ سماویہ کا مطالعہ کرتے دیکھتا، تو وہ کس طرح اُمی والی علامت آپ میں موجود ہونے کا یقین کرتا اور کتبِ سابقہ کی اقتداء و اتباع میں آپ پر کس طرح ایمان لاتا؟ لہٰذا آخر تک آپ کا وصفِ امیت پر رہنا ہی سراسر مصلحت اور عینِ حکمت تھا، گو شیعی علماء اس کو سمجھنے سے قاصر ہی ہوں۔

کیا سیدِ عالم و عالمیان صرف تہتّر زبانیں جانتے تھے؟

علامہ ڈھکو صاحب نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تہتّر زبانیں جانتے تھے اور ان میں کلام فرما سکتے تھے، لیکن ہم کہتے ہیں صرف تہتّر کیا تہتّر ہزار زبانیں جاننا بھی بعید نہیں، کیونکہ آپ تمام جہانوں کے لیے رحمتِ مجسّم بنا کر بھیجے گئے، لہٰذا جتنی اجناس و اصناف اور انواع و اقسام امم و اقوام کی ہیں، حیوانات ہوں یا جنّ و انسان ان سب کی بولیاں آپ کو معلوم تھیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ ۔ یعنی ہم نے ہر نبی و رسول کو اس کی قوم کی زبان کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ وہ انہیں اپنا مدّعا و مقصود سمجھا سکے اور ان کی بات بھی سمجھ سکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب انسانوں، جنّوں اور ملائکہ نیز جملہ حیوانات کے لیے بھی رسولِ رحمت ہیں کما قال اللہ تعالیٰ، وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ہٰذا ان تمام کی زبانیں آپ کو معلوم ہونی چاہئیں، لیکن باوجود اس قدر علم کے محلِ بحث امیّت اسی طرح برقرار اور باقی و دائم رہے گی، کیونکہ یہ زبانیں عام طریقہ تعلیم کے مطابق آپ نے حاصل نہیں کیں۔ اگر عربی النّسل بچہ فصیح عربی بول لے لیکن بطورِ تعلیم و تعلّم نہ ہو اور ہم اس معیار کی عربی نہ بول سکیں، مگر درسی تعلیم حاصل کی ہو تو پھر بھی وہ اُمّی رہے گا اور ہم اُمّی نہیں ہوں گے۔ نیز یہ وسعتِ علم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں کسی غلط فہمی کی موجب نہیں ہو سکتی، بلکہ حقانیت کی دلیل ہوگی اور اگر لکھنا شروع فرما دیں اور مطالعہ شروع فرما لیں، تو مغالطہ پیدا ہو سکتا ہے۔ نیز تہتّر زبانوں میں آپ کا لکھ سکنا بطورِ معجزہ محلِ بحث نہیں ہے، لیکن بطورِ عادتِ جاریہ ایک سطر لکھنا بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا اور کلام اسی معمول میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ لکھنے کی پابندی میں اور علامہ موصوف کی توجہ کے لیے عرض کر دوں کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ اگر بطورِ اعجاز بھی لکھنا آپ کے حق میں محال سمجھتے تو ولا تخطّہ کے اندر لاتے نہی کا احتمال ہی ذکر نہ فرماتے اور نہی والا معنی ہی نہ کرتے،

کیونکہ جو شخص لکھنے سے بالکل عاجز و قاصر ہو، اس کو لکھنے سے منع کرنا ہی غیر معقول ہوگا لہٰذا صاف ظاہر کہ آپ نے لکھنے کی قدرت تسلیم کی، لیکن اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے تحت آپ سے فعلِ کتابت کا سرزد ہونا محال بالغیر قرار دے دیا اور، اس کلامِ صداقت نشاں پر جرح و قدح کا کوئی جواز نہیں ہے۔

کتبِ اہل السنّت اور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھنے کا ثبوت

علامہ موصوف نے کتبِ اہل السنّت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھنے کا کوئی ثبوت تحریر نہیں کیا۔ حسبِ عادت صرف دعویٰ کر کے آگے چل دیتے ہیں اور مقامِ نزاع و خلاف میں محض دعویٰ کر دینا کافی نہیں ہوا کرتا، مگر ڈھکو صاحب نے مباحثہ و مناظرہ اور استدلال و استشہاد کا طریقہ ہی نیا ایجاد کیا ہوا ہے، لہٰذا جواب کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی تھی، لیکن پھر بھی بطورِ تبرّع جواب عرض کیے دیتے ہیں۔

علامہ موصوف کے اس دعویٰ کا دار و مدار غالباً صلح حدیبیہ کے موقعہ پر تحریر کیے گئے معاہدہ پر ہے، جس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے معاہدہ لکھتے وقت آپ کے نامِ نامی کے ساتھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لکھ دیا۔ فریقِ مخالف نے اس پر اعتراض کیا کہ ہم آپ کو رسول اللہ مانتے تو جنگ کیوں کرتے اور رکاوٹ کیوں ڈالتے، لہٰذا اس کو مٹا دیجئے۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا، اس لفظ کو مٹا کر محمد بن عبد اللہ لکھ دو۔ انہوں نے عرض کیا میری مجال نہیں اور نہ ایمان و ایقان اس کی اجازت دیتا ہے کہ رسول اللہ کا لفظ مٹا دوں، تو آپ نے اپنے دستِ اقدس کے ساتھ اس لفظ پر لکیر کھینچ دی۔ اس کے بعد جمہور کا قول یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا اب ابنِ عبد اللہ لکھ دو اور بقولِ بعض آپ نے صرف ابنِ عبد اللہ کا لفظ خود تحریر فرمایا اور آپ اچھی طرح لکھتے نہیں تھے فکتب ولم یکن یحسن یکتب۔ اس کے علاوہ لکھنے کا کوئی ثبوت نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ جزوی اور محتمل امر ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انکار کے بعد ضرورت اور مجبوری کے تحت ہے اور وہ بھی بقولِ

جمہور صرف لکیر کھینچنے تک محدود ہے، لہٰذا اس سے علامہ صاحب محلِ نزاع میں کیا حاصل کر سکتے ہیں ماسوا غوغا آرائی کے، کیونکہ سبب آمر کی طرف فعل کا نسبت کیا جانا متعارف اور عام ہے۔ الغرض ڈھکو صاحب کی ساری تحریر اور گرج اور چمک صرف اپنی غلط فہمی بلکہ کج فہمی پر مبنی ہے جس کی ذمہ داری حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ پر نہیں ڈالی جا سکتی۔

شیعی علماء اعلام کے اقوال

آئیے اب اس مسئلہ پر شیعی علماء اعلام کے اقوال ملاحظہ کریں؛

صاحب ناسخ التواریخ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیازی اور مختصہ احکام میں سے حرام امور کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے۔ "در ذکر محظورات و محرمات رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم (تا) پنجم خط نوشتن قال اللہ تعالیٰ، ولا تخطہ بیمینک اذًا لارتاب المبطلون ۰ (جلد اوّل از کتاب دوم صـ۵۹۹)

آپ کے لیے مختصہ امور اور احکام میں سے پانچواں حرام اور ممنوع امر ہے خط لکھنا اور تحریر کرنا جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اور نہ لکھنا تم اس کو اپنے داہنے ہاتھ سے ورنہ باطل پرست لوگ شک و تردد میں پڑیں گے۔ کہیے علامہ صاحب جملہ خبریہ اور لائے نافیہ کی صورت میں خط لکھنا حرام کیسے ہو گیا؟ لفظاً یا معنیً جملہ انشائیہ ماننا لازم ہے یا نہیں؟ اور جو معنی حضرت شیخ الاسلام نے کیا وہی آپ کے علماء سے ثابت ہے یا نہیں؟ کیا یہ ترجمہ حضرت پیر صاحب کا فی الواقع علمی شاہکار ہے یا نہیں ہے۔۔؟

۲۔ علامہ طبرسی نے سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کے حوالے سے لکھا ہے؛

هٰذه الاية تدل علىٰ ان النبى صلى الله عليه وسلّم ما كان يحسن ان يكتب قبل النبوة فاما بعد النبوة فالذى نعتقده فى ذالك التجويز لكونه عالمًا بالقرأة والكتابة والتجويز لكونه غير عالم بهما من غير قطع علىٰ احد الامرين

وظاهر الاية يقتضى ان النفى قد تعلق بما قبل النبوة دون ما بعدها ولان التعليل يقتضى اختصاص النفى بما قبل النبوة لان المبطلين انما يرتابون فى نبوته لو كان يحسن الكتابة قبل النبوة فامّا بعد النبوة فلا تعلق له بالريبة والتهمة فيجوز ان يكون تعلمها من جبرئيل عليه السلام (تفسير مجمع البيان صـ۲۸۷ و ۲۸۸ ج ۷ و منہج الصادقین صـ۱۶۸ و ۱۶۹ ج ۷)

یہ آیتِ کریمہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اعلانِ نبوت سے پہلے درست طریقہ پر نہیں لکھ سکتے تھے۔ رہا اعلانِ نبوت کے بعد کا دور تو ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ممکن ہے آپ اس میں کتابت اور قرأت کا علم اور ملکہ رکھتے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دوران بھی آپ کو یہ ملکہ حاصل نہ ہو۔ کسی ایک امر کا حتمی علم اور یقین نہیں ہے۔ ہاں آیتِ کریمہ سے بظاہر یہی پتہ چلتا ہے کہ نفی کا تعلق اعلانِ نبوت سے پہلی حالت کے ساتھ تھا نہ کہ اعلانِ نبوت کے بعد والے دور سے۔ نیز جو علت اس نفی کی بیان کی گئی ہے، وہ بھی اعلانِ نبوت سے پہلی حالت کے ساتھ نفیِ کتابت کا اختصاص چاہتی ہے، کیونکہ باطل پرست اسی صورت میں آپ کی نبوت میں شک و شبہ کر سکتے تھے، جبکہ آپ قبل از نبوت اچھی طرح لکھ سکتے ہوتے، لیکن اعلانِ نبوت کے بعد والے دور کو اس تہمت اور ریبت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ آپ نے جبرئیل علیہ السلام سے کتابت کا علم اور ملکہ حاصل کر لیا ہو۔

شیعہ کا مذہب مختار

مجمع البیان اور منہج الصادقین کی عبارات ہی ڈھکو صاحب کی تعلی اور گرج چمک کی بنیاد تھیں اور بلا حوالہ یہی تقریر انہوں نے اپنے رسالہ میں درج کر دی لیکن ان عبارات سے صرف اتنا قدر ثابت ہوا کہ ممکن ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت

جبرئیل علیہ السلام سے فنِ کتابت کا علم حاصل کر لیا ہو، لیکن اس کا یقین اور اعتقاد جازم نہیں ہے، لیکن آیئے دیکھیں کہ اُن کا مذہب مختار اس باب میں کیا ہے؟ علامہ فتح اللہ کاشانی کے قول کے مطابق جو لوگ آپ کو آخر عمر تک اُمّی تسلیم کرتے ہیں، وہی صواب کے بہت قریب ہے اور شعرانی نے کہا صحیح ہی یہی ہے۔

۱۔ و مذہب آنانکہ وے صلی اللہ علیہ وسلم را اُمّی دانند از اول عمر تا آخر عمر بصواب اقرب است ۔ منہج الصّادقین ج ۷ ص ۱۶۹

یعنی جن لوگوں کا مذہب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اوّل عمر سے آخر عمر تک اُمّی تھے، وہ صواب اور درستگی کے بہت زیادہ قریب ہے۔

۲۔ صاحبِ تیسیر نے کہا تھا کہ آغازِ کار میں رسم الخط اور لکھا ہوا پڑھنے کا علم و ملکہ نہ ہونا فضیلت تھا؛ وچوں معجزہ ظاہر شد و در اُمیّتِ اُو شک و شبہ نماند حق تعالیٰ در آخر عمر ایں فضیلت بوے ارزانی داشت تا معجزہ دیگر باشد۔

یعنی جب آپ کا معجزہ ظاہر ہو گیا اور آپ کے اُمّی ہونے میں شک و شبہ نہ رہا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو آخری عمر میں یہ فضیلت عطا فرما دی۔

لیکن ابو الحسن شعرانی صاحب نے اپنے حاشیہ میں اس پر رد کرتے ہوئے لکھا کہ ان لوگوں کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آپ کے لیے علمِ قرآت اور علم الخط از رُوے حدس اور گمان ثابت کیا ہے نہ کہ نقل اور روایت کے ساتھ "و تاریخ را باید بنقل ثابت کرد نہ بحدس"۔ اور لکھنے وغیرہ کے قول کو نقل کے ساتھ ثابت کرنا چاہیئے نہ کہ ظن و تخمین کے ساتھ اور جن لوگوں نے یہ قول کیا ہے ان کا منشا قول یہ ہے کہ لکھنا اور پڑھنا فضیلت ہے اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس اس فضیلت سے خالی نہیں ہونی چاہیئے۔

"لیکن حق آنست کہ خط و کتابت و قرآت برائے تعلیم و تعلم است نہ خود فی حد ذاتہ فضیلت نیست و آنکہ بے واسطہ با عالم اعلیٰ رابطہ دارد چہ نیازش بخط و قرآت باشد۔" حاشیہ منہج الصّادقین، ج ۷ ص ۱۶۹

لیکن حق و حقیقت یہ ہے کہ علم الخط اور علمِ قرآت اور لکھا ہوا دیکھ کر پڑھ سکنا تعلیم و تعلّم کے لیے وسیلہ اور ذریعہ ہے، بذاتِ خود کوئی فضیلت نہیں ہے، لہٰذا وہ ہستئ مقدّس جو بلا واسطہ عالمِ بالا اور ربِ اعلیٰ کے ساتھ رابطہ رکھتے ہوں، اُن کو رسم الخط اور لکھا ہوا پڑھ سکنے کی طرف محتاجی نہیں ہو سکتی۔

ستّر علوم پر دسترس اور اُن میں لکھنے کی حقیقت

علامہ ڈھکو صاحب نے اپنا عقیدہ و نظریہ بیان کیا تھا کہ آپ کو ستّر علوم پر کامل دسترس تھی اور ان میں آپ لکھ پڑھ سکتے تھے، لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ دراصل وہ روایت بصائر الدرجات کی ہے جو خود بھی ضعیف کتاب ہے اور اُس کی یہ روایت بھی ضعیف ہے جیسا کہ حاشیہ "منہج الصادقین" میں ہے:

"و در بصائر الدرجات کہ خود کتابے ضعیف است بسند ضعیف روایت کردہ است کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بہفتاد زبان میخواند و می نوشت و ایں ہا مخالف بظاہر قرآن است۔ خواندن با عجاز و وحی و تعلیم جبریل در ہر جا کہ ثابت شود از محلِ کلام خارج است۔ منہج الصّادقین جلد ۷، ص ۱۶۹

یعنی "بصائر الدرجات" میں جو کہ بذاتِ خود کتاب بھی ضعیف ہے، پھر اس میں ضعیف روایت کے ساتھ مروی و منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ستّر زبانوں میں پڑھتے اور لکھتے تھے، لیکن یہ روایت قرآن مجید کے ظاہری معنی و مفہوم کے خلاف ہے۔ بطورِ اعجاز پڑھ لینا یا وحی اور تعلیم جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ جہاں بھی ثابت ہو، وہ محلِ بحث اور مقامِ نزاع سے خارج ہے۔

یہ تھی علامہ ڈھکو صاحب کی دلیل و بُرہان جس کو خود اس کے اہلِ مذہب نے رد کر دیا تھا اور بناء الفاسد علی الضعیف فی الضعیف قرار دیا تھا۔

اقول: علاوہ ازیں اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمر شریف کے آخری حصّہ میں فنِ کتابت اور قرآت میں مہارت حاصل کر چکے تھے، تو اب آپ کو اُمّی والے

لقب سے موصوف کرنا غلط ہونا چاہیے، کیونکہ جو پہلے اُمّی ہو اور بعد ازاں لکھ پڑھ لے اور علوم مروّجہ کی تکمیل کر لے، تو اُس کو اُمّی نہیں کہہ سکتے، لہٰذا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کو عمر شریف کے آخری حصّہ میں اُمّی کہنا غلط ہونا چاہیے اور اگر یہ وصف ذکر کیا جائے، تو توہین و تحقیر کا ارتکاب لازم آنا چاہیے، کیونکہ پڑھے لکھے کو اُمّی کہنا اس کی تعلیم و تعلّم اور اس فن میں دسترس کا انکار ہے، حالانکہ یہ لازم باطل ہے، لہٰذا ملزوم بھی باطل ہے اور علامہ فتح اللہ کاشانی کا یہ قول برحق ثابت ہو گیا کہ جو لوگ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کو اوّل عمر سے لے کر آخر عمر تک اُمّی تسلیم کرتے ہیں، صواب اور صحیح ترین قول انہیں کا ہے۔ ڈھکو صاحب اب کہیے! لعنت بریں مذہب باد! تاکہ تمہارے ہی منہ پر لوٹ کر آئے، کیونکہ تمہارا اپنا مذہب مختار یہی ہے
الحاصل جب آپ اُمّی ہیں اور آپ پر لکھنا حرام ہے، تو قول باری تعالیٰ! وَلَا تَخُطُّہٗ خبر ہو تو معنیٰ نہی والا ہی ہے، تو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کا ترجمہ بالکل عینِ صواب اور حقیقت کے مطابق ہو گیا، لہٰذا اس پر ڈھکو صاحب کی تنقید اپنی جہالت اور اپنے مذہب سے بیگانگی کا نتیجہ ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے مختصہ احکام سے لاعلمی کا ثمرہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے اُمّی ہونے کا مطلب

یہ امر ذہن نشین رہے کہ ہمارے نزدیک اُمّی ہونے کا آپ کے حق میں یہ مطلب نہیں کہ آپ بے علم تھے نعوذ باللہ بلکہ آپ کے اُمّی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کرنے والے اور تعلیم و تربیت میں مخلوق کا بارِ احسان نہ اٹھانے والے بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے سب کچھ سیکھنے اور حاصل کرنے والے اور تعلیم و تربیت پانے والے کما قال اللہ تعالیٰ، وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ وعلمک ما لم تکن تعلم (الآیہ) نیز فرمایا، ثم ان علینا بیانہ اور فرمایا، سنقرئک فلا تنسیٰ (الآیہ) اسی لیے امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے

فرماتے ہیں ؎ کفاک بالعلم فی الامی معجزۃ
فی الجاھلیۃ والتادیب فی الیتم

یعنی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ جاہلیت میں موجود ہونے اور اُمّی ہونے کے باوجود صاحبِ علم ہونا اور یتیمی کے باوجود حُسنِ ادب اور اخلاقِ عالیہ سے متصف ہونا صداقتِ نبوّت پر معجزانہ دلیل ہے اور اسی حقیقت کو امامِ اہلِ سنّت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ نے یوں ادا فرمایا ہے ؎

ایسا اُمّی کس لیے منّت کشِ اُستاد ہو
کیا کفایت اُس کو اقرأ ربک الاکرم نہیں

بلکہ یہ وہ اُمّی ہیں، جن پر سلسلۂ تعلیم کی انتہا ہو گئی اور پھر کسی معلّمِ کائنات اور نبی و رسول کے مبعوث فرمانے کی ضرورت نہ رہی اور پہلی شریعتیں ان کی شریعت سے منسوخ ہو گئیں اور پہلی کتابیں ان کی کتاب سے۔ ولنعم ما قیل! ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست — کتب خانۂ چند ملّت بشست

حدیثِ قرطاس کی دُوسری توجیہ اور جناب علامہ ڈھکو صاحب کی جواب میں فریب کاری!

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے الفاظ پہلے ملاحظہ فرمالیں۔ آپ فرماتے ہیں بفرضِ تسلیم اس روایت میں خلافت کا ذکر تک نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور وہ بھی بلافصل اس سے کیسے ثابت ہو گئی۔ ص ۷۹ اس کے جوابات میں ڈھکو صاحب نے جو مبسوط تحریر سپردِ قرطاس فرمائی، بتلاؤ اسے کوئی مناسبت حضرت شیخ الاسلام کے فرمان سے ہے۔ آپ فرماتے ہیں اس روایت میں قطعاً خلافت کا ذکر ہی نہیں چہ جائیکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور وہ بھی بلافصل مذکور ہو۔ ڈھکو صاحب نے کس جملہ سے اس جواب کو توڑا ہے۔ کتبِ اہلِ السنّت کا حوالہ دیا ہے، تو ان میں بھی بطورِ احتمال اس امر کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی خلافتِ بلافصل حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی تو مراد

نہیں، مگر اس سے روایت میں تصریح خلافت کیسے ثابت ہو گئی اور عقلی طور جو جواب دیا ہے کہ زندگی بھر مختلف اسالیب و عناوین سے جس کا ذکر کیا تھا، اب وہی لکھنی تھی اور کیا لکھنا تھا؟ یہ جواب بھی غلط ہے کیونکہ از روئے عقل کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جس کو زندگی بھر بیان فرماتے رہے اور اس کا اعلان کرتے رہے، اس کا ذکر اب تکرار محض کی وجہ سے اتنا اہم نہیں تھا، جتنا قدر کہ دوسرے اہم دینی امور لہذا جو ابھی بتکرار بیان نہیں ہو سکے تھے ان کے لیے لکھنے کا اہتمام مقصود تھا تو اس عقلی وجہ کو کیوں نظر انداز کیا جائے اور جو ڈھکو صاحب کے عقل نے اختراع کی ہے، اس کا کیوں التزام کیا جائے، لہذا نہ از روئے نقل یہ جواب صحیح ہوا اور نہ ہی از روئے عقل۔

امام غزالی علیہ الرحمہ پر بہتان

علامہ صاحب نے حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کی طرف ایک عبارت کی نسبت کر دی، لیکن ان کی کسی کتاب کا حوالہ ہی نہیں دیا۔ کیا اس طرح کے دعوے اور دلائل کی مثال و نظیر کسی نے دیکھی ہے؟ غالباً آپ سرّ العالمین کا حوالہ دینا چاہتے تھے، لیکن طبعی تقاضا کے برعکس شرم آگئی کہ اپنی لکھی ہوئی کتاب کی نسبت اہل السنّت کے عالم کی طرف کر کے جگ ہنسائی اور رسوائی کیوں مول لیں، لیکن پوری طرح شرم نہیں آئی، ورنہ یہ موضوع اور من گھڑت عبارت ذکر ہی نہ کرتے نہیں نہیں، بلکہ بہت بڑی فریب کاری کا مظاہرہ کیا ہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ "احیاء العلوم" جیسی معروفِ زمانہ کتابوں میں مذکور عبارت کا حوالہ ہے، حاشا و کلاّ، یہ ان کی کسی معروف کتاب میں نہیں، بلکہ ان سب میں اس کے منافی و مخالف عقیدہ کا اثبات ہے۔

قاضی نور اللہ شوستری نے اس کتاب کے اور امام غزالی علیہ الرحمہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ ملاحظہ ہو:

مجمل عقیدہ اُو ایں است کہ در مبادی حال بواسطہ مصاحبت روسائے

اہلِ ضلال از نورِ ایمان خالی بودہ و آخر مومن موالی بلکہ شیعہ اعالی گردیدہ ——
(مجالسِ المؤمنین ص۱۹۲)

یعنی اجمالی طور پر غزالی علیہ الرحمہ کے عقیدے کا بیان یہ ہے کہ ابتدا میں روسا اہلِ ضلال کی صحبت کی وجہ سے نورِ ایمان سے خالی تھے اور آخر میں مومن موالی ہو گئے اور عالی مرتبت شیعہ۔

در کتاب سرّ العالمین کہ آں را سرِّ مکنون نیز گویند و آں از جملہ کتبے است کہ غزالی آں را در آخر نوشتہ و افشاء سرِّ خود نمودہ و تصریح بارتدادِ خلفاء ثلاثہ و تابعان ایشاں فرمودہ۔ یعنی کتاب سرّ العالمین جس کو سرِّ مکنون بھی کہا جاتا ہے اور یہ منجملہ ان کتابوں کے ہے، جن کو امام غزالی علیہ الرحمہ نے عمر کے آخری حصہ میں لکھا اور اپنے راز کا افشاء کیا، اور خلفاء ثلاثہ اور ان کے متبعین کے مرتد ہوتے اور دینِ حق سے برگشتہ ہوتے کا قول کیا۔
(مجالس المؤمنین جلد دوم، ص۱۹۶)

جب قاضی شوستری یہ راز بیان کر چکا، تو ایک سوال سوجھا، لہذا اس کا جواب دینا بھی ضروری سمجھتے ہوئے سوال و جواب کو کتاب میں درج کیا، آپ بھی ذرا اس سوال و جواب کا مطالعہ فرما کر محظوظ ہوں اور علامہ ڈھکو صاحب کی ڈھٹائی ہیں اس کی مجبوری و معذوری کو محسوس کریں، کیونکہ اخلاف اپنے اسلاف کی راہ کیونکر چھوڑ سکتے ہیں اور تلبیس و تدلیس کا یہ طریقہ انہیں اسلاف سے ہی ورثہ میں ملا ہے، لہذا وہ اس معاملہ میں مجبور محض ہیں۔

سوال : کسے نگوید کہ چوں حکم بتشیع غزالی و امثال اُو کہ بمذہب اہل السنّت اشتہار دارند نمودید پس باید کہ سخن ایشاں را کہ در کتب کلامیہ و غیر آں مسطور است بر اہل سنّت حجت نسازید۔ **جواب** : زیرا کہ ما میگوئیم کہ حکم ما بتشیعِ غزالی و امثال او نظر بباطنِ حال ایشاں است و شک نیست کہ ظاہرِ حال ایشاں موافق اہل السنّت بودہ و تصانیف ایشاں بر طبق عقائد آں جماعت واقع شدہ۔ و ہمگی مطالعہ آں تصانیف کردہ اند و آنچہ در آنجا مسطور است بقبول تلقی نمودہ اند و آں را مخالف روایات و

درایات خود ندانستہ اندلیس فی الحقیقت احتجاج ما بآنچہ در تصانیف امثال غزالی است احتجاج است بتصانیفیکہ اہل السنت آں را اعتبار کردہ اند بلکہ افتخار بآں نمودہ اند ہر چند مصنف آں شیعی باشد باطناً یا ظاہراً۔ (مجالس جلد دوم صـ۱۹۸)

سوال: یعنی کوئی شخص یہ نہ کہے کہ جب تم غزالی علیہ الرحمہ وغیرہ کے شیعہ ہونے کے قائل ہو تو پھر اُن کی وہ عبارات جو کتب کلامیہ وغیرہ میں مسطور ہیں اور مسلکِ اہل سنت کے خلاف ہیں، وہ اُن کے خلاف بطورِ حجت وسند پیش نہ کرو (کیونکہ یہ تو شیعہ کی عبارت کو اہل سنت کے خلاف حجت قرار دینے کے مترادف ہوا)

جواب: کیونکہ ہم جواب میں کہتے ہیں کہ ہمارا غزالی اور اس قسم کے لوگوں کو اہلِ تشیع میں شمار کرنا ان کے باطنی حال کے پیشِ نظر ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ ان کا ظاہری حال اہل سنت کے موافق ہے اور اُن کی تصانیف بھی اہل سنت کے مطابق پائی گئی ہیں اور تمام اہل السنت نے ان کا مطالعہ کیا اور اُن کو اپنے ہاں قابلِ قبول ٹھہرایا اور اُن کو اپنی روایات و درایات کے مخالف نہیں سمجھا، لہٰذا درحقیقت ہمارے استدلال کا دارومدار ان تصانیف پر ہے جن کو اہل السنت نے معتبر سمجھا ہے، بلکہ ان پر فخر کا اظہار کیا ہے، خواہ اُن کا مصنف باطن میں شیعہ ہو یا ظاہر میں۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اہل السنت امام غزالی علیہ الرحمہ وغیرہ کی جن کتابوں پر اعتبار و اعتماد کرتے ہیں اور اُن پر اظہارِ فخر کرتے ہیں، اُن میں ایسی عبارات نہیں ہیں جو شوستری صاحب نے نقل کی ہیں اور جن میں ایسی عبارات ہیں، وہ سربستہ راز ہیں، جن سے صرف شیعہ حضرات آگاہ ہوئے اور وہ اہل السنت کے نزدیک نہ قابلِ قبول اور نہ امام غزالی علیہ الرحمہ وغیرہ کی تصنیفات ہی ہیں، لہٰذا جو معتبر اور مقبول ہیں، ان میں عقیدہ اہل السنت کی صحیح اور مکمل ترجمانی ہے، ان کو اہل السنت کے خلاف کون احمق پیش کر سکتا ہے؟ اور جن کو پیش کیا جاتا ہے، وہ اہل سنت کے نزدیک صحیح النسبت ہی نہیں، لہٰذا ان کو اہل سنت

کے خلاف پیش کرنا بھی سراسر تحکم اور سینہ زوری ہے۔ الغرض اس سوال کا دوبارہ سہ بارہ مطالعہ کرو اور جواب کی مطابقت بھی مشاہدہ کرو، تو یقیناً یہی کہنا پڑے گا

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی (غالبؔ)

جب امام غزالی علیہ الرحمہ بقول قاضی شوستری شیعہ ہو گئے تھے اور تشیع کے بعد انہوں نے کوئی کتاب لکھی جس میں خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے متعلق نعوذ باللہ مرتد ہونے کا قول کیا وغیرہ وغیرہ، تو ایسی کتاب نصیر الدین طوسی کی ہو یا امام غزالی کی، اس سے اہل سنت کو الزام دینے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

کتاب سر العالمین حضرت شاہ عبدالعزیز کی نظر میں

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تحفہ اثنا عشریہ صـ۴۰ پر شیعہ کے اکیسویں مکر و کید کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کبھی اپنے طور پر کتاب لکھ کر اس میں صحابہ کرام علیہم الرضوان پر طعن و تشنیع اور اہل سنت کے مذہب کو باطل کرنے والی عبارات درج کر کے اہل السنت والجماعت کے اکابر علماء میں سے کسی کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اس کتاب کے آغاز میں خطبہ لکھ دیتے ہیں، جس میں کتمانِ اسرار اور حفظِ امانت کی وصیت درج کر دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ جو کچھ اس کتاب میں ہے، وہ ہمارا خفیہ عقیدہ ہے اور جو کچھ دوسری کتابوں میں لکھا ہے، وہ محض پردہ داری اور زمانہ سازی کے طور پر لکھا ہے۔

مثل کتاب سر العالمین کہ آں را بامامِ غزالی نسبت کنند و علیٰ ہذا القیاس کتب بسیار تصنیف کردہ اند و بہر یک از معتبرین اہل السنت نسبت نمودہ اند و کسی کہ بکلام آں بزرگ آشنا باشد و مذاقِ سخن عبرا دامتیاز و تفرقہ نماید کمیاب می باشد، ناچار عوام طلبہ دریں مکر غوطہ خورند و خیلے سراسیمہ و حیراں شوند۔ (تحفہ اثنا عشریہ صـ۴۰)

مثل کتاب "سر العالمین" کے جس کو امام غزالی کی طرف نسبت کرتے ہیں اور علیٰ ہذا القیاس بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں اور اہل السنت کے معتبر علماء کرام میں

سے ہر ایک کی طرف ایسی اختراعی کتابوں کی نسبت کی ہے اور چونکہ ہر شخص اس بزرگ کے کلام سے آشنا نہیں ہوتا اور اس کے مذاق سخن کو دوسرے لوگوں کے مذاق سخن سے جدا اور ممتاز نہیں کر سکتا، لہذا ناچار، عام طلبہ اس مکر میں غوطے لگانے لگ جاتے ہیں۔ اور بہت زیادہ حیران و سرگرداں ہوتے ہیں۔

اقول: یہ طریقہ واردات صرف علماء اکابر کے ساتھ نہیں بلکہ ائمہ کرام کے ساتھ بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ جو کچھ وہ مجمع عام میں اور خطبات میں فرماتے اس کو زمانہ سازی اور پردہ داری اور عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا بہانہ قرار دیتے ہیں اور اپنی طرف سے روایات گھڑ کر ائمہ کی طرف منسوب کر کے اسے ان کا اصلی اور باطنی عقیدہ قرار دیتے ہیں اور اسی غرض سے مستقل چور دروازہ تقیہ والا ایجاد کیا ہے۔ اللّٰھمّ انا نجعلك فی نحورھم ونعوذ بك من شرورھم۔

امام غزالی سید نعمۃ اللہ الموسوی الجزائری کی نظر میں

اگر علامہ ڈھکو صاحب نے اپنے علماء مذہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو پھر بھی ایسی جرأت نہ کرتے اور "سر العالمین" جیسی کتاب سے استدلال نہ کرتے۔ شیعی فاضل سید نعمت اللہ الجزائری نے صوفیاء کرام پر جرح و قدح کرتے ہوئے حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کے متعلق اپنے غیظ و غضب اور بغض و عناد کا خوب اظہار کیا اور ان کی تالیفات معروفہ کے حوالہ جات سے شیعہ کے خلاف اُن کے تاثرات کو مفصل طریقہ پر بیان کیا۔ چنانچہ جزائری صاحب نے کہا:

۱۔ احیاء العلوم میں امام غزالی نے لکھا ہے: قد انکشف له فضل ابی بکر علی امیر المومنین علی علیه السلام کہ ان کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہونے کا کشف ہوا، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حقیقت اُن پر منکشف کی گئی۔

۲۔ اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" جو کہ انہوں نے درس و تدریس کے ترک

کرنے اور مجاہدات و ریاضات میں بیس سال تک مشغول رہنے کے بعد تالیف کی، اس میں انہوں نے تشیعہ کا رد کیا اور ان کے عقیدۂ عصمتِ ائمہ کو باطل قرار دیا اور اس میں مذہبِ امامیہ کے بطلان کا کشف ہونے کی تصریح کی ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

وانکشف له بطلان مذهب الامامیه بعد ان ترک التدریس وانقطع فی دمشق ومکة المکرمة نحواً عن عشرین سنة ملازماً للخلوة فی آخر عمره وصنف کتاباً سماه المنقذ من الضلال یتضمن الرد علی من یدعی العصمة والابطال لمذهبهم۔

۳۔ امام غزالی علیہ الرحمہ نے بار بار احیاء العلوم وغیرہ میں روافض کا ذکر آنے پر لکھا: قالت الرافضة خذلهم الله تعالیٰ۔ رافضیوں نے اس طرح کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل و رسوا کرے۔

۴۔ احیاء العلوم میں ہی انہوں نے لکھا کہ اگر کوئی رافضی ہمارے پاس آئے، اور کسی شخص پر قتل کا الزام عائد کرے اور اپنے لیے بدلہ لینے کا استحقاق ثابت کرے تو ہم کہیں گے کہ تیرا اپنا قتل کیا جانا حلال ہے، تو دوسرے سے قصاص کا طلبگار کیونکر ہو سکتا ہے؟ قال فیه انه لو جاء الیه رافضی وادعی انه لطلب دم عند احد قلنا ان دمك هدر۔ (انوار نعمانیہ جلد ثانی ص ۲۸۵، ۲۸۶)

کتاب سر العالمین علامہ جزائری کی نظر میں

حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کے متعلق شیعہ کے عظیم محدث کا نقطۂ نظر معلوم کر لینے کے بعد اب اس کتاب کے متعلق اس کی رائے معلوم کریں:

نعم ربما نسب الیه کتاب یسمی سر العالمین فیه مقالة یظهر منها میله الی الحق ونطقه به لیکون حجة علیه وبعضهم انکر کون الکتاب له او ان المقالة الملحقة بالکتاب۔

(انوار نعمانیہ جلد ثانی ص ۲۸۶)

ہاں بعض دفعہ اُن کی طرف ایک کتاب کی نسبت کی جاتی ہے جو کہ سر العالمین کے نام سے موسوم ہے، اس میں ایک مقالہ ہے، جس میں ان کا حق کی طرف یعنی مذہبِ شیعہ کی طرف میلان اور اس کے ساتھ تعلق ظاہر ہوتا ہے تاکہ اس پر حجّت و بُرہان بنے اور بعض علماء نے اس کتاب کا غزالی کی تصنیف ہونے کا انکار کیا ہے اور یا یہ کہ یہ مقالہ الحاقی ہے، یعنی اسے روافض نے اپنی طرف سے لکھ کر کتاب میں درج کر دیا ہے

جزائری صاحب کا انتقال ۱۱۱۲ھ میں ہوا ہے اور انھوں نے اس کتاب کی نسبت کا مشکوک ہونا اپنے قول "بما نسب الیہ کتاب ......" سے ظاہر کر دیا، کیونکہ فعلِ مجہول کے ساتھ نسبت کی تعبیر اس نسبت کے ضعیف اور ناقابلِ اعتماد و اعتبار ہونے کی دلیل ہے اور متداول کتب اور معروف و متواتر مؤلفات و مصنّفات سے روافض کا رد اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہونے کا عقیدہ نقل کر کے بتلا دیا کہ ان کا حقیقی اور واقعی مذہب جو ان متداول و معروف کتابوں میں ہے، وہ رفض و تشیع کے رد و ابطال پر مبنی ہے اور جس کتاب میں روافض اور اہلِ تشیع کے موافق عبارت موجود ہے۔ وہ ساری کتاب یا اس کا وہ مقالہ من گھڑت ہے اور ناقابلِ انتساب اور وہ لائقِ اعتماد و اعتبار نہیں ہے۔ ایسی صورت میں آپ ڈھکو صاحب کو داد دیں، جو پندرھویں صدی میں پھر اسی رسوائے زمانہ غیر معتبر اور ناقابلِ قبول کتاب سے استدلال پیش کر رہے ہیں اور بالکل خوفِ خدا اور شرمِ خلق سے بے نیاز ہو کر۔

الغرض ڈھکو صاحب کا امام غزالی علیہ الرحمہ پر یہ بہتانِ عظیم ہے اور اس کو حقیقت اور واقعہ سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے اور نہ ان کی متواتر و معروف کتابیں اس کی تائید کرتی ہیں، بلکہ جس طرح سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول شاذ اور مشہور حدیث میں تعارض ہو تو اعتبار مشہور کا ہوگا نہ کہ شاذ کا۔ اسی طرح امام غزالی علیہ الرحمہ کی طرف منسوب اس شاذ بلکہ موضوع و مَن گھڑت عبارت کا ان مشہور و متداول کتب کے اندر بصراحت مذکور عقائد و نظریات کے مقابل کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟

ڈھکو صاحب کی بے اصُولی

تفسیر حسن عسکری کے حوالہ کا جواب دیتے ہوئے ڈھکو صاحب نے کہا تھا کہ اس کتاب کی نسبت حضرت امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ کی طرف مشکوک ہے، لہٰذا جب تک اس کے مندرجات کی تائید و تصدیق دوسری صحیح اور مستند روایات سے نہ ہو جائے اس وقت تک اس کے مندرجات سے استدلال و استشہاد درست نہیں ہے لیکن جو قاعدہ اور ضابطہ اپنے لیے وضع کرتے ہیں اور اسے اصولِ مناظرہ قرار دیتے ہیں۔ اہلِ سنّت کے خلاف جوابی کارروائی میں اس کو بھُول جاتے ہیں بلکہ دیدہ دانستہ نظر انداز کر جاتے ہیں، حالانکہ ع ـــــ "ہرچہ برائے خود نہ پسندی برائے دیگراں مپسند" مُسلّم قانون ہے۔ لیکن علامہ موصوف صرف چند ورق سیاہ کرنے کو ہی اپنا منتہائے مقصود قرار دیئے ہوئے ہیں، ہرچند سراسر بے اصولی پر ہی مشتمل کیوں نہ ہوں۔

حدیثِ قرطاس کی تیسری توجیہ کے جواب میں علامہ ڈھکو صاحب کی کیادی و مکاری

تیسری توجیہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے شیعی استدلال کے ابطال میں یہ ذکر فرمائی تھی کہ حدیث قرطاس میں اِیْتُوْنِیْ جمع کا صیغہ ہے جس میں گھر کے اندر موجود تمام افراد کو مخاطب ٹھہرایا گیا ہے۔ اس میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔ چلو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرما بھی دیا: حسبنا کتاب اللہ یعنی ہمیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم پر درد کا غلبہ ہے، لہٰذا اس دوران آپ کو تکلیف نہ دو۔ تو سوال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر عمل کرنا تھا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر؟ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے کاغذ اور قلم اور دوات پیش نہ کیے؟ انتہیٰ

اب علامہ ڈھکو صاحب کے جوابات اور اُن کا رد ملاحظہ فرمائیں،

شِق اوّل: اس کا پہلا جواب علامہ صاحب یہ دیتے ہیں کہ صیغہ "اِیتونی" ضرور جمع مذکر کا ہے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ اس میں داخل نہیں، بلکہ یہ خطاب ان کے لیے ہے جن کے گمراہ ہونے کا خدشہ تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ چونکہ ہادی و مہدی تھے اور کائنات کو صراطِ مستقیم پر چلانے والے تھے، لہذا ان کو یہ تحریر لکھوانے کی کیا ضرورت تھی؟ سبحان اللہ! کیا خوب جواب ہے۔ اس کو پڑھ کر ارسطو، افلاطون اور بوعلی سینا بھی دم بخود رہ جائیں۔ اقول وباللہ التوفیق!

۱۔ جس طرح حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تحریر لکھوانا چاہتے تھے، مگر اپنے فائدہ کے لئے نہیں، بلکہ لوگوں کی ہدایت اور بھلائی کے لیے، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی لوگوں کی ہدایت اور بھلائی کے لیے اس کو لکھوا لیتے۔ آخر دوسری کتابیں بھی تو لکھی ہوئی تسلیم کی جاتی ہیں جن میں ستّر ستّر ہاتھ لمبائی والے صحیفے بھی ہیں، تو وہ کس لیے ہیں؟ ہدایتِ خلق کے لیے یا گمراہی کے لیے؟

۲۔ اس ہادیٔ خلائق نے قرآن مجید کیوں لکھا تھا؟ اپنی ہدایت کے لیے یا لوگوں کی ہدایت کے لئے؟ جو مصلحت قرآن مجید کے لکھنے میں تھی، کیا وہی مصلحت یہاں موجود نہیں تھی؟ آپ خود تو بقولِ شیعہ ازلی مومن اور عارف تھے۔

۳۔ پھر سوال یہ نہ تھا کہ کس کی ہدایت مطلوب تھی؟ سوال یہ ہے کہ حکم کس کا تھا اور تعمیل کس نے نہیں کی؟ لیکن ثابت ہو گیا کہ کاغذ، قلم و دوات پیش نہ کرنے اور تعمیلِ ارشاد نہ کرنے میں سبھی برابر رہے ع این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔

۴۔ اگر اس عقیدہ و نظریہ کے تحت عملی طور پر تعمیلِ حکم نہ کرنا جائز تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی وہی کچھ کیا جو اس عقیدہ اور نظریہ کے تحت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا آپ نے ذرا اس عقیدہ و نظریہ کو ظاہر کر دیا اور حسبنا کتاب اللہ کہہ دیا۔ یعنی ہمیں ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے، لہذا ان کو بھی ضرورت نہیں تھی اور جن کو اللہ تعالیٰ نے الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم

الاسلام دیناً۔ کا مژدہ سُنایا، یعنی میں نے آج کے دن (نو ذوالحجہ کے دن) تم پر اپنی نعمت کامل و مکمل کر دی اور تمہارے لیے دینِ اسلام کو بطورِ دین پسند کیا، لہذا وہ تمام صحابہ کرام مستثنےٰ ہو جانے چاہئیں، تو پھر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور حکم کا مخاطب کس کو ٹھہرایا جائے گا، کیونکہ جن کی مغفرت و بخشش اور اُن کے اللہ تعالیٰ سے راضی ہونے اور اللہ تعالیٰ کے اِن سے راضی ہونے کا قرآن کریم گواہ ہے۔ وہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح مستثنےٰ ہی ٹھہریں گے۔

۵۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید و رسالت پر لبّیک کہنے کی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کیا ضرورت تھی؟ نعوذ باللہ اور کفّار کے ساتھ حرب و قتال کی نیز ہجرت وغیرہ کی، کیونکہ آپ تو پہلے سے مومن تھے اور بقولِ شیعہ حضرات پنجتن پاک، عالمِ ارواح و نورانیت میں اور روزِ اوّل سے ایمان واخلاص میں بھی برابر کے شریک تھے، لہذا یہ دعوت بھی دوسروں کے لیے تھی اور اس کی تعمیل بھی دوسروں کو کرنی چاہیے تھی۔ خدارا سوچیے اتنا لغو اور بیہودہ جواب دینے کی کوئی ہوشمند آدمی جرأت کر سکتا ہے ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جُنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

شِق دوم: علامہ ڈھکو صاحب نے کہا جب بڑے پروانہ رسالت نے آپ پر ہذیان کی تہمت لگا دی اور اکثریت نے ان کی ہاں میں ہاں ملا دی، تو اس تحریر کا فائدہ کیا ہو سکتا تھا؟ جواب کی یہ شق بھی کئی وجوہ سے لغو و باطل ہے اور سراسر کیادی و مکاری۔

۱۔ کیونکہ سوال یہ نہیں کہ اس کا فائدہ ہوتا یا نہ ہوتا۔ سوال صرف یہ ہے کہ ارشادِ نبوی کی تعمیل ضروری تھی اور وہ بمعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کسی کی طرف سے بھی نہ پائی گئی۔ رہا فائدہ ہونے کا معاملہ تو وہ قرآن مجید سے بھی ہر ایک نے نہیں اٹھایا، خود اہلِ اسلام میں ایسے فرقے ہیں جو قول باری تعالیٰ یُضِلُّ بِهٖ مَنْ يَّشَاءُ کے مطابق اس کی وجہ سے گمراہ بھی ہوتے ہیں، جس کو ڈھکو صاحب چاہیں، تو اپنی افتادِ طبع کے مطابق قرآن مجید کے نقصانات میں بھی شمار کر سکتے ہیں، مگر اس کا نازل کرنا سراسر حکمت اور یاد کرنا اور کرانا

اور جمع کرانا سب ہی اہم عبادات ہیں۔ لہٰذا زیادہ کے لیے نہ سہی، تھوڑوں کے لیے ہی کچھ تو اس سے فائدہ اُٹھاتے وقلیل من عبادی الشکور کے مطابق اہلِ حق کی تعداد کفار و مشرکین کے مقابل ہمیشہ تھوڑی رہی ہے، لہٰذا یہ کوئی صحیح توجیہ و تاویل عدم تعمیل کی نہیں ہو سکتی۔

حضرت نوح علیہ السّلام کے تبلیغی زمانہ کو دیکھو اور ان کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہونے والوں کی تعداد کو بھی دیکھو تو پھر کہہ دینا چاہیے کہ اتنی قلیل تعداد کے لئے اس قدر اور اتنا عرصہ تکلیف برداشت کرنے اور کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں جس طرح کفار کے "انك لمجنون" اے نبی کہلانے والو! بے شک تم تو مجنون ہو، کہنے کے باوجود آپ کے قرآن مجید اور کتابِ حکمت نے آپ کی حکمت و دانائی کے سکے بٹھا دیئے اسی طرح وہ تحریرِ مقدس اور اس کے فیوض و برکات، آپ کی حکمت اور دانائی کا نقش اہلِ عالم کے قلوب و اذہان پر مزید گہرا کر دیتی۔ کیا اس تحریر پر مترتب اس فائدہ اور انجام کار ہاتھ آنے والی برکات کو نظر انداز کرنے کی کوئی وجہ جواز ہو سکتی تھی؟ قطعاً نہیں کیونکہ نبی علیہ السّلام کا کام تھا تعمیرِ ملّت کی بنیاد رکھنا اور بعد ازاں وہ عمارت اُن کے غلاموں کے ہاتھوں رشکِ ثریا ہو جاتی، لہٰذا فوری مصلحت کو دیکھنا اور انجام و عواقب کو نہ دیکھنا منصبِ نبوّت و امامت کے سراسر خلاف ہے۔

۲۔ وہ تحریر بھی لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے پاس رکھ لیتے اور دوسرے رازہائے درونِ پردہ کی طرح اس کو بھی شیعہ حضرات پر منکشف کر دیا جاتا اور اُن کے ایمان کو لوہے کی لٹھ کی طرح مضبوط کر دیا جاتا اور اُن کو مومنین در مومنین بنا دیا جاتا۔ جب حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریری سندِ خلافت بلا فصل پر صریح اور غیر مبہم الفاظ میں ان کے پاس موجود ہوتی، تو اہل السنت کی روایات کا سہارا لینے کی ضرورت ہی نہ رہ جاتی اور کھینچ تان کر ان سے مطلب برآری کی تکلیف سے نجات حاصل ہو جاتی۔

۳۔ سارے مہاجرین و انصار نہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت کدہ پر موجود تھے اور نہ ہی مسجد شریف میں، لہٰذا جب وہ تحریر انصار کو دکھلا دی جاتی تو یقیناً

سقیفائی اور شورائی خلافت کا تیا پانچہ کیا جا سکتا تھا، کیونکہ جب وہ خود خلافت نہیں لے رہے تھے، تو حکمِ نبوی کی مخالفت کر کے اپنی دُنیا و آخرت کیونکر خراب کر سکتے تھے اور یہی وہ حضرات تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ مانا اور آپ کی خاطر بدری صحابہ طلحہ و زبیر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بھی جنگ کرنے سے گریز نہ کیا، جبکہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم پاس ہوتا، تو روزِ اول میں ہی جنگِ جمل والا منظر پیش آ سکتا تھا، لیکن افسوس ہزار افسوس مدّعی ہی سُست نکلا، یہ گواہ بچارے سوائے مکاری اور ہیرا پھیری کے کیا کر سکتے ہیں۔

۴۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نعوذ باللہ من ہذا البہتان حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہذیان کا الزام عائد کیا تھا، تو اب وہ حکیمانہ تحریر وصول کرنا اور سراسر مصلحت و منفعت پر مشتمل وہ وثیقہ حاصل کرنا مزید ضروری ہو گیا تھا تاکہ معترضین کا ناطقہ بند کیا جا سکتا اور اُس دَور کے لوگوں پر اور بعد میں آنے والی نسلوں پر ایسے لوگوں کے قلبی احوال کی نشان دہی کا ایک بیّن ثبوت ہوتا اور ان کے مقامِ نبوی سے بے خبر بلکہ اس کے مخالف ہونے کی قوی سند ہوتی، لیکن عملی طور پر ان کے ساتھ اتفاق کر کے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہی ان کے اس زعم کی تصدیق کر دی نعوذ باللہ یا کم از کم یہ امکان اور احتمال لوگوں کے دلوں میں راسخ کر دیا کہ ذاتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہذیان طاری ہو سکتا ہے اور ان کا ہر حکم ماننا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ بعض دفعہ اس کی مخالفت ضروری ہو جاتی ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ!

دعویٔ ہذیان درحقیقت ہذیان ہی ہے

یاد رہے کہ اہل السُنّت کی کسی کتاب میں قطعاً یہ مذکور نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کی طرف ہذیان کی نسبت کی تھی۔ آپ نے صرف خالص ہمدردی کی بناء پر مشورہ دیا: قد غلبه الوجع وعندكم كتاب الله۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر دَرد کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب موجود ہے، لہٰذا اس وقت آپ کو

یہ تکلیف نہ دی جائے، مگر بمطابق قولِ سعدی علیہ الرحمہ ؎

چشمِ بد بیں کہ برکندہ باد   عیب نماید ہنرش در نظر

ڈھکو صاحب اور جملہ شیعہ برادری کو سراسر خلوص و محبت پر مبنی یہ مشورہ اعتراض وانکار ہی معلوم ہوا اور جن لوگوں نے "أَهَجَرَ" کا لفظ استعمال کیا ہے، وہ استفہامِ انکاری کے طریقہ پر ہے "أهجر استفهموه" کیا آپ بلا مقصد یہ کلام فرما رہے ہیں -؟ اچھی طرح آپ سے سمجھ لو۔ اس عبارت سے اس توہم کا شدت اور سختی سے انکار کرنا مقصود ہے کہ آپ کی زبانِ اقدس پر بے مقصد کلام جاری ہو گیا ہو اور اس طرح کے استفہامِ انکاری کلامِ مجید میں بھی وارد ہیں، جیسے أليس منكم رجل رشيد تو اس میں صحیح الفکر اور صاحب الرائے شخص کے وجود کا انکار مقصود ہے اور قول باری تعالیٰ، هل من شركاءكم من يفعل ذالك۔ تو اس میں بھی اس امر کا انکار مقصود ہے، یعنی تمہارے مفروضہ معبودات میں کوئی بھی ایسے کام کرنے والا نہیں ہے
علاوہ ازیں اگر کسی جگہ کسی روایت میں استفہامی کلمہ بطریقِ صراحت مذکور نہیں تو مقدر ہے جیسے کہ قولِ ابراہیم علیہ السلام قرآن مجید میں منقول ہے کہ آپ نے ستارے کو دیکھا تو فرمایا "هٰذا ربی" پھر چاند کو دیکھا تو فرمایا، "هٰذا ربی" بعد ازاں سورج کو دیکھا تو فرمایا هٰذا ربی هٰذا اکبر۔ حالانکہ ظاہری طور پر اس کلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ان اقوال کے دوران مشرک ہونا لازم آتا ہے اور اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ پیغمبر کی ذات ابتدائے ولادت سے دعوائے نبوت تک کفر و شرک سے منزہ و مبرا ہوتی ہے، لہٰذا یہاں کلمۂ استفہام مقدر ماننا لازمی اور ضروری ہے۔ یعنی أهٰذا ربی۔ کیا یہ مرا رب ہے اور مقصد اس کی ربوبیت کا انکار ہے اور قرآن مجید محاوراتِ عرب کے مطابق نازل ہوا ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ استفہامِ انکاری میں بھی حرفِ استفہام کا مقدر ہونا معروف اور شائع و ذائع تھا، لہٰذا کسی صحابی پر بھی یہ اعتراض کرنا بالکل غلط ہے اور بہتان محض ہے۔ یہی تحقیق محققین علماءِ اسلام نے بیان فرمائی ہے جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اشعۃ اللمعات جلد چہارم صفحہ ۶۲۴ پر فرمایا، "ایں کلام محمول بر استفہام انکاری

است و اگر در بعضے روایات حرفِ استفہام مذکور نباشد مقدر است۔ یعنی یہ کلام استفہامِ انکاری کے معنی میں ہے اور اگر بعض روایات میں حرفِ استفہام مذکور نہیں ہے، تو صرف لفظ کے لحاظ سے محذوف ہے۔ نیت و ارادہ میں ہے اور ہر دو صورت میں معنی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے مقصد کلام نہیں فرما رہے، بلکہ اس کی تعمیل ضروری ہے اور یہ کلام بھی ان حضرات کی طرف سے بطورِ دلیل پیش کیا گیا جو اس وقت کاغذ اور قلم و دوات پیش کر کے تحریر حاصل کرنا چاہتے تھے تو وہ کس طرح ہذیان کی نسبت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر سکتے تھے اور دوسرا فریق محض ہمدردی اور اخلاص کی بنا پر اس شدید درد کی حالت میں آپ کو تکلیف دینے سے گریز کر رہا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت کر رہا تھا۔ ان کا قول تو صرف یہ تھا: قد غلبه الوجع وعندكم كتاب الله۔ اس کے یہ معنی کس لغت میں ہیں کہ آپ ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ العیاذ باللہ! بلکہ اس کا تو صرف اور صرف یہ معنی ہے کہ آپ پر درد کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس اللہ کی کتابِ ہدایت موجود ہے جس کی تفسیر و تشریح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرصۂ مدید اور زمانۂ بعید سے پڑھتے آ رہے ہو۔

نیز ان کے لیے اس اعتقادِ جازم اور یقینِ کامل کی کوئی صورت ہی نہ تھی کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اسی مرض اور تکلیف کے دوران وصال فرما جائیں گے بلکہ ان کی امیدیں اور آرزوئیں یہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کاملہ عاجلہ عطا فرمائے گا اور حسبِ سابق آپ سے تعلیم حاصل کر لیں گے اور وہ ضروری اور اہم امور معلوم کر لیں گے اور اگر لکھوانے ضروری ہیں، تو بعد میں لکھوا لیں گے۔

سوال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے، وہ وحیِ الٰہی سے ہوتا تھا، کما قال اللہ تعالیٰ، وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ لہٰذا یہ حکم فوری اہمیت کا حامل نہ ہوتا، تو آپ اس دوران درد و الم میں اس کو زبانِ اقدس پر کیوں لاتے؟

جواب: اگر آپ کا بولنا وحیِ الٰہی کے تابع ہے، تو آپ کا سکوت و اعراض

بھی اس کے مطابق ہے، وہ اس کے خلاف کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ نیز احکام صرف فرائض و واجبات میں ہی منحصر نہیں ہوتے مستحب اور اولیٰ و انسب بھی ہوتے ہیں اور ان کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے سوال کر لینا محل اعتراض نہیں ہو سکتا اور اگر حتمی اور لازمی امر ہوتا، تو آپ اس پر اصرار فرماتے لیکن آپ نے ان کے استفسار پر فرمایا: مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ میں جس حال میں ہوں، وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو، حالانکہ تحریر لازمی ہونے کی صورت میں آپ کی طرف سے یہ جواب نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ اس صورت میں یہ تحریر فرائضِ رسالت میں داخل ہوتی اور اس فریضہ کی ادائیگی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی جاتی۔

چوتھی توجیہ کے جواب میں ڈھکو صاحب کی حقائق پر پردہ پوشی

• حدیثِ قرطاس سے شیعی استدلال کے ابطال میں چوتھی وجہ حضرت شیخ الاسلام نے یہ بیان فرمائی تھی کہ فرض کر لیتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خلافت ہی لکھنا چاہتے تھے، گو اس کا ذکر روایت میں نہیں ہے، مگر جب آپ فرما رہے ہیں کہ میرے بعد خلیفہ بلافصل ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) ہوگا اور ان کے بعد حضرت عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) دیکھو تفسیر صافی، تفسیر قمی، تفسیر حسن عسکری اور دیگر تمام معتبر تفاسیر۔ تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کے حکم اور فرمان کے خلاف اور اپنے ارشادات کے خلاف کوئی دوسری خلافت بھی لکھ سکتے تھے۔

شقِ دوم: اس کے جواب میں ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کے متعلق خلافتِ حقّہ کا اظہار آپ نے نہیں فرمایا تھا بلکہ خود بخود ان کے خلافت و حکومت پر قابض ہو جانے کی خبر دینا مقصود تھا جیسے کہ خروجِ دجال کی خبر دی۔ نہ اس کو خلافت کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے ان کی خلافت کا برحق ہونا ثابت ہو سکتا ہے۔

الجواب: وعلی اللہ الاعتماد۔ علامہ ڈھکو حضرتِ صدیق و فاروق

(رضی اللہ عنہما) کے اعلانِ خلافت کو دجال کے خروج کے اظہار و اعلام کے مماثل قرار دے رہے ہیں، جو سراسر جھوٹ اور کذب بیانی ہے اور حقائق کو پردہ پوشی۔ ہم پہلے وہ آیتِ کریمہ پیش کرتے ہیں۔ پھر شیعی مفسرین کے اقوال پیش کر کے قارئین کے عدل و انصاف پر یہ فیصلہ چھوڑ دیں گے کہ آیا ان کی دیانت و امانت اور عدالت و انصاف یہی کہتے ہیں کہ یہ خلافت اسی قسم کی پیشگوئی تھی، جیسے خروجِ دجال کی خبر یا برحق خلافت کا اظہار و اعلام تھا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ارشاد فرمایا: واذ اسر النبی الی بعض ازواجہ حدیثاً فلما نبأت بہ واظہرہ اللہ علیہ عرف بعضہ و اعرض عن بعض قالت من انباءک ھذا قال نبأنی العلیم الخبیر۔ اور اس وقت کو یاد کرو، جبکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازواج میں سے بعض کو راز کی بات بتلائی، تو جب انہوں نے وہ آگے بتلا دی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پر مطلع فرما دیا، تو آپ نے اس میں سے بعض کے افشاء کے متعلق انہیں جتلایا اور بعض کے جتلانے سے گریز کیا۔ اُس نے دریافت کیا کہ آپ کو کس نے بتلایا؟ تو آپ نے فرمایا: مجھے ظاہر و باطن کا علم اور خبر رکھنے والے نے بتلایا ہے۔

اور قرآن مجید نے اس راز کے افشاء کرنے اور زوجہ محترمہ کو وہ راز بتلانے کی وجہ بھی بتلا دی کہ آپ اس بیوی کو خوش کرنا چاہتے تھے اور اسے رضامند کرنا چاہتے تھے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضاۃ ازواجک۔ یعنی اے نبی! آپ اس چیز کو اپنے اوپر کیوں حرام ٹھہراتے ہو؟ اور اس سے باز رہنے کی کیوں قسم کھاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال ٹھہرائی ہے۔ تم اس تحریم کے ذریعے اپنی بیویوں کو خوش کرنا چاہتے ہو اور اُن کی رضامندی کے طلب گار ہو۔

• اور اس روایت کے نقل کرنے میں تمام شیعی تفاسیر اور مفسرین متفق ہیں کہ

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے آپ پر حرام ٹھہرالیا تھا تاکہ حضرت حفصہ بنتِ عمر رضی اللہ عنہما راضی ہوجائیں، کیونکہ اُن کے گھر میں اور اُن کی باری میں حضور سرورِ عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماریہ قبطیہ کے ساتھ مباشرت فرمائی تھی، جس سے وہ غمزدہ ہوگئیں اور اس فعل کو اپنے حق اور احترام کے منافی سمجھا، لہٰذا آپ نے اُن کو خوش و خرم کرنے کے لیے حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو حرام ٹھہرایا اور ساتھ ہی اُنہیں یہ بھی بتلادیا: ان ابابکر یلی الخلافۃ من بعدی ثم ابوک ۔ تفسیر قمی ص۳۵۴ تفسیر صافی ص۲۳۴ ج۲ تفسیر منہج الصادقین ص۳۳۲ ج۹ تفسیر مجمع البیان ص۳۱۴ ج۵ وغیرہ ذالک ۔ یعنی میرے بعد خلیفہ بلا فصل ابوبکر صدیق اور پھر تمہارے باپ عمر فاروق رضی اللہ عنہما۔

اس پس منظر میں اس روایت کا صاف اور واضح مطلب و مفہوم یہی ہے کہ یہ امارت و خلافت اور حکومت و سلطنت اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشاء کے عین مطابق ہے نہ کہ اس کے منافی و مخالف اور غاصبانہ و ظالمانہ ورنہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے لیے اس میں خوشخبری کونسی ہوسکتی تھی اور ان کی دل جوئی اور رضامندی کے لیے بطورِ مژدہ اس راز کا انکشاف ان پر کیوں کیا جاتا، جس طرح دجال کا خروج و ظہور، ڈھکو صاحب اور اس کے ہم مشرب لوگوں کے لیے مژدہ و خوشخبری نہیں، حالانکہ غیبی خبر ضرور ہے۔ اسی طرح ظالمانہ اور غاصبانہ خلافت و امارت غیبی خبر تو ہوسکتی تھی، لیکن اس کو بطورِ مژدہ و خوشخبری سنانا اور اس کے ذریعے پریشان اور غمزدہ ام المومنین کو خوش کرنے کی سعی اور کوشش فرمانا، کسی بھی معقول انسان کے نزدیک درست نہیں ہوسکتا۔

الغرض کلامِ مجید اور احادیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سیاق و سباق اور پیش منظر اور پس منظر میں بہر حال شیخین (بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بھی بقول بعض شیعی مفسرین کے) خلافتِ حقہ اور امارت و سلطنتِ مطلقہ کی خبر دے رہے ہیں۔

علی الخصوص جب یہ حقیقت ذہن نشین رکھی جائے کہ جس طرح آج کے قرآن خوان کو یہ تجسس اور جستجو ہوتی ہے کہ وہ راز کیا تھا اور اس کا انکشاف حضور نبی اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس پر کیا اور اُس نے کس کو بتلایا۔ پھر جس قدر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے افشائے راز سے متعلق جتلایا، وہ کیا ہے؟ اور جس حصہ سے اعراض اور رُوگردانی فرمائی، وہ کیا ہے؟ تو لامحالہ اس دور میں ہر قرآن خوان کو یہ جستجو اور تجسس پیدا ہونا لازم تھا اور اس کے متعلقہ امور سے باخبر ہونے کی خواہش اور طلب ہر دل میں ضرور پیدا ہوتی ہوگی اور کونسا عقلمند انسان ہے جو یہ باور کرسکے کہ خواص اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مفسرین صحابہ اور علی الخصوص حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جیسی ہستیاں بھی اس سے بے خبر ہوں، بلکہ حتمی اور قطعی طور پر ان کو یہ تمام تفصیل معلوم ہونا لازم اور ضروری ہیں، بلکہ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت امیر رضی اللہ عنہ سے بیعت خلافت کے لیے ہاتھ بڑھانے اور یہ منصب بذاتِ خود سنبھالنے کے لیے عرض کیا گیا، تو آپ نے فرمایا میرا اس وقت بیعت لینا کچے پھل کو توڑنے اور غیر کی زمین میں کھیتی باڑی کرنے کے مترادف ہے اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس عہد کا پابند کیا گیا ہوں کہ میں ان خلفاء کی اطاعت کروں ـــــ لہٰذا ڈھکو صاحب کا یہ دعویٰ کہ خلافتِ شیخین کا اعلان و اظہار محض دجال کے خروج جیسی پیشین گوئی ہے۔ اسی صورت میں صحیح ہوسکتا ہے، جب خروجِ دجال کی پیشین گوئی اور غیبی خبر سے اُن کو بھی فرحت و شادمانی حاصل ہوسکے اور یہ خبر سُن کر اُن کے سارے غم و آلام دُور ہوجائیں، لیکن ایسی خبر اگر کسی کے لیے سوہانِ رُوح ہو اور وہ اسے سُن کر لرز اٹھے تو اس کی مسرت و شادمانی اور دل جوئی و رضامندی کے لیے اسے یہ خبر نہیں سنائی جاسکتی۔ بعینہٖ اسی طرح ظالمانہ اور غاصبانہ حکومت و خلافت جو ظالم و غاصب کے لیے عذاب الیم کی موجب ہوا کرتی ہے۔ اس کے ذریعے ظالم و غاصب کے عزیز و اقارب کو خوش نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان کو کوئی خوشی اور مسرت حاصل ہوسکتی ہے، لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ کم از کم حضور

سرورِ عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خلافت و امارت کو غاصبانہ اور ظالمانہ نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے ان کو بتلایا کہ وہ ظالمانہ حکومت ہوگی اور نہ آپ نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس لیے بتلایا تھا کہ وہ اس حکومت و خلافت کو ظالمانہ سمجھیں۔ ہاں شیعہ حضرات کو بالعموم اور ڈھکو صاحب کو بالخصوص کہیں دوسری جگہ سے الہام ہوگیا ہو اور یہ مخفی راز ان پر منکشف ہوگیا ہو تو ہم اس کا انکار نہیں کرسکتے، کیونکہ علم و آگہی کا دوسرا ذریعہ بھی موجود ہے۔ کما قال تعالیٰ ان الشیاطین لیوحون الیٰ اولیاءھم۔ بے شک شیاطین اپنے دوستوں اور احباء و اولیاء کی طرف وحی کرتے ہیں۔ لہذا اس امر کا یقین رکھنا ضروری ہے کہ ان حضرات کی طرف سے یہ دعویٰ سراسر الہامی ہے۔ اگرچہ ذریعہ اس کا سراسر شیطانی ہے، کیونکہ شیاطین کا اس خلافت کے خلاف سرگرم عمل ہونا ان کا فطرتی تقاضا تھا اور ان خلفاء راشدین نے اسلام کی ترویج و اشاعت اور تائید و تقویت کا اہتمام کرکے فارس کے آتش کدے ٹھنڈے کرکے اور صلیب کی پرستش ختم کرکے انہیں بہت دکھ پہنچایا تھا اور رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل بنائے ہوئے جھوٹے نبیوں کا صفایا کرکے ان کی ساری تدبیریں خاک میں ملا دی تھیں، لہذا وہ کس طرح اس خلافت کو بنظرِ تحسین دیکھ سکتے تھے اور ان کے لیے یہ حکومتِ الٰہیہ کیونکر قابلِ قبول اور قابلِ برداشت ہوسکتی تھی، لہذا انہوں نے انسانوں میں سے اپنے بھائی، دوست بلکہ محبوب و مطلوب تلاش کیے، اور اس خلافت کے متعلق اپنی بے چینی اور قلق و اضطراب سے انہیں آگاہ کرکے ان سے اپنے زخمی دلوں کی مرہم پٹی اپنے درد کا درماں طلب کیا اور ان حضرات نے دوستی اور قلبی تعلق کا حق ادا کرتے ہوئے وہ کارنامے سرانجام دیئے کہ خود شیاطین بھی سر پیٹ کر رہ گئے ہوں گے ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا   کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

تنبیہ: ہماری اس گزارش سے علامہ ڈھکو صاحب کے ایک اور دعوے یعنی شق اول کا کھوکھلا پن اور اس کی لغویت بھی واضح ہوگئی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے

کہ حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا کہ اگر سیدِ عرب و عجم صلی اللہ علیہ وسلم خلافت ہی لکھنا چاہتے تھے، تو وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت تھی، کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کے اعلام و اطلاع سے جان چکے تھے کہ میرے بعد خلیفہ بلافصل ابوبکر صدیق ہوں گے پھر حضرت عمر اور آپ بطورِ مژدہ و خوشخبری حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا پر اس کا انکشاف بھی کرچکے تھے، تو اپنے اعلان و اظہار اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کے برعکس آپ کوئی دوسری خلافت کیسے لکھ سکتے تھے۔ علامہ ڈھکو صاحب نے کہا پیر صاحب کا یہ قول: کلمۃ حق ارید بہا الباطل کے ضمن میں آتا ہے اور قیامت تک آپ کا یہ مقصد ثابت نہیں ہوسکتا کہ شیخین کی خلافت منشاء ایزدی کے مطابق ہے، حالانکہ آیتِ مبارکہ کے سیاق و سباق۔ قسم کھانے کے پس منظر سے اور اس کے بعد اپنی زوجہ محترمہ کی دلجوئی اور تسلی و اطمینان کے لیے خلافتِ فاروقیہ کا مژدہ سنانے سے تو لازمی طور پر یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خلافت منشاء ایزدی کے عین مطابق تھی اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی منشاء و مرضی کے بالکل مطابق، کیونکہ اسی پر دینِ اسلام کا راسخ اور مستحکم ہونا موقوف تھا اور ترویج و ترقی پانا اور اطراف و اکناف عالم میں پھیلنا وغیرہ۔

اور یہی وجہ ہے کہ ابن ابی الحدید معتزلی شیعی کو اعتراف کرنا پڑا کہ اللہ تعالیٰ کا اسلام اور اہلِ اسلام پر خصوصی کرم اور لطف تھا کہ صحابہ کرام کو خلافت کی اس ترتیب کا الہام کیا۔ ورنہ   اسلام کبھی پھل پھول نہ سکتا اور قبل ازیں اس خلافت کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ عندیہ اور نظریہ بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ خلافت وہی خلافت ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض۔ الآیہ میں وعدہ فرمایا ہے لہذا اس پس منظر میں اس کا منشاء ایزدی اور مرضیٔ رسول کے مطابق ہونا روزِ روشن کی طرح واضح اور عیاں ہے اور حضرت قبلہ پیر صاحب کا یہ فرمان حقیقتِ واقعیہ کا بیانِ صداقت نشان ہے اور کیوں نہ ہو آپ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اولاد و امجاد سے ہیں۔ لہذا آپ ان کے نظریہ و عقیدہ سے کیونکر منحرف ہوسکتے ہیں، بلکہ الولد سر لابیہ

کے تحت آپ عقائد و نظریات کے لحاظ سے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے عقائد و نظریات کے امین تھے اور انہیں کو آپ نے بڑے مدلل انداز میں بیان فرمایا۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

شقِ سوم: علامہ ڈھکو صاحب کے جواب کی تیسری شق یہ تھی کہ پھر اہل سنت اس خلافت کو اجماعی اور شورائی کیوں قرار دیتے ہیں، نصی کیوں قرار نہیں دیتے؟ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ کو پہلے ابوبکر اور ان کے بعد حضرت عمر (رضی اللہ عنہم) کے خلیفہ بننے کی خبر دے دی تھی، لیکن جواب کی یہ شق بھی بوجوہ لغو اور باطل ہے اور بغض و عناد اگر کسی کو اندھا اور بہرہ کر دے، تو پھر اس کا کیا علاج ہے؟

۱۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ سرورِ انبیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برسرِ منبر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی خلافت کا اعلان کر دیا تھا تاکہ اس کو نصی خلافت قرار دیا جاتا، لیکن اس طرح کا اعلان عام نہ کرنے کے باوجود یہ تسلیم کیے بغیر بھی چارہ نہیں کہ آپ نے بطور راز داری جو کچھ بیان فرمایا، وہ بھی صرف آپ کا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا بھی ارشاد ہی تھا، کما قال تعالیٰ: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى کیونکہ آپ اپنی مرضی اور خواہشِ نفس سے نہیں بولتے، بلکہ آپ کی زبان پر وحیِ الٰہی اور کلام خداوند تعالیٰ جاری ہوتا ہے۔ علامہ صاحب ہی بتلائیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعلان عام کیے بغیر صرف دو تین خدام اور حاضرینِ مجلس کو جو کچھ بتلائیں اس کا اعتبار نہیں ہے اور اسے آپ کا ارشاد اور فرمان کہنا غلط ہے؟ اور وہ فرمان وحیِ الٰہی اور کلامِ خدا کہلانے کا حقدار نہیں ہے؟ ہاں اس کو نصی خلافت اس لیے نہیں کہتے کہ اس کی صورت یہ ہوتی کہ آپ عام اہلِ اسلام کے سامنے کسی صحابی کے خلیفہ ہونے کا اعلان کرتے اور انہیں اس خلیفہ کی اطاعت اور اتباع کا پابند اور مکلف ٹھہراتے لہٰذا بایں معنی نصی بھی نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی منشا اور مرضی کے مطابق بھی ہے۔

۲۔ نیز ہم اس خلافت و امامت کو اجماعی اور شورائی قرار دیتے ہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور پسندیدگی کو دخل نہیں، بلکہ رضاءِ خلق، رضائے خالق کا مظہر اور عنوان ہوا کرتی ہے، لہٰذا اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اجماع و اتفاق اور ان کی اس خلافت پر رضامندی بھی اللہ تعالیٰ کی منشاء اور مرضی کی مظہر ہے اور یہی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے، جس کا جواب دینے کی علامہ صاحب کو ہمت نہ ہوئی۔ آپ فرماتے ہیں:

انما الشوریٰ للمهاجرين والانصار فان اجتمعوا علی رجل وسموه اماما كان ذالك لله رضًى۔ نہج البلاغہ

یعنی شوریٰ اور انتخابِ خلیفہ کا حق مہاجرین اور انصار کے لیے ہے اور وہ جس شخص کو بھی باہمی رضامندی اور اتفاق و اتحاد سے خلیفہ نامزد کر دیں، تو وہی اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ امام اور خلیفہ ہوگا، لہٰذا یہ خلافت شورائی اور اجماعی ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے مطابق ہے اور اعلانِ عام نہ فرمائے جانے کی وجہ سے نصی نہ کہلائے گی، مگر بطور مژدہ اور خوشخبری اس ترتیبِ خلافت کا حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا پر اظہار ان حضرات کی خلافتِ الٰہیہ موعودہ اور خلافتِ حقہ کی دلیل بھی ہے۔ اس کے نص خلافت نہ ہونے سے اس کا بطلان اور خلافِ واقع ہونا کس طرح لازم آگیا یا ظالمانہ خلافت والا مفہوم کیسے اور کس طرح یہاں سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

شقِ چہارم: ڈھکو صاحب نے فرمایا کہ اعلانِ خلافت تو اتنا اہم تھا کہ اس کے بغیر تمام کارِ نبوت اکارت ہونے کا اندیشہ تھا: کما قال اللہ تعالیٰ: وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ۔ اور یہاں افشائے راز پر دل ٹیڑھے ہو رہے ہیں، لیکن یہ شق بھی سراسر دھوکہ بازی اور فریب کاری پر مبنی ہے اور بے بنیاد اور خلافِ حقیقت دعویٰ ہے۔

اس سے بڑی دشمنی اور عداوت بھی کوئی ہو سکتی ہے جو دوستی اور محبت کی آڑ میں سر انجام دی گئی ہے۔

۲۔ عن ابی عبد اللہ علیہ السّلام قال لما خطب الیہ قال انہا صبیۃ قال فلقی العباس فقال لہ مالی أبی باس فقال وماذاک قال خطبت الیٰ ابن اخیک فردنی اما واللہ لاعودن زمزم ولا ادع لکم مکرمۃ الاھدمتھا ولاقیمن علیہ شاھدین بانہ سرق ولاقطعن یمینہ فاتاہ العباس فاخبرہ وسألہ ان یجعل الامر الیہ فجعلہ الیہ۔

حضرت ابوعبداللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی اور منقول ہے کہ جب سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس نکاح کا پیغام بھجوایا تو انہوں نے فرمایا؛ امِ کلثوم ابھی بچّی ہے۔ تو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور فرمایا؛ مجھے کیا ہے؟ کیا مجھ میں کوئی عیب اور نقص ہے؟ آپ نے دریافت فرمایا؛ آپ کا مقصد کیا ہے؟ تو فرمایا میں نے آپ کے بھتیجے سے رشتہ طلب کیا ہے، لیکن انہوں نے میری التجا کو رد کر دیا ہے۔ بخدا! میں تم سے زمزم واپس لے لوں گا اور اس کے علاوہ تمہاری ہر مکرمت و بزرگی اور ساز و سامانِ فخر و ناز کو ختم کر دوں گا اور میں دو گواہ قائم کر کے کہ حضرت علی بن ابی طالب نے چوری کی ہے، اس کے دائیں ہاتھ کو کاٹ دوں گا۔ چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورتِ حال سے ان کو باخبر کیا اور اس نکاح کا معاملہ ان کے سپرد کرنے کا مطالبہ کیا؛ چنانچہ آپ نے حضرت ام کلثوم کا حضرت عمر کے ساتھ نکاح کا معاملہ حضرت عباس کے سپرد کر دیا اور انہوں نے زمزم کی سقایت اور یہ شرف برقرار رکھنے کے لیے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ کٹنے کے ڈر سے حضرت ام کلثوم کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نکاح کر دیا۔ وکذا فی الانوار النعمانیہ للعلامۃ الجزائری جلد اوّل ص۸۳ وکذا فی الشافی لعلم الہدیٰ ص۲۱۶)

اب اس افسانہ کو ملاحظہ کرنے کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق

کیا تاثر قائم ہوتا ہے؟ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شیری اور دلیری اور اسد اللّٰہی شان کے متعلق کیا تاثر قائم ہوتا ہے؟ اور تمام بنو ہاشم اور بنو عبد مناف کے متعلق کیا تاثر قائم ہوتا ہے؟ امام حسین رضی اللہ عنہ کو ہر حیلہ و بہانہ کے باوجود بیعت کے لیے نہ جھکایا جاسکا اور شیرِ خدا رضی اللہ عنہ کو رشتہ دینے کے لیے خالی دھمکی دے کر جھکا لیا گیا اور آپ کے اس کے اس فرمان اُلمنیۃ ولاالدنیۃ کی دھجیاں اڑا دی گئیں کہ موت قبول کی جاسکتی ہے، مگر ذلّت قبول نہیں کی جاسکتی۔ کوئی معقول شیعہ عالم ہے جو مظلومِ کربلا سیّد الشہدا کے عمل اور علی مرتضےٰ شیرِ خدا رضی اللہ عنہما کے اس عمل و کردار میں تطبیق دے سکے اور باپ بیٹے بلکہ امامِ اوّل اور امامِ ثالث میں وحدتِ فکر ثابت کر سکے۔

تزویج اُمِّ کلثوم کی وجہ سے حضرت علی کی حضرت عبّاس پر ناراضگی

قاضی نور اللہ شوستری صاحب فروعِ کافی کی اس دوسری روایت میں مزید رنگ بھر کر اسے ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں؛

۳۔ در کتاب استغاثہ وغیرہ منقول است کہ چوں عمر بن الخطاب بجہت ترویج خلافت فاسدہ خود داعیۂ تزویج امِ کلثوم دخترِ حضرت امیر نمود و آں حضرت جہت اقامتِ حجت امتناع نمود، آخر عمر عباس را نزدِ خود طلبید و سوگند خوردہ گفت اگر علی را بدامادیٔ من راضی نہ سازی آنچہ در دفعِ او ممکن باشد خواہم کرد و منصبِ سقایتِ حج و زمزم را از تو خواہم گرفت عباس ملاحظہ نمود کہ اگر ایں نسبت واقع نشود آں فظ غلیظ مرتکب چناں امر ناصواب خواہد شد۔ از حضرت امیر علیہ السلام التماس و الحاح نمود کہ ولایتِ نکاح آں مطہرہ مظلومہ را باو تفویض نماید و چوں مبالغۂ عباس در آں باب از حد گزشت۔ آں حضرت از روئے اکراہ ساکت شدند تا آں کہ عباس از خود ارتکابِ تزویج او نمود و جہت اطفاء نائرہ فتنۂ اورا باں منافق ظاہر الاسلام عقد فرمود و ظاہراً بواسطۂ ایں وکالت فضولی و امثال آں حضرت امیر علیہ السلام عباس را مانند دیگر یارانِ فدائی خود راسخ در محبت و اخلاص نمی دانست۔ (مجالس المومنین جلد اوّل ص۱۸۲)

کتابِ استغاثہ وغیرہ میں منقول ہے کہ جب عمر بن الخطاب نے اپنی خلافتِ فاسدہ کی ترویج و ترقی کے لیے حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اُمِّ کلثوم

ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) میرے بعد امورِ سلطنت کے مالک ہوں گے۔
(وکذا فی التفسیر الصافی نقلاً عن مجمع البیان - جلد ثانی صـ ۲۳۴)

ب: قولہ تعالیٰ: واذ اسر النبی الی بعض ازواجہ حدیثا سخنے راکہ تحریم ماریہ است وحکومت ابوبکر وعمر بعد از و (رتا) عرف بعضہ واعرض عن بعض شناسا گردانید پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام برخے ازاں حدیث را بحفصہ وخبر داد او را از افشاء بعض آنکہ آں تحریم ماریہ است یعنی باو گفت کہ قصۂ تحریم ماریہ کہ باسرار آں امر نمودہ بودم، تو افشاء آں نمودی و اعراض کرد رسول از بعض دیگر یعنی حکومت ابوبکر و عمر بن خطاب وتعریف افشاء آں نکرد۔ (منہج الصادقین جلد ۹ صـ ۳۴۲)

اس عبارت کا بھی معنی و مفہوم وہی ہے، جو مجمع البیان والی عبارت کا ہے اور ذکر کیا جا چکا ہے۔

الغرض اگر ان حضرات کی حکومت و امارت اور خلافت و امامت کے انکشاف پر قول باری تعالیٰ: فقد صغت قلوبکما میں ناراضگی کا اظہار کیا گیا ہوتا، تو اس کو ذکر کیا جاتا اور علی الخصوص شیعی مفسرین تو لازماً اس کو درمیان میں لانے کی سعی کرتے۔ جب قرآن مجید اور احادیثِ نبویہ کی شہادت سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس انکشاف و اظہار کو کلیۃً نظر انداز کر دیا گیا اور اس پر کسی قسم کی سرزنش تو کیا گلہ ہی نہیں دیا گیا، تو ڈھکو صاحب کو یہ انکشاف کہاں سے ہو گیا کہ اس خلافت کے انکشاف پر زلزلے طاری ہونے لگے ہیں؟ کیا وہی ذریعہ الہام ہے جو قول باری تعالیٰ "ان الشیاطین لیوحون الی اولیاءھم" میں بیان کیا گیا ہے؟ یقیناً صرف اور صرف وہی ذریعۂ انکشاف ہے۔

۳- بلکہ حقیقتِ حال یہ تھی کہ سوال یہ نہیں تھا کہ کیا بیان کیا اور کیا بیان نہیں کیا؛ تھوڑا کیا یا زیادہ بیان کیا۔ سوال صرف یہ تھا کہ تم نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہو اور امہات المومنین تمہارا لقبِ امتیاز اور طرۂ امتیاز ہے، لہٰذا تمہارا عمل و کردار

بھی اسی طرح اعلیٰ وارفع ہونا چاہیئے اور جن کے صدقے تمہیں عزت و کرامت نصیب ہوئی ہے۔ ان کے احکام کی مکمل تعمیل ہونی چاہیئے۔ لہٰذا افشاءِ راز کرنا اور راز کو راز نہ رکھنا تمہارے جیسے مقام و مرتبہ کی مالک عورتوں کو زیب نہیں دیتا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی تعلیم و تربیت تھی، اور ان کے اخلاق و اعمال کی تہذیب و تزئین، نہ کہ ان کی مذمت۔ لیکن یہ صرف شیعی ذہن کا فتور تھا کہ اس تعلیم و تربیت اور تادیب و تہذیب کو خلافت میں تنقیص و تنقید کا سبب بنا لیا اور اس کو غاصبانہ اور ظالمانہ خلافت فرض کر لیا اور یہ صرف سبائی ذہنیت کی ہی کارستانی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ افشاءِ راز خواہ وہ جیسا بھی ہو، مناسب نہیں ہوتا، نہ یہ کہ واقعہ کے مطابق اور برحق ہو تو اس کا افشاء درست ہو گا اور خلافِ واقعہ اور ناحق ہو تو اس کا افشاء ممنوع ہوتا ہے۔ لہٰذا ان غیر معقول سوالات کے بحمد اللہ معقول جواب آ چکے ــــ فھل من مدکر۔

۴- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ فرمایا تھا: ان ابا بکر یلی الخلافۃ من بعدی ثم ابوك۔ اس کا ترجمہ یوں کرنا کہ وہ خود بخود قابض ہو جائیں گے اور خلافت کو غصب کر لیں گے، یہ کس لغت اور کس محاورہ کے لحاظ سے ہے اور برحق خلیفہ بننے کی خبر دینا ہو تو اس کے لیے کونسی تعبیر متعین ہے؟ کسی جملہ سے قائل کی مراد متعین کرنے کی صورت یہی ہوتی ہے کہ اس کے ظاہری اور متبادر الی الفہم معنی کو دیکھا جائے اور ظاہر و متبادر بالکل وہی ہے، جو ہم نے بیان کیا اور حضرت شیخ الاسلام نے بیان فرمایا اور شیعی معنی نہ اس جملہ سے متبادر الی الفہم اور نہ اس پر کوئی قرینہ قائم ہوا، لہٰذا وہ سراسر تحریف ہے۔

۵- اگر امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مرضِ وصال میں انتقالِ اقتدار فرما دیتے، تو ان خلفاء کے لیے یہ موقعہ فراہم نہیں ہو سکتا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل میں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ نے عملی طور پر اقتدار منتقل کر کے خلافت مرتضویہ کا تحفظ کیوں نہ کیا اور اس میں آپ نے اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشاء کے مطابق

عمل فرمایا یا ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کی مرضی اور منشاء کے مطابق؟ اور آپ نے اپنا فریضہ یعنی حقدار کو اس کا حق مہیا کرنے کا کیوں نہ ادا فرمایا اور اس موقعہ پر ان کی جانشینی کا اعلان کیوں نہ فرمایا؟

۶۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے پاس کوئی فوج و سپاہ نہیں تھی اور نہ ہی وہ ایسے عظیم قبیلہ کے فرد تھے، جو امر خلافت میں ان کی امداد و اعانت کا حق ادا کرتے جس سے انہوں نے خود بخود خلافت و حکومت پر قابض ہونا تھا، بلکہ ان کی خلافت و امامت کا دار و مدار اہلِ حل و عقد کی بیعت پر تھا اور وہ مہاجرین و انصار تھے اگر وہ حضرات ان کی بیعت نہ کرتے، تو یہ خلیفے اور امام نہیں بن سکتے تھے، اس لیے ماننا پڑے گا کہ ان کو تو والی اور حاکم بنایا گیا تھا نہ کہ خود بخود بنے تھے، لہذا اگر یہ معنیٰ کیا جائے، جو ڈھکو صاحب نے کیا ہے، تو حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب لازم آتی ہے۔

علاوہ ازیں خلافت و امامت کا بذریعہ شوریٰ انعقاد پذیر ہونا درست ہے، تو ان حضرات کی خلافت برحق ثابت ہوگئی اور نہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی باطل ہوگئی، کیونکہ وہ بھی نص سے نہیں، بلکہ اسی شوریٰ اور مہاجرینؓ و انصار کے انتخاب سے منعقد ہوتی تھی۔ بیعت کرنے والے نہ پہلے کسی نص کو جانتے تھے اور نہ بعد میں —————— انہوں نے کسی نص کے ذریعے حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کی خلافتِ حقّہ کو تسلیم کیا، بلکہ محض شورائی و اجماعی ہونے کی وجہ سے ہی اس کو برحق تسلیم کیا۔ لہذا یا تو چاروں خلافتیں برحق تسلیم کرنی پڑیں گی یا چاروں باطل، پھر اس تفریق کی وجہ جواز کوئی نہیں ہو سکتی۔

۷۔ جن لوگوں نے پہلے غصب کرانے میں خلفاء ثلاثہ کا مکمل تعاون کیا اور بعد ازاں بھی اسی نظریہ پر قائم رہے کہ ان کی خلافتِ برحق تھی اور اس کا از روئے شوریٰ و انتخاب انعقاد پذیر ہونا بالکل درست تھا، وہ مومن رہے یا مرتد ہو گئے؟ اگر مومن رہے، تو خلافتِ بلا فصل کا عقیدہ رکنِ اسلام نہ رہا۔ اندریں صورت اس

پر کارِ نبوت کا توقف اور دار و مدار کیونکر ہو سکتا ہے اور خلافتِ مرتضوی کا اعلان نہ کرنے سے سب کارِ نبوت اکارت کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور اگر مرتد ہو گئے تھے العیاذ باللہ! تو ان سے تعاون اور استمداد کا کیا جواز؟ نیز ان کو خوش کرنے کے لیے شیخین کی تعریف و توصیف بھی کرتے رہنے کا کیا جواز ہوگا، حالانکہ قبل ازیں متعدد حوالہ جات سے یہ حقیقت ثابت کی جا چکی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ علی الاعلان برسرِ منبر حضرات شیخین کو ساری امت سے افضل قرار دیتے تھے۔ وغیر ذالک۔

۸۔ علامہ ڈھکو صاحب کے بقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں کہ وہ از رہِ ظلم و تعدّی خلافت پر قابض ہو جائیں گے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرمائیں وہ خلافت، خلافتِ موعودہ ہے اور خلافتِ الٰہیہ، تو اس صورت میں رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں سے کس پر فتویٰ لگایا جائے گا؟ اور شیعہ حضرات ان میں سے کس کو صادق اور کس کو کاذب کہیں گے؟ نعوذ باللہ من ذالک کیا منصبِ امامت پر فائز شخص تصدیقِ رسول کا پابند نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے نبی کی تکذیب کرنا جائز ہے؟ العیاذ باللہ!

کیا ہیں ان معقول سوالات کے معقول جوابات کسی معقول شیعہ کے پاس؟ قطعاً نہیں، بالکل نہیں۔ انفرادی طور پر کجا، اجتماعی طور پر بھی ممکن نہیں ہیں۔

علماءِ شیعہ کی عداوتِ شیخین میں ہوش و خرد سے بیگانگی

شیعی مفسر قمی اور محسن کاشانی رقمطراز ہیں کہ جب خلافت کے متعلق یہ راز فاش ہو گیا اور ابوبکر صدیق اور عمر فاروق (رضی اللہ عنہما) کو معلوم ہو گیا کہ واقعی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "ان ابا بکر یلی الخلافۃ من بعدی ثم ابوک۔" تو انہوں نے دو آدمی دوسرے ساتھ ملا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کھلانے اور شہید کرنے کا پروگرام بنایا۔

فاجتمعوا اربعة على ان يسموا رسول الله صلى الله عليه وسلم فنزل جبرئيل عليه السلام بهذه السورة (الى) عرف بعضه اى اخبرها وقال اخبرت بما اخبرتك وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ لم يخبرهم بما علم مما هموا به من قتله۔ (تفسیر قمی مع تفسیر حسن عسکری۔ ص۳۵۴)

یعنی جب چار آدمیوں نے آپ کو زہر دے کر شہید کرنے کا پروگرام بنایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی (تا)، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض حصہ کے متعلق حضرت حفصہ (رضی اللہ عنہا) کو جتلایا اور باز پرس کی کہ تو نے آگے کیوں بتلایا، جو میں نے تجھے بتلایا تھا اور بعض سے چشم پوشی فرمائی یعنی یہ جان کر بھی کہ انہوں نے میرے قتل کا ارادہ کیا تھا، انہیں اپنے جان لینے اور اللہ تعالیٰ کے جتلانے کا ذکر نہ کیا۔ (تفسیر صافی جلد دوم ص۲۳۴)

اقول: اس اضافہ میں کئی وجوہ سے سقم ہے جو اس کے سراسر افترا اور بہتان ہونے کی بیّن دلیل ہے۔

۱۔ جب انہیں معلوم ہو چکا کہ خلافت مل جائے گی، تو پھر آپ کو زہر کھلانے اور شہید کرنے کا پروگرام بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہاں یہ علوم نہ ہوتا، تو ہاتھ پاؤں مارنے اور حیلوں وتدبیروں سے کام لینے کی ضرورت پڑتی علی الخصوص جبکہ ڈھکو صاحب کے نزدیک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ راہب کی اس پیشگوئی کی وجہ سے ہی اسلام لائے تھے کہ تم اس رسول کے خلیفہ بنو گے، تو اس علم کے مطابق پروگرام بنا لیتے۔ اب اس تاخیر سے اور آپ کے اطلاع دینے کے بعد یہ پروگرام بنانے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔

۲۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل اور زہر خورانی کا منصوبہ اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کیا اتنا معمولی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان لوگوں کو توبہ کرنے کا حکم نہ دیا اور صرف حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ کو

حضرت ماریہ قبطیہ (رضی اللہ عنہن) کی تحریم کی خبر دینے پر توبہ کا حکم دیا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہ ان کو گلہ دیا اور نہ دوسرے مخلص صحابہ کو اس غلط اقدام کی اطلاع دی اور نہ ہی ایسے لوگوں سے تعلقات توڑے، نہ ان کی بچیوں کو طلاق دے کر فارغ کیا تاکہ لوگوں کو ان کے تعلقات اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تقرّب کی وجہ سے مغالطہ نہ لگے، تو کیا کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبّت ہے، اس کے تحت اس امر کو نظر انداز کیے جانے کے قابل سمجھ سکتا ہے؟ اور خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے بھیانک جرم کو جس کا تعلق نبی ورسول کی شہادت وقتل سے تھا، قابلِ عفو ودرگزر سمجھ سکتے تھے؟

۳۔ نیز جب خلافت کے خواہشمندوں کے عزائم آپ کو معلوم ہو چکے اور ان کے ایسے مکروہ ارادے آپ پر واضح ہو چکے تھے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عملی طور پر خلافت سونپنا اور اپنی ظاہری زندگی میں اقتدار کو منتقل فرما دینا زیادہ ضروری اور لازم ہو چکا تھا، لیکن آپ نے اس سے اعراض اور روگردانی کر کے گویا عملی طور پر خلافتِ مرتضوی کا راستہ مسدود کر دیا، لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات عداوتِ شیخین میں ہوش و خرد اور عقل وفہم سے بالکل بیگانے ہو چکے ہیں اور ان کی سوچ اور فکر کی صلاحیتیں ہی ختم ہو کر رہ گئی ہیں، ورنہ بقائمی ہوش وحواس اس قسم کی روایات کیونکر گھڑی جا سکتی ہیں۔

اُمّ المومنین حضرت حفصہ کی عداوت میں بے حیائی کی انتہا

(ب) قمی صاحب اور محسن کاشانی صاحب لکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے حرام ٹھہرانے کے بعد فرمایا: انا افضى اليك سرًّا فان انت اخبرت به فعليك لعنة الله والملائكة والناس اجمعين فقالت نعم ما هو؟ قال ان ابابكر يلى الخلافة من بعدى ثم من بعده ابوك قالت من انباءك هذا قال نبأنى العليم الخبير (تفسیر قمی مع العسکری ص۳۵۴/ تفسیر صافی جلد دوم ص۲۳۴)

یعنی میں ایک راز تیرے تک پہنچانے لگا ہوں اور اس کا افشا کرنے والا ہو پس اگر تو نے اس کی کسی کو خبر دی، تو تجھ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوگی۔ اس کے تمام فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی۔ تو انہوں نے کہا ہاں ٹھیک ہے! فرمائیے وہ راز کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: بے شک میرے بعد ابوبکر والیٔ خلافت ہوں گے اور اس کے بعد عمر۔ تو انہوں نے دریافت فرمایا آپ کو اس کی اطلاع کس نے دی؟ تو فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے، جو ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے۔

اقول: اس روایت میں بھی کئی وجوہ سے افترا اور بہتان واضح ہوتا ہے۔

۱۔ حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا شرعی احکام سے ہٹ کر ان کو ایسے راز کے تحفظ کا مکلف ٹھہرانا، جس کے افشاء و اظہار پر ان کو اس قدر شدید لعنت کا حقدار بننا پڑے، کونسی رحمت کا مظاہرہ ہے؟ اور ان کے لیے کونسی خوشخبری کا موجب ہوسکتا ہے، جبکہ عورتوں کے طبعی ضعف اور صبر و تحمل کی قلت کا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے حکیم اور معلمِ حکمت سے بڑھ کر کس کو اندازہ ہوسکتا ہے؟

۲۔ راز افشاء کرنے کے باوجود اور ایسی شدید و مغلظ لعنت کے حقدار ہونے کے باوجود ان کو امہات المومنین میں شامل رکھنا اور زوجہ بنا کر رکھنا خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کتنا شدید اور غلط تاثر پیدا کرسکتا ہے؟ اور لوگوں کی نظروں میں آپ کا مقام کیا چھوڑے گا؟ کیا فخرِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسی بیویوں کا انتخاب کر رکھا تھا؟ العیاذ باللہ

۳۔ یہ خبر دینے پر کہ میرے بعد ابوبکر صدیق خلیفہ ہوگا اور پھر عمر فاروق، یہ سوال کرنا کہ تمہیں کس نے اطلاع دی ہے، اس کا کیا موقعہ محل ہوسکتا ہے؟ کیا ایسی غیبی خبروں کی اطلاع دینے والا اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی ہوسکتا تھا؟ اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن اس سے بے خبر ہوسکتی تھیں، لہٰذا اس صورت میں اس سوال کا کیا مطلب ہوسکتا تھا؟ الغرض ہر طرح تحریف ہی تحریف مطمحِ نظر معلوم ہوتی ہے۔

۴۔ من انباءك هٰذا اور نبأني العليم الخبير کو ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی خلافت کی اطلاع کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے، حالانکہ قرآن مجید اس راز کو فاش کرنے کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہار پر ان کا یہ سوال نقل کر رہا ہے، کیونکہ اس وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے بھی آپ کو اطلاع دیئے جانے کا امکان تھا، جنہیں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے یہ راز بتلا دیا تھا، لہٰذا آپ کا اس موقعہ پر یہ سوال برمحل تھا اور معقول بھی مگر آپ نے تسلی کرا دی کہ مجھے عائشہ صدیقہ نے نہیں بتایا، بلکہ اللہ علیم و خبیر نے بتلایا ہے، لیکن شیعی مفسر نے بالکل بے موقعہ و بے محل تفسیر کر کے تحریفِ معنوی کا ارتکاب کیا ہے اور اہلِ تورات کی یاد تازہ کردی ہے۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ شیعہ حضرات نے روایات میں کس قدر تحریف اور تغییر و تبدیل سے کام لیا ہے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب ترین صحابہ کو اور امہات المومنین کو کس قدر اپنی بدباطنی اور بغض و عناد کا نشانہ بنایا ہوا ہے اور اس بغض و عناد میں کس قدر اندھے ہوئے جا رہے ہیں اور لازم آنے والے مفاسد سے کس طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں؛ البتہ جو خاندانی ہیں یا قدرے شعور کے مالک، وہ ایسی روایات نقل کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں، جیسے طبرسی صاحبِ مجمع البیان۔

ڈھکو صاحب کی جاہلانہ اور بے محل تنقید

جو کتاب یا رسالہ شائع ہوتا ہے، اس کی کتابت مصنفین نہیں کرتے بلکہ انہیں کاتب حضرات لکھتے ہیں اور وہ بعض اوقات کچھ کا کچھ لکھ جاتے ہیں، بالخصوص عربی کو۔ کیونکہ عربی سے ان کو واقفیت بہت کم ہوا کرتی ہے اور خود ڈھکو صاحب کے رسالہ میں اس طرح کی شدید غلطیاں موجود ہیں، مثلاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو باغیانِ شریعت لکھ دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۳۰) لہٰذا ڈھکو صاحب کا رسالہ "مذہبِ شیعہ" میں کاتب کی غلطی سے وَلَا تَخُطُّهُ کی جگہ ولا تخطوه لکھے جانے کو حضرت

شیخ الاسلام قدس سرہ کی طرف نسبت کرنا اور کہنا کہ اس سے ان کی قرآن دانی پر تیز روشنی پڑتی ہے، انتہائی جاہلانہ اور سوقیانہ انداز اور سراسر غلط اور بیجا اعتراض ہے۔ آپ بحمداللہ حافظِ قرآن بھی تھے اور عربی لکھنے اور بولنے میں کامل دسترس کے مالک، جس کو صرف موافق ہی نہیں، بلکہ مخالف بھی تسلیم کرتے ہیں، لہٰذا اصحاب علم اور شریف لوگوں کو اس قسم کے اعتراض زیب نہیں دیتے، گو علامہ ڈھکو صاحب ایسے اعتراضات سے باز نہ ہی رہیں گے اور نہ ہی رہ سکتے ہیں، کیونکہ یہ اُن کی افتادِ طبع اور مجبوری ہے۔

رسالہ مذہب شیعہ — از شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

حدیث غدیر اور شیعی استدلال کا ابطال

اسی طرح یہ بھی ابلہ فریبی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافتِ بلافصل کی دلیل کے طور پر غدیر خم کی روایت پیش کی جائے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا: من کنت مولاہ فعلی مولاہ یعنی جس کا میں دوست ہوں، حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس کے دوست ہیں۔ ظاہر ہے قرآن حکیم میں مولیٰ بمعنی دوست وارد ہے۔ دیکھو آیتِ کریمہ: فان اللہ ھو مولاہ وجبریل وصالح المؤمنین "یعنی اللہ تعالیٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا دوست خود اللہ تعالیٰ شانہٗ ہے اور حضرت جبرئیل اور نیک بندے" والملائکۃ بعد ذالک ظہیر۔ ان کے بعد فرشتے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امداد کنندہ ہیں۔

اب مولیٰ کا معنیٰ حاکم یا امام یا امیر کرنا صراحۃً قرآن مجید کی مخالفت ہے اور تفسیر بالرائے اور کونسا مسلمان نہیں مانتا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستوں کے دوست ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ کے

رسول نے گھر میں، ہجرت میں، نماز میں، سفر میں حتیٰ کہ قبر میں اپنا ساتھی اور رفیق منتخب فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ یقیناً ان کے دوست ہیں۔ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا صاف صاف اور واضح ترین ارشادِ گرامی نہ بھولیے جو کہ آپ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حق میں فرماتے ہیں: یعنی ھما حبیبای۔ وہ دونوں میرے محبوب ہیں اور دوست یہ حوالہ گزر چکا ہے۔ (رسالہ مذہب شیعہ صفحہ ۸)

تحفۂ حسینیہ — از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

تتمۂ مبحث حدیث غدیر

سب سے پہلے مفصل روایت ملاحظہ فرمائیں، پھر اس کے بعد متنازعہ خلافت کے پس منظر میں اس استدلال کے ضعف اور سقم کو ملاحظہ فرمائیں:

عن البراء بن عازب وزید بن ارقم رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزل بغدیر خم واخذ بید علی فقال ألستم تعلمون انی اولیٰ بکل مومن من نفسہ قالوا بلیٰ فقال اللھم من کنت مولاہ فعلی مولاہ، اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ وادر الحق معہ حیث دار فلقیہ عمر بعد ذالک فقال ھنیئاً یا ابن ابی طالب اصبحت وامسیت مولیٰ کل مومن ومومنۃ (رواہ احمد۔ مشکوۃ باب مناقب علی رضی اللہ عنہ)

حضرت براء اور حضرت زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ غدیر خم پر اترے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا، تو فرمایا کیا تم جانتے نہیں ہو کہ میں سب مومنین سے ان کے ارواح ونفوس سے بھی زیادہ قریب ہوں۔

انہوں نے کہا: جی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: اے اللہ! جس کا میں مولیٰ ہوں، علی اس کے مولیٰ ہیں۔ اے اللہ! اُس کو دوست بنا، جو علی کو دوست بنائے اور اس کو اپنا دشمن قرار دے، جو علی کو اپنا دشمن سمجھے۔ اس کی مدد کر جو علی کی مدد کرے اور اس کو محرومِ التفات فرما جو علی کو چھوڑ دے اور محرومِ اعانت رکھ اور حق کو ادھر ہی پھیر جدھر کہ علی پھرے۔ تو اس کے بعد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ملے اور کہا اے علی بن ابی طالب! تمہارے لیے مبارک باد اور خوشخبری ہے (اس اعزاز پر) کہ آپ مومن مردوں اور عورتوں کے ہمیشہ کے لیے محبوب بن گئے۔

محلِ نزاع: اس میں کلام نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق ہیں اور امام المسلمین، لیکن اہلِ تشیع اور روافض آپ کی خلافت بلافصل کے عقیدہ کو جزوِ ایمان بلکہ عینِ ایمان سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے ہی انہوں نے تمام صحابہ کرام مہاجرین و انصار اور ان کے کامل متبعین کو صرف اور صرف اس جرم میں کافر و مرتد قرار دے دیا کہ انہوں نے آپ کو خلیفہ بلافصل تسلیم نہ کیا اور "ارتد الناس الا ثلاثہ" کا قول کیا، یعنی سوائے حضرت ابوذر، حضرت سلمان اور حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے تمام صحابہ مرتد ہو گئے تھے (روضہ کافی، رجال کشی اور انوار نعمانیہ وغیرہ) حالانکہ کلام مجید کی بیسیوں آیات ان کے اخلاص اور قلبی صفائی، صدق اور سچائی، نجات و فلاح اور اللہ تعالیٰ کی رضا و رضوان سے مشرف اور بہرہ ور ہونے کی بیّن برہان اور صادق تبیان ہیں جیسے کہ قدرے مفصل بیان ان کا گزر چکا۔

اس کے برعکس اہل السنّت کا مذہب یہ ہے کہ آپ چوتھے خلیفہ ہیں اور خلیفہ کا مقرر کرنا صحابہ کرام کا اپنا معاملہ تھا کہ اپنے امورِ سلطنت کی بہتری اور اس کے انتظامات کی درستی کے لیے جس کو چاہیں خلیفہ و امام نامزد کریں۔ وہ اللہ تعالیٰ اور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کسی خاص شخص کو امام

اور خلیفہ بنانے کے پابند اور مکلف نہیں ٹھہرائے گئے تھے، لہذا انہوں نے اپنی صواب دید سے امرِ خلافت میں جو فیصلہ کیا، وہ بالکل صحیح اور درست تھا اور انہیں کا عمل و کردار ہمارے اس نظریہ و عندیہ کا دار و مدار ہے کہ خلیفہ کا تقرر اہل اسلام کے اپنے فرائض میں سے ہے۔ صحیح انتخاب کر لیا تو ماجور اور مستحق ثواب، ورنہ مجرم اور مستحق عذاب و عتاب اور اسے اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری قرار دینا یا محتاجِ نص کہنا غلط ہے۔

شیعی استدلال کی مدارِ صحت

ہماری سابقہ گزارش سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی ہو گی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت بلافصل کے عقیدہ کو جزوِ ایمان بلکہ عینِ ایمان قرار دینا اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے، جب کوئی قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت آیت یا حدیث اس پر دلالت کرے اور ظاہر ہے کہ حدیث متواتر ہی قطعی الثبوت ہوتی ہے نہ کہ مشہور یا خبر واحد، لہذا اس حدیث سے استدلال کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس کا تواتر اور قطعی الثبوت ہونا ثابت ہو۔ نیز لفظ مولیٰ کا معنی صرف اور صرف خلیفہ بلافصل ہو۔ اس کے علاوہ دوسرے معنی میں از روئے لغت یا محاورات اس کا استعمال نہ پایا جائے۔ اور اگر دوسرے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہو تو پھر اس استدلال کا دار و مدار ایسے قطعی قرائن اور حتمی شواہد پر ہو گا جو اس مقام پر صرف مولیٰ بمعنی خلافت بلافصل کا معنی متعین کر دیں اور کسی دوسرے معنی کا امکان اور احتمال باقی نہ چھوڑیں، ورنہ اگر ایسے قرائن اور شواہد موجود بھی ہوں، جو صرف اس معنی کے اولیٰ اور انسب ہونے پر دلالت کریں اور اس کے زیادہ موزوں اور قرینِ قیاس ہونے پر دلالت کریں، تو پھر استدلال صرف مفید ظن ہو گا اور اس کے معارضہ میں اگر اسی قوت کا قرینہ موجود ہو گا تو استدلال ساقط ہو جائے گا اور اگر اس لفظ کا معنی بھی خلیفہ بلافصل میں منحصر نہ ہو اور ترجیح کا فائدہ دینے والے بھی قرائن بھی موجود نہ ہوئے، تو یہ استدلال

سرے سے لغو اور باطل ٹھہرے گا۔ گویا دو امر کا اثبات شیعہ کے ذمّے ہے۔

اوّل: حدیث کا تواتر، کیونکہ صرف وہی قطعی الثبوت ہوتی ہے اور خبرِ واحد ظنی ہوتی ہے جو عقائد کے اثبات میں کافی نہیں ہوتی، بلکہ اکابرینِ شیعہ اس کو وجوبِ اعمال میں بھی حجّت و دلیل تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ ابو جعفر طوسی تلخیص الشافی ص۳۲۶ میں تصریح کرتا ہے

اخبار آحاد لا توجب علماً عندنا وعند خصومنا وعندنا خاصة لا توجب عملاً۔ یعنی اخبارِ احاد ہمارے نزدیک بھی اور ہمارے مخالفین کے نزدیک بھی علم او یقین کا فائدہ نہیں دیتیں اور بالخصوص ہمارے نزدیک وجوب عمل بھی ثابت نہیں کر سکتیں۔ **دوم:** اس میں وارد لفظ مولیٰ کا خلیفہ بلا فصل میں منحصر ہونا اور اس معنیٰ کے ساتھ مختص ہونا اور ہم بلا خوفِ تردید اور بغیر کسی توقف و تردّد کے یہ کہتے ہیں اور بالکل بجا کہتے ہیں کہ صرف ڈھکو صاحب نہیں بلکہ کوئی شیعی فاضل قیامت تک یہ دونوں امر ثابت نہیں کر سکتا۔

امرِ اوّل کی تحقیق

حدیثِ غدیر قطعاً متواتر اور قطعی الثبوت نہیں ہے، کیونکہ امام بخاری اور امام مسلم اور واقدی جیسے محدّث جنہوں نے دور و دراز کے سفر کر کے احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع فرمایا۔ انہوں نے اس کو سرے سے نقل ہی نہیں کیا بلکہ ابو داؤد سجستانی اور ابو حاتم رازی اور دیگر بعض عادل اور مرجع انام قسم کے لوگوں نے اس کو مطعون ٹھہرایا ہے۔ اندریں صورت اس کے تواتر کا دعویٰ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اس کو خبرِ واحد اور صحیح تسلیم کرتے ہیں اور ہمارے نزدیک قولِ مختار یہی ہے، لیکن خبرِ واحد اور صحیح ہمارے نزدیک صرف اعمال میں حجّت و سند ہے نہ کہ عقائدِ قطعیہ میں اور اکابرینِ شیعہ کے نزدیک وجوبِ عمل کا فائدہ بھی نہیں دیتی، لہٰذا اس قطعی عقیدہ کے اثبات کے لیے اس کو پیش کرنا صحیح نہیں ہے، خواہ واقع میں یہ حدیث صحیح

ہی کیوں نہ ہو اور ہمارا کلام اس مقام میں اس روایت کے تواتر کے ردّ و انکار میں ہے نہ کہ اس کی صحت کے انکار میں۔ کذا حققہ الدہلوی فی اشعۃ اللمعات والہیتمی فی الصواعق۔

تنبیہ: یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہے کہ خبر کے متواتر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل السنّت کی دو تین کتابوں میں منقول ہو یا شیعہ اور سُنّی دونوں فریق کی کتابوں میں اس کا ذکر ہو، بلکہ تواتر کا دار و مدار اس پر ہے کہ سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر آخری ناقل محدّث تک ہر دور میں اس کے راوی اس قدر کثیر التعداد ہوں کہ از روئے عقل و درایت ان کا جھوٹ اور کذب پر اتفاق محال اور ناممکن ہو۔

نیز ایک دو راوی کہہ دیں کہ جس مقام پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ ارشاد فرمایا، وہاں اتنے ہزار صحابہ کرام موجود تھے۔ اس سے بھی روایت کا تواتر ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ناقلین کی تعداد تو اس طرح ہزاروں تک نہیں پہنچ جاتی، ناقل تو صرف دو تین ہی ثابت ہوئے، لہٰذا یہ کہنا کہ چونکہ غدیر خم میں موجود صحابہ کرام سینکڑوں یا ہزاروں کی تعداد میں تھے، لہٰذا یہ روایت متواتر ہو گئی۔ خود فریبی بھی ہے اور دوسروں کو بھی مغالطہ دینے کی ناکام کوشش، کیونکہ اس حدیث و روایت کے نقل کرنے والوں کی تعداد کا لحاظ ضروری ہے نہ کہ راوی اور ناقل خواہ ایک ہی ہو مگر موقعہ پر بہت سے لوگ موجود ہوں، تو اس روایت کو متواتر کہہ دیا جائے گا۔

امرِ ثانی کی تحقیق

دوسرا امر جس پر شیعی استدلال کا دار و مدار ہے، وہ یہ ہے کہ یہ روایت اس معنیٰ میں قطعی الدلالت ہے کہ مولیٰ کا لفظ صرف خلیفہ بلا فصل ہی کے معنیٰ میں مستعمل ہوتا ہے، جبکہ یہ بھی قطعاً غلط ہے۔ خود شیعی اقرار و اعتراف کے مطابق مولیٰ کے معانی کی تعداد چھبیس تک پہنچتی ہے اور ظاہر ہے کہ لفظ مشترک کے اس قدر کثیر التعداد معانی میں سے کسی ایک کی تعیین محتاجِ قرائن ہے اور یہیں سے

اس کی از رُوئے دلالتِ ظنیّت واضح ہو جاتی ہے۔ جب یہ روایت متواترہ بھی نہ ہوئی، اور اس کا معنیٰ خلیفہ بلا فصل والا قطعی اور حتمی طریقہ پر بھی ثابت نہ ہوا تو محلِ نزاع میں اس سے استدلال محل نظر ہو گیا، کیونکہ شیعی کتابِ لغت میں بھی مولیٰ کا معنیٰ خلیفہ بلا فصل موجود نہیں ہے، چہ جائیکہ عام کتبِ لغت ہیں۔

قرائن کی حیثیت

اب رہ گیا معاملہ قرائن کے ذریعے مولیٰ کے کثیر التعداد معانی میں سے اس مطلوبہ معنیٰ یعنی خلافت و امامت متعین کرنے کا تو یہاں دو صورتیں ہی ہو سکتی ہیں۔

اوّل یہ ہے کہ ایسے قرائن کے ذریعے اس کا معنیٰ متعین کیا جائے جو قطعیت کا فائدہ دیں اور ان قرائن کے ہوتے ہوئے دوسرے معانی کا مراد ہونا باطل اور ناجائز ہو تو ایسے قرائن بھی بالکل موجود نہیں ہیں اور علامہ ڈھکو صاحب نے جو قرائن پیش کر کے ان کے قطعی ہونے کا دعویٰ کیا ہے، ان پر بحث عنقریب ہدیۂ ناظرین ہو گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایسے قرائن موجود ہوں، جو اس مطلوبہ معنیٰ کی صرف ترجیح اور اولیت کا فائدہ دیں اور بطورِ ظن غالب مولیٰ بمعنیٰ خلیفہ کا ارادہ وزنی اور راجح قرار دیں، ایسے قرائن پیش کیے جا سکتے ہیں، مگر ان کے معارض قرائن ایسے ہیں، جو ان سے بھی اقویٰ ہیں، لہذا ان کے موجود ہونے کی وجہ سے شیعی قرائن کی دلالت محلِ نزاع میں قابلِ اعتداد و لائقِ التفات نہ رہے گی اور ہمارے نزدیک ایسے ہی قسم کے چند وہ قرائن ہیں، جو شیعہ حضرات نے اس مقام پر پیش کیے ہیں، لہذا ان کے بیان کرنے پر ان کے معارض اور مناقض قرائن بلکہ دلائل و براہین کو بیان کر دیا جائے گا۔ جن سے ناظرین کرام خود ہی یہ فیصلہ کر لیں گے کہ شیعی استدلال اور ان کی طرف سے پیش کردہ قرائن میں کوئی وزن نہیں ہے۔

نوٹ: اہلِ تشیع کو اس امر کا اعتراف ہے کہ حدیثِ غدیر اور حدیثِ منزلت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی تصریح نہیں ہے، بلکہ ان میں صرف

اس پر تعریض ہے اور اس کی طرف صرف اشارہ ہے۔ علامہ طبرسی نے "الاحتجاج" صـ ۲۵۵ پر ذکر کیا ہے: واثبت حجۃ اللہ تعریضًا لا تصریحًا بقولہ فی وصیہ من کنت مولاہ فھذا مولاہ وبقولہ ھذا منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی ولو قال لھم لا تقلد والامامۃ الا لفلان بعینہ والا نزل بکم العذاب لاتاھم العذاب وزال باب الانظار والامھال۔

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حجت بطورِ اشارہ و کنایہ بیان فرمائی اور اس کی تصریح نہیں فرمائی۔ ان دونوں حدیثوں میں یعنی من کنت مولاہ فھذا مولاہ ہو خواہ انت منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی ہو۔ وصیِّ رسول حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وصایت اور خلافت کی تصریح نہیں فرمائی اور اگر آپ تصریح فرماتے کہ منصبِ امامت صرف فلاں معین شخص کو ہی سونپنا ورنہ تم پر عذاب نازل ہو جائے گا، تو یقینًا ان پر اس حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں عذاب نازل ہو جاتا اور مہلت کا دروازہ بند ہو جاتا۔

لہذا کسی بھی شیعہ عالم کو ان دونوں روایات کو قطعی دلیل اور خلافتِ علی کی نص صریح قرار دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، بلکہ وہ آپ کی خلافت و امامت کی طرف بقول طبرسی کے صرف تعریض اور اشارات ہیں، حالانکہ قطعی عقیدہ کے لیے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت دلیل درکار تھی اور یہاں نہ ثبوت قطعی اور نہ ہی دلالت قطعی، تو اس سے وہ قطعی عقیدہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے، جس کی بنا پر ایک لاکھ چوبیس ہزار اصحابِ رسول کو العیاذ باللہ مرتد قرار دے دیا گیا ہے اور ان خدامِ رسول اور محسنینِ اسلام پر ہر قسم کے سبّ و شتم اور طعن و تشنیع کو صرف جائز ہی نہ رکھا گیا، بلکہ اسے جزوِ ایمان بنا لیا گیا اور جس طرح نماز فرض ہے، اسی طرح تبرّا کو بھی فرائضِ اسلام میں شمار کر لیا گیا ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

رسالہ تنزیہ الامامیہ از محمد حسین ڈھکو صاحب

۱- پیر صاحب کا حدیثِ غدیر کی دلالت میں خدشہ ظاہر کرنا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ اس حدیث کی صحت و صداقت مُسلّم ہے اور اس کے متواتر ہونے کی دلیل۔

۲- پیر صاحب نے مولیٰ کا معنیٰ دوست کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مولیٰ کا صرف ایک یہی معنی ہے جو مدعی کے علومِ عربیہ سے نابلد ہونے کی بین دلیل ہے۔ بلکہ عربی زبان میں یہ لفظ پورے چوبیس معانی میں مستعمل ہے۔

۳- ان کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ قرآن مجید میں مولیٰ بمعنی دوست استعمال ہوا ہے، بلکہ بمعنی اَولیٰ، سیّد و سردار اور ناصر و مددگار بھی استعمال ہوا ہے۔

۴- یہ بھی غلط ہے کہ مؤلف کی پیش کردہ آیت میں مولیٰ بمعنی دوست استعمال ہوا ہے، بلکہ یہاں بمعنی ناصر و مددگار ہے۔

۵- مولیٰ کے معانی اگرچہ چوبیس ہیں، مگر مشہور ان میں سے تین ہیں: اولیٰ بالتصرف، ناصر و مددگار اور دوست اور قاعدہ یہ ہے کہ لفظ مشترک کے متعدد معانی میں سے موقعہ و محل کی مناسبت سے داخلی اور خارجی قرائن کے ساتھ ایک معنی کو متعین کیا جاتا ہے اور ہم بلا خوفِ رد علی الاعلان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حدیثِ غدیر میں مولیٰ کا معنیٰ سوائے اولیٰ بالتصرف اور حاکم و سردار کے دوسرا کوئی معنیٰ مراد نہیں ہو سکتا اور اس پر دس عدد قرائن اور شواہد قطعیہ پیش کیے جاتے ہیں تاکہ جنابِ امیر علیہ السلام کی خلافت بلا فصل بالکل بے غبار۔ واضح اور آشکار ہو جائے۔

ملخص رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۱۴۹/۱۵۰

تحفہ حسینیہ از ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے حدیث غدیر سے شیعی استدلال کے ابطال میں جو کچھ فرمایا تھا، اس پر ڈھکو صاحب کی طرف سے اعتراضات کی فہرست اور تفصیل

ملاحظہ فرما چکے، اب ان کے جوابات کا مطالعہ فرمائیں اور خود ہی حق و باطل اور صحیح و غلط کا فیصلہ کریں۔

جواب الاوّل: حدیثِ غدیر کی صحت قولِ مختار کے مطابق مسلّم ہے لیکن تواتر محلِ اختلاف ہے، ہمارے نزدیک یہ حدیث اخبار آحاد کے قبیل سے ہے، لہذا تواتر کا درمیان میں اضافہ کر لینا اس تحریف اور تغییر و تبدیل کا مظہر ہے جو ڈھکو صاحب کو اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملی ہے۔ ہر روایت کی صحت اس کے متواتر ہونے کو مستلزم نہیں ہوتی، لہٰذا یہاں عیاری سے کام لیا گیا ہے۔ اگر متواتر ہوتی تو قطعی الثبوت ہوتی، اور اس کو عقیدۂ قطعی کے اثبات میں پیش کیا جانا ممکن ہوتا، بشرطیکہ اس کی دلالت مطلوبہ معنی پر بھی قطعی ہوتی۔ جب تواتر ہی ثابت نہ ہوا، تو اس کے ساتھ کسی عقیدۂ قطعی بلکہ ظنی کا اثبات بھی ممکن نہ رہا، بلکہ وجوبِ عمل ثابت کرنا بھی ممکن نہ رہا جیسے کہ ڈھکو صاحب کے اکابر نے تصریح کی ہے، جیسے کہ حوالہ دیا جا چکا ہے۔

جواب الثانی: پیر صاحب نے مولیٰ کے معانی کا دوست کے معنی میں انحصار ثابت نہیں کیا، بلکہ بطورِ احتمال ایک معنی ذکر کر دیا ہے اور چونکہ وہ مقامِ منع میں ہیں، اور مستدل شیعہ ہیں اور مانع کے لیے محض بیانِ احتمال کافی ہوتا ہے، تو آپ نے بھی اپنا وہی حق استعمال کیا ہے اور مشہور عقلائی قاعدہ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال کے مطابق مقامِ منع میں اتنا قدر ہی کافی ہے۔

نیز لفظ مشترک کے جب متعدد معانی ہوں اور ان میں سے بعض پر فریقین کا اتفاق ہو تو وہ متعین ہو جائیں گے اور مولیٰ بمعنی دوست بھی مسلّم بین الفریقین ہے، لہذا اسی کو متعین ہونا چاہیے، کیونکہ عمومِ مشترک تو ہو نہیں سکتا، ورنہ علامہ صاحب کو قرائن بیان کر کے مشترک کے ایک معنی کو معین کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی اور اور جب ایک ہی معنیٰ ایک جگہ مراد ہو سکتا ہے تو جو متفق علیہ ہے، وہی متعین ہو جائے گا، لیکن ڈھکو صاحب نے دونوں مُسلّم قاعدوں کو نظر انداز کیا ہے اور ساتھ ہی بلا وجہ کچھو کا کردار بھی ادا کیا ہے۔

جواب الثالث: حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے مولیٰ کے معانی کا صرف اس ایک معنی میں منحصر ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں فرمایا اور نہ ان کے کلام میں حصر پر دلالت کرنے والا کوئی لفظ موجود ہے، بلکہ حقیقی وجہ بیانِ احتمال ہے اور معنی مسلّم بین الفریقین کا متعین ہونا، لہذا یہ اعتراض محض تعداد بڑھانے کی بے سود کوشش ہے، اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ دونوں اعتراض اپنے مفروضہ دعویٰ حصر پر ہیں۔

جواب الرابع: اللہ تعالیٰ کے دوست اور اس کے معاون و مددگار ہونے میں تلازم ہے اور ان کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ناممکن ہے، جبکہ دوسری جگہ کبھی دوستی ہوتی ہے، لیکن نصرت و اعانت بوجہ ضعف و ناتوانی نہیں پائی جاتی اور کبھی امداد و اعانت ہوتی ہے، مگر دوستی والا معنی موجود و متحقق نہیں ہوتا جیسے کہ اجنبی آدمی موقعہ پر پہنچ جائے اور ظالم کے ظلم و استبداد سے بچالے، لہذا حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ کا مقصد یہاں پر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ دوست ہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس کی اعانت و نصرت اس کی دوستی کی فرع ہے، لہذا اصل اور مدارِ اعانت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بعض دوسرے حضرات نے اگر فرع کو بیان کر دیا اور مترتب نتیجہ کو تو وہ بھی صحیح ہے، جبکہ آپ نے اصل اور مدار کو بیان کر دیا، لہذا اس اعتراض کا کوئی موقعہ و محل نہیں ہے یا ان حضرات نے مطلق مفہومی تفاسیر کو سامنے رکھا اور آپ نے مخصوص مقام اور مادۂ خاص میں نظر مرکوز رکھی۔ علاوہ ازیں مولیٰ بمعنی دوست مسلّم عند الخصم ہے، لہذا مثال میں بحث دأب المحصلین سے خارج ہے اور اہلِ علم کے شایانِ شان نہیں ہے کما ھو المقرر عند العقلاء من ارباب الفنون۔

جواب الخامس: ڈھکو صاحب فرماتے ہیں مولیٰ کے مشہور معانی تین ہیں: اولیٰ بالتصرف، ناصر و مددگار اور دوست، اور یہاں بقول ان کے پہلا معنی متعین ہے۔ ان قرائن کی رُو سے جو وہ بیان کریں گے، لیکن اولیٰ بالتصرف بطورِ خلافت بلا فصل کے ہی ہو، کلام صرف اس میں ہے نہ کہ مطلق خلافت اور

تصرّف میں، کیونکہ اہل السنّت کے نزدیک آپ خلیفہ برحق ہیں، مگر چوتھے ہیں۔ لہذا پہلے از رُوئے لغت یہ معنی ثابت کرنا چاہیے، اس کے بعد قرائن پیش کرنے کی نوبت آئے گی، کیونکہ قرائن کے ذریعے مشترک کے متعدد موضوع لہ معانی میں سے ایک کا تعین کیا جاتا ہے نہ کہ قرائن کے تحت مشترک لفظ کا معنی از سرِ نو وضع کیا جاتا ہے، اور علامہ ڈھکو صاحب اور تمام شیعی علماء اپنے پیش کردہ قرائن کے تحت اس مشترک کا معنی وضع کرتے ہیں جو بالکل غلط طرزِ فکر اور سراسر باطل طریقہ ہے۔

۲۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت غدیر خم میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے یہ لفظ "فعلیّ مولاہ" استعمال فرمایا، اسی وقت آپ کے لیے خلافت و حکومت ثابت ہو گئی یا نہ اور بر تقدیرِ اول دریافت طلب امر یہ ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس وقت اپنا اقتدارِ اعلیٰ بھی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو منتقل فرما دیا یا نہ؟ دوسری صورت میں بیک وقت دو حاکم اور متصرّف عملی طور پر موجود ہو گئے اور خود مخالفین بھی اس کے قائل نہیں ہو سکتے اور پہلی صورت میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غدیر خم کے بعد سے وصال تک حکومت و اقتدار سے علیحدہ ہونا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اقتدار پر قابض ہونا اور ملک عرب میں متصرف ہونا لازم آئے گا، حالانکہ یہ بھی حقائق اور واقعات کے خلاف ہے اور مسلماتِ خصم کے بھی خلاف ہے، لہذا ماننا پڑے گا کہ فوری طور پر تو اس تصرّف و تسلط اور اختیار و اقتدار کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت نہیں کیا جا سکتا اور مستقبل میں اس معنی کے مراد ہونے کی صورت میں اقتدار و اختیار اور تصرّف و تسلّط ثابت ہو سکتا ہے لیکن مستقبل میں تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔ نزاع و اختلاف صرف بلا فصل تصرّف کا مالک ہونے میں ہے اور لفظ مولیٰ باعتبارِ وضع اس پر دلالت ہی نہیں کرتا۔ اگر دلالت کرتا ہے، تو مطلق حکومت اور تصرّف پر کرتا ہے۔ اس میں نزاع نہیں ہے۔

لہٰذا علماء شیعہ کا مدعیٰ اس سے قطعاً ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی اہل السنت کے مذہب و مسلک پر اس سے اعتراض ہو سکتا ہے۔

۳۔ اگر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد قطعی طور پر خلافتِ بلافصل ہی تھی تو آخر شیعہ صاحبان کو تو یہ عربی آگئی "وخلیفتہ بلا فصل" کیا سرورِ عالم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر عربی (نعوذ باللہ) نہیں آتی تھی؟ یا دیدہ دانستہ امت کو الجھن میں ڈالنا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بلافصل خلافت کو چیستان بنانا مقصود تھا؟ نعوذ باللہ! جو کہ مکارمِ اخلاق کی تتمیم اور شرائع اسلام کی تکمیل فرمانے والے رحمتِ عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نبی کی شان سے بعید تر ہے۔

۴۔ ظاہر ہے جس بادشاہ نے اپنے بعد کسی کو بھی ولی عہد بنایا' اس کی ولی عہدی میں کوئی اختلاف رونما نہ ہوا۔ دوسری حکومتوں کے معاملات کو چھوڑ و، تاریخ اسلام کے دورِ اوّل میں حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ولی عہد بنانا ہر ایک کو معلوم ہے۔ یہاں خلیفہ اور ولی عہد ہونے میں کسی کو اختلاف نہ ہوا — آخر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی العیاذ باللہ خلیفہ بنانے اور ولی عہد مقرر کرنے کا سلیقہ نہ آیا یا بالعموم صحابہ کرام مہاجرین و انصار کو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے اتنا تعلق بھی نہیں تھا جتنا کہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے تھا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں سبھی نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بقولِ شیعہ مخالفت کی، مگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ولی عہد بنایا' تو کسی نے بھی اختلاف نہ کیا۔ زمانہ اپنے تمام تر ادوار میں کتبِ تواریخ اپنے تمام تر اوراق میں اس قسم کی کوئی مثال دکھلا سکتی ہیں۔ جب نہیں اور یقیناً نہیں دکھلا سکتیں تو معلوم ہوا کہ یار لوگوں نے اس حدیثِ غدیر کا معنیٰ ہی غلط سمجھا ہے اور مقصدِ نبوی بیان کرنے کی بجائے اپنی طرف سے گھڑنت کی ہے اور حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں معنوی تحریف کر کے اپنے اسلاف کی تقلید کا حق ادا کیا ہے۔

علامہ ڈھکو صاحب کے بیان کردہ قرائن اور ان کا ردِّ بلیغ

علامہ موصوف نے اپنی کسی دوسری کتاب سے یہ عبارت نقل کر دی ہے' اس لیے ایسے حوالہ جات کی طرف اشارات اور بعض جگہ تصریح آگئی ہے' جن کا پوری کتاب میں کہیں نام و نشان ہی نہیں۔ بہرحال ہم بالترتیب قرائن کا ذکر کر کے ہر ایک کے متعلق واضح کرتے جائیں گے کہ اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا' جو شیعی علماء حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

پہلا قرینہ: اس حدیث کی ابتداء میں یہ جملہ الستُ اولیٰ بکم من انفسکم وارد ہے' جو اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ آنے والے لفظ مولیٰ سے یہی اولیٰ والا معنیٰ مراد ہے اور یہ جملہ آیتِ قرآنی اَلنبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم سے مقتبس ہے' جس کے متعلق مفسرین نے لکھا ہے: ای فی الامور کلھا (تفسیر بیضاوی جلد دوم ص ۲۵۶ طبع مصر) لہٰذا جن معنوں میں نبی مولیٰ ہے' انہیں معنوں میں علی بھی مولیٰ ہیں۔ (رسالہ تنزیہہ الامامیہ ص ۱۵۱)

الجواب بفضل اللہ الوہاب: علامہ ڈھکو صاحب بھی خوب آدمی ہیں۔ دعویٰ یہ کیا تھا کہ حدیثِ غدیر میں فعلی مولاہ کا معنیٰ ہے اولیٰ بالتصرف اور حاکم یعنی خلیفہ بلافصل اور قرینہ بیان کرتے وقت یہ کہہ کر اپنے فرض یعنی مشترک لفظ مولیٰ کے تین معروف معانی میں سے اس ایک معنیٰ کی تعیین سے سبکدوش ہو گئے کہ مولیٰ کا یہاں وہی معنی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مولیٰ کا معنی ہے مگر اس میں تو اختلاف ہی نہیں ہے کہ دونوں جگہ متناسب معنی مراد ہونا چاہیے۔ ہر دو جگہ محبوب والا معنیٰ ہوگا یا محب والا یا ناصر و مددگار والا یا اولیٰ بالتصرف والا — لہٰذا یہاں ڈھکو صاحب کو یہ ثابت کرنا لازم تھا کہ اَلنبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم میں اولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلافصل والا معنی ہی مراد ہے اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی معنی مراد نہیں ہو سکتا۔ جب یہ

ثابت نہ کیا اور نہ کر سکتے ہیں، تو اس قرینہ کا ذکر ہی ٹھیک نہ ہوا۔

آیئے اب آپ ہمارے پیش کردہ دلائل اور قرآن میں اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش فرمائیں کہ یہاں کونسا معنیٰ مراد ہے۔ **النبیّ اولیٰ بالمومنین کا صحیح مفہوم**

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مؤمنین کے ساتھ ان کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہیں کا معنیٰ یہ نہیں کہ اس جملہ میں آپ کی خلافت و امارت بیان کی جا رہی ہے بلکہ امت پر آپ کی شفقت اور محبت اور پیار بیان کیا جا رہا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے النبیّ اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم فرما کر ساتھ ہی فرمایا وازواجہ امھاتھم کہ میرے نبی کی مقدّس بیویاں مومنین کی مائیں ہیں اور بعض قرآت میں وھو اب لھم بھی وارد ہے، یعنی نبی مکرّم صلی اللہ علیہ وسلم مومنین کے باپ ہیں اور یہ جملہ نہ بھی ہو تو ازواجِ رسول کا امہات المومنین ہونا ہی آپ کے امّت کے لیے باپ ہونے کو مستلزم ہے اور امّت کے لیے مثل آباء بلکہ اس سے بھی زیادہ مشفق اور مہربان ہونے کی دلیل ہے، اسی لیے آیتِ کریمہ کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا: من ترک مالا فلورثتہ ومن ترک دیناً او ضیاعاً فعلیّ و الیّ۔

تفسیر صافی جلد ثانی ص۱۰۳ ومعانی الاخبار ص۲۰)

"یعنی جس نے اپنے ورثہ میں مال چھوڑا، تو اس کے وارثوں کے لیے ہے اور جس نے قرض چھوڑا یا یتیم بچے اور بیوگان وغیرہ تو اس قرض کی ادائیگی مجھ پر لازم ہے اور وہ یتیم بچے اور بیوگان وغیرہ بھی میرے ذمے۔"

صاحبِ تفسیرِ صافی ملاّ محسن کاشانی نے اس کی تصریح کرتے ہوئے کہا:

فالزم اللہ نبیّہ للمومنین مایلزم الوالد والزم المومنین من الطاعۃ لہ ما یلزم الولد للوالد" پس اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ حقوق لازم کیے جو والد پر اولاد کے لیے لازم ہوتے ہیں اور مومنین پر وہ امور لازم کیے جو اولاد پر والد کے حق میں لازم اور ضروری ہوتے ہیں۔"

۲۔ تفسیرِ صافی میں ہی اس آیتِ کریمہ کا معنیٰ بیان کرتے ہوئے کہا: یعنی اولیٰ بھم فی الامور کلھا فانہ لا یامرھم ولا یرضیٰ منھم الا بما فیہ صلاحھم ونجاحھم بخلاف النفس فلذالک اطلق فیجب ان یکون احب الیھم من انفسھم وامرہ انفذ علیھم من امرھا وشفقتھم علیہ اتم من شفقتھم علیھا (ص۱۰۲ ج۲)

یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام امور میں مؤمنین کے لیے اَولیٰ ہیں، کیونکہ آپ ان کو اس امر کا حکم دیتے ہیں اور وہی ان سے پسند کرتے ہیں، جس میں ان کی بہتری ہو، کامیابی ہو بخلاف نفس کے کہ وہ اِن امور کا حکم دیتا ہے اور ایسے امور کا ان سے سرزد ہونا پسند کرتا ہے جو اُن کی تباہی و بربادی کے موجب ہوتے ہیں، اسی لیے مطلقاً النبیّ اولیٰ بالمومنین فرمایا اور کسی خاص امر کے ساتھ اس کو مخصوص اور مقیّد نہ ٹھہرایا، لہٰذا ضروری اور لازم ہے کہ آپ مومنین کو اپنے نفوس سے زیادہ محبوب ہوں اور آپ کا حکم ان پر ان کے نفوس کی نسبت زیادہ نافذ ہو اور ان کی شفقت نبیٔ معظّم رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس سے زیادہ اتم و اکمل ہو، جتنی کہ انہیں اپنے نفسوں پر ہے۔

فائدہ: اور یہی معنی اس آیتِ کریمہ کا تفسیر منہج الصادقین جلد ہفتم ص۲۸۳ اور تفسیر مجمع البیان ص۳۳۸ جلد رابع ص۳۳۸ پر مرقوم ہے۔

۳۔ تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک کے لیے روانہ ہونے لگے، تو بعض صحابہ نے عرض کیا: نستأذن آباءنا وامھاتنا (صافی جلد ثانی ص۱۰۳ ومجمع البیان، جلد رابع ص۳۳۸) "یعنی ہم اپنے آباء اور امّہات سے اجازت لے لیں۔" (پھر آپ کے ساتھ اس غزوہ میں شریک ہوں گے)، تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مومنین کے لیے ان کے آباء و اجداد اور امّہات و جدّات کی نسبت اطاعت اور فرمانبرداری کے زیادہ حقدار ہیں۔

۴۔ تفسیر منہج الصّادقین یہی معنی بیان کرنے کے بعد (جو ابتداءً صافی، منہج اور

مجمع کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے، علامہ کاشانی نے ذکر کیا: در حدیث صحیح آمدہ است ما من مومن الا انا اولیٰ بہ فی الدنیا والآخرۃ ونیز بروایتِ صحیحہ ثابت شدہ کہ مسلمان نگردد، ہیچ یک از شما مومن نباشد تا نباشم دوست تر باواز پدر و مادر و فرزند و ہمہ مردمانِ او۔ پس باید کہ فرمانِ او از فرمان ہا لازم تر باشد و لہذا صاحب عین المعانی گفتہ کہ محبتِ او سزاوار تر است از خود و غیر خود از اقارب و اجانب واز مجاہد منقول است کہ ہر پیغمبرے پدر امت خود است و لہذا ہمہ مومنان برادران یک دیگر اند چہ پیغمبر پدر ایشاں است در دین۔

ترجمہ: "حدیثِ صحیح میں وارد ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں کوئی مومن، مگر میں زیادہ محبوب ہوں اس کے لیے دنیا و آخرت میں نیز صحیح روایت میں وارد ہے کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ میں اس کو باپ، ماں اور تمام خویش و اقربا سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔ پس چاہیے کہ آپ کا فرمان دوسرے تمام فرمانوں کی نسبت زیادہ لازم اور واجب القبول ہو۔ اسی لیے صاحبِ عین المعانی نے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت زیادہ لائق اور مناسب ہے۔ اپنی ذات سے بھی اور اپنے غیر سے بھی اقربا ہوں یا اجانب اور بیگانے اور حضرت مجاہد سے منقول ہے کہ ہر پیغمبر اپنی امت کے لیے والد کی مانند ہوتا ہے اور اس لیے تمام مؤمنین آپس میں بھائی ہیں، کیونکہ پیغمبرِ اسلام از روئے دین و ایمان کے والد ہیں۔"

الحاصل ان تفسیری اقوال سے واضح ہو گیا کہ قول باری تعالیٰ: "النبی اولی بالمومنین من انفسھم" میں سرورِ عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے سے زیادہ محبوب ہونا اور اپنے خویش و اقربا اور آباء و امہات سے زیادہ محبوب اور شفقت کا زیادہ سزاوار اور حقدار ہونا مراد ہے، کیونکہ نفوسِ انسانی گمراہی اور ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں، جبکہ آپ ہدایت فرماتے ہیں اور راہِ اخلاص و نجات پر چلاتے ہیں اور خویش و اقربا صرف جسمانی تربیت اور دنیوی امداد و اعانت کر سکتے

ہیں، جبکہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم روحانی تربیت فرماتے ہیں اور حیاتِ ابدی عطا فرماتے ہیں اور دنیا میں شرِ شیطان و شرِ نفس سے بچانے میں معاون و مددگار ہیں اور آخرت میں عذابِ دوزخ اور قہر خداوندی سے بچاتے ہیں، لہذا آپ محبت و مودت کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ الغرض خود شیعہ حضرات کی تفاسیر سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس جگہ خلافت و حکومت والا معنیٰ مراد نہیں ہے چہ جائیکہ خلافت بلا فصل والا معنیٰ علی الخصوص، جبکہ حکومت و خلافت پہلے سے ثابت تھی اور یہ آیت غزوہ تبوک کے اس موقعہ پر نازل ہوئی، جبکہ بعض صحابہ نے آباء و امہات سے اجازت لینے کا اذن طلب کیا، لہذا اس کو سرے سے اولیٰ بالتصرف والے معنیٰ کا قرینہ بنانا ہی درست نہ ہوا، چہ جائیکہ اس کو قطعی قرینہ خلافتِ بلافصل کا قرار دیا جائے، بلکہ یہ جملہ تو اس امر کی دلیل صریح اور برہان بین ہوا کہ یہاں مولیٰ بمعنیٰ محبوب ہے، جیسے کہ یہاں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ذکر فرمایا۔

مولیٰ بمعنیٰ محبوب پر قرائن کا بیان

۱۔ پچھلی ساری عبارات سے یہ مدعا واضح ہو چکا ہے، دوبارہ ان پر غور فرمالیں تاکہ شیعہ اکابرین کی زبانی اس امر کی تصریح روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے کہ یہاں مولیٰ بمعنیٰ دوست ہے۔

۲۔ قول باری تعالیٰ: وازواجہ امھاتھم میں ہم بھی داخل ہیں یا نہیں؟ دوسری شق کا بطلان اظہر من الشمس ہے، لہذا پہلی شق ہی متعین ہو گئی کہ قیامت تک پیدا ہونے والی امت کے لیے ازواج نبی امہات ہیں تو لامحالہ ضمیرِ ہم کے مرجع سے بھی یعنی المؤمنین سے بھی قیامت تک پیدا ہونے والے مؤمنین مراد ہیں اور ان سب کے لیے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اولیٰ ہیں، تو اب کون عقلمند انسان ہے جو یہ کہے کہ اب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری طور پر حاکم ہیں اور ملک و سلطنتِ ظاہری پر آپ قابض و متصرف ہیں، لہذا روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

تب بھی محبوب تھے اور اب بھی محبوب ہیں۔ اس وقت بھی سب پر آپ کو جان و مال اور خویش و اقربا سے عزیز سمجھنا فرض تھا اور اب بھی اسی طرح فرض ہے۔

۳۔ وہ حدیث جس کو علامہ کاشانی نے ذکر بھی کیا اور اسے صحیح بھی کہا۔ مامن مومن الا وانا اولیٰ به فی الدنیا والآخرۃ میں یہی اولیٰ کا لفظ موجود ہے اور اس میں مومن نکرہ ہے جو کہ نفی کے تحت داخل ہے جو مفید عموم و استغراق ہے۔ نیز دُنیا و آخرت کی تعمیم بھی مذکور ہے، جبکہ آخرت محلِ حکومت اور مقامِ امارت و سلطنت ہی نہیں ہے، لہذا آخرت میں آپ کے مومنین کے ساتھ اولیٰ ہونے کا معنیٰ محبت و شفقت والا ہی متعین ہے تو دُنیا کے لحاظ سے بھی یہی معنی متعین ہو گیا، لہذا آیت اور حدیثِ صحیح کی شہادت سے واضح ہو گیا کہ یہاں محبوبیت والا معنیٰ مراد ہے نہ کہ اولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلافصل والا گویا جس جملہ کو ڈھکو صاحب نے خلافت بلافصل کا قطعی قرینہ بنایا تھا، وہ درحقیقت محبوبیت اور احبیت کا قرینہ ہے اور اس کی مذہبی کتب کی رُو سے یہ حقیقت آشکارا ہو چکی۔

تنبیہ: اولیٰ کو اسمِ تفضیل کا صیغہ اگر وَلیٔ بمعنی قرب و استحقاق سے بنائیں تو پھر بھی قولِ باری تعالیٰ: النّبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم اور قولِ نبوی: الست اولیٰ بالمومنین من انفسھم ہماری دلیل ہے اور ہمارے مدّعا کا واضح قرینہ اور اگر اس کو ولایت بمعنی محبت سے مشتق قرار دیں، تو بھی ہمارا مدّعا ثابت ہے اور یہ دوسرا معنی پہلے کی نسبت اولیٰ ہے، کیونکہ اس صورت میں جہت اولویت کو خارج سے اعتبار نہیں کرنا پڑتا، جبکہ پہلی صورت میں جہت اولویت کو محذوف ماننا پڑتا ہے یعنی احق بالتصرّف جبکہ حذف خلافِ اصل ہے، لہذا اب صریح مفہوم اس آیت و حدیث کا یہی ہو گیا کہ نبیِ مکرّم صلی اللہ علیہ وسلم مؤمنین کے لیے اپنے نفوس سے زیادہ محبوب تر ہیں۔

۴۔ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں الست اولیٰ بالمومنین من انفسھم کے بعد وارد ہے، فمن کنت مولاہ یعنی جس کا میں مولیٰ تھا، خواہ اس کَانَ کے لفظ کو استمرار کے معنی میں ہی لے لو، تب بھی ماضی کو شامل ہونا اس کا لازمی اور ضروری ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ نبیٔ اکرم سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم ہجرت سے قبل مومنین کے لیے مولیٰ تھے یا نہیں؟ اگر تھے اور یقیناً مولائے مومنین تھے تو نہ اس وقت مولیٰ کا معنی حکمران اور صاحبِ سلطنت تھا، نہ اب یہ معنی مراد ہوا۔ اس وقت بھی آپ مولیٰ بمعنی محبوب تھے اور اب بھی اسی معنی سے مولیٰ ہوں گے، کیونکہ حکومت و سلطنت تو بہت بعد میں قائم ہوئی۔

۵۔ اس حدیث و روایت میں مولیٰ اور اَولیٰ کی مومنین کے ساتھ تخصیص فرمائی گئی ہے۔ قرآن مجید میں بھی اور حدیث شریف میں بھی حالانکہ آپ کی حکومت و سلطنت تو مؤمنین کے ساتھ خاص نہیں تھی، بلکہ یہودِ خیبر اور نصارائے نجران بھی آپ کے زیرِ فرمان تھے اور آپ کی رعایا تھے، لہذا اگر یہاں حکومت و سلطنت والا معنیٰ مراد ہوتا تو مومنین کے ساتھ تخصیص کا کوئی مطلب نہیں ہو سکتا تھا، جس سے واضح ہو گیا کہ یہ آیتِ کریمہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ہے: ذالك بان اللّٰه مولی الذین آمنوا وانّ الكافرین لا مولیٰ لهم۔ "یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا مولیٰ ہے اور کافرین کے لیے کوئی مولیٰ نہیں ہے۔" حالانکہ کفار و مشرکین اللہ تعالیٰ کی حکومت سے باہر تو نہیں تھے۔ اگر انہیں نصیب نہیں تو اللہ تعالیٰ کی محبت اور مومنین کو جو چیز کفّار سے ممتاز کرتی ہے، وہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور ان کی اللہ تعالیٰ سے محبت اور اللہ تعالیٰ کی ان سے محبت ہی ہے کما قال اللّٰه تعالیٰ: اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ وقال اللّٰه تعالیٰ: اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ وقال اللّٰه تعالیٰ: یُحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗ۔ لہذا اس تخصیص سے بھی واضح

ہوگیا کہ یہاں مخصوص محبت اور خصوصی تعلق کا بیان ہے اور حکومت و سلطنت کا بیان مقصود نہیں ہے۔ تو جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اولیٰ بالمؤمنین اور مولی المومنین ہونے کا مطلب واضح ہوگیا تو ع

چرا در معنیٔ من کنت مولائے بپیچی ہر شوہ   علی مولا بآں معنی کہ پیغمبر بُود مولیٰ

کا مطلب واضح ہوگیا۔

شیعی علماء کا منشاء غلط

۱۔ شیعی علماء کو مغالطہ یہاں سے لگتا ہے کہ فی الواقع چونکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حاکم اور صاحب سلطنت اور تنفیذ احکام پر مقتدر تھے، لہٰذا اس لفظ سے بھی یہی معنیٰ مراد ہوگا، حالانکہ واقع میں ایک صفت اور معنیٰ سے موصوف ہونا الگ چیز ہے اور اطلاق کیے گئے لفظ سے بھی اس معنیٰ کا مراد ہونا الگ چیز ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ ہر ہر ذرہ کائنات کا مالک بھی ہے اور حاکم و متصرف بھی اور ملکِ سماوات والارض کا بلا شرکت غیرے حاکم، اور عرش و تختِ کائنات پر مقتدر اور غالب لیکن باوجود اس کے اس نے اپنے آپ کو مولی الذین آمنوا کہا ہے اور کافروں سے مطلقاً اپنے مولیٰ ہونے کی نفی کر دی ہے اور فرمایا: وان الکافرین لا مولی لھم۔ لہٰذا واضح ہوگیا کہ واقعہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصفِ حکومت سے موصوف ہونا اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ جب بھی آپ پر لفظِ مولیٰ اطلاق کیا جائے، تو اس سے بھی وہی حکومت و سلطنت والا معنیٰ مراد ہو بلکہ موقعہ و محل کے مطابق دوسرے معانی بھی مراد لیے جاسکتے ہیں۔

۲۔ ڈھکو صاحب نے قاضی بیضاوی کی عبارت فی الامور کلھا دیکھ کر سمجھ لیا کہ جب تمام امور میں آپ سب مؤمنین سے اولیٰ ہیں اور ان امور میں حکومت و سلطنت بھی داخل ہے، لہٰذا آپ کا اولیٰ بالحکومت والامارت ہونا ثابت ہوگیا، حالانکہ یہ کوتاہ اندیشی اور تغافل شعاری کا بدترین نمونہ ہے، کیونکہ

تفسیر صافی اور منہج الصادقین میں بھی بالکل وہی کلمات ذکر کیے گئے ہیں یعنی اولی بھم فی الامور کلھا (صافی ج ۲ ص ۱۰۲) اور منہج الصادقین میں ہے: یعنی در ہمہ کارہائے دین و دنیا (ص ۲۸۳) لیکن باوجود اس کے معنی محبوبیت والا مراد ہے، کیونکہ آپ کا نفوس کی نسبت دین و دنیا کے امور میں اولیٰ ہونا مراد ہے، کیونکہ نفس انسانی ہلاکت اور بغاوت کی طرف لے جاتا ہے جبکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم خیر اور بھلائی، نجات و فلاح کی طرف بلاتے ہیں، لہٰذا نفوسِ انسانی انکے دشمن اور مبغوض ٹھہرے کما فی الحدیث: اعدی اعداءک نفسک التی بین جنبیک "یعنی سب دشمنوں سے تیرا بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے" اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم موجب فوز و فلاح ہونے کی وجہ سے محبوب تر ہوگئے۔ لہٰذا اس تفسیری عبارت کو اپنی دلیل بنانے میں بہت بڑی جہالت کا مظاہرہ ہے یا تجاہل کا۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

دوسرا اور تیسرا قرینہ مولیٰ بمعنیٰ اولیٰ بالتصرف پر

(تنزیہہ الامامیہ ص ۱۵۱)

اس حدیث اور اس اہتمام سے واضح ہے کہ جنابِ امیر کی وہ خصوصیت بیان ہو رہی ہے، جس میں اور کوئی صحابیِ رسول آپ کا شریک نہیں اور وہ نہیں مگر یہی اولیٰ بالتصرف۔ ارشادِ ربانی ہے: المومنون بعضھم اولیاء بعض۔ "یعنی بعض مومن دوسرے بعض مومنین کے محب ہیں"۔ یہی معانی اگر یہاں بھی مراد ہوتے تو اس قدر اہتمام و انتظام کی کیا ضرورت تھی؟ جو کہ تحصیل حاصل کو مستلزم ہے اور وہ محال ہے۔ علی الخصوص جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کو عینِ ایمان اور آپ کے ساتھ بغض کو نفاق اور کفر قرار دیا جاچکا تھا، لہٰذا یہ صرف اور صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عملی خلافت کا اعلان تھا، جس کے بغیر کار و بار رسالت اکارت ہو رہا تھا۔

الجواب وھو الملھم للصدق والسداد

غدیرِ خم میں صحابہ کرام کو جمع فرمانا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمانا: من کنت مولاہ فعلیّ مولاہ۔ ڈھکو صاحب کے نزدیک قطعی قرینہ بن گیا کہ یہاں صرف اور صرف اولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلافصل والا معنی ہی مراد ہے۔ محبت والا معنی تو تمام مومنین میں باہم پایا ہی جاتا ہے۔ اگر وہی بیان کرنا مقصود ہوتا، تو اس میں تکرارِ محض ہوتا، لیکن اس قرینہ اور اس کی دلالت میں چند وجوہ سے سقم اور ضعف ہے۔ اس لیے ڈھکو صاحب اور شیعی علماء کے لیے مفید مدعا نہیں ہو سکتا۔

۱۔ از روئے ایمان کے باہم محبت اور الفت کا پایا جانا ضروری ہے، لیکن محبت کے درجات مختلف ہوتے ہیں۔ عمومی وجہ محبت کی پائی جائے، تو اس کے بعد خصوصی وجہ سے محبت کا وجوب ولزوم بیان کرنا تکرارِ بے فائدہ کا موجب نہیں ہے۔ عمومی محبت میں خود حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں، کیونکہ آپ مومن بھی ہیں اور مومن گر بھی، لیکن بحیثیتِ نبی و رسول ہونے کے اور سب کا ہمدرد اور خیر خواہ ہونے کے اور دنیا و آخرت میں منبع انعام و احسان ہونے کے سبب مومنین پر آپ کے ساتھ خصوصی محبت فرض ہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدماتِ اسلام اور جہادِ کفار نیز روحانی فیوض و برکات کا منبع اور سرچشمہ ہونے کے لحاظ سے آپ کے ساتھ بھی مومنین پر خصوصی محبت ضروری اور لازم ہے اور انہیں وجوہات و اسبابِ محبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ نے مختلف مواقع پر مختلف حضرات کے متعلق خصوصی اہتمام کے ساتھ یہ حکم بیان فرمایا۔ چنانچہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کے متعلق فرمایا: فمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم ”جس نے ان سے محبت کی، پس میری محبت کی وجہ سے محبت کی اور جس نے بغض رکھا پس اس نے میرے بغض کی وجہ سے ان کے ساتھ بغض رکھا۔“ اہل بیت کرام کے متعلق بالعموم بھی اور حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہم کے بارے بھی بالخصوص یہ ارشاد فرمایا:

اللّٰھم انی احبّھما فاحبھما واحبّ من یحبّھما۔

”اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں، لہٰذا تو بھی ان کو اپنا محبوب بنا اور ان سے محبت رکھنے والوں کو بھی اپنا محبوب بنا۔“

الغرض بالعموم محبت کا وجوب ولزوم بیان کرنے کے بعد بالخصوص محبت کے وجوب ولزوم کا بیان کرنا بے فائدہ تکرار اور تحصیلِ حاصل کے ضمن میں نہیں آتا، جبکہ اس اہتمام کے ساتھ قبل ازیں کسی کے حق میں محبت کے وجوب لزوم کو بیان نہیں کیا گیا تھا، لہٰذا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ظاہر اور واضح ہو گئی کہ آپ کی محبت کو محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مماثل قرار دیا گیا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے سب بڑوں کی عزت کرو اور بالخصوص والدین کی عزت کرو تو کون عقل و دانش کا دشمن اس کو بے فائدہ تکرار تصور کرے گا کہ والدین بھی بڑے ہوتے ہیں اور سب بڑوں کی عزت و توقیر کے حکم میں ان کے متعلق بھی حکم پایا گیا لہٰذا یہ تکرارِ محض ہے۔

۲۔ نیز اس اہتمام و انتظام کی خصوصی وجوہات بھی تھیں، جن میں ایک ایک وجہ تو یہ ہے آنے والے حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے آپ کی عظمت کا اظہار کیونکہ آپ کے علم میں تھا کہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دشمنی رکھیں گے اور آپ کو کافر و مشرک تک کہیں گے نعوذ باللہ! جیسے خوارج، لہٰذا آپ کی عظمتِ شان بیان فرمائی اور آپ کے ساتھ محبت و مودت کے وجوب و لزوم کو واضح فرمایا تاکہ ہمدردی اور خیر خواہی کا حق ادا ہو جائے اور کسی کو کوئی غلط فہمی اس بارے میں نہ رہے جس طرح کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کے متعلق اس گروہ کا علم ہونے کی وجہ سے جو کہ ان پر سب و شتم کریں گے۔ فرمایا: اذا لقیتم الذین یسبون اصحابی فقولوا لعنۃ اللہ علی شرکم ”جب ان لوگوں سے ملو جو میرے صحابہ کو گالیاں دیتے ہیں، تو کہو لعنت ہو تمہارے شر و فساد پر۔“ اور فرمایا: اللہ اللہ فی اصحابی لاتتخذوھم غرضًا من بعدی

میرے صحابہ کے معاملے میں خدا سے ڈرنا، خدا سے ڈرنا۔ ان کو اپنے اعتراضات کا نشانہ نہ بنا لینا، لیکن بالعموم صحابہ کرام کے ساتھ اس قدر بغض و عناد رکھنے والے نہ تھے، جتنا قدر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغض و عناد رکھنے والے تھے جو کہ صاحبِ قوت و شوکت بھی تھے اور مقابلہ میں آکر لڑنے اور جنگ کرنے والے اور آپ کے روبرو آپ پر کفر و شرک کے فتوے لگانے والے اس لیے آپ کی خاطر زیادہ اہتمام فرمایا۔ بخلاف خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے کہ ہر دور میں ان کے مداح اور ان کی عظمت کے معترف ہی غالب و کامران اور برسرِ اقتدار رہے خواہ بنو امیہ کا دور تھا یا بنو عباس کا یا بعد والے ادوار ماسوائے چند جزوی علاقوں اور اقوام کے اور وہ بھی چھ سات صدیوں کے بعد۔ لہٰذا یہ امر اس اہتمام و انتظام کا داعی اور موجب تھا۔

دوسری وجہ اس اہتمام و انتظام کی یہ تھی کہ سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن میں امیر لشکر بنا کر بھیجا تھا اور یمن سے ہی آپ وافر مقدار میں قربانیاں لے کر مکہ مکرمہ میں حج کے لیے پہنچے اور آپ کے بعض رفقائے کار کو آپ کے خلاف شکایات پیدا ہوئیں اور انہوں نے حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آپ کی شکایت کی، تو اس وقت آپ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق بڑے اہتمام کے ساتھ محبت و مودت کے لزوم کو بیان فرمایا اور ان کو موردِ طعن و تشنیع بنانے سے منع کیا۔ عن بریدة الاسلمی قال غزوت مع علی الیمن فرءیت منه جفوة فلما قدمت علی رسول الله صلی الله علیه وسلم ذکرت علیاً کرم الله وجهه فرءیت وجه رسول الله صلی الله علیه وسلم قد تغیر فقال یا بریدة الست اولیٰ بالمومنین من انفسهم قلت بلیٰ یا رسول الله قال من کنت مولاه فعلی مولاه۔ (رواه احمد و رواه النسائی باسناد قوی جید رجاله کلهم ثقات۔ روح المعانی جلد۶ ص۱۷۳)

حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت میں یمن میں جہاد کیا، تو میں نے ان سے جفا کاری اور شدت و سختی کا مشاہدہ کیا۔ جب بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا، تو آپ کی خدمت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا، تو میں نے دیکھا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ اقدس غصہ سے سُرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا، اے بریدہ! کیا میں مومنین سے ان کے نفوس سے بھی زیادہ محبوب نہیں ہوں؟ تو میں نے عرض کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ! تو آپ نے فرمایا، من کنت مولاه فعلی مولاه۔

نیز محمد بن اسحاق نے یحییٰ بن عبداللہ کے واسطہ سے یزید بن طلحہ سے نقل کیا ہے۔

اقبل علی من الیمن لیلقی رسول الله صلی الله علیه وسلم بمکة فعجل الی رسول الله صلی الله علیه وسلم واستخلف علی جنده الذین معه رجلا من اصحابه فعمد ذالك الرجل فکسا کل رجل حلة من البز الذی کان مع علی کرم الله وجهه فلما دنا جیشه خرج لیلقاهم فاذا علیهم الحلل قال ویلك ما هذا قال کسوت القوم لیتجملوا به اذا قدموا فی النّاس قال ویلك انتزع قبل ان تنتهی الی رسول الله صلی الله علیه وسلم قال فانتزع الحلل من النّاس فردها فی البز واظهر الجیش شکواه لما صنع بهم۔ روح المعانی ج۶ ص۱۷۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے مکہ شریف کی طرف آئے تاکہ حضور نبی اکرم کے ساتھ ملاقات کریں۔ آپ جلدی مکہ شریف کی طرف روانہ ہوئے اور لشکر میں اپنے ساتھیوں میں سے ایک ساتھی کو خلیفہ اور نائب بنایا، تو اس خلیفہ نے اس بزازی سے جو آپ کے پاس تھی، ایک ایک جوڑا ہر سپاہی اور لشکری کو دے دیا۔ جب آپ واپس لشکر کے پاس پہنچے، تو وہ لشکری آپ کی ملاقات کے لیے نکلے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک نیا جوڑا پہنے ہوئے ہے، تو آپ نے اپنے نائب کو بلایا اور فرمایا

تجھ پر ہلاکت ہو، یہ کیا ہے؟ اُس نے کہا: میں نے انہیں یہ پوشاکیں پہنائی ہیں تاکہ جب لوگوں میں آئیں، تو جمال و زینت اور زیبائش و آرائش کے ساتھ آئیں، تو آپ نے فرمایا: ان سے واپس لے لو، قبل اس کے کہ ہم رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پہنچیں، چنانچہ اُس نے وہ جوڑے واپس لے لیے اور اس بزازی میں شامل کر دیئے جو حضرت امیر علیہ السلام کے ساتھ تھی۔ لشکر نے بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کے اس فعل کی وجہ سے آپ کی شکایت کی۔

یہی مفصل روایت شیعی مفسر علامہ فتح اللہ کاشانی نے تفسیر منہج الصادقین میں ذکر کی ہے، جس کا آغاز یوں ہے: چوں امیر المومنین بنزدیک مکہ رسید خلیفہ بر قوم خود تعیین فرمود (تا) ایشاں اظہارِ شکایتِ امیر کردند۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمود کہ علی بن ابی طالب ایں امر را بر وجہ صواب کرد ایشاں منزجر نشدہ بر شکایت اداصرار کردند۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بر منبر آمد و خطبہ فرمود و گفت

ایها النّاس ار فعوا السنتکم عن علی بن ابی طالب فانہ خشن فی ذات اللہ وغیر مداھن فی دینہ۔ چوں خشم و مبالغہ رسول را دیدند زبان کوتاہ کردند۔ تفسیر منہج الصادقین جلد سوم ص ۲۷۷

ترجمہ: یعنی جب حضرت علی رضی اللہ عنہ مع لشکر مکہ شریف کے قریب پہنچے تو آپ نے قوم پر ایک شخص کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا اور خود مکہ شریف میں بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے ( ) اور جب واپس ہوتے اور لشکر کو نئے جوڑے زیبِ تن کیے دیکھا اور اپنے نائب کو اتروانے کا حکم دیا اور اُس نے واپس لے لیے۔ تو ان لشکریوں نے آپ کی شکایت بارگاہِ رسالت پناہ علیہ التحیۃ والثناء میں کی۔ آپ نے فرمایا: علی بن ابی طالب نے صحیح اقدام کیا اور اُن کا یہ فعل بالکل درست اور صواب ہے، مگر وہ باز نہ آتے اور اسی شکایت پر اصرار کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوتے اور خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اے لوگو! اپنی زبانیں علی بن ابی طالب کی شکایت سے روک لو، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں سخت ہیں اور اس کے دین میں مداہنت سے کام لیتے ہوئے مخلوق کی رو رعایت اور ان کے پاس و لحاظ کو احکامِ خداوندی پر مقدم ٹھہرانے والے نہیں ہیں۔ جب ان لشکریوں نے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی اور غصہ کا مشاہدہ کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت اور آپ کی طرف سے دفاع کی سعی اور مبالغہ کو دیکھا، تو اپنی زبانیں بند کر لیں اور اس شکوہ و شکایت سے باز آ گئے۔

وجۂ اہتمام: شیعہ و سُنّی ہر دو کے نزدیک ثابت و متحقق اور ہر دو کی معتبر اور مستند کتب میں مروی اور منقول اس روایت سے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حق میں محبت و مودّت کے وجوب و لزوم کے اس عظیم اہتمام کی وجہ اب واضح ہو گئی، کیونکہ آپ کے زیرِ کمان لشکریوں کو آپ کے خلاف شکایت پیدا ہو گئی تھی اور حجاج کرام میں پھیل چکی تھی اور مشہور و معروف ہو چکی تھی، اس لیے اس کا ازالہ از حد ضروری تھا اور جب تک اس قسم کا اہتمام نہ ہوتا، نہ سب لوگ آپ کی محبت کے وجوب و لزوم اور اس کی اہمیت و ضرورت کو سمجھتے اور نہ ہی ان کے قلوب و اذہان سے یہ وساوس اور خدشات دور ہو سکتے تھے، اس لیے اس قدر اہتمام و انتظام بھی فرمایا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنی جانوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ عزیز اور پیارا سمجھنے کی تلقین فرمائی اور انہیں روایات سے آغازِ خطاب میں اپنے متعلق اس استفسار کی حکمت بھی واضح ہو گئی۔

الست اولیٰ بالمومنین من انفسھم۔ کیا میں مومنین کے لیے ان کے ارواح و نفوس سے بھی زیادہ محبوب نہیں ہوں۔ یعنی جب میں تمہارے لیے مثل والد کے شفیق ہوں اور تمہارے ساتھ اولاد کی طرح محبت رکھنے والا ہوں اور تمہارے نفسانی تقاضوں کے برعکس سراسر تمہاری فلاح و نجات اور اچھائی اور بھلائی میں کوشاں ہوں، تو جو کچھ اب فرما رہا ہوں، یہ بھی تمہاری بہتری

اور خیر خواہی والی صورت ہے، لہذا میرے اس حکم کو عین فلاح و نجات اور سرخروئی اور آبرومندی کا موجب سمجھتے ہوتے اس کی بھی پابندی کرو اور یہی وجہ ہے کہ آخر میں فرمایا "اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ" اے اللہ! جو علی سے دوستی رکھے اس کو تو بھی اپنا دوست بنا اور جو علی سے دشمنی رکھے، تو بھی اُس کو اپنا دشمن بنا، تاکہ محبتِ مرتضیٰ کا موجب فلاح ہونا واضح ہو جائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عداوت کا موجبِ خسران ہونا اور اللہ تعالیٰ کی عداوت کا موجب ہونا معلوم ہو جائے تو اب اس حدیث کے اوّل و آخر اور سیاق و سباق نے واضح کر دیا کہ من کنت مولاہ فعلیّ مولاہ میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت و مؤدت اور الفت و عقیدت کی تاکید اکید ہے اور اس سے خلافت بلافصل کا اثبات سراسر بے موقعہ اور بے محل ہے۔ اور اس جملے یعنی فعلی مولاہ کو ماقبل اور مابعد سے بالکل بے تعلق اور بے جوڑ ثابت کرنے کی، ناکام کوشش کی ہے۔

۳۔ نیز عقلی اور درایتی طور پر بھی اس اہتمام و انتظام کی وجہ واضح ہے، کیونکہ حروب قتال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قریش کے بہت سے آدمی قتل ہو گئے تھے بہ نسبت دوسرے صحابۂ کرام علیہم الرضوان کے کہ ان کے ہاتھوں اس قدر افراد قتل نہیں ہوئے تھے، تو اس امر کا امکان تھا کہ مقتولین کے رشتہ دار و اقربا اور ان کی اولاد اپنے دلوں میں آپ کے متعلق کسی طرح کی کدورت اور رنجش رکھیں، لہذا آپ نے اعلان فرمایا اور بڑے اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا کہ علی مرتضیٰ میرے قریبی ہیں اور بھائی اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ میرے حکم سے کیا اور میں نے جو کچھ کیا اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا۔ لہذا جس طرح تم پر میرے ساتھ محبت لازم ہے اور بغض و کدورت حرام ہے۔ اسی طرح علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے بھی محبت و الفت تم پر لازم ہے اور ان کے ساتھ بغض و عناد رکھنا ممنوع اور چونکہ زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جنگ و جدال اور حرب و قتال کا سلسلہ اب ختم ہو چکا تھا

اس لیے یہ آخری وصیّت اور تاکید اکید فرمائی۔

تکرار اور تحصیل حاصل کے لزوم سے مغالطہ دینے کی سعیٔ مذموم!

علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ حدیثِ غدیر میں علی مولاہ سے محبوبیت والا معنیٰ مراد ہو تو یہ تکرار محض ہونے کی وجہ سے بے فائدہ اعلان ہوگا اور تحصیل حاصل ہونے کی وجہ سے محال اور ناممکن، کیونکہ اس اعلان سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا آپ کی محبّت کے وجوب اور لزوم کو بیان کر دیا تھا۔

اقول: علامہ ڈھکو صاحب قطعی قرائن بیان کرنے لگے تھے، جن کی وجہ سے علی مولاہ کا اولیٰ بالتصرف، حاکم اور خلیفۂ بلافصل کے علاوہ دوسرا کوئی معنیٰ ممکن ہی نہ ہو، لیکن ذکر ایسے قرائن کر رہے ہیں جو اس معنیٰ کی ترجیح اور غلبۂ ظن کا فائدہ بھی نہیں دیتے۔ شاید انہوں نے صرف قطعی کا لفظ سُن رکھا ہے، اور اس کے معنیٰ و مفہوم پر غور کرنے کا موقعہ ہی نصیب نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک اہم حکم تکرار کے ساتھ ذکر کرنا نہ بے فائدہ ہوتا ہے اور نہ وہ تحصیل حاصل جو کہ محال ہے۔ توجّہ کے لیے چند امور سپردِ قرطاس کیے جاتے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے کلامِ مجید میں بیسیوں جگہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ فرمایا ہے۔ اممِ سابقہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کا متعدد مواقع پر ایک ہی قصہ اور واقعہ مختلف اسالیب اور متنوع انداز میں دہرایا ہے اور سورۂ رحمٰن میں کتنی دفعہ فَبِاَیِّ اٰلَاۤءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝ کا تکرار ہے تو بقولِ علامہ ڈھکو صاحب قرآن مجید ہی تکرارِ بے فائدہ اور تحصیلِ حاصل محال کا مجموعہ بن جائے گا۔

۲۔ حدیثِ قرطاس پر بحث کرتے ہوئے ڈھکو صاحب نے کہا کہ حضور نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم بار بار اور مختلف اسالیب وعناوین سے جس خلافت مرتضوی کا ذکر کرتے رہے تھے، اب بھی وہی خلافت لکھنی تھی اور کیا لکھنا تھا؟ یعنی وہاں خلافت کا بار بار ذکر اور تکرار اس آخری موقعہ پر بھی اسی کے مراد ومقصود ہونے کی دلیل ہو گیا، لیکن محبت کا وجوب ولزوم بار بار بیان ہو چکا، تو اب اس کا ذکر بے فائدہ تکرار بھی ہو گیا اور تحصیل حاصل ہونے کی وجہ سے محال بھی ۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد　　جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

علامہ صاحب سے کون پوچھے کہ وہ تکرار کیوں بے فائدہ نہ ہوا اور تحصیل حاصل کا موجب ہونے کی وجہ سے محال کیوں نہ ہوا اور یہ تکرار کیوں بے فائدہ اور مستلزم محال ہو گیا اور کہیں وہ اپنی حالت ہی تو اس شعر میں بیان نہیں کرتے رہے ۔

کبھی گرتا ہوں ساغر پر کبھی گرتا ہوں مینا پر
میری بے ہوشیوں سے ہوش ساقی کے بکھرتے ہیں

۲۔ علامہ ڈھکو صاحب کے بیان کردہ اس قرینہ نے ان کی دلیل کو وزنی کرنے کی بجائے ان کے بہت سے دلائل کا صفایا کر دیا، بلکہ خود اسی دلیل کو بھی ختم کر کے رکھ دیا۔ مثلاً غزوۂ تبوک کے موقعہ پر ہزاروں افراد کی موجودگی میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: انت منی بمنزلة هارون من موسٰی۔ کیا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل کا اعلان ہوا تھا یا نہیں؟ دوسری صورت میں اس کو دلائلِ خلافت کے طور پر پیش کرنا لغو ہو گیا اور پہلی صورت میں جب ہزاروں افراد اور مہاجرین وانصار کے سامنے آپ کی خلافت وامامت کا اعلان ہو چکا تھا، تو اب مَن کنتُ مولاہ فعلی مولاہ کہہ کر اس کا اعلان کرنا بے فائدہ تکرار بن گیا اور تحصیلِ حاصل جو کہ محال ہے ۔

نیز قولِ باری تعالیٰ: انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا الذین یقیمون الصلوة ویؤتون الزکوٰة وھم راکعون ۰

اہلِ تشیع کے نزدیک حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی امامت وخلافت بلافصل کی نصِ قطعی ہے، کیونکہ حالتِ رکوع میں صرف آپ نے ہی زکوٰۃ اور صدقہ دیا تھا اور اس آیتِ مبارکہ کی بار بار تلاوت بھی ہوتی رہی اور نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا فریضۂ رسالت ادا کرتے ہوئے صحابہ کرام کو اس آیت کے معنیٰ ومفہوم کی تعلیم بھی دی ہو گی۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ویعلمهم الکتاب والحکمة اور وہ آیتِ مبارکہ غدیرِ خم کے اس واقعہ سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی؛ لہذا اب غدیرِ خم میں امامتِ مرتضیٰ اور ان کی خلافت بلافصل کا اعلان تکرارِ محض اور تحصیلِ حاصل ہونے کی وجہ سے ممکن ہی نہ رہا۔

الغرض ڈھکو صاحب کے بیان کردہ اس قرینہ سے انہیں اپنے کئی دلائل سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے، لہذا اس کو قرینہ کہنا ہی غلط ہے، چہ جائیکہ قطعی قرینہ کہا جائے۔

کیا اعلانِ خلافت کے بغیر کارِ نبوت اکارت ہو رہا تھا؟

قولِ باری تعالیٰ یا ایها الرسول بلغ ما انزل الیک کی تحقیق

ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ غدیرِ خم کے موقع پر صرف اور صرف اعلانِ خلافت کرانا تھا، کیونکہ اس کے بغیر کاروبارِ رسالت اکارت ہو رہا تھا اور اس جملہ میں جناب کا اشارہ اس آیۂ کریمہ کی طرف ہے: یا ایها الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالته واللہ یعصمک من الناس ان اللہ لا یهدی القوم الکافرین ۰ اور قبل ازیں اس کی تصریح بھی ان کی طرف سے گزر چکی ہے۔ یعنی اے رسولِ معظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جو کچھ آپ کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، اس کو لوگوں تک پہنچاؤ۔ پس اگر آپ نے ایسا نہ کیا، تو آپ نے فریضۂ رسالت ادا نہ کیا اور اللہ تعالیٰ آپ کو ان لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ قومِ کفار کو ہدایت نہیں دیتا۔

اقول: ۱۔ اس طرزِ استدلال اور قرینہ میں بھی وہی سابقہ خرابی اور فساد لازم آئے گا اور یہ سودا مہنگا پڑے گا، کیونکہ جب آیاتِ امامت کی تبلیغ ہو چکی تھی اور فرمانِ رسالت انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ بھی جاری ہو چکا تھا وغیرہ وغیرہ، تو اب یہ اعلان درست ہی نہیں تھا اور تکرارِ محض کی وجہ سے اس میں تحصیل حاصل تھی اور وہ علماء شیعہ کے نزدیک محال ہے، لہٰذا اب اس اعلان پر کاروبارِ رسالت کیونکر موقوف ہو سکتا تھا اور اس کے بغیر وہ اکارت کیوں ہو رہا تھا؟

۲۔ اس آیتِ کریمہ میں خلافت کی تصریح موجود نہیں ہے اور جب اس اعلان کے بغیر کاروبارِ رسالت اکارت جا رہا تھا، تو معلوم ہوا کبھی قرآن و سنت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق خلافت و ولایت کا اعلان اس سے قبل نہیں کیا گیا تھا۔ لہٰذا وہ سارے دلائل جو اس واقعہ سے قبل نازل شدہ آیات سے پیش کیے جاتے ہیں یا سیّدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس واقعہ غدیر سے قبل صادر ہونے والی احادیث سے پیش کیے جاتے ہیں، وہ لغو اور باطل ہو گئے کیونکہ اگر اعلانِ خلافت پہلے ہو چکا ہوتا اور وہ بھی تکرار کے ساتھ تو اب اس پر کارِ رسالت کے موقوف ہونے کا کوئی معنی نہیں تھا اور بقول علماء شیعہ کارِ رسالت تو اسی اعلان پر موقوف تھا، تو یقیناً پہلے سے کوئی اعلانِ خلافت نہیں کیا گیا ہوگا، لہٰذا وہ سارے دلائل غلط ہو کر رہ گئے اور ان کا پیش کرنا لغو اور باطل ٹھہرا۔

۳۔ کیا خلافتِ امیر کا صرف اعلان کر دینا زیادہ اہم تھا؟ یا عملی طور پر ان کو خلافت دینا اور اقتدار ان کے حوالے کرنا اور ظاہر ہے کہ محض اعلان کی بجائے عملی طور پر اقتدار ان کے حوالے کرنا اور خلافت انہیں سونپنا زیادہ مؤثر اور مؤکد امر تھا اور اس سے اس راہ کی ساری مشکلات دُور ہو سکتی تھیں، لیکن نہ نبیٔ مکرّم رسولِ معظّم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کو اقتدار سونپا اور نہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا اور خلافت و امامت کبریٰ کی مسند حوالے کرنا تو بہت اہم معاملہ تھا۔ یہاں تو

مسجدِ نبوی کا مصلیٰ بھی آپ کے حوالے نہیں کیا گیا تھا۔ الغرض جو چیز اہم اور مفید تھی اور جس میں سب مشکلات کا حل تھا، وہ دینا کوئی نہیں اور جو اعلان بقولِ علماء شیعہ کیا گیا، اس کا حضرت امیر المومنین کرم اللہ وجہہ الکریم کو کوئی فائدہ نہ پہنچا کیونکہ سب صحابہ کرام نے متفقہ طور پر وہ خلافت اور اقتدار حضرتِ صدّیق اور فاروق و عثمان رضی اللہ عنہم کے یکے بعد دیگرے حوالے کر دیا، تو اس اعلان پر کارِ رسالت کو موقوف کرنے میں آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کیا آیا؟

۴۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بقولِ شیعہ من کنت مولاہ فعلی مولاہ فرما کر حضرتِ امیر کی خلافت کا اعلان فرما رہے تھے اور اللہ تعالیٰ یہ اعلان کرا رہا تھا جبکہ مہاجرین و انصار نے بالاتفاق خلافت علی الترتیب حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کو دے دی۔ اب دو ہی صورتیں ہیں، یا تو صحابہ کرام کو حکم خداوندی کا مخالف اور حکمِ رسالت کا باغی سمجھا جائے اور دائرۂ اسلام سے خارج نعوذ باللہ اور یا شیعہ حضرات کا یہ مفروضہ غلط اور باطل محض یقین کیا جائے۔

پہلی صورت قرآن مجید کی بیسیوں آیات سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ہزاروں ارشادات اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بےشمار ارشادات کے خلاف ہے، جن کا بطورِ نمونہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اور علی الخصوص حضرتِ امیر کے اس ارشاد کے خلاف ہے: ما کان اللہ لیجمعکم علی ضلال ولا یضرب بہم عمیً۔ (شرح ابن میثم بحرانی مع نہج البلاغہ جلد رابع ص ۳۵۵) یعنی اللہ تعالیٰ کو یہ زیبا نہیں کہ انہیں (مہاجرین کو) گمراہی پر متفق کرے اور نہ یہ کہ انہیں حق سے اندھا اور ناشناسا رکھ کر مارے اور اسی طرح اس ارشاد کے بھی مخالف ہے: فان ابیٰ قاتلوہ علی اتباعہ غیر سبیل المؤمنین۔ (نہج البلاغہ مصری ج ۲، ص ۲) پس اگر کوئی شخص مہاجرین و انصار کے منتخب امام کی بیعت سے ازراہِ طعن و تشنیع اور بدعت خروج

کرتا ہے، تو اسے واپس لوٹانے کی کوشش کرو اور اگر انکار کرے، تو اس کے ساتھ جنگ کرو، بوجہ مومنین کی راہ سے ہٹ کر دوسری راہ پر چلنے کے، جس سے صاف ظاہر اور مہرِ نیمروز کی طرح روشن ہے کہ مہاجرین و انصار کا گمراہی اور ضلالت پر اجماع و اتفاق محال اور ناممکن ہے، جیسے کہ قرآن مجید کا اعلان ہے:

ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولیٰ ونصلہ جہنم وساءت مصیرا۔ "جو شخص مومنین کی راہ سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کرے گا، وہ جدھر مڑے گا، ہم اس کو اُدھر ہی پھیر دیں گے، یعنی شترِ بے مہار کی مانند کر دیں گے اور جہنم میں اسے داخل کریں گے اور بُرا ٹھکانا ہے۔"

لہٰذا قطعی طور پر ثابت ہوگیا کہ مہاجرین و انصار، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر قطعاً اجماع و اتفاق نہیں کر سکتے تھے، تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ شیعہ حضرات کا مفروضہ اعلانِ خلافت ہی غلط ہے اور ارشادِ مصطفوی من کنت مولاہ فعلی مولاہ کا قطعاً یہ معنی نہیں ہے، بلکہ محبوبِ قلوب اور راحتِ ارواح و نفوس والا معنی مراد ہے۔

۵۔ اگر اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل کا اعلان، ہو چکا ہوتا، تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرضِ وصال میں امرِ خلافت کے متعلق دریافت کرنے کا حضرت امیر کو مشورہ نہ دیتے اور یہ نہ فرماتے کہ ہمارا حق ہے تو ہمیں اس کی وضاحت فرما دیں، بلکہ ہمیں عنایت فرمائیں اور اگر ہمارا حق نہیں، تو پھر جس کا حق ہے اور جس کو ملنی ہے، اس کو ہمارے متعلق، وصیت فرمائیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اٹھارہ ذوالحجہ کے اعلان کو دو ماہ بعد بھول چکے ہوں؟ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کیوں فرماتے کہ اگر آپ ہماری خلافت سے انکار فرمائیں، تو کبھی بھی لوگ ہمیں خلافت نہیں دیں گے۔ لہٰذا واضح ہوگیا کہ جملہ مہاجرین و انصار، بلکہ خود اہل بیت علی الخصوص حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے

بھی یہ معنی نہیں سمجھا تھا، جو شیعہ لوگوں نے اختراع کر لیا ہے۔

۶۔ قبل ازیں اس مضمون کے حوالہ جات بکثرت ذکر ہو چکے ہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد لے رکھا تھا کہ خلافت کے لیے نزاع اور اختلاف نہ کرنا نظرت فی امری فاذا طاعتی قد سبقت بیعتی واذا المیثاق فی عنقی لغیری، وغیرہ بلکہ دوسرے خلفاء کی اطاعت کرنا اور ان کی موافقت کرنا، تو اب شیعی علماء بتلائیں کہ اعلانِ خلافت تو اتنا اہم کہ اس کے بغیر کارِ رسالت ہی اکارت ہو رہا تھا اور عملی خلافت اتنی غیر اہم کہ آپ کو حکم دے دیا تھا کہ مل جائے تو بہتر اور نہ ملے تو اختلاف و نزاع سے گریز لازم اور دوسرے خلفاء کی اطاعت فرض۔ تو کیا یہ اعلانِ خلافت تھا یا ایک مزاح اور مذاق تھا، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے متفقہ طور پر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ روا رکھا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

۷۔ بقول شیعی علماء حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت و سلطنت اس قدر اہم تھی کہ اس کے عملی اعلان کے بغیر کارِ رسالت اکارت ہو رہا تھا، لیکن یہی سلطنت حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی نظر میں سراب اور چھٹ جانے والے سحاب۔ بکری کے ناک کی ریزش سے حقیر، کھجور کی جالی کے بنے ہوئے شکستہ جوتے سے بھی کم قیمت بلکہ خنزیر کی اس ہڈی سے بھی حقیر جو جذامی کے ہاتھ میں ہو، تو کیا اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک جو امرِ خلافت اس قدر اہم تھا، اس کو ان تشبیہات کے ذریعے انتہائی ذلیل و حقیر قرار دینا آپ کی طرف سے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولِ مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توہین و تحقیر کا موجب نہیں ہوگا؟ یقیناً موجبِ توہین و تحقیر ہوگا، لہٰذا اس لفظ مولیٰ سے یہ ظاہری حکومت و سلطنت مراد لینا قطعاً غلط ہے تاکہ حضرت امیر کرم اللہ وجہہ الکریم کی طرف اس توہین و تحقیر کی نسبت لازم نہ آئے۔

کیا قولِ باری تعالیٰ یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ کا نزول غدیرِ خم پر ہوا؟

علامہ ڈھکو صاحب کے اس قرینہ اور طرزِ استدلال کا دار و مدار اس مفروضہ پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا نزول غدیرِ خم پر ہوا اور اس کی تعمیل میں سیّدِ رسل صلی اللہ علیہ وسلم نے باہتمامِ تام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ اعلان فرمایا من کنت مولاہ فعلیّ مولاہ لیکن داخلی اور خارجی قرائن سے یہ دعویٰ پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچ سکتا اور جب بنیاد و اساس ہی ختم ہو جائے، تو اس پر قائم عمارت کیونکر برقرار رہ سکتی ہے؟ بلکہ وہ دھڑام سے گر جائے گی، تو آیئے وہ قرائن و شواہد ملاحظہ فرمائیں۔

داخلی قرائن کا بیان

۱۔ پہلا قرینہ یہ ہے کہ قولِ باری تعالیٰ مَا اُنزل الیك من ربّك عام ہے اور عام کو اپنے عموم پر رکھنا لازم اور ضروری ہوتا ہے، جب تک کہ کوئی مخصص موجود نہ ہو اور یہاں قطعاً کوئی قطعی مخصص موجود نہیں ہے، بلکہ ہو سکتا بھی نہیں، کیونکہ احکامِ الٰہیہ میں سے کوئی بھی شیئ اگر آپ اُمّت تک نہ پہنچائیں، تو یقیناً فریضۂ رسالت کی ادائیگی کما حقہٗ نہیں پائی جائے گی، لہٰذا اس آیت کو حضرتِ امیر کی خلافت بلا فصل کے اعلان کے ساتھ مخصوص کرنا اس عموم کو باطل ٹھہرانے کے مترادف ہے، جو بالکل قواعد و اصول کے خلاف ہے۔

۲۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ قولِ باری تعالیٰ واللہ یعصمك من النّاس میں تبلیغِ رسالت پر عصمت و حفاظت کی ضمانت اس وقت زیادہ ضروری تھی، جب آپ تنہا تھے یا صرف چند معدود آدمی حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے، نہ کہ جب آپ کی حکومت و سلطنت پورے عرب پر قائم تھی اور ہزاروں جاں نثار

آپ کے ادنیٰ اشارہ پر کٹ مرنے کو تیار تھے، لہٰذا اس آیت کا تعلق غدیرِ خم کے ساتھ قائم کرنا اور ابتدائی دورِ رسالت سے نہ کرنا، کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا۔

۳۔ تیسرا قرینہ یہ ہے کہ قولِ باری تعالیٰ: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ مقامِ تعلیل میں واقع ہے اور جہاں بھی اِنَّ کے ساتھ جملہ کا آغاز کیا جاتا ہے اور آیت کا اتمام اس پر کیا جاتا ہے، وہ حکمِ سابق کی علت پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر علم کی بات ہوگی، تو اس کی علت یوں بیان کی جائے گی، اِنَّ اللّٰہ علیم خبیر اور قدرتِ خداوندی سے متعلق امر کا تذکرہ ہوگا، تو اس کے آخر میں اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر ذکر کر دیا جائے گا، وعلیٰ ہذا القیاس لہٰذا یہاں بھی یہ جملہ مقامِ تعلیل میں ہے، تو مقصد یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کفار کو تمہارے لئے ضرر اور نقصان پہنچانے کی راہ پر نہیں چلنے نہیں دے گا اور یا یہ مقصد ہوگا کہ جو شخص کفر پر اصرار کرے، تو آپ اسے تبلیغِ رسالت میں تقصیر اور کوتاہی نہ سمجھیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچانا چاہتا، اس لیے وہ ہدایت حاصل نہیں کر رہے نہ کہ تمہاری تبلیغ میں کوئی کسر رہ گئی ہے، لیکن اگر شیعہ حضرات کا دعویٰ درست تسلیم کیا جائے، تو لازم آئے گا کہ حضور نبیٔ معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو ولایتِ علی کے اعلان میں صحابہ کرام مہاجرین و انصار سے ڈر اور خوف لاحق تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حوصلہ دلایا اور دلیر کیا حالانکہ اس کا بطلان اظہر من الشمس ہے، کیونکہ جب آپ اکیلے تھے اور کفار و مشرکین سے خوفزدہ نہ ہوئے، تو اب خدام و مخلصین کے بکثرت موجود ہونے کے باوجود کیونکر خوفزدہ ہو سکتے تھے؟ لیکن شیعہ حضرات نے حضور نبیٔ محترم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان سے خوفزدہ اور لرزہ براندام ماننے میں ذرا بھر جھجک اور تامّل سے کام نہیں لیا۔ پہلے حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں، پھر اس توہّم کا بطلان مشاہدہ کریں۔

بقولِ شیعی علماء خلافت امیر کے اعلان میں رسولِ معظّم صلی اللہ علیہ وسلم کا پس و پیش

فلما وقف بالموقف اتاه جبرئیل علیه السلام عن الله تعالیٰ فقال یا محمّد انّ الله یقرءك السلام ویقول لك قد دنیٰ اجلك ومدتك (الیٰ) فاقم (علی بن ابی طالب) للنّاس علما وجدد (عهده ومیثاقه وبیعته (الیٰ) فخشی رسول الله صلی الله علیه وسلم قومه واهل النفاق والشقاق ان یتفرقوا ویرجعوا جاهلیة لما عرف من عداوتهم ولما ینطوی علیه انفسهم لعلیٍّ من البغضة وسأل جبرئیل علیه السلام ان یسأل ربه العصمة من الناس وانتظر ان یاتیه جبرائیل علیه السلام بالعصمة من النّاس من الله فاخر ذالك الیٰ ان بلغ مسجد الخیف فامره ان یعهد عهده ویقیم علیًا للنّاس ولم یاته بالعصمة من الله الّذی اراد حتّی اتیٰ کراع الغمیم بین المکّة والمدینة فاتاه جبرئیل وامره بالذی اتاه من قبل الله تعالیٰ ولم یاته بالعصمة فقال یا جبرئیل انی اخشیٰ قومی ان یکذبونی ولا یقبلوا قولی فی علیٍّ فرحل فلما بلغ غدیر خم قبل الجحفة بثلاثة امیال اتاه جبرئیل (الیٰ) فقال یا محمد انّ الله یقرءك السلام ویقول لك (یا ایها الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك فی علی وان لم تفعل فما بلغت رسالته والله یعصمك من النّاس۔ (تفسیر صافی جلد اول صفحہ ۱۶۶ تا ۱۶۷)

ترجمہ: "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موقف یعنی عرفہ میں ٹھہرے، تو جبرئیل امین آپ کی خدمت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ سلام فرماتا ہے اور یہ حکم دیتا ہے کہ آپ کا وقتِ وصال قریب آچکا ہے اور مدّتِ تبلیغ پوری ہونے والی ہے (تا) لہٰذا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو لوگوں کے لیے علمِ ہدایت قائم کیجئے اور ان کے عہد و میثاق اور بیعت کی تجدید کیجئے۔ رسول اللہ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو اپنی قوم سے اور اہلِ نفاق و شقاق سے خطرہ لاحق ہوا کہ وہ جدا نہ ہو جائیں اور جاہلیت کی طرف نہ لوٹ جائیں بسبب اس کے کہ آپ ان کی عداوت کو جان چکے تھے اور بسبب اس کے کہ ان کے نفوس بغضِ علی کو چھپائے ہوئے تھے اور آپ نے جبرائیل علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے لوگوں سے عصمت اور تحفّظ کی ضمانت فراہم کرنے کا مطالبہ کریں اور آپ اس انتظار میں رہے کہ جبرئیل امین اللہ تعالیٰ کی طرف سے عصمت کا عہد لے کر نازل ہو تو ولایت کا میں اعلان کر دوں، لہٰذا آپ نے اس اعلان کو مؤخّر کر دیا۔ یہاں تک کہ آپ مسجدِ خیف میں پہنچ گئے، تو پھر جبرائیل علیہ السّلام نے اس عہد کا حکم دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لوگوں کا امام اور خلیفہ متعیّن کرنے کا حکم پہنچایا، لیکن اس دفعہ بھی وہ اس عہد و پیمان کے بغیر ہی نازل ہوئے، جس کا آپ نے مطالبہ کیا، حتّٰی کہ آپ کراع الغمیم تک پہنچ گئے جو مکّہ مکرمہ اور مدینہ منوّرہ کے درمیان ہے، تو اس وقت جبرئیل السلام نازل ہوئے اور جو حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے تھے، اس کی تبلیغ کا حکم دیا، لیکن عصمت اور تحفظ کی ضمانت جس کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے مطالبہ کیا تھا، وہ اب بھی نہ لائے، تو آپ نے فرمایا اے جبرئیل! مجھے اپنی قوم سے تکذیب کا اندیشہ ہے اور علی مرتضیٰ (کرم اللہ وجہہ الکریم) کے بارے میں میرے قول کے قبول نہ کرنے کا خوف ہے (لہٰذا میں بغیر عصمت کی ضمانت کے اعلان نہیں کرتا)، تو آپ نے وہاں سے (بغیر ولایتِ علی کا اعلان کیے اور حکم خداوندی پر عمل کیے) کوچ فرمایا، تو آپ جب غدیرِ خم پر پہنچے جو جحفہ سے تین میل پیچھے

ہے، تو جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے اور سخت تاکیدی حکم بمع تہدید و توبیخ کے اور ضمانتِ عصمت کے لائے) اور کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ فرماتا ہے؛

یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک فی علی وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس۔

اے رسول! جو کچھ آپ کی طرف علی (رضی اللہ عنہ) کے متعلق نازل کیا گیا ہے، وہ لوگوں تک پہنچا دو اور اگر اس طرح نہیں کرو گے، تو تم نے فریضۂ رسالت ادا نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ تمہیں لوگوں (کی ایذا اور تکلیف) سے محفوظ رکھے گا۔"

۲۔ فانزل اللہ هذه الایة تشجیعًا له علی القیام بما امرہ اللہ تعالیٰ باداءہ الخ تفسیر مجمع البیان للطبرسی جلد ۲، ص ۲۲۳

شیعی مفسر علامہ طبرسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ولایت علی کے اعلان والے فریضہ کی ادائیگی پر دلیر کرنے اور حوصلہ دلانے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔

نبی الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اندیشہ ناک اور خوف زدہ ہونے والے توہم کا بطلان

اس عبارت میں آپ نے غور فرمایا کہ کس طرح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعلان میں تاخیر و التواء اور ٹال مٹول سے کام لیا اور نو ذوالحجہ میں نازل ہونے والے حکم کو عرفہ میں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی بجائے بار بار اصرار کے باوجود اٹھارہ ذوالحجہ کو مکہ مکرمہ سے بہت دور غدیر خم کے مقام پر پورا کیا اور وہ بھی اس وقت جب عصمت و حفاظت کی ضمانت بھی حاصل ہوئی اور تعمیلِ حکم نہ ہونے کی صورت میں رسالت بھی ہاتھ سے جاتی دیکھی، حالانکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعتِ خداوندی اور خداداد جرأت و شجاعت کے پیشِ نظر یہ توہم سراسر باطل اور لغو ہے، کیونکہ؛

۱۔ جب ساری دنیا پر کفر تھا اور بیت اللہ شریف میں تین سو ساٹھ بتوں کی پوجا جاری تھی، اُس وقت اعلانِ توحید اور بتوں کی الوہیت کی نفی اور انکار اور ان کی مذمت کرتے وقت تو عصمت اور تحفظ کی ضمانت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور پہلی دفعہ حکم ملتے ہی تعمیل کر دی، مگر اب تمام انصار، بنو ہاشم اور بنو عبد مناف اور عرب کے اطراف و اکناف سے اہلِ اسلام کی امداد و اعانت حاصل ہونے کے باوجود اتنا خطرہ لاحق ہو گیا اور وہ بھی صرف آپ کی ذات کو، نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات کو، جنہوں نے امام اور خلیفہ بننا تھا اور اقتدار کے خواہشمند حضرات کے اقتدار سے محروم ہونے کا سبب بننا تھا۔

۲۔ علاوہ ازیں اس اعلان سے اگر خطرہ لاحق ہوتا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خطرہ لاحق ہونا تھا، کیونکہ ان کی طرف سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کر دینے سے تو اُلٹا اقتدار جلدی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مل جانا تھا، اس میں اُن کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ اگر فائدہ کی کوئی ممکنہ صورت تھی تو یہی کہ حضرت علی کو شہید کر دیتے اور یہ امر ناممکنات میں سے بھی نہیں تھا، کیونکہ ابن ملجم اگر یہ اقدام کر سکتا تھا، جو جرأت و شجاعت میں قطعاً کوئی مقام نہیں رکھتا تھا، تو قریش کے لیے یہ کیونکر ناممکن اور محال تھا؟ الغرض جس ہستی کو ایسی ضمانت کی اشد ضرورت لاحق تھی، نہ انہوں نے ضمانت طلب کی اور نہ ہی اُن کے لئے نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے مطالبہ کیا اور نہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اس ضمانت کا اعلان فرمایا اور جن کو اہلِ اسلام سے ضمانتِ عصمت حاصل کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، وہ اس کے طلب میں بھی اس قدر اصرار سے کام لیتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی صرف انہیں کے لیے عصمت کا وعدہ فرمایا، جس کی نگاہِ عقل و خرد میں اور تجربات و مشاہدات کی روشنی میں قطعاً کوئی ضرورت اور نہ موزونیت، لہذا روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ اندیشہائے دور دراز شیعہ حضرات کی افسانہ نگاری ہے اور سبائی ذہنیت

کا مظاہرہ ہے، جس میں خود دامنِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی آلودہ کرنے کی ناپاک سعی سے گریز نہیں کیا گیا اور عقلمندی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا گیا۔

۳- نیز اس قدر تہدید و تشدید اور وعید و تغلیظ کے بعد بھی بقول علامہ طبرسی، صاحبِ "الاحتجاج" سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطریقِ صراحت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان نہ فرمایا، بلکہ صرف بطورِ تعریض اور اشارہ اس کا ذکر فرمایا۔ ملاحظہ ہو احتجاج طبرسی ص۲۵۵۔ قبل ازیں عبارت ذکر کی جا چکی ہے، تو آخر تعریض اور کنایہ میں کونسا ایسا خطرہ لاحق تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ کو اس قدر سخت حکم نازل کرنا پڑا، تب آپ نے اس حکم کی تعمیل فرمائی اور وہ بھی ناقص اور ناتمام طریقہ پر، جس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ اگر دھمکیاں دے کر اور تغلیظ و تشدید فرما کر اعلان کرانا تھا، تو صریح اعلان تو کرایا جاتا اور آپ کو اس منصب پر عملی طور پر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو فائز کرنے کا حکم دیا جاتا۔

۴- نیز لازم آئے گا کہ سب مہاجرین و انصار اور ان کے تابعین بالاحسان قومِ کفار میں سے ہوں، العیاذ باللہ! جیسے کہ ان اللہ لا یھدی القوم الکافرین کا تقاضا ہے، حالانکہ وہ تو غیظ کفار و مشرکین ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم (الیٰ) لیغیظ بھم الکفار۔ یعنی اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں اور صحابہ کرام کے ذریعے کفار کو غیظ و غضب کی آگ میں جلانا چاہتا ہے اور وہ خود بھی اور اس کے محبوب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ان کو دیکھ کر باغ باغ ہوتے ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ یعجب الزراع جیسے کہ کھیتی بان اپنی کھیتی کو پھلتے پھولتے دیکھ کر خوش و خرم ہوتا ہے۔

الغرض یہ تو تھے داخلی قرائن، اب مفسرین کے نقل کردہ شانِ نزول کی روایات اور خارجی قرائن کے ذریعے، اس آیتِ کریمہ کے معنیٰ و مفہوم کا تعین کیا جاتا ہے۔

قولِ باری تعالیٰ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک کا شانِ نزول اور خارجی قرائن

شیعی فاضل نے بار بار دعویٰ کیا اور بلند بانگ اعلان کیا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافتِ بلافصل کا اعلان کیے بغیر کارِ رسالت و نبوت اکارت اور برباد ہو رہا تھا اور اس دعویٰ کی صداقت کا دار و مدار اس پر تھا کہ یہ آیتِ کریمہ اس موقعہ پر نازل ہوئی ہو، جبکہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ولایت کا اعلان ہو رہا تھا، یعنی غدیرِ خم میں جیسے کہ تفسیرِ صافی میں یہ تاثر دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کے غدیرِ خم میں نازل ہونے پر نہ ہی علماءِ اسلام کا اجماع ہے اور نہ ہی جمہور اس کے قائل ہیں اور اگر اس کے قائل ہیں، تو صرف شیعہ حضرات تو ایسی صورت میں علامہ ڈھکو صاحب کا بیان کردہ قرینہ ہی یقینی طور پر موجود نہ ہوا، تو اس کے ذریعے مولیٰ کا معنیٰ خلیفہ بلافصل کیسے قطعی طور پر ثابت ہو گیا ع قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

۱- علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں کہا، قد اکثر المفسرون فیہ الاقاویل فقیل ان اللہ بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم برسالۃ ضاق بھا ذرعا وکان یھاب قریشا فازال اللہ بھذہ الایۃ تلک الھیبۃ عن الحسن۔ وقیل یرید ازالۃ التوھم من ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کتم شیئا من الوحی للتقیۃ عن عائشۃ وقیل غیر ذالک۔ یعنی مفسرین نے اس آیت کے شانِ نزول میں بہت سے اقوال نقل کیے ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا، تو آپ تنگ دل ہوئے اور آپ قریش کی طرف سے خوفزدہ تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ کے ذریعے وہ خوف اور ہیبت زائل فرما دی اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ

اس آیۂ کریمہ سے اس توہم کا ازالہ کرنا مقصود ہے کہ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بطورِ تقیہ اور خوف و اندیشہ کچھ وحی چھپالی تھی اور اس کا اظہار نہیں کیا تھا اور اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں ۔ (مجمع البیان، جلد ثانی، ص ۲۲۶)

۲۔ تفسیر منہج الصادقین میں علامہ فتح اللہ کاشانی صاحب نے بھی اس آیت کا یومِ غدیر میں نزول صرف بعض علماءِ اہل سنت کے حوالہ سے نقل کیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ مفسرین اور علماء کی اکثریت اس آیت کو غدیرِ خم اور قولِ مصطفوی من کنت مولاہ فعلیٌّ مولاہ سے متعلق نہیں سمجھتی ۔۔۔

ملاحظہ ہو، منہج الصادقین جلد سوم ص ۲۷۳ نزد بعضے از اعاظم اہل سنت و اجماعِ اہل بیت ایں آیت در غدیرِ خم نازل شدہ و ازاں جملہ علی بن احمد الواحدی کہ یکے از افاضل و مشاہیرِ اہل سنت است الخ یعنی بعض اعاظم اہل سنت اور اجماعِ اہلِ بیت سے منقول ہے کہ یہ آیت غدیرِ خم میں نازل ہوئی تھی ۔۔۔ ان اہل سنت میں سے واحدی اور ثعلبی کا ذکر ہے، جن کا حال بعد میں ذکر کیا جائے گا اور اہل بیت کے اکابرین کو ہمیشہ شیعہ راویوں کے افتراء اور بہتان تراشی سے شکایات رہیں جیسے رجال کشی اور تنقیح المقال وغیرہ میں تصریح ہے، لہٰذا ان کے اجماع کا دعویٰ ان راویوں کی زبانی جن کو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کذاب، مفتری، یہودی اور مجوسی کہیں کس طرح قابلِ اعتبار ہو سکتا ہے ۔؟

۳۔ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے درِ منثور میں نقل کیا ہے:

اخرج ابن مردویہ والضیاء فی المختارۃ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای آیۃ انزلت علیک من السماء اشد علیک فقال کنت بمنٰی ایام الموسم واجتمع مشرکوا العرب وافناء الناس فی الموسم فنزل علیَّ جبرئیل فقال یا ایہا الرسول بلّغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلّغت رسالتہ

واللہ یعصمک من النّاس قال فقمت عند العقبۃ فقلت ایّہا النّاس من ینصرنی علیٰ ان ابلغ رسالۃ ربی ولکم الجنّۃ ایہا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ وانا رسول اللہ الیکم تنجحوا ولکم الجنّۃ قال فما بقی رجل ولا امرءۃ ولا صبیّ الا یرمون علیَّ بالتراب والحجارۃ ویبصقون فی وجہی ویقولون کذاب صابئ الخ درِ منثور جلد ثانی، ص ۲۵۸ وکذا فی روح المعانی جلد سادس ص ۱۷۲

"یعنی ابنِ مردویہ نے نقل کیا ہے اور ضیاء نے مختارۃ الصحاح میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ آپ پر آسمان سے نازل ہونے والی آیات میں سے کون سی آیت زیادہ گراں بار اور سخت تھی، تو آپ نے فرمایا کہ میں ایامِ موسم میں منیٰ کے مقام پر موجود تھا اور سارے عرب کے مشرکین اور انواع و اقسام کے لوگ جمع تھے، تو جبرئیل علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے: یا ایّہا الرّسول بلّغ ما انزل الیک الآیۃ تو میں پہاڑی کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور بآوازِ بلند کہا: اے لوگو! تم میں سے کون ہے جو رسالت کے احکام کی تبلیغ میں میری امداد اور اعانت کر کے جنت کا حقدار بنے۔ اے لوگو! کہو لا الٰہ الا اللہ اور میں تمہاری طرف اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تم نجات پاؤ گے اور تمہارے لیے جنت ہو گی۔ آپ نے فرمایا: میرا یہ کہنا تھا کہ منیٰ میں موجود ہر مرد و عورت اور بچے نے مجھ پر مٹی پھینکنی شروع کر لی اور بعض پتھر مارنے لگے اور میرے منہ پر تھوکنے لگے اور کہتے تھے کہ یہ جھوٹے ہیں اور باپ دادے کے دین کو بدل ڈالنے والے۔

فائدہ ۱: اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ آیۂ کریمہ حجۃ الوداع

کے موقع پر نازل نہیں ہوئی تھی، کیونکہ اس موقعہ پر منیٰ میں مشرکین و کفار کب تھے، بلکہ اس سے پہلے سال حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھیج کر اعلان کرادیا گیا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک خواہ کسی علاقہ کا بسنے والا ہو، وہ حج نہیں کرسکتا۔ نیز مکہ مکرمہ آپ کی مملکت کا حصہ تھا اور آپ پورے عرب کے حاکم اور بادشاہ بھی بن چکے تھے اور قریش و دیگر قبائل فتح مکہ کے بعد جوق در جوق حلقۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے یا دور دراز علاقوں کی طرف فرار ہو گئے تھے اور وہاں پناہ گزیں ہو چکے تھے، تو ان کے مردوں، عورتوں اور بچوں کی طرف سے اس قسم کے تشدد اور بے حرمتی کا آپ کو کیسے سامنا کرنا پڑ گیا، لہٰذا مہرِ نیمروز کی طرح روشن اور واضح ہوگیا کہ یہ واقعہ ہی ہجرت سے پہلے کا ہے اور عرب دَورِ جاہلیت میں حج کیا کرتے تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان قبائل کے پاس تشریف لے جا کر توحید و رسالت کا اعلان فرماتے اور انہیں دینِ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دیتے تھے اور یہیں پر آپ نے اوس و خزرج کے قبائل کو بھی دو مرتبہ دعوتِ اسلام دی اور انہوں نے آپ کی دعوت قبول کرتے ہوئے آپ کا طوقِ غلامی اپنے گلے میں ڈالا اور بیعت کی، جس کو کتبِ سیر اور تواریخ میں عقبۂ اولیٰ اور عقبۂ ثانیہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے اور یہیں پر ان کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ منورہ جانے کی صورت میں ہر ممکن تعاون اور تحفظ فراہم کرنے کا معاہدہ ہوا تھا۔ الحاصل قبائلِ عرب اور قریش ہر سال جمع ہوتے تھے اور آپ ان کی قیام گاہوں پر جا کر رؤسا کو علیحدگی میں دعوتِ اسلام دیتے تھے، مگر اس موقعہ پر کھل کر اسلام کی دعوت دینے کا حکم کیا گیا اور آپ نے ہر ممکن ردِّ عمل اور تشدد کی پرواہ کیے بغیر وہ حکم پورا کیا اور تعمیلِ حکم میں کسی مصلحت اندیشی اور فکرِ فردا کو دخل انداز نہ ہونے دیا۔

الغرض آیتِ مبارکہ کے الفاظ و کلمات اور یہ روایت بالکل باہم منطبق ہیں اور روایتی اور درایتی اور داخلی و خارجی قرائن بھی اسی کے مؤید ہیں، لہٰذا

یہی روایت اور اُس کے موافق و مطابق دیگر روایات جو اس آیت کے شانِ نزول کے ضمن میں درِ منثور اور رُوح المعانی وغیرہ میں نقل کی گئی ہیں، وہی راجح اور مختار ہیں اور لائقِ اعتداد و اعتبار اور جن روایات میں اس کا حجۃ الوداع کے موقعہ پر نزول تسلیم کیا گیا، وہ قطعاً قابلِ اعتبار اور لائقِ اعتداد نہیں ہیں، بلکہ راوی کی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔

فائدہ ۲:۔ نیز اس روایت سے مغالطہ کی وجہ بھی واضح ہوگئی کہ یہ آیتِ کریمہ منیٰ میں نازل ہوئی تھی اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس ہجری میں حج ادا فرمایا تھا جو حجۃ الوداع کے نام سے معروف ہے۔ لہٰذا اس آیت کا نزول حجۃ الوداع کے موقعہ پر تسلیم کیا گیا اور یہ تمیز اور تفریق نہ کی گئی کہ ہجرت سے قبل بھی آپ نے حج فرمائے تھے، گو اس وقت حج فرض نہیں کیا گیا تھا اور اہلِ جاہلیت بھی اپنے نظریہ کے مطابق ان مقاماتِ مخصوصہ کی زیارت کے لیے جمع ہوتے تھے اور اس کو موسم یا ایام الموسم سے تعبیر کیا جاتا تھا، لہٰذا اس غلط فہمی کی وجہ سے ہجرت سے پہلے کے واقعہ کو حجۃ الوداع پر چسپاں کر دیا گیا اور اس موقعہ پر نازل ہونے والی آیت کو غدیر خم کے واقعہ پر کفار و مشرکین سے تحفظ اور عصمت کے وعدہ کو مہاجرین و انصار اور اہلِ اسلام سے حفاظت اور تحفظ پر منطبق کر دیا گیا اور توحید و رسالت اور دیگر احکامِ شرع اور فرائضِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مفروضہ خلافت بلا فصل پر چسپاں کر دیا گیا، حالانکہ اس خلافتِ بلا فصل اور عقیدۂ امامت کی فرضیت کا پہلا انکشاف عبداللہ بن سبا پر ۳۵ھ میں خلافتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے دوران ہوا تھا اور لفظِ مولیٰ کے واضح اور معروف معنیٰ کو بھی چھوڑ کر نئے معنیٰ پر منطبق کر دیا گیا، حالانکہ نہ آیت کو اس موقع محل سے کوئی تعلق تھا اور نہ لفظ مولیٰ کو اس مفروضہ معنیٰ کے ساتھ۔ روایات تفصیلاً ملاحظہ کرنی ہوں تو "درِ منثور" کا مطالعہ فرمائیں اور شیعی استدلال کا ابطال ملاحظہ کرنا ہو تو "روح المعانی" کا متعلقہ مقام مطالعہ فرمائیں۔

۳- نیز یہ حقیقت بھی محتاجِ بیان نہیں کہ شانِ نزول کی روایات کا وہ درجہ نہیں ہوتا، جو کہ کتبِ صحاح میں مروی احادیث کا ہے، بلکہ ان میں بکثرت ضعیف، بلکہ موضوعات بھی موجود ہیں اور شیعی علماء بالعموم اور محمد حسین ڈھکو صاحب بالخصوص تصریح کرتے ہیں کہ ہم اپنی صحاح اربعہ میں بھی منقول ہر روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ رسالہ تنزیہہ الامامیہ ص ۱۰۳ تو پھر اہلِ سنت کو ایسی کتابوں کی روایات سے الزام کیونکر دے سکتے ہیں، جو ہر قسم کی ضعیف اور موضوعات پر مشتمل ہوں جبکہ اہل السنت کی صحیح ترین کتاب حدیث بخاری شریف میں قول باری تعالیٰ: الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینًا کا نزول عرفہ کے دن یعنی نو ذوالحجہ بروز جمعہ عرفات کے میدان میں مروی و منقول ہے، لہٰذا اس کے خلاف جو روایت بھی ہوگی، وہ اس اصح الکتب کے معارض نہیں ہو سکے گی، بلکہ متروک اور ناقابلِ اعتقاد و عمل ہوگی اور جب اس آیت کا نزول عرفات میں نو ذوالحجہ کو تسلیم کیا جائے، تو حضرات شیعہ کی ساری نظریاتی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے، کیونکہ دین کی تکمیل اس دن ہو جائے، تو غدیر خم میں من کنت مولاہ فعلی مولاہ کے اعلان پر رسالت کا دارومدار کیونکر ہو سکتا ہے اور اس کے بغیر کارِ رسالت اکارت کیونکر ہوگی، کیونکہ اس امر پر فریقین کا اتفاق ہے کہ یوم عرفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کا اعلان نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اس کے نو دن بعد وقوع پذیر امر کو موردِ اکمال اور محلِ اتمام کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور یہ اعلان نہ کرنے پر رسالت کے اکارت ہونے کی دھمکی کیونکر دی جا سکتی تھی؟

الغرض صحیح وجہ غدیر خم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق من کنت مولاہ فعلیّ مولاہ کے اعلان کی وہی ہے جو قبل ازیں ذکر کی جا چکی ہے کہ لشکرِ یمن کو حضرتِ امیر علیہ السلام سے شکایت پیدا ہوئی تھی اور ان کے دلوں میں غم و غصہ پیدا ہو گیا کہ انہوں نے سرفروشانِ اسلام کے بدن پر سے کپڑے اتروا

لیے ہیں اور ان کی سرفروشی اور جاں نثاری کی کوئی قدر نہیں کی، بلکہ بخل اور کنجوسی کا مظاہرہ کیا ہے العیاذ باللہ! تو اس شکایت کو دور کرنے اور اس غم و غصہ کو زائل کرنے کے لیے حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح اہتمام فرما کر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی بارگاہ رسالت میں قدر و منزلت ظاہر فرمائی اور اہل اسلام پر ان کی محبت و مودت کے وجوب و لزوم کو تاکیدی انداز میں بیان فرمایا: ھٰذا ھو الحق فماذا بعد الحق الا الضلال۔ نہ اس موقعہ پر یہ آیت: یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک (الآیہ) نازل ہوئی اور نہ ہی وہ مولیٰ بمعنی خلیفہ بلافصل ہونے کا قطعی قرینہ بن سکتی ہے۔ مولیٰ بمعنی خلیفہ بلافصل کے دعویٰ میں بھی شیعہ حضرات منفرد ہیں اور اس آیتِ کریمہ کا نزول غدیر خم کے مقام پر تسلیم کرنے میں بھی گویا ڈھکو صاحب کا حاصلِ استدلال یہ ہوا کہ چونکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ مولیٰ بمعنی خلیفہ بلافصل ہے اور ہمارا دعویٰ ہے کہ اس اعلانِ ولایت کے بغیر کارِ رسالت اکارت ہو رہا تھا کیونکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے مقام پر نازل ہوئی، لہٰذا اہل السنت کے نزدیک بھی خلافت بلافصل حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ثابت ہوگئی ع

ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہیے

تنبیہ: کسی بھی مدعا کے اثبات کے لیے برہانی مقدمات میسر ہوں، تو وہ قطعی نظریہ اور عقیدہ کہلائے گا اور مظنون مقدمات ہوں گے، تو وہ عقیدہ اور نظریہ بھی ظنی ہوگا۔ جب نظریہ امامت کو اہلِ تشیع قطعی عقائد میں سے شمار کرتے ہیں، تو اس پر استدلال بھی قطعی اور یقینی مقدمات سے ہونا چاہیے، جو یہاں بالکل موجود نہیں اور جو کچھ پیش کیا جاتا ہے، وہ اُن کے اپنے مزعومات اور مفروضات ہیں جن کی تائید نہ واقعات و حقائق سے ہوتی ہے اور نہ ہی اہل سنت کے مسلمات سے لہٰذا یہ انداز استدلال نہ برہانی ہوا اور نہ ہی جدلی۔ اور یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اہل السنت کی کسی کتاب میں کوئی روایت موجود ہونے سے یہ سمجھ لینا کہ یہ ان کے مسلمات سے ہے، سراسر غلط ہے اور خود فریبی کیونکہ فریقین کی کتب میں ہر قسم کی روایات موجود ہیں،

صحیح وحسن ہیں، تو ضعیف اور موضوعات بھی ہیں، لہٰذا واضح ہوگیا کہ اس قرینہ کو قرینہ کہنا ہی صحیح نہ تھا، چہ جائیکہ اسے قطعی کہا جاتا اور اس کے ذریعے مولیٰ بمعنیٰ اولیٰ بالتصرف اور حاکم والا معنیٰ قطعی طور پر متعین ہوجاتا۔

تنزیہہ الامامیہ

چوتھا قرینہ کہ مولیٰ بمعنیٰ اولیٰ بالتصرّف اور خلیفہ بلافصل ہے!!

حارث ابن نعمان فہری کا واقعہ اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ حدیثِ غدیر میں مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرّف یعنی حاکم وسردار ہے اور وہ اہل زبان سے تھا۔ اس نے اس لفظ سے وہی معنی سمجھا اور اپنی شقاوت اور بدبختی کی وجہ سے اپنی ہلاکت منظور کرلی، مگر ولایتِ علوی اور خلافتِ مرتضوی کا اقرار نہ کیا (رسالہ ص ۱۵۱)

الجواب وھو الموفق للصدق والصواب

اس قرینہ کو ذکر کرتے وقت بھی شیعہ علماء نے حقائق سے آنکھیں بند کرلیں، ورنہ وہ کبھی بھی یہ استدلال پیش کرنے کی جرأت نہ کرتے۔ پہلے ان کی بیان کردہ مفصل روایت ملاحظہ ہو، جس کی طرف علامہ موصوف نے صرف اشارہ کردیا ہے پھر اس کے وجوہ بطلان ملاحظہ فرمائیں۔ علامہ فتح اللہ کاشانی اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں۔ (منہج الصادقین، جلد سوم ص ۲۷۴/۲۷۵)

ثعلبی آوردہ است کہ چوں حکایتِ نصب شاہِ اولیاء منتشر و ایں قصہ مشہور گشت حارث بن نعمان فہری بر ناقہ نشست و متوجہ مدینہ شد از برائے آنکہ مجادلہ نماید بحضرت رسالت پناہ و مناقشہ کند در نصب علی بن ابی طالب (تا)، یعنی چوں آں ملعون ایں دعا کرد و عذابِ الیم از قہارِ عظیم درخواست سنگے از آسمان بیفتادہ و سراو خوردہ و از دبرش بیرون رفت و در ساعت ایں آیت نزول

یافت کہ سٲل سائل بعذاب واقع للکافرین لیس لہٗ دافع من اللہ ذی المعارج۔

یعنی جب شاہِ اولیاء کے منصبِ خلافت پر نصب کئے جانے کی حکایت مشہور ہوگئی اور یہ قصہ عوام میں معروف ہوگیا، تو حارث بن نعمان فہری اپنی اونٹنی پر سوار ہوکر عازم مدینہ ہوا تاکہ بارگاہِ رسالت مآب میں حاضر ہوکر مجادلہ و مناقشہ کرے کہ اس منصب پر اپنے چچا زاد بھائی حضرت علی بن ابی طالب کو کیوں مقرر کیا ہے؟ اور کہا کہ آپ نے ہمیں توحید و رسالت کی گواہی کا حکم دیا۔ ہم نے وہ گواہی دے دی۔ آپ نے ہمیں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے اس کو بھی قبول کرلیا۔ پھر تم اس پر بھی راضی نہ ہوئے، حتیٰ کہ اس بچے کو اس منصب پر فائز کردیا، اور من کنت مولاہ فعلی مولاہ کا اعلان کردیا۔

تو کیا یہ اعلان آپ نے اپنی طرف سے کیا ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: بخدا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو وہ واپس لوٹا۔ درآنحالیکہ کہہ رہا تھا: اللھم ان کان ھٰذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء او ائتنا بعذاب الیم۔ اے اللہ! اگر یہ حکم اور اعلان برحق ہے، جو تیری طرف سے نازل ہونے والا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہمیں عذابِ الیم میں مبتلا کر تو اس دوران اس پر ایک پتھر آسمان سے گرا جو اس کے سر سے داخل ہوکر اس کی سرین سے باہر نکل گیا اور اسی وقت یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی: سٲل سائل بعذاب واقع الآیہ یعنی سوال کرنے والے نے سوال کیا اس عذاب کے متعلق جو کفار پر نازل ہونے والا ہے، جس کو اللہ بزرگ و برتر کے علاوہ کوئی دور کرنے والا نہیں ہے۔

نیز یہی روایت علامہ طبرسی نے سورۃ المعارج کی اس آیت کے شانِ نزول میں مجمع البیان جلد خامس ص ۳۵۲ پر ذکر کی ہے۔ چونکہ بقول علامہ

ڈھکو صاحب، یہ روایت حدیث غدیر میں مولیٰ بمعنی خلیفہ بلا فصل ہونے پر قطعی قرینہ ہے۔ اگر یہ ثابت، تو وہ بھی ثابت ہو جائے گی اور اگر ثابت نہ ہوئی تو اس معنیٰ کا تعین بھی دعویٰ بلا دلیل ہو کر رہ جائے گا، لہٰذا اس کے جملہ روایتی اور درایتی پہلوؤں پر غور فرما دیں، تو آپ یہ فیصلہ دیئے بغیر نہیں رہ سکیں گے کہ یہ روایت محض شاعرانہ تخیل اور افسانہ نگاری پر مبنی ہے اور اس کو واقعہ و حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ و تعلق نہیں ہے اور بوجوہ اس کا بطلان ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ باتفاق مفسّرین و ائمہ قرات سورۂ معارج اور اس کی یہ آیت مکّی ہے اور مکّی آیات ہونے کا معروف اور مختار معنی یہ ہے کہ وہ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہوں یا اس میں کفارِ مکّہ کو مخاطب ٹھہرایا گیا ہو۔ کوئی معنی بھی لو، یہ روایت درست نہیں ہو سکتی، کیونکہ از روئے روایت یہ آیت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اعلانِ ولایت کے بعد، لہٰذا اس کو مکّی سُورت اور مکّی آیت کے نزول سے کیا ربط و تعلق ہو سکتا ہے؟ علامہ آلوسی نے رُوح المعانی میں یہ قول نقل کر کے اس کو رد کرتے ہوئے فرمایا: وانت تعلم ان ذالك القول منه عليه الصلوٰة والسلام فی امیر المومنین علی رضی اللہ عنه کان فی غدیر خم وذالك فی اواخر سنی الهجرة فلا یكون ما نزل مكیًا علی المشهور فی تفسیره وقد سمعت ما قیل فی مكیة هٰذه السورة (هی مكیة بالاتفاق) جلد ۲۹، ص ۵۵)

"یعنی یہ قول کہ یہ آیت حارث بن نعمان فہری کے حق میں ولایتِ علی کا انکار کرنے کی وجہ سے نازل ہوئی، بالکل غلط ہے۔ کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں ولایت کا اعلان غدیرِ خم میں پایا گیا جو کہ ہجرت نبوی کا آخری سال ہے اور اس موقع پر یا اس کے بعد نازل ہونے والی آیت مشہور و معروف معنی کے لحاظ سے مکّی نہیں ہو سکتی، حالانکہ یہ امر بھی گوش گزار ہو چکا ہے کہ اس کے مکّی ہونے پر سب متفق ہیں۔"

۲۔ اس قرینہ کا دار و مدار اس پر ہے کہ یہ آیت حارث بن نعمان فہری کے حق میں نازل ہوئی، جبکہ اُس نے ولایت علی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ یہ بھی غلط ہے، کیونکہ اس پر بھی مفسّرین متفق نہیں، بلکہ اس میں مختلف اقوال ہیں۔ علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں اس پر بحث کرتے ہوئے متعدد روایات نقل کی ہیں، تو جب حتمی اور قطعی طور پر حارث کے حق میں نزول ہی ثابت نہ ہوا، تو اس کا غیر قطعی قول مولیٰ کے معنیٰ کا قطعی تعین کیسے کرے گا؟

پہلی روایت: مجاہد سے منقول ہے کہ اس سائل سے مراد وہی شخص ہے جس نے کہا تھا: اللھم ان کان ھٰذا ھو الحق الآیہ اور وہ نضر بن حارث ہے۔

دُوسری روایت: حسن سے منقول ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: جس عذاب کا تم تذکرہ کرتے ہو، وہ کس کے لیے ہوگا؟ تو اس کے جواب میں فرمایا: وہ کفّار کے لیے ہے، اور اسے اللہ بزرگ و برتر کے علاوہ کوئی دور کرنے والا نہیں ہے۔

تیسری روایت: جبائی سے منقول ہے کہ دعا اور سوال کرنے والے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں آپ کے ساتھ کفّار پر عذاب نازل کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

چوتھی روایت: ابنِ زید سے منقول ہے کہ سَال جہنّم کی وادی ہے اور وہ کفار کے عذاب کے ساتھ دہک رہی ہے۔

علماءِ اہل السنّت اور سال سائل کا مصداق

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "درِ منثور" میں اس کے متعلق مختلف روایات نقل کی ہیں:

(۱) فریابی۔ عبد بن حمید۔ نسائی۔ ابن ابی حاتم، ابنِ مردویہ اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ سائل نضر بن الحارث ہے اور اُس نے کہا تھا: اللھم ان کان ھٰذا ھو الحق مِن عِندك الآیہ۔ اور

حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

(ب) ابن المنذر نے زید بن اسلم کے واسطہ سے بھی اس کا مصداق نضر بن الحارث بن کلدہ قرار دیا ہے۔

(ج) ابن ابی حاتم نے سدی کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ سال سائل الآیہ مکہ مکرمہ میں نضر بن حارث کے متعلق نازل ہوا، جبکہ اس نے کہا تھا: ان کان ھذا ھو الحق الآیہ اور اس کو یہ عذاب جنگِ بدر میں دیا گیا۔ (تفسیر درِ منثور جلد ع۶، صـ۲۶۴)

(د) تفسیر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں بھی سال سائل کا مصداق نضر بن الحارث کو قرار دیتے ہوئے فرمایا: یعنی دعا داع وھو النضر بن الحارث (الی) فقتل یوم بدر صبرًا۔ یعنی یہاں پر سوال بمعنی دُعا ہے اور وہ دعا کرنے والا النضر بن الحارث تھا اور وہ بدر کے دن قیدی بن جانے کے بعد قتل کر کے کیفر کردار کو پہنچایا گیا۔

(ھ) علامہ آلوسی نے "درمنثور" میں منقول ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کے متعلق فرمایا، جس میں اس سائل سے نضر بن الحارث مراد لیا گیا ہے کہ یہی قول سدی، ابن جریج اور جمہور سے منقول ہے اور اسی نضر بن الحارث نے انکارِ رسالت کرتے ہوئے اور منصبِ نبوت کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا، اے اللہ اگر یہ رسول تیری طرف سے ہے، تو ہم پر پتھر برسا یا عذاب الیم نازل فرما۔ (روی ذالك عن بن جریج والسدی والجمهور الخ۔

(و) قیل ھو ابو جهل حیث قال "اسقط علینا کسفا من السماء" یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سائل سے مراد ابوجہل ہے، جبکہ اُس نے کہا تھا اس رسول کے برحق ہونے اور ہمارے منکر ہونے کی وجہ سے ہم پر آسمان کا ٹکڑا گرا دے۔

الغرض نہ آیت کا مدنی ہونا ثابت، اور نہ سائل کا حارث بن نعمان فہری ہونا

قطعی طور پر ثابت ہوا بلکہ آیت مکی اور ہجرت سے پہلے نازل ہوئی اور مصداق اس کا بقولِ جمہور اور بقولِ مفسرِ صحابہ و حبرِ امت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نضر بن الحارث جو کہ بدر میں قتل بھی ہو گیا۔ تو اندریں صورت یہ قطعی قرینہ کیسا بن گیا مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلا فصل کا۔ بلکہ اس کو قرینہ کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔ علماء شیعہ پر تعجب ہے کہ جس روایت کی بنیاد و اساس ہی نہیں ہوتی، اسی کو قطعی دلیل کہہ دیتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف قطعی کا لفظ سنا ہوا ہے، مگر اس کا معنی معلوم نہیں یا صرف عوام شیعہ کو بیوقوف بنانے کے لیے ایسے وزنی لفظ استعمال کرتے ہیں اور یا خود ہی اپنے عقل و خرد سے بھی تقیہ کیے ہوئے ہیں اور خلافت بلا فصل کی محبت میں بصارت اور بصیرت سے محروم ہوتے ہیں۔

تفسیر ثعلبی اور واحدی کی حیثیت

علامہ فتح اللہ کاشانی نے یہ روایت ثعلبی کے حوالے سے نقل کی اور قول باری تعالیٰ: یا ایھا الرسول بلغ الآیہ کو واحدی کے حوالے سے اہل السنت کی طرف منسوب کیا اور علامہ ڈھکو صاحب نے ان کو قطعی قرآن بنا کر پیش کر دیا لہٰذا ان کی حیثیت اور مرتبہ و مقام کا بیان کرنا ازحد ضروری ہے تاکہ ان کے مندرجات سے استدلال و استشہاد کی حیثیت واضح ہو جائے۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر "اتقان" میں طبقات المفسرین بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول تفاسیر کے اسنادوں میں سے ضعیف ترین اسناد یہ ہے: واوهى طرقه طريق الكلبى عن ابى صالح عن ابن عباس فان انضم الى ذالك رواية محمد بن مروان السدى الصغير فهى سلسلة الكذب وكثيرا ما يخرج منه الثعلبى والواحدى۔ تفسیر اتقان جلد ثانی صـ۱۸۹

یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول تفاسیر کی سندوں میں سے کمزور ترین سند اور طریق روایت وہ ہے جس میں کلبی ابوصالح کے واسطہ سے آپ کی تفاسیر نقل کرتا ہے اور اس کے ساتھ محمد بن مروان سدی صغیر شامل ہو جائے، تو یہ پورا سلسلہ ہی کذابوں اور جھوٹے راویوں کا ہے اور ثعلبی اور واحدی بسا اوقات اور عمومی طور پر اسی سند اور طریق روایت سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

امام سیوطی نے ہی ابن جریر طبری کے دور کے بعد والے مفسرین پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے روایات کے اسنادوں کو حذف کر دیا اور مسلسل اقوال نقل کرتے چلے گئے، تو اس طرح غلط اور بے بنیاد اقوال بھی تفاسیر میں داخل ہو گئے اور صحیح و علیل کا امتیاز ختم ہو گیا اور یکے بعد دیگرے آنے والے مفسرین نے ان سابقین کے اقوال کو بلا تفریق و تمیز نقل کرنا شروع کر دیا اور معتمد علیہ اور غیر معتمد کا فرق جو اسلاف کے پیشِ نظر رہتا تھا، وہ نظر انداز ہو گیا۔ بعد میں وہ حضرات آئے، جن کو کسی نہ کسی فن اور شعبہ میں دسترس حاصل تھی، تو اس نے اپنی تفسیر کو اسی رنگ سے رنگ دیا۔ نحو کے ماہر بیان اعراب اور تفصیل تراکیب میں منہمک ہوتے، تو فلسفہ کے ماہرین نے تفسیر میں فلسفہ کو بھر دیا۔ والاخباری لیس له شغل الا القصص واستیفاءها والاخبار عن السلف سواء کانت صحیحة او باطلة کالثعلبی ج۲ ص۱۱۹

اور جو اخبار و روایات پر عبور رکھتے تھے، ان کا مشغلہ صرف قصص کا بیان اور ان کی بھرمار رہ گیا اور انہوں نے اسلاف سے ہر قسم کی خبروں کا نقل کر دینا اپنا منتہائے مقصود قرار دے دیا، خواہ سچی ہوں یا جھوٹی اور باطل جیسے کہ ثعلبی نے یہی شغل اپنایا۔ انتہی ملخصاً۔

ناظرین کرام پر یہ حقیقت اب پوری طرح واضح ہو گئی ہو گی کہ تفسیر ثعلبی میں مذکور عام اقوال کس سلسلۂ کذب سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کا مطمح نظر

اور بنیادی مقصد کیا ہے؟ لہٰذا اس قسم کی تفسیر سے ایک بے بنیاد قصہ اور حکایت نقل کر کے اس کو قطعی قرینہ اور دلیل بنا دینا، دیانت اور امانت اور علم و تحقیق کی دنیا میں درخورِ اعتنا اور لائقِ اعتبار نہیں اور محقق و مدقق، مجتہد العصر اور حجۃ الاسلام ہونے کے دعویدار کو قطعاً زیب نہیں دیتا بلکہ کوئی معمولی سوجھ بوجھ والا طالب علم بھی اس قسم کے دعووں کی جسارت نہیں کر سکتا کہ جس امر کا اپنا وجود ہی نہ ہو، اس کو قطعی کہہ دے اور اس کے ذریعے مولیٰ بمعنی خلیفہ بلا فصل کو قطعی قرار دے دے۔

حیرت ہے کہ وہ نظریہ و عقیدہ جس کے تحت حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک لاکھ چودہ ہزار یا چوبیس ہزار صحابہ کرام مرتد قرار دیئے گئے اور ان کے سب کارنامے اور خدمات و قربانیاں برباد اور بے اعتبار قرار دے دی گئیں۔ اس کا دارومدار ان جھوٹی اور بے سروپا حکایات پر ہے۔ اگر انکار پر آئے تو بیسیوں آیات سے قطعی انداز میں ثابت ان کے فضائل و کمالات اور صدق و اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور جنت کے مژدے بھی ناقابلِ اعتبار بنا ڈالے اور جو ماننے پہ آئے تو ایسی جھوٹی اور بے بنیادوں حکایات کو قطعی عقائد بنا ڈالا۔

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

پانچواں قرینہ:

مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلا فصل پر

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیر خم میں ولایتِ علی کا اعلان کیا تو تمام صحابہ کرام نے بالعموم اور عمر بن الخطاب نے بالخصوص حضرت امیر کو مبارکباد دی اور کہا، بخ بخ لك یا ابن ابی طالب لقد اصبحت مولای و مولیٰ کل مومن و مومنة۔ "مبارک ہو، مبارک ہو اے ابن ابی طالب! تم میرے اور تمام مومن مردوں اور عورتوں کے مولیٰ بن گئے ہو۔" یہ بھی اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ انہوں نے یہاں پر مولیٰ بمعنی اولیٰ سمجھا تھا، ورنہ صرف اخوت اور محبت مراد ہونے کی صورت میں مبارکباد کوئی معنے نہیں رکھتی۔ رسالہ تنزیہ الامامیہ ص۱۵۲

الجواب بتوفیق الوھاب

علامہ صاحب نے حدیث غدیر میں وارد مولیٰ کے خلیفہ بلا فصل اور اَولیٰ بالتصرف کے معنی میں ہونے پر پانچواں قطعی قرینہ یہ پیش کیا کہ چونکہ آپ کو مولیٰ بننے پر مبارکباد دی گئی، لہٰذا قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ اس چوبیس معانی میں مشترک لفظ کا یہاں صرف اور صرف خلیفہ بلا فصل والا معنی ہی مراد ہے، مگر اس روایت کو قطعی قرینہ قرار دینا بھی بوجوہ باطل ہے۔

۱- پہلے تو یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس روایت کی حیثیت کیا ہے؟ اور خود ہی وہ منکر، ضعیف اور ناقابلِ اعتبار ہو، تو پھر اس کے بل بوتے پر مولیٰ المعنی خلیفہ بلا فصل کی قطعیت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ علامہ سید محمود آلوسی نے روح المعانی میں اس پر بحث کرتے ہوئے فرمایا: وھذا ضعیف فقد نصوا ان علی بن زید وابا ھارون وموسیٰ ضعفاء لا یعتمد علی روایتھم وفی السند ایضاً ابو اسحٰق وھو شیعی مردود الروایۃ۔ روح المعانی ج۶ ص۱۷۴

یہ روایت ضعیف ہے، کیونکہ علماء جرح و تعدیل نے تصریح فرمائی ہے کہ اس کے راوی علی بن زید، ابو ہارون اور موسیٰ بن عثمان ہیں اور وہ سبھی ضعیف ہیں اور ان کی روایات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ نیز اس روایت کی سند میں ابو اسحاق بھی ہے اور اس کی روایت مردود اور ناقابلِ قبول ہے، کیونکہ وہ شیعہ ہے ——— لیجئے حضرات جو روایت ہی مردود اور ناقابلِ قبول ہے، تو اس کو قطعی کہنا کیونکر درست ہوا اور اس کا سہارا لے کر مولیٰ کے کثیر التعداد معانی میں سے ایک کے متعین ہونے کی قطعیت کس طرح ثابت ہو گئی؟

۲- روایت کی ذاتی حیثیت یعنی ضعف و نکارت سے قطع نظر کر لیں اور اس کو صحیح تسلیم کر لیں، پھر بھی اس سے شیعی علماء کا دعویٰ ثابت نہیں

ہو سکتا، کیونکہ مولیٰ ہونا حاکم ہونے کو مستلزم ہی نہیں ہے۔ چہ جائیکہ بلا فصل خلافت و حکومت کو مستلزم ہو۔ اس ضمن میں احتجاج طبرسی کا ایک حوالہ پیش خدمت ہے: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انی لم اسئل اللہ اللیلۃ شیئاً الا اعطانیہ ولم اسألہ لنفسی شیئاً الا سألت لك مثلہ وانی دعوت اللہ عز وجل ان یواخی بینی وبینك ففعل وسألتہ ان یجعلك ولی کل مؤمن ومؤمنۃ ففعل وسألتہ ان یجمع علیك اُمتی بعدی فابیٰ علیّ۔ احتجاج ص۱۵۹ طبع جدید۔

یعنی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے آج رات اللہ تبارک و تعالیٰ سے جو کچھ طلب کیا، اُس نے مجھے عطا فرمایا اور میں نے اس سے اپنی ذات کے لیے جو کچھ طلب کیا، تمہارے لیے بھی اسی طرح کا مطالبہ کیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ میرے اور تیرے درمیان اخوت اور بھائی چارہ قائم فرمائے، تو اللہ تعالیٰ نے اسے شرفِ قبولیت بخشا۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ تمہیں تمام مومنین مردوں اور عورتوں کا مولیٰ بنائے تو اس نے اس دعا کو بھی شرفِ قبولیت و اجابت بخشا اور تجھے سب کا مولیٰ بنا دیا اور میں نے یہ التجاء کی کہ میری ساری امت کو میرے بعد تجھ پر متفق اور متحد کر دے، تو اس نے اسے شرفِ قبولیت بخشنے سے انکار فرما دیا (اور ساری امت کو میرے بعد تیری خلافت و امارت پر متفق و متحد نہ فرمایا)۔

شیعی فاضل کی زبانی اور مستند ترین کتاب کے حوالے سے فرمانِ نبوی کے ذریعے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ ولی اور مولیٰ ہونا علیحدہ امر ہے، اور خلیفہ و حاکم ہونا علیحدہ امر ہے، ورنہ دعائے ولایت قبول ہونے کے بعد اور تمام مؤمنین و مومنات کا مولیٰ بن جانے کے بعد پھر خلافت پر اتفاق کی دعا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی اور نہ اللہ تعالیٰ کے انکار کی کوئی وجہ، بلکہ وہ فرماتا، میں تو قبول کر چکا ہوں

خلیفہ بنا چکا ہوں، ان سب کو متفق و متحد کرنے کا ضامن ہو چکا ہوں، تمہیں پھر دُعا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ اور ان پر امّت کو متحد اور متفق کرنے سے انکار فرمایا، تو ثابت ہو گیا کہ یہ دونوں امر الگ الگ ہیں، لہٰذا قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مولیٰ ہونا حاکم اور خلیفہ ہونے کے معنیٰ میں نہیں تھا، بلکہ دو علیحدہ علیحدہ حقیقتیں اور حیثیتیں تھیں، مگر علامہ ڈھکو صاحب کو اس سے کیا غرض ؟ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر نہیں مانتے کہ مولیٰ ہونا خلیفہ ہونے کو مستلزم ہے تو نہ مانیں، وہ تو مانیں گے اور ڈنکے کی چوٹ اور اس کے قطعی اور حتمی ہونے پر اعتقاد رکھیں گے اور منکرین کو کافر و مُرتد اور منافق کہیں گے، خواہ کسے باشد، کیونکہ ان کے پاس اس دعوٰی پر قطعی قرائن موجود ہیں اور وہ پورے دس قرائن ہیں۔ نعرۂ حیدری یا علیؑ

نیز اس روایت سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ خلافت و حکومت نہ بھی حاصل ہو مگر مولی المومنین ہونا بہت بڑا اعزاز ہے، اسی لیے سیدِ عالم رسولِ مکرّم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں اس اعزاز و امتیاز کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی اور جو مصلحت و حکمت دعائے مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی، وہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام کے مبارک باد دینے میں تھی۔ اگر اخوت و محبت مراد ہونے کی صورت میں مبارکباد کوئی معنی نہیں رکھتی تھی، تو پھر التجائے رسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم بھی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی اور اگر دعا و التجا اس لیے درست تھی کہ اس میں عام اخوت و محبت مراد نہیں تھی، بلکہ مخصوص اور اتم و اکمل اور سب مؤمنین و مومنات کی طرف سے الفت و محبت مراد تھی، تو مبارکبادی کا باعث و موجب بھی یہی مخصوص اور اتم و اکمل محبوبیت تھی، لہٰذا یہ مبارک بادی خلافت بلا فصل کا قطعی قرینہ کیسے بن گئی ؟

علامہ موصوف کو کون سمجھائے کہ دنیوی اقتدار تو بقولِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سراب ہے اور چھوٹ جانے والا سحاب اور چند روزہ فانی متاع اور اصل اعزاز

اور حقیقی انعام تو وہ محبوبیت ہے جو صرف ظاہری زندگی میں نہیں، بلکہ وفات و وصال کے بعد بھی قلوبِ خلق پر حاوی اور غالب اور حکمران و متصرّف رہتی ہے، جیسے کہ ہر ایک کے مشاہدہ میں ہے کہ اربابِ سلاسل کس طرح آج بھی محبوبِ قلوب اور قبلہ ارواح بنے ہوئے ہیں۔

۳۔ ابن بابویہ قمی نے "مُعانی الاخبار" میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ سرورِ انبیاء حبیب کبریاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اللہ ربی ولا امارۃ لی معہ وانا رسول ربی ولا امارۃ معی وعلی ولی من کنت ولیہ ولا امارۃ معہ۔ معانی الاخبار ص۲۴

اللہ تعالیٰ میرا رب ہے اور میرے لیے امارت و حکومت اس کے ساتھ نہیں تھی اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، جبکہ بوقتِ بعثت میں امیر و حاکم نہیں تھا اور حضرت علی ہر اُس شخص کے ولی ہیں، جس کا میں ولی تھا، جبکہ وہ (ہر اُس شخص کے) امیر نہیں ہیں۔

سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے بھی واضح ہو گیا کہ ولایتِ مرتضیٰ علیحدہ امر ہے اور ان کا امیر ہونا علیحدہ امر ہے اور ولایت امارت و حکومت کو مستلزم نہیں اور ساتھ ہی دلیل بھی آپ نے دے دی کہ میں جب سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، —— اس وقت سے مولیٰ ہوں، لیکن امیر و حاکم اس وقت سے نہیں ہوں اور جس کا میں مولیٰ تھا، علی بھی اس کے مولیٰ ہیں مگر نہ میں وقت بعثت سے امیر تھا اور نہ ہی یہ ابھی سے امیر ہوں گے۔ مجھے بھی امارت و حکومت بعد میں حاصل ہوئی اور انہیں بھی بعد میں حاصل ہو گی۔

الغرض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ولایت کو امارت سے جدا مانتے ہیں اور مولیٰ کو خلیفہ بلا فصل سے مختلف مانتے ہیں اور ان میں نہ از روئے معنی و مفہوم اتحاد و توافق تسلیم فرماتے ہیں اور نہ وجود خارجی اور مصداق کے لحاظ سے اور یہی مذہب اہل سنّت و جماعت کا ہے۔ اب ڈھکو صاحب کی مرضی کہ وہ راہِ نبوّت و رسالت پر چلیں اور ہماری موافقت کریں یا ہماری ضد میں بلکہ خلفائے ثلاثہ کی عداوت میں باغیٔ نبوت بن جائیں اور راہِ نبی سے انحراف کریں۔

مولیٰ بمعنیٰ اَولیٰ سے کیا ثابت ہوا؟

(۴) ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ مبارکبادی اس امر کی دلیل ہے کہ ان مبارکباد دینے والے صحابہ نے مولیٰ بمعنیٰ اولیٰ سمجھا، مگر علامہ صاحب فرمائیں کہ محض اولیٰ سمجھنے سے کیا خلافت بلافصل تسلیم کر لینا اور عملی طور پر اقتدار و اختیار کا مالک تسلیم کرنا ثابت ہو جاتا ہے؟ اَولیٰ سمجھا تھا، تو اخوت و محبت کے لحاظ سے بھی آپ اولیٰ ہو سکتے تھے، تو محض تصرف و حکومت کے لحاظ سے اولیٰ سمجھنا کیسے لازم آگیا؟ اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں فرمایا: مَاْوٰكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰكُمْ — تمہارا ٹھکانا نارِ جہنم ہے، اور وہ تمہارا مولیٰ ہے۔ یہاں مولیٰ بمعنی اولیٰ ہے، تو کیا آگ کو خلیفہ بلافصل اور حاکم و سُلطان تسلیم کیا جائے گا اور امر و نہی کے ساتھ تصرف کرنے والی — نیز کلامِ خداوندی میں ہے: واُولوا الارحام بعضهم اَولیٰ ببعض۔ یعنی ذوی الارحام میں سے بعض دوسرے بعض کے ساتھ اولیٰ ہیں تو کیا یہاں خلافت ثابت ہو گئی۔ قطعاً نہیں، بلکہ صرف یہ مطلب ہے کہ وہ جلانے کی زیادہ حقدار ہے اور ذوی الارحام وراثتِ مالی کے حقدار ہیں اور اگر مولیٰ بمعنی اولیٰ ہو بھی سہی، تو اس سے شیعی علماء کو کیا حاصل ہو سکتا ہے، جب تک اولیٰ بالحکومت والتصرّف ثابت نہ ہو اور ان متعلقات کا نہ حدیثِ غدیر میں ذکر اور نہ مبارکباد دینے والوں کے کلام میں تو پھر خواہ مخواہ اس معنی کی تعیین کیسے ہو گئی؟

رہا یہ توہم کہ بالعموم محبت و ولایت اور اخوت و بھائی چارہ تو اسلام و ایمان کی وجہ سے ثابت تھا، والمومنون بعضهم اولیاء بعض۔ تو پھر اس پر مبارکبادی کا کیا معنی؟ تو جواباً گزارش ہے ع

سخن شناس نۂ خطا ایں جاست

یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کو محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں داخل

کیا گیا تھا اور یہ ابدی و غیر فانی اور ناقابلِ تغییر و تبدیل حکم تھا، یعنی جس طرح محبّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی وقت بھی ترک نہیں کی جا سکتی اور نہ کبھی اس کا وجوب و لزوم ختم ہو سکتا ہے۔ اس طرح حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی محبّت بھی کسی وقت ترک کرنے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ بخلاف عام مومنین کی محبّت کے، لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اس مخصوص محبت میں اپنے ساتھ شریک فرمانا ان کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا اور آپ یقیناً اس پر مبارک باد کے مستحق تھے۔

اگر وہ صحابہ کرام جو غدیر خم میں موجود تھے، اس کو خلافتِ بلافصل کا اعلان سمجھ رہے تھے، تو پھر انہوں نے عملی طور پر آپ کو وصالِ نبوی کے بعد کیوں خلیفہ تسلیم نہ کیا؟ انصار نے خود اپنے علاقہ پر تصرّف حاصل کرنے کا پروگرام کیوں بنایا اور پھر اس پروگرام سے دستبردار ہو گئے، تو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بلافصل تسلیم نہ کیا۔ آخر وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی دنیا کی خاطر اپنا دین و ایمان اور اپنی دنیوی شوکت و سلطنت دونوں ہی کیونکر قربان کر سکتے تھے، بلکہ وہ اپنے عزم و ارادہ سے باز صرف اس لیے آگئے کہ انہوں نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی حدیثِ رسول سُن لی تھی: الائمة من قریش کہ امام و حاکم قریش ہی ہوں گے، تو ان حضرات سے یہ توقّع کیسے ہو سکتی تھی کہ براہِ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سنیں تو تسلیم نہ کریں اور بواسطہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سنیں تو اسے فوراً تسلیم کر لیں۔ نیز بنو عبد المطلب، بنو ہاشم اور بنو عبد مناف ان سب کو کیا ہو گیا تھا کہ انہوں نے بھی اس حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل نہ کیا اور نہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ اقدس پر عمل کیا اور نہ ہی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حق قرابت کو ملحوظ رکھا ؎ کچھ تو کہیے کہ ماجرا کیا ہے؟

چھٹا قرینہ

مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرّف اور خلیفہ بلافصل پر

سابقہ سطور میں متعدد کتب کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے کہ اس اعلان کے

بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا تھا کہ حضرت امیر کو امیر المومنین کہہ کر سلام کرو۔ یہ اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ مولیٰ سے مراد اولیٰ بمعنی سردار ہے۔ تنزیہ الامامیہ ص۱۵۲

الجواب ومنہ التوفیق والسداد

ڈھکو صاحب نے پانچویں اور چھٹے قرینہ کو بیان کرتے ہوئے سطور بالا اور سطور سابقہ کا لفظ استعمال کیا اور متعدد کتب کے حوالہ جات ذکر کرنے کا دعویٰ کیا ہے، حالانکہ آپ کے پورے رسالہ میں ان دونوں قرینوں کے متعلق کہیں بھی کسی کتاب کا حوالہ موجود نہیں ہے، مگر آپ ہیں کہ نشہ و مستی کے عالم میں بس یہی رٹ لگاتے جا رہے ہیں کہ متعدد کتب کے حوالہ جات سے لکھا جا چکا ہے ؎

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے

حالانکہ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا طالب علم بھی سمجھتا ہے کہ مولیٰ بمعنی خلیفہ بلافصل شیعہ کا دعویٰ ہے اور اس کے اثبات کے لئے انہیں قطعی دلائل و شواہد پیش کرنے لازم ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک یہ نظریہ قطعی عقائد اور اصولِ اسلام میں شامل ہے، لیکن یہاں دلائل بھی محض دعویٰ کے طور پر ہیں نہ کتاب کا نام، نہ عبارت مکمل طور پر درج کرتے ہیں، بلکہ اکثر طور پر عبارتیں ہی غائب ہوتی ہیں، آخر یہ استدلال کا کونسا قسم ہے اور جوابی کارروائی کا کونسا انداز ہے؟ اگر محض دعویٰ کر دینا ہی مدعی کے لیے کافی ہو اور اس کی سچائی کی دلیل ہو، تو پھر اسلامی فرقوں میں سے کوئی بھی غلطی پر نہیں، بلکہ سبھی سچے ہیں۔ الغرض ہمارا نظریہ و عقیدہ صرف اور صرف یہ ہے کہ غدیر خم کے واقعات پر مشتمل روایات میں سے جو صحیح طور پر ثابت ہے، وہ ہے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے متعلق من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ کا اعلان۔ اس کے علاوہ امیر المومنین ہونے کا اعلان یا امیر المومنین کے لقب سے سلام دینے کا حکم یا خلافت و امارت کی صراحت وغیرہ قطعاً پایۂ تکمیل وصحت اور ثبوت کو نہیں پہنچتیں اور نہ مستند اور معتبر کتابوں میں کوئی ایسی

روایت موجود ہی ہے۔ اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے علامہ آلوسی نے روح المعانی ج ۶ ص۱۷۳ پر فرمایا: وانت تعلم ان اخبار الغدیر التی فیھا الامر بالاستخلاف غیر صحیحۃ عند اھل السنۃ ولا مسلمۃ لدیھم اصلاً۔ یعنی تمہیں معلوم ہے کہ غدیر خم کی وہ روایات و اخبار کہ جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کا حکم ہے، وہ اہل السنت کے نزدیک صحیح نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے نزدیک معتبر اور مقبول ہیں اور یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس اعلان کا پس منظر کیا تھا اور باعث و موجب کونسا تھا؟ یعنی لشکریوں کی آپ کے خلاف شکایات اور آپ پر طعن و تشنیع اور آپ کی شان میں تنقیص و تفریط، جس کو علماء اہل السنت اور علماء شیعہ دونوں فریق نے ذکر بھی کیا ہے اور تسلیم بھی کرتے ہیں۔

رہا اس خاص روایت اور مخصوص مقصد پر مشتمل اخبار کے علاوہ دوسرے قسم کی روایات کا معاملہ جن کو بالعموم شیعہ علماء بطور استدلال پیش کرتے ہیں، تو وہ ایسی کتابوں سے لی جاتی ہیں، جن میں مؤلفین نے صحاح کو جمع کرنے کا التزام ہی نہیں کیا اور نہ وہ خود ان کے تمام مندرجات کی صحت کے قائل ہیں، بلکہ ان کے پیش نظر واقعہ غدیر کے متعلق ہر قسم کی روایات اور ان کے اسناد اور طرقِ روایت کو جمع کرنا تھا اور ان کی درجہ بندی اور ترجیح راجح وغیرہ کا معاملہ انہوں نے دوسرے حضرات پر چھوڑ دیا لہٰذا ان کتب کے مؤلف اگرچہ سُنّی ہوں، بلکہ اکابر اہل سنت سے ہوں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے جو کچھ ذکر کیا ہے، وہ سب ان کے نزدیک صحیح ہے اور تمام اہل سنت پر بھی ان کو صحیح ماننا اور ان پر اعتقاد رکھنا لازم ہے۔ سید محمود آلوسی نے فرمایا:

وقد اعتنیٰ بحدیث غدیر خم ابوجعفر بن الجریر الطبری فجمع فیہ مجلدین اورد فیھما سائر طرقہ والفاظہ وساق الغث والسمین والصحیح والسقیم علیٰ ما جرت بہ عادۃ کثیر من المحدثین فانھم یوردون ما وقع لھم فی الباب من غیر تمییز بین صحیح وضعیف وکذالک الحافظ الکبیر ابوالقاسم ابن العساکر اورد احادیث

كثيرة في هذه الخطبة والمعول عليه فيها ما اشرنا اليه ونحوه مما ليس فيه خبر الاستخلاف كما يزعمه الشيعة۔ روح المعانی ج ۶ ص ۱۹۵

"ابوجعفر بن جریر طبری نے حدیثِ غدیر کے بیان میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا اور اس میں دو جلدیں مرتب کیں اور اس واقعہ میں وارد خطبہ کے تمام اسنادات اور طرق روایا جمع کیے اور ہر قسم کے منقولہ الفاظ و کلمات اور ہر قوی و ضعیف اور صحیح و سقیم کو ان میں جمع کر دیا ہے جیسے کہ بہت سے محدثین کی عادتِ معروفہ ہے کہ وہ کسی باب اور عنوان کے مناسب موصول اور دستیاب ہر روایت کو وہاں پر درج کر دیتے ہیں اور ان میں سے صحیح اور ضعیف میں تمیز و تفریق نہیں کرتے اور یہی حال حافظ کبیر ابوالقاسم ابن عساکر کا ہے۔ انہوں نے بھی اس خطبہ کے ضمن میں بہت سی احادیث ذکر کی ہیں اور قابلِ وثوق اور لائقِ اعتماد صرف وہی ہیں، جن کی طرف ہم نے اشارہ کر دیا ہے یا اسی قسم کی وہ روایات، جن میں خلافتِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ نہیں ہے جیسے کہ شیعہ کا زعم ہے"

تنبیہ: قبل ازیں بار بار اس طرف قارئین کی توجہ دلا چکا ہوں کہ شیعہ حضرات بھی اپنی کتابوں میں مذکور ہر روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے، حتیٰ کہ صحاحِ اربعہ میں مذکور تمام روایات کو بھی صحیح اور حجت ماننے سے انکاری ہیں، حالانکہ ان کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ امام غائب حضرت مہدی نے "کافی" مؤلفہ محمد بن یعقوب کلینی کا مطالعہ فرمایا اور اس پر مہرِ تصدیق لگاتے ہوئے فرمایا: هذا كاف لشيعتنا۔ اور اسی طرح اہل السنت نے بھی کتبِ حدیث و روایت کی درجہ بندی کرتے ہوئے صحاحِ ستہ کو دوسری کتابوں پر ترجیح دی اور ان میں سے بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایات کو۔ پھر "بخاری" کی انفرادی اور بعد ازاں "مسلم" کی انفرادی روایات کو راجح قرار دیا اور ان چھ کتابوں کو بھی صحیح اس معنی کے ساتھ نہیں مانتے کہ ان کی ہر روایت صحیح ہے بلکہ اکثریت ان روایات کی درجہ صحت کو پہنچی ہوئی ہے، لہٰذا للاکثر حکم الکل کے تحت انہیں صحاحِ ستہ کہا گیا۔ کما حققه المحدث الدہلوی فی اشعة اللمعات (مقدمہ جلد اوّل)

نیز یہ حقیقت بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ شیعہ مقامِ استدلال میں ہیں اور وہ خلافت

بلا فصل کے دعویٰ کو عقائدِ قطعیہ میں شمار کرتے ہیں، تو اس کے اثبات میں ایسا طرزِ استدلال اپنانا جو جدل بھی نہ کہلا سکے، قطعاً قابلِ التفات اور لائقِ اعتبار نہیں ہو سکتا، جبکہ جدلی قیاس مدّعا کے ثبوت کا فائدہ بھی نہیں دیتا۔ صرف مخالف کے دفاع پر مشتمل ہوتا ہے۔ مدعائے قطعی کے اثبات کے لیے بہر حال بُرہانی قیاس کا ہی پیش کرنا لازمی ہوتا ہے اور جدلی قیاس کا بھی یہ مطلب نہیں ہوتا کہ فریقِ ثانی کی کسی کتاب کی کوئی روایت نقل کر دی، خواہ وہ اس کو ضعیف **بلکہ موضوع** اور من گھڑت ہی کیوں نہ تسلیم کرتے ہوں، بلکہ اپنی طرف سے دعویٰ کر دیا کہ یہ سُنّی ہے اور پھر بطورِ الزام اور جدل، اس کی روایات پیش کر دیں جیسے کہ خطیب خوارزم اور ابن ابی الحدید وغیرہ کے حق میں علماءِ شیعہ نے اسی کارستانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ الحاصل ان معروضات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب ڈھکو صاحب کے بیان کردہ اس قرینہ کی حقیقت معلوم کریں۔

۱۔ ایسی کوئی روایت صحیح السند اور معتبر و مقبول کتبِ اہل سنت میں موجود نہیں، لہٰذا یہ دعویٰ، جب خود پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتا، تو اس کو قطعی قرینہ قرار دینا ایک مجنونانہ حرکت کے سوا کیا ہے؟ علامہ موصوف کے استدلال کا حاصل یہ ہوا کہ چونکہ اہلِ تشیع تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو صحابہ کرام نے بحکم حضور سیدِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام، امیر المومنین کے لقب سے سلام کیا، لہٰذا اہل السنت کے نزدیک بھی قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ مولیٰ کا معنیٰ خلیفہ بلا فصل ہے ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

۲۔ ابو نعیم نے حلیہ میں ذکر کیا ہے کہ لوگوں نے حضرت حسنِ مثنّیٰ بن امام حسن بن حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا کہ حدیثِ غدیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافتِ بلا فصل پر تنصیص اور اس کی تصریح ہے یا نہیں؟ تو آپ نے فرمایا: لو كان النبي صلى الله عليه وسلم اراد خلافته لقال ايها الناس هذا ولي امري والقائم عليكم بعدي

فاسمعوله واطیعوه ثم قال الحسن اقسم باللہ سبحانہ ان اللہ ورسوله صلی اللہ علیه وسلم لو آثر علیا لاجل هٰذا الامر ولم یقدم علی کرم اللہ وجهه علیه لکان اعظم الناس خطأً۔ روح المعانی، ج ۶ ص۱۷۵

"یعنی اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کا ارادہ کیا ہوتا، تو آپ اس طرح فرماتے یہ میرا ولی الامر اور ولی عہد ہے اور میرے بعد تمہارے انتظام کا مالک اور قیم امر لہذا اس کے حکم کو قبول کرو اور اس کی اطاعت کرو۔ بعد ازاں حضرت حسن مثنیٰؒ نے قسم اٹھا کر فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے امرِ خلافت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چن لیا تھا اور اُن کی خلافت کا اعلان کر دیا تھا اور وہ وقت آنے پر خلافت کے لیے آمادہ نہ ہوئے اور امورِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے سعی اور جدوجہد نہ کی، تو یقیناً ان سے بڑا خطا کار اور گنہ گار کوئی نہیں ہو سکتا۔"

مقامِ غور ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی تہدید و تخویف اور رسالت کے سلب کرنے کی دھمکی دے کر اعلانِ خلافت کرانے کی کوشش کی گئی اور حضور نبی معظّم صلی اللہ علیہ وسلم نے کارِ رسالت اکارت ہونے کے اندیشہ پر اعلان کیا تو کیا من کنت مولاہ فعلی مولاہ کہنے سے وہ مدّعا پورا ہو گیا اور السّلام علیک یا امیر المومنین کہلوانے سے وہ غرض پوری ہو گئی، جبکہ آلِ نبی اور آلِ علی رضی اللہ عنہم کے عظیم فرد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے داماد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے فرما رہے ہیں کہ خلافت کا اعلان کرنا ہوتا، تو اس کی صحیح صورت یہ تھی۔

۳۔ احتجاج طبرسی کے حوالے سے ذکر کر چکا ہوں کہ حدیثِ غدیر میں صرف خلافتِ مرتضوی کی طرف اشارہ اور کنایہ ہے، تصریح نہیں ہے اور تصریح نہ فرمانے کی وجہ یہ بیان کی کہ اگر تصریح فرماتے اور کہتے، لا تقلدوا الامامۃ الا فلاناً [illegible]بینه والا نزل بکم العذاب لاتاهم العذاب و

زال باب الانظار والامهال کہ تم نے امامت و خلافت کی ذمہ داری صرف فلاں معیّن شخص کے ہی سپرد کرنی ہے، ورنہ تم پر عذاب نازل ہوگا، تو ضرور ان پر عذاب نازل ہو جاتا اور مہلت کا دروازہ بند ہو جاتا۔

مگر سوال یہ ہے کہ جس طرح رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم بطورِ اشارہ اور کنایہ بھی کچھ کہنے کو تیار نہ تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے رسالت ختم کرنے کی دھمکی دے کر علی مولاہ کا اعلان کرا لیا اور آپ بھی اعلان کر کے رسالت کے چھن جانے کے خطرے سے محفوظ ہو گئے، تو امّت کو بھی اسی قسم کی دھمکی دے کر اقرارِ خلافت کرا لیا جاتا اور عذابِ الٰہی سے بھی بچا لیا جاتا۔ کیا رسولِ معظّم صلی اللہ علیہ وسلم کو دھمکی دینا جائز تھا؟ — مگر امّت کے لیے ایسی مشروط اور معلق دھمکی دینا روا نہیں تھا۔ نبی الانبیاء علیہ التحیۃ والثناء کی کسرِ شان لازم نہ آئی اور اُمّت کی کسرِ شان لازم آتی تھی؟ مالکم کیف تحکمون۔

نیز عذاب کی وعید نہ سنائی جاتی، خلافت کی تو تصریح کر دی جاتی اور کہا جاتا امرِ خلافت صرف فلاں معیّن شخص کے لیے ہے، اس میں تو تعریض اور اشارہ و کنایہ سے کام لے کر الجھن پیدا نہ کی جاتی۔ امّت کو عذاب سے بچانا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت دلانے سے اگر زیادہ اہم ہی تھا، تو عذاب کی وعید سنائے بغیر بھی اعلانِ خلافت ہو سکتا تھا، کم از کم اس کی تصریح تو ہو جاتی اور غلط فہمیاں تو دُور ہو جاتیں۔

الغرض خود اکابرینِ شیعہ جب تسلیم کرتے ہیں کہ یہاں صرف تعریض ہے اور انہیں مہلت دینے اور عذاب سے بچانے کے لیے اعلانِ صریح نہیں کیا گیا تھا، تو پھر السّلام علیک یا امیر المومنین کہلانے کا مطلب کیا ہوا؟ کیا اس میں تعریض تھی اور تصریح نہیں تھی؟ گویا ڈھکو صاحب کا بیان کردہ یہ قرینہ نہ اہل السنّت کے مسلمات سے ہے اور نہ ہی تمام شیعہ ہی اس کے قائل اور معترف ہیں، مگر نظر بددور ہے قطعی اور ناقابلِ ریب و شک۔

۴۔ اگر اعلانِ خلافت بھی ہو چکا تھا اور امارت پر مبارکبادیں بھی اور

امیرالمومنین کے لقب سے سلام کرنے کا حکم اور اس کی تعمیل بھی ہو چکی تھی، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا کیا معنی ہے؟ سلمنا للہ امرہ ورضینا عن اللہ قضاءہ نظرت فی امری فاذا طاعتی قد سبقت بیعتی واذا المیثاق فی عنقی لغیری۔ نہج البلاغہ۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے امر کو تسلیم کیا اور اس کی قضاء پر راضی ہوئے۔ میں نے اپنے معاملہ میں غور و فکر کیا، تو ناگاہ میری دوسرے خلفاء کے لیے اطاعت میرے اپنے بیعت لینے سے سبقت لے جا چکی تھی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مجھے ان خلفاء کی تابعداری کا پابند کر دیا گیا تھا کیا اس سے بڑا استہزاء اور ٹھٹھا بھی کوئی ہو سکتا ہے کہ ایک طرف اعلان خلافت اور امیرالمومنین کا لقب دے کر سلام کروائے جائیں اور دوسری طرف عہد و پیمان اطاعت لے کر ان کو دوسرے خلفاء کی پیروی اور فرمانبرداری کا پابند کر دیا جائے۔

۵۔ انصار نے جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی حدیث رسول الائمۃ من قریش سنی، تو اس پر عمل کیا اور اپنے دعوی خلافت اور اپنے قول: منا امیر و منکم امیر سے دستبردار ہو گئے جو شیعہ اور اہل السنت دونوں کے نزدیک مسلم ہے اور ان کی کتب معتبرہ میں مروی و منقول ہے، تو آخر یہ اعلان خلافت اور سلام امارت اور اہتمام رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کیوں بھول گیا؟ مقام حیرت ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی زبانی حدیث سنیں تو فوراً عمل کریں مگر زبان رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنیں اور اس اہتمام کے ساتھ سنیں، پھر بھی اس کو نظر انداز کر دیں اور اس مبارکبادی وغیرہ کی بھی مطلق پرواہ نہ کریں۔ کیا ہے کوئی اہل تشیع میں جاگتے ضمیر والا جو اس اہل حقیقت اور ناقابل انکار و تردید واقعہ کو سامنے رکھ کر اس سبائی مفروضہ سے توبہ کرے اور حقیقت کا اعتراف و اقرار کرے۔

نیز اہل السنت کی معتبر ترین کتابوں یعنی بخاری وغیرہ میں منقول ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے مرض الوصال میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے امر خلافت کے متعلق دریافت کرنے کا مشورہ دیا لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اگر آپ ہمیں خلافت نہ دیں،

تو پھر کبھی بھی خلافت لوگوں کی طرف سے ہمیں نہیں ملے گی، لہذا میں نہیں پوچھتا۔ اگر اعلان خلافت بھی ہو چکا اور مبارکبادیاں بھی دی جا چکی تھیں اور امیرالمومنین کے لقب کے ساتھ علیک سلیک بھی ہو چکی تھی، تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اس مشورہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس جواب کا کوئی معنی نہیں رہ جاتا۔ لہذا یہ قرینہ شیعہ و سنی روایات بلکہ مسلمات کی رو سے انمل بے جوڑ، بے حقیقت، ناقابل اعتماد و اعتبار اور سراسر لغو اور بیہودہ ہے اسے قرینہ کہنا بھی غلط ہے تا بہ قطعیت چہ رسد

تنزیہ الامامیہ

ازعلامہ ڈھکو صاحب

ساتواں قرینہ مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلافصل پر

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جو کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درباری شاعر تھے۔ انہوں نے پورے واقعہ کو نظم کیا۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اس حدیث سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان ہی سمجھا تھا۔ آپ فرماتے ہیں ؎

فقال لہ قم یا علی فاننی   رضیتک من بعدی اماما وھادیا

اے علی! اٹھو! میں نے تمہیں اپنے بعد لوگوں کا ہادی و رہنما منتخب کیا ہے۔

تحفہ حسینیہ

ازابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

الجواب ومنہ الہام الصواب

علامہ موصوف نے اپنے استدلال کا دار و مدار اب حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب اشعار پر رکھا ہے، لیکن جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ واقعی آپ کا کوئی دیوان ہے اور وہ تحریف و تبدیل اور زیادت و نقصان سے محفوظ ہے،

اور اس میں الحاقی اور مصنوعی اشعار نہیں ہیں، اس وقت تک اس استدلال کی کوئی حیثیت نہیں ہوسکتی اور تعجب کی جا ہے کہ جن لوگوں کے نزدیک کلام اللہ کی صحت مشکوک ہے اور وہ اس کو تغییر و تبدیل سے محفوظ و مصئون تسلیم نہیں کرتے اور ہزاروں روایات ان کی معتبر ترین کتبِ مذہب میں ایسی موجود ہیں جو اس قرآن کو ناقابلِ وثوق قرار دیتی ہیں اور محرّف و متغیّر ٹھہراتی ہیں تو اسی اہلِ مذہب کے نزدیک دیوان حسّان اور اُس کی نظمیں کیوں قابلِ وثوق ہوگئیں؟ لہذا جب تک اس نسبت کا درست ہونا اور اس کے مندرجات کا تغییر و تبدل سے محفوظ ہونا ثابت نہ کر دیا جائے، استدلال درست نہیں ہوسکتا۔

۲۔ اگر حضرت حسّان رضی اللہ عنہ آپ کو بلا فصل خلیفہ اور امام و ہادی مان چکے تھے اور قصیدے بھی پڑھ چکے تھے، تو پھر ان کو مرتدین کے کھاتے میں کیوں ڈال دیا؟ اور ارتد الناس الا ثلاثۃ کی تیغ جفا سے اس قصیدہ خوان مرتضیٰ کی رگِ وفا کیوں کر کاٹ دی؟ اگر واقعی انہوں نے اسی معنیٰ میں آپ کو ہادی و رہنما سمجھا تھا جو شیعہ کا مدّعا ہے، تو پھر ان پر فتوائے ارتداد کیوں؟ اور اگر یہ معنیٰ نہیں سمجھا تھا، تو ان کے قول سے استدلال کیوں؟ اور اگر اپنے نظریہ سے منحرف ہوگئے تھے، تو دنیاوی منفعت اور مصلحت کونسی حاصل کی جس کے تحت دین کو قربان کر دیا یا ان کو خطرات کونسے درپیش تھے، جن کے تحت ڈر کر مارے جان کے خوف کے اپنے قصائد اور اظہارِ عقیدت کے برعکس ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ تسلیم کر لیا؟

۳۔ نیز اس قصیدہ میں اگر ثابت ہیں، تو امام اور ہادی کے الفاظ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امام اور ہادی ہونے میں کسی کافر کو نزاع و اختلاف ہے۔ اگر اختلاف ہے تو بلا فصل خلافت میں ہے اور امام و ہادی کے الفاظ اس پر دلالت ہی نہیں کرتے، چہ جائیکہ قطعی قرینہ بن سکیں، کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امّت کے علماء کا فریضہ ہے اور عوام اہلِ اسلام پر اس کی تعمیل لازم ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام بھی ہادی اور امام بن کر تشریف لائے، مگر ان میں عظیم المرتبت

ہستیاں ظاہری حکومت پر فائز نہیں تھیں اور بنی اسرائیل میں امام و ہادی رونما ہوئے مگر وہ حکمران اور خلفاء نہیں تھے۔ کما قال اللہ تعالیٰ وجعلنا ھم أئمۃ یھدون بامرنا ہم نے ان کو امام بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ الغرض وہ انبیاء و رُسل جو حکمران اور بادشاہ نہیں تھے اور دوسرے مذہبی رہنما جن کا تعلّق بنی اسرائیل سے تھا، وہ سبھی امام اور ہادی تھے، لیکن ان کو خلیفہ اور وہ بھی بلا فصل کہنا غلط ہے، تو پھر اس جگہ امام و ہادی کہنے سے قطعی قرینہ خلافت بلا فصل کا کیسے ہاتھ لگ گیا؟

۴۔ نیز اسی موقعہ پر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث ثقلین بھی زبانِ اقدس سے بیان فرمائی کہ میں تمہارے اندر دو قیمتی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ ایک قرآن اور دوسری اہل بیت اور جب تک ان کے ساتھ تمسک اور اقتداء کرتے رہوگے، ہرگز گمراہ نہیں ہوگے۔ تو اس حدیث میں آپ نے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جس طرح قرآن ہادی ہے، اسی طرح اہل بیت بھی ہادی ہیں، اور ہر حکمران جس طرح قرآنِ حکیم کے مطابق احکام نافذ کرنے کا پابند ہے، اسی طرح اہل بیت کرام اور بالخصوص حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مشوروں کے مطابق عمل کرنے کا پابند ہے۔ نیز کتبِ سماویہ ہادی بھی ہیں اور ان کو امام بھی کہا گیا ہے کما قال اللہ تعالیٰ، ومن قبلہ کتاب موسیٰ اماما ورحمۃ۔ وقال اللہ تعالیٰ ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدًی للمتّقین۔ حالانکہ ان کو خلیفہ کہنا بھی درست نہیں، چہ جائیکہ خلیفہ بلا فصل۔

لہذا اس حدیث کی روشنی میں حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا، وہ اہل السنّت کے مسلک کے عین مطابق ہے اور شیعی علماء کا اس کو اپنے مذہب پر قطعی دلیل بنانا، تو دُور کی بات ہے، اشارہ قرار دینا بھی درست نہیں ہوسکتا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشیرِ خاص بنانا، متعدد حوالہ جات سے واضح کیا جا چکا ہے، لہذا جو مقصد اس ارشادِ نبوی میں مضمر تھا، اس پر مکمّل عمل درآمد کیا گیا۔

آٹھواں قرینہ مولی المعنی اَولیٰ بالتصرّف اور خلیفہ بلافصل پر

اس اعلان کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جناب امیر کے دوستوں کے لیے دُعائے خیر فرمانا اور مخالفین کے لیے بد دعا کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں مولی سے مراد اولی بالتصرّف ہی ہے جیسے کہ رسم ہے کہ اعلانِ ولی عہدی کے بعد اس قسم کی دعائیں کی جاتی ہیں، جن سے مقصد ولی عہد کی اطاعت کی ترغیب اور نافرمانی سے ترہیب ہوتی ہے۔

ص ۱۵۳

تحفہ حُسینیہ: الجواب وھو الملھم للصدق والصّواب

علامہ ڈھکو صاحب قطعی قرائن اور شواہد بیان کرنے لگے تھے، لیکن اب ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق تارہائے عنکبوت کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے ہیں کیونکہ بعد میں یہ دعا ہے کہ اے اللہ! اس شخص کو دوست بنا جو علی کو دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو علی سے دشمنی رکھے، لہٰذا اس سے ولی عہدی ثابت ہو گئی۔

۱۔ یہی دُعا تو اس ولی عہدی کے مخالف اور منافی قرینہ ہے، کیونکہ اگر ولیعہدی مقصود ہوتی، تو دعا یوں دی جاتی، اللھم وال من اطاعہ وعاد من عصاہ اے اللہ! جو ان کی اطاعت کرے، اُس کو محبوب بنا اور جو ان کے حکم کی خلاف ورزی کرے، اس کو اپنا دشمن بنا۔ جب محبت وعداوت کا ذکر کیا، تو معلوم ہوا کہ یہ ولی عہدی کا اعلان نہیں تھا، بلکہ مخصوص محبت کے وجوب ولزوم کا اعلان تھا جو اصل قرینہ تھا بقول حضرت حسن مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے وہ تھا فاسمعوا لہ واطیعوہ کہ یہ تمہارا مولی اور ولی امر ہے اور قیّم امور، لہٰذا اس کی اطاعت کرنا اور اس کے احکام کو قبول کرنا، مگر اس کو تو یہاں ذکر نہ کیا گیا اور جو ذکر کیا گیا، وہ قرینہ ہی نہیں بن سکتا، تا بہ قطعیت چہ رسد۔

۲۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے من کنت مولاہ فعلی مولاہ

کے اعلان کے وقت ولایت ثابت ہو چکی، اسی لیے اس روایت میں من بعدی کا لفظ موجود نہیں ہے اور ولایت بمعنی تصرف تو اس وقت ہو ہی نہیں سکتی تھی ورنہ بیک وقت دو حکومتیں لازم آئیں، البتہ ولایت بمعنی محبتِ مخصوصہ ہو سکتی تھی اور یہ دونوں محبتیں جمع بھی ہو سکتی تھیں اور فعلی مولاہ کا جملہ اسمیہ ہونا جو دوام واستمرار کے لیے ہوتا ہے اور وہ بھی من کنت مولاہ کے استمرار ودوام کی طرح ولایت علی کے استمرار ودوام پر دلالت کرتا ہے، جو کہ اس امر کا قوی قرینہ ہے کہ یہاں ولایت بمعنی محبت ہے، نہ کہ ولایت بمعنی خلافت جو کہ بعد از وصالِ نبوی حاصل ہونی تھی۔ کیا ہوش وحواس کے قائم ہوتے ہوئے اس دعا سے ولایت بمعنی خلافت بلا فصل پر ادنیٰ اشارہ بھی سمجھا جا سکتا ہے، چہ جائیکہ اس کو قطعی قرینہ تسلیم کر لیا جائے۔

نانواں قرینہ۔ مولی المعنی اَولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلافصل پر

اس آیت کے بعد تکمیل دین کا نزول جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے، اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ آج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت بڑے عظیم الشان فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہو رہے تھے، جس پر دینِ اسلام کی تکمیل کا دارومدار تھا اور وہ امامت وخلافت علی ہی ہو سکتی ہے نہ اعلان محبت وغیرہ۔

ص ۱۵۴

الجواب بفضل مفیض الخیر والسداد

ڈھکو صاحب کا یہ دعویٰ قطعاً غلط ہے کہ قول باری تعالیٰ، الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا کا نزول غدیر خم میں اعلانِ ولایت کے بعد ہوا، بلکہ عرفہ کے میدان میں نو ذوالحجہ بروز جمعہ اس کا نزول ہوا، لہٰذا اس پر خلافتِ مرتضوی کا اعلان مترتب کرنا قطعاً درست نہیں ہے اور اہل السنّت کے کتبِ صحاح میں اس کی تصریح موجود ہے اور تمام مفسرین اور علماء اہل السنّت کا اسی پر اتفاق ہے اور اگر شیعہ حضرات اس آیت کے غدیر خم پر

نازل ہونے کے قائل ہیں، تو ہمارے خلاف بطورِ الزام اور جدل ان کا یہ قول کیونکر پیش کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ نیز علماء شیعہ کا بھی اس پر اجماع و اتفاق ثابت نہیں۔ جیسے کہ تفسیر منہج اور مجمع میں منقول متعدد اقوال اس پر شاہد ہیں۔

۳۔ علامہ موصوف نے اعلانِ خلافت کو بہت ہی عظیم الشان فرض قرار دیا ہے۔ جب اعلان کی عظمت اتنی ہے، تو ظاہر ہے خلافت کی عظمت کیا ہوگی؟ حالانکہ شیعی نظریات اور مسلمات کے آئینہ میں دیکھیں اور شیعی مفروضات کو تسلیم کر لیں، تو امت کو اس خلافت سے ذرا بھر فائدہ نہیں پہنچا۔ پچیس سال کا عرصہ تو خلفاء ثلاثہ کی موافقت و متابعت اور ان کی خلافت کو خلافتِ الٰہیہ اور خلافتِ موعودہ قرار دیتے ہوئے گزر گیا اور اسی دوران بقول شیعہ قرآن بھی بدل دیا گیا اور شریعت کے دیگر احکام میں بھی رد و بدل ہوتا رہا، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ ٹس سے مس نہ ہوئے اور جب خلافت مل گئی، تو نہ اصلی قرآن دے سکے اور نہ خلفاء سابقین کی روش اور کردار کے خلاف کوئی اقدام کر سکے اور نہ ان کے جاری کردہ طور طریقوں کو بدل سکے، کیونکہ ہمیشہ یہی خطرہ و اندیشہ لاحق رہا کہ میرا لشکر مجھے چھوڑ نہ جائے اور میں تنہا نہ رہ جاؤں۔ دیگر احکام کو تبدیل کرنا تو دُور کی بات ہے، تراویح چھڑوانا، جس میں سراسر بدنی راحت کا سامان موجود ہے، وہ بھی ممکن نہ ہوا، جیسے کہ علامہ ڈھکو صاحب اور اس کے طبیب روحانی نے خود تسلیم کیا ہے۔ رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۶۵ تا ۶۷ کا تفصیلی مطالعہ فرمائیں۔

لہٰذا اندریں حالات تمام اہلِ تشیع کے اعتراف کی رو سے جب خود خلافت مرتضوی اسلام اور امتِ مسلمہ کے لیے کسی فائدہ کا موجب نہ ہو سکی اور اسلامیانِ عالم کو اس سے ہدایت حاصل نہ ہو سکی، تو اس کے اعلان کو عظیم الشان فریضہ کی ادائیگی قرار دینا شیعی مسلمات کی رُو سے کیونکر درست ہو سکتا ہے ——؟

پہلے انبیاء کرام علیہم السلام نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے اعلان کے پابند تھے اور اس عظیم الشان فریضہ کو ہر ایک نے ادا کیا۔ پھر آپ

کے ظہور پر واضح بھی ہو گیا کہ واقعی وہ رسولِ گرامی اسی اہتمام کے لائق تھے، لیکن شیعی روایات کو تسلیم کیا جائے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اسلام کی آبیاری کی بجائے اس کی جڑیں کھوکھلی ہوتی نظر آتی ہیں۔ جو لوگ اسلام کے خلاف تھے نعوذ باللہ وہ آپ کے امام تھے اور انہیں کے آپ وزیر و مشیر تھے، ان کو ہی رشتے دیتے رہے تھے انہیں کی بیعت کو اپنی بیعت کی حقانیت اور درستگی کی دلیل بناتے رہے اور ان کو مقتدایانِ اسلام اور عظیم المرتبت مومن قرار دیتے رہے اور ان کو بے عیب، پاکدامن، راست رو اور سنت کا قائم کرنے والا وغیرہ قرار دیتے رہے، جس سے ان کی مکمل تائید اور موافقت پائی گئی اور علانیہ ایک جملہ بھی آپ ان کے خلاف نہ بول سکتے تھے اور نہ بولے۔ تو کیا شیعی مفروضات کے مطابق آپ کے ہاتھوں جب دینِ حق کی بنیادیں ہی کھوکھلی ہو گئی تھیں، تو اس خلافت کے اہتمام کا کیا مطلب؟ اور اس کے اعلان کے عظیم الشان فرض ہونے کا کیا مطلب ہو سکتا تھا۔

ہاں اہل السنت اس خلافت مرتضویہ کو اپنے دور میں فی الجملہ عظیم الشان مانتے ہیں کیونکہ آپ نے ان کے نزدیک ذرہ بھر دین کی مخالفت برداشت نہیں کی اور اس کو منہاج النبوت کے مطابق چلایا اور اس میں کسی تعلق اور رشتہ داری کو حائل نہ ہونے دیا اور نہ ہی دین میں مداہنت اور بے جا رواداری کو برداشت کیا، خواہ اس کی کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑی اور یہ خلافت امت کے حق میں نعمت بھی تھی اور قابلِ فخر بھی، لیکن وہ شورائی تھی اور چوتھے درجہ میں تھی اور اس میں خلفاء ثلاثہ اور بالخصوص شیخین کی روش و کردار کو برضا و رغبت اور بصد خلوص و محبت اپنایا گیا تھا، نہ اس میں تقیہ تھا اور نہ کتمانِ حق نہ مافی الضمیر کے مخالف و برعکس کا اظہار، لیکن شیعہ حضرات کے زعم و گمان کے مطابق، آپ بظاہر خلفاء سابقین کی مدح و ستائش کرتے اور ان کی سیرت و کردار کو اپناتے اور خواص میں ان کو مرتد اور دین کو تباہ کرنے والے قرار دیتے اور اس طرح آپ نے گویا دو اسلام جاری کیے ایک ظاہری اور علانیہ۔ دوسرا مخفی اور پوشیدہ جو خواص تک محدود رہا اور نعوذ باللہ

فرقہ بندی اور اختلاف و انتشار کے وہ بیج بوئے کہ قیامت تک ان سے پیچھا چھڑانے کی عالمیانِ اسلام میں ہمت نہیں ہو سکتی، لہٰذا اگر شیعی مفروضات درست ہیں تو وہ خلافت نہ امت و اسلام کے لیے رحمت اور نہ اس کا اعلان کوئی اہم فریضہ تھا اور اگر وہ رحمت تھی اور سراسر رشد و ہدایت کا موجب تھی، تو پھر شیعی مفروضات غلط ہیں اور اُن کا یہ پرچار حضرتِ امیر رضی اللہ عنہ کی تنقیص و توہین کا موجب ہے۔

نیز جس طرح اعلانِ ولایت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اہم فریضہ تھا۔ اسی طرح خلافت بلا فصل کا دعویٰ اور اس کی خاطر ہر قسم کی تکالیف برداشت کرنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فریضہ تھا۔ بقول ڈھکو صاحب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو اس اعلان کے بعد عظیم الشان فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہو گئے، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جو بارِ گراں خلافت والا ڈالا گیا تھا، تو اس فرض سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کب سبکدوش ہوئے؟ خود ان کے پوتے نے فرمایا کہ اگر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمِ خداوندی سے آپ کی خلافت کا اعلان کیا تھا، تو اس کا دعویٰ نہ کر کے اور اس کے حصول کی خاطر کوئی اقدام نہ کر کے آپ بہت بڑے مجرم اور گناہ گار ٹھہرے۔ مگر علامہ صاحب کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گناہگاری کی پرواہ نہیں، صرف خلفاء ثلاثہ غاصب ثابت ہو جائیں، تو مدعا پورا ہو جائے گا، یعنی شیطان اور ابنِ سبا کی خوشنودی حاصل ہو جائے اور بس۔

قرآن مجید ایسے عظیم فریضہ اور مدارِ اسلام کے بیان سے خاموش کیوں ہے؟

۴۔ علامہ ڈھکو صاحب نے اعلانِ ولایت کو عظیم الشان فریضہ کی ادائیگی اور اس سے سبکدوشی قرار دیا، حالانکہ خلافت و امامت واقعی اگر فرائضِ اسلام میں سے اہم عقیدہ اور ایمان کے ارکانِ خمسہ توحید۔ عدل۔ نبوت۔ امامت اور قیامت میں سے چوتھا اہم رکن تھا، تو کہیں اس کی تصریح قرآن مجید میں بھی ہونی چاہیے تھی، کیونکہ اصل سرچشمۂ ہدایت وہی ہے اور اگر فریقین میں قدرِ مشترک کوئی ہو سکتا ہے تو وہ بھی قرآن مجید ہے اور شیعہ حضرات کے مہدی علیہ السلام کے ظہور تک تو لازماً اسی پر اعتماد کرنا

پڑے گا اور اس میں متعدد جگہ اصولی عقائد اور فرائض اسلام کو بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، لیکن بارہ ائمہ کی خلافت کا اور بالخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اس میں کہیں تذکرہ نہیں ہے اور نہ اس عظیم الشان فریضہ کو صاف اور واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف اہمیت اس قدر ہو اور دوسری طرف اس کے بیان اور تصریح سے اجتناب کی کیفیت ہو تو یہ قابلِ فہم اور لائقِ تسلیم نہیں ہے۔

ا۔ متقین اور مخلصین کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن مجید نے ایمان بالغیب، اقامت صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ، قرآن مجید اور کتبِ سابقہ کی تصدیق اور آخرت پر یقینِ کامل کی صفات گنوائی ہیں، مگر خلافت و ولایت کا ذکر نہیں فرمایا۔

ب۔ ایمانِ رسول اور مومنین کے ایمان کے متعلقات بیان کرتے ہوئے فرمایا، کل آمن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ۔ یہاں بھی توحید و رسالت اور کتب و ملائکہ کا ذکر نہیں ہے۔

ج۔ مومنین کی فلاح و نجات پر مشتمل خصائل حمیدہ اور اخلاقِ عالیہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: قد افلح المومنون الآیہ اس میں بھی نماز میں خشوع۔ لغویات سے اعراض، ادائیگی زکوٰۃ، زنا اور بدکاری سے اجتناب، حفظِ امانت رعایتِ عہد اور محافظتِ صلوات کو ذکر فرمایا، لیکن خلافتِ علی اور ائمہ اثنا عشریہ کو یہاں بھی شرطِ فلاح و نجات نہ ٹھہرایا۔ وغیر ذالک من الآیات۔

د۔ اگر خلافت کا تذکرہ ہے، تو اس میں نہ بارہ ائمہ کا بالعموم تذکرہ اور نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بالخصوص ذکر ہے، بلکہ عام مؤمنین کے ساتھ وعدۂ استخلاف ہے۔

ھ۔ اگر اطاعت و فرمانبرداری میں اللہ تعالیٰ اور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اولی الامر کا ذکر ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ تو اس میں بھی نہ بارہ کا ذکر نہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا، بلکہ منکم فرما کر اس تخصیص کو تقریباً ختم ہی کر دیا۔ کیونکہ حکمِ اطاعت جن کو ہے، انہی میں سے اُولی الامر کی اطاعت لازم کی گئی ہے نہ کہ اولی الامر من آل

الرسول یا من اہل البیت کی اطاعت لازم کی گئی ہے۔ نیز اگر امام خمینی صاحب اولی الامر میں داخل ہوسکتے ہیں تو خلفاء ثلاثہ کیوں داخل نہیں ہوسکتے؟

و۔ اگر ولایت کا ذکر کیا گیا ہے، تو وہ بھی عمومی انداز میں مثلاً انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا الآیہ اس میں نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصریح اور نہ بارہ میں حصر کا نام ونشان، جبکہ والذین آمنوا کے عموم میں لاتعداد حضرات داخل ہوسکتے ہیں اور عام لفظ کو اپنے عموم پر رکھنا بھی لازم ہے۔

ز۔ یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک الآیہ میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ کی امامت وخلافت کی تصریح نہیں، بلکہ داخلی اور خارجی قرائن کی رو سے اس خلافت کے ساتھ اس کا قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے اور جب تک ضعیف بلکہ موضوع روایات کو اور شانِ نزول پر مشتمل اخبار وحکایات کو ساتھ شامل نہ کیا جائے۔ کسی آیت سے اس عظیم فریضہ کی طرف اشارہ بھی معلوم نہیں ہوتا ع یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ اگر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جان کا ڈر اور خوف تھا، نعوذ باللہ! تو اللہ تعالیٰ کو کس سے ڈر تھا اور کس کا خوف تھا؟ تو اس نے اپنے کلام میں اس کی صراحت کیوں نہ کر دی؟

۵۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت کے اعلان کو لازم فرمایا، تو آپ نے دُنیائے کفر کی مخالفت ومخاصمت اور مدافعت کو خاطر میں لائے بغیر اس کا اعلان کیا جس میں کوئی التباس واشتباہ نہ رہا لیکن وہ فریضہ جو اس اعلانِ رسالت والے فریضہ کی روح اور جان تھا اور اس کا دار ومدار تھا۔ اس کا اعلان ایسے انداز میں کیا گیا کہ اِدھر اُدھر سے قرائن ملا ملا کر اس کے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر پھر بھی بات نہیں بنتی اور وہ خلافت اس اعلان سے ثابت نہیں ہوتی اور شیرِ شمشیر زن، خیبر شکن اور مظہر قوتِ پروردگار جن کی جرأت وشجاعت اور بسالت کے ساتھ سیدِ کائنات بھی رشک کریں (مناقب ابن شہر آشوب) وہ بھی خاموش ہیں۔ شیعہ کہتے ہیں آپ قتل اور موت سے ڈر گئے تھے اور وہ آپ

کہتے ہیں، میں اللہ تعالیٰ کے امر وقضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہوں ع
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

کیا ایسے فرائض جو جانِ فرائض اور مدارِ رسالت ہوں، ان کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے جو اللہ تعالیٰ، رسول خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا ہے؟ لہٰذا روزِ روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ نہ خلافتِ بلافصل ہی فرائضِ اسلام میں داخل تھی اور نہ اس کا اعلان کیا۔

دسواں قرینہ، مولیٰ بمعنیٰ بلافصل پر

خود امیر المؤمنین کا مختلف مقامات پر اپنی خلافت وامارت کے اثبات میں اس حدیث شریف یعنی من کنت مولاہ فعلی مولاہ کو پیش کرنا اور اس کے ساتھ تمسک کرنا بھی اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ یہ حدیث آنحضرت کی خلافت بلافصل کی دلیل جمیل ہے۔ تنزیہ الامامیہ ص ۱۵۳

الجواب بتوفیق الملک الوہاب

علامہ صاحب نے شرح حدیدی وغیرہ کے حوالے سے حضرت امیر المؤمنین کا اس حدیث کے ساتھ استدلال کرنا ثابت کیا ہے، مگر دریافت طلب امر یہ ہے کہ آپ نے اس حدیث کو کس انداز میں پیش کیا تھا۔ اگر اس انداز میں کہ اس حدیث کی رُو سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری خلافت بلافصل کا اعلان فرما دیا تھا اور تم نے میری خلافت وامامت کا اقرار کر لیا تھا اور تم نے مجھے امیر المؤمنین بن جانے کی مبارکباد دی تھی، تو ڈھکو صاحب اس کو قطعی قرینہ بنانے میں حق بجانب ہوتے۔ بشرطیکہ یہ کتابیں اہل السنت کی بھی ہوتیں اور ان کے ہاں قابلِ قبول بھی، مگر یہ سراسر جھوٹ اور کذب بیانی ہے، نہ اس انداز میں حضرتِ امیر نے اس کا تذکرہ کیا اور نہ ہی شرح حدیدی وغیرہ اہل السنت کی کتابیں ہیں اور اگر آپ نے اس انداز میں ذکر فرمایا تھا کہ تم میں کوئی شخص ایسا ہے؟ جس کے متعلق حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو: من کنت مولاہ فعلی مولاہ

تو واقعی شرح حدیدی وغیرہ میں اس کا تذکرہ ہے، لیکن اس صورت میں اس سے استدلال اور اس کو قطعی قرینہ بنانا بوجوہ باطل ہو جائے گا۔

اوّل: آپ نے اس کو تعدادِ فضائل کے طور پر ذکر کیا۔ اگر اس میں ہی آپ کی خلافت کا اعلان تھا اور اس کے ذریعے آپ کے امیر ہونے کا عہد و پیمان تو آپ بھی اس کو اثباتِ خلافت اور اعلانِ حکومت کے طور پر پیش کرتے۔ حالانکہ آپ نے محض بیانِ فضیلت کے لیے اس کا ذکر کیا ہے اور اس حدیث کا فضائلِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں داخل ہونا محلِ بحث ور نزاع نہیں ہے۔

۲۔ علامہ موصوف اگر دیانت سے کام لیتے، تو انہیں یہ صراحت بھی کرنی چاہیے تھی کہ ان فضائل اور استحقاقِ خلافت کے وجوہ و اسباب کا آپ نے کس وقت ذکر کیا؟ حضرت صدیق اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہما کے دور میں قطعاً ان فضائل سے تمسک اور استدلال نہیں فرمایا۔ حالانکہ اگر اس حدیث میں خلافت بلافصل کا اعلان تھا، تو اس سے استحقاقِ خلافت پر استدلال بھی بلافصل ہونا چاہیے تھا نہ کہ اربابِ شوریٰ کے سامنے جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بمع حضرت امیر رضی اللہ عنہما کے نامزد کر دیا تھا۔ آخر اس تاخیر اور التوا کی وجہ کیا ہے؟

۳۔ اگر یہ استدلال شیخین کی خلافت کے مقابلہ میں ہوتا، تو آپ ان کو خلافت کا اہل اور مستحق تسلیم نہ فرماتے اور اپنے استحقاق اور اہلیت کی نفی نہ کرتے حالانکہ متعدد روایات اور اخبار آپ سے اس مضمون کی مروی اور منقول ہیں جو کہ اسی شرح حدیدی وغیرہ میں مذکور ہیں۔

ا۔ جب جنابِ ابوسفیان نے حضرتِ امیر رضی اللہ عنہ سے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھانے کو عرض کیا، تو آپ نے فرمایا:

انك تريد امرًا لسنا من اصحابه وقد عهد الىّ رسول الله صلى الله عليه وسلم عهدًا فانا عليه فتركه ابوسفيان وعدل الى العباس بن عبد المطلب فى منزله فقال يا ابا الفضل انت احق بميراث ابن اخيك امدد يدك

لا بايعك فلا يختلف عليك الناس بعد بيعتى اياك فضحك العباس وقال يا ابا سفيان يدفعها على ويطلبها العباس؟ فرجع ابوسفيان خائبًا۔ شرح ابن ابى الحديد جلد ۶ ص ۱۸

"اے ابوسفیان! تو ایک ایسے امر کا ارادہ رکھتا ہے، جس کے ہم لائق اور مالک نہیں ہیں اور تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد لیا تھا، میں اسی پر قائم ہوں۔ ابوسفیان آپ سے الگ ہوا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی طرف مائل ہوا اور ان کے گھر جا کر ان کو عرض کیا: اے ابوالفضل! تم اپنے بھتیجے کی وراثت کے زیادہ حقدار ہو، ہاتھ بڑھاؤ تاکہ میں تمہارے ہاتھ پر بیعت کروں، میری بیعت کے بعد لوگ آپ کے ساتھ بیعت کرنے میں اختلاف نہیں کریں گے۔ یہ سُن کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ ہنس پڑے اور کہا اے ابوسفیان! اس بیعتِ خلافت کو علی بن ابی طالب ٹھکرا دیں اور عباس اس کو طلب کریں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو ابوسفیان ناکام اور بے نیلِ مرام واپس ہوتے۔"

ب۔ جنابِ ابوسفیان کے ایسے ہی ایک مطالبہ کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ملاحظہ ہو کتاب السقیفہ للجوہری شرح حدیدی۔

طالما غششت الاسلام واهله فما ضررتهم شيئًا لاحاجة لنا الى خيلك ورجلك لولا انا رءينا ابا بكر لها اهلا لما تركناه۔ اے ابوسفیان تو نے بہت دفعہ اسلام اور اہلِ اسلام کو دھوکہ دیا، لیکن انہیں ذرہ بھر نقصان نہ پہنچا سکا، ہمیں تیرے سواروں اور پیادوں کی امداد و اعانت کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم ابوبکر کو امارت و خلافت کے اہل اور لائق نہ سمجھتے، تو اسے کبھی اس منصب پر قائم نہ رہنے دیتے۔ جلد ثانی ص ۴۵

ج۔ قبل ازیں نہج البلاغہ کے حوالہ سے اسی مطالبے کے جواب میں آپ کا یہ فرمان گزر چکا کہ میرا ابھی خلافت کا وقت ہی نہیں ہے اور یہ دعویٰ کرنا کچا پھل توڑنے اور غیر کی زمین میں کھیتی باڑی کرنے کے مترادف ہے وغیر ذالک من الخطبات۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو خلیفہ بنائیں اور آپ دوسروں کو امامت وخلافت کا اہل اور حقدار تسلیم کریں اور ان کی بیعت کرتے پھریں اور ان کی شورٰی میں شامل ہو جائیں۔ پھر اس کے فیصلہ کو تسلیم کرلیں، حالانکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا بھی تھا کہ شورٰی میں شامل نہ ہونا، مگر آپ کا جواب یہ تھا کہ میں اختلاف کو پسند نہیں کرتا تو جو ہستی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بھی ان کے حکم کی تعمیل فرماتے اور اس کی مخالفت گوارا نہ کرے۔ کیا وہ ان کو غاصب و ظالم سمجھ سکتے تھے اور اس پس منظر میں کیا کوئی عقلمند یہ باور کر سکتا ہے کہ آپ کے نزدیک حدیثِ غدیر کا یہی معنی تھا جو ابن سبا اینڈ کمپنی نے تیار کیا ہے؟ ورنہ لازم آئے گا کہ آپ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت تو برداشت کر سکتے تھے، مگر صحابہ کی مخالفت برداشت نہیں کر سکتے تھے، تو اس سے بڑھ کر بھی کوئی گناہگاری ہو سکتی ہے؟

ابن ابی الحدید کا اثناء عشریہ پر ردّ و انکار

علامہ ڈھکو صاحب نے امیر المومنین کے لقب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سلام کرائے جانے کا اور حدیثِ غدیر سے خلافت پر استدلال کی نسبت حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی طرف کرتے وقت شرح حدیدی جلد ۲ ص ۶۱ کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ وہاں بالکل ایسی بحث موجود ہی نہیں ہے۔ البتہ اس سے چند صفحات پہلے اس مبحث کو اس انداز میں ذکر کیا ہے کہ اثناء عشری شیعہ کا حدیثِ منزلت اور حدیثِ غدیر سے خلافتِ امیر رضی اللہ عنہ پر استدلال غلط ہو جاتا ہے اور لوگوں سے آپ کے لیے بیعت لینے اور آپ کی ولایتِ عہد کا اقرار کرانے اور امیر المومنین کے لقب سے سلام کرانے کا حقیقت اور واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ جو شخص بھی نبی محتشم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد امرِ خلافت میں صحابہ کرام کے نزاع و اختلاف کو دیکھے اور انصار کے مدعی خلافت بننے اور قریش و مہاجرین کے قرابتِ نبوی کے تحت استحقاقِ خلافت کا اپنے اندر منحصر کرنا ملحوظ رکھے۔ پھر حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل یعنی سبقتِ اسلام۔ یارِ غار ہونے

اور امامِ نماز ہونے سے استدلال کو مدِ نظر رکھے، تو اثنا عشری شیعہ کے دعوؤں کی کوئی حقیقت معلوم نہیں ہوتی؛ لاریب ان المنصف لما سمع ماجرٰی لھم بعد وفات رسول اللہ یعلم قطعا انہ لم یکن ھٰذا النص ج ۲۔ ص ۵۹۔ یعنی اس میں شک و شبہ نہیں کہ کوئی بھی انصاف پسند شخص جب بھی وصالِ نبوی کے بعد صحابہ کرام کو پیش آنے والا باہمی معاملہ اور ان کا مباحثہ سنے تو وہ بالیقین اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ خلافتِ مرتضوی یا خلافتِ صدیقی کے بارے میں کوئی صریح اور واضح اور ناقابلِ شک و احتمال روایت موجود نہیں تھی۔

الغرض اس سے آپ ڈھکو صاحب کی دیانت داری کا بچشمِ خود مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ شرح حدیدی میں لکھا گیا ہے اور جنابِ والا اس کو پیش کس طرح کر رہے ہیں۔

الحاصل آپ نے یہاں تک ڈھکو صاحب کے پیش کردہ دس قرائن اور شواہد کا حال معلوم کر لیا، جن میں سوائے تحکم اور سینہ زوری یا صرف لفاظی اور شاعرانہ تخیل کے کچھ نہ تھا اور واقعات و حقائق سے انہیں دُور کا بھی تعلق نہیں تھا اور منصف و دیانت دار شخص ایسے امور کو قرائن اور اشارات کہنا بھی پسند نہیں کرتا، جن کو بزعمِ خویش مجتہد اور حجۃ الاسلام نے قطعی قرائن اور شواہد بنا کر پیش کیا ہے۔

معیارِ صحت برائے روایات

تنبیہ: علامہ ڈھکو صاحب نے ان دس عدد قرائن کو بیان کرتے وقت متعدد کتابوں کے نام ذکر کیے ہیں، جن میں اکثر تو ان کے اپنے مذہب کی تھیں، مثلاً شرح حدیدی۔ مروج الذہب للمسعودی۔ ینابیع المودت۔ مناقب خطیب خوارزم اور سرِّ مکتوم وغیرہ جو ازرہِ تقیہ اہل سنّت کی ظاہر کر کے حوالے دے دیئے اور بعض ایسی ہیں جو غیر معروف اور غیر متداول قسم کی کتابیں ہیں، جن کا معیارِ صحت یہ ہے کہ مستند اور متداول کتب کے مطابق ہوں تو درست اور مخالف ہونے کی صورت میں غلط اور ناقابلِ اعتماد و اعتبار اور یہی حال ان معروف کتب کا ہے، جن کے مصنفین نے روایات کی صحت اور قوت کا

التزام نہیں کیا، مثلاً تاریخ طبری، درمنثور وغیرہ بلکہ اس عنوان پر جس قسم کی روایات ملیں، ان کو درج کر دیا اور سند ساتھ ذکر کر دی یا مآخذ کا حوالہ دے دیا تاکہ اسانید کی رو سے صحت و سقم کا فیصلہ ناظرین خود کرتے رہیں۔

لہٰذا ان میں بھی فیصلہ کن امر یہی ہے کہ جو روایات صحاح اور شیخین یعنی بخاری اور مسلم کی روایات کے خلاف نہ ہوں، وہ مقبول ہیں، ورنہ ناقابلِ قبول اور خود شیعی علماء کو اعتراف ہے کہ ان کی اپنی صحاح اربعہ میں منقول و مرقوم روایات بھی ساری صحیح نہیں ہیں، حالانکہ کافی کے متعلق بقولِ علماء شیعہ حضرت مہدی علیہ السلام کی مہرِ تصدیق بھی موجود ہے جیسے کہ کافی کے سرورق پر ان کا یہ دعویٰ مرقوم ہے: قال امام العصر وحجۃ اللہ المنتظر علیہ سلام اللہ الملک الاکبر فی حقہ ھٰذا کاف لشیعتنا۔ اور اسی لیے انہوں نے بھی ہمارے ائمہ حدیث اور اربابِ جرح و تعدیل کی تقلید کرتے ہوئے اپنی کتبِ احادیث کی درجہ بندی کی ہے اور ان میں مرقوم و منقول احادیث و روایات کی بھی درجہ بندی کی ہے اور اسماء رجال میں کتابیں تالیف کی ہیں اور اپنے راویوں پر جرح و تعدیل کی ہے۔

الغرض جب شیعہ علماء کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ ہر روایت جو شیعہ مذہب کی کتابوں میں مذکور ہو تو ضروری نہیں کہ وہ صحیح بھی ہو تو دوسروں کو اس طرح تمیز اور تحقیقِ صحت کا حق کیونکر نہیں دیا جاتا، جو اس فن میں امام اور مقتدا ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ کہ اپنی کتابوں کی نسبت ہماری طرف کر کے ہمارے خلاف الزامی کارروائی کی جاتی ہے۔ کما سبق منا تحقیقہ مراراً۔

تنقیح دعویٰ اور مولیٰ بمعنیٰ اَولیٰ میں منشاء غلط

علامہ موصوف کے بیان کردہ قرائن اور پیش کردہ روایات کی حقیقت جب ہدیۂ ناظرین ہو چکی، تو ہم اب ان کے اس دعویٰ کی حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حدیثِ غدیر میں مولیٰ بمعنیٰ اولیٰ بالتصرف ہی ہے تاکہ اس وہم کا ازالہ ہو جائے

کہ دلیل کے بطلان سے دعویٰ کا بطلان لازم نہیں آتا، بلکہ ممکن ہے کوئی دوسری دلیل موجود ہو جو اس کے اثبات کا فائدہ دے، کیونکہ جب ناظرین کرام یہ دیکھ لیں گے اور ان پر روزِ روشن کی طرح یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ مولیٰ بمعنیٰ اولیٰ ہی ثابت نہیں، تو پھر اس کے تعین پر اور مولیٰ کے دیگر معانی پر اس کی ترجیح کا دعویٰ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ شیعی فاضل نے اس کا چوبیس معانی میں اشتراک تسلیم کیا ہے۔

فائدہ عظیمہ: ۱۔ علامہ ڈھکو صاحب نے مولیٰ بمعنیٰ اولیٰ بالتصرف پر کوئی لغوی شہادت پیش نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ قول باری تعالیٰ وَمَاوٰکُمُ النَّارُ ھِیَ مَوْلٰکُمْ کو ہی اس کی دلیل بنایا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں مولیٰ بمعنیٰ دوست تو ہو نہیں سکتا اور خود اہل السنت کے مفسرین نے اس کا معنیٰ اَولیٰ بِکُمْ کیا ہے، لہٰذا مولیٰ بمعنیٰ اَولیٰ ثابت ہو گیا اور جب اتنا قدر ثابت ہو گیا اور یہ خود واضح تھا کہ آگ جہنمیوں میں تصرف کریگی، لہٰذا ساتھ بالتصرف بھی ملا دیا اور اس طرح مولیٰ بمعنیٰ اولیٰ بالتصرف ثابت ہو گیا، لیکن علامہ صاحب نے اس میں لغت عربی میں لفظ کے موضوع لہ معنیٰ اور بطورِ مجاز مستعمل فیہ معنیٰ میں فرق نہیں کیا، لہٰذا یہاں پر ساری تقریر کو امرِ فاسد پر موقوف کر دیا گیا ہے۔ اگر لغتِ عرب میں مولیٰ بمعنیٰ اولیٰ ہو تو اولیت بیان کرتے وقت ھٰذا اولیٰ بذالک من فلان کی جگہ ھٰذا مولیٰ بذالک من فلان درست ہونا چاہیے، حالانکہ اہلِ لغت کے نزدیک بالاجماع اس طرح کہنا غلط اور باطل ہے اور ڈھکو صاحب اپنے رسالہ میں جب تسلیم کر چکے کہ لفظِ مولیٰ مشترک ہے، تو اس پر کتبِ لغت سے استدلال کرنا لازم تھا۔

اس مقام پر حضرت علامہ سید محمود آلوسی بغدادی کی تحقیق ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے تاکہ اس دلیل کا فسادِ مبنیٰ اور بطلانِ مدار واضح ہو جائے۔ لا یخفی ان اول الغلط فی ھٰذا الاستدلال جعلھم المولیٰ بمعنی الاولیٰ وقد انکر ذالک اھل العربیۃ قاطبۃ بل قالوا لم یجئ مفعلٌ بمعنی افعل اصلا

ولم یجوز ذالك الا ابوزید اللغوی متمسکاً بقول ابی عبید فی تفسیر قوله تعالیٰ "هی مولکم" ای اولیٰ بکم ورد بانه یلزم علیه صحة فلان مولیٰ من فلان کما یصح فلان اولیٰ من فلان و اللازم باطل اجماعاً فالملزوم مثله وتفسیر ابی عبید بیان لحاصل المعنی یعنی النار مقرکم ومصیرکم والموضع اللائق بکم ولیس نصاً فی ان لفظ المولیٰ ثمہ بمعنی الاولیٰ (روح المعانی ج صـ ۱۷۴)

"یعنی اس استدلال میں پہلی غلطی شیعی علماء کی یہ ہے کہ مولیٰ کو اولیٰ کے معنی میں کیا جائے، حالانکہ تمام اہل عربیت نے اس کا انکار کیا ہے، بلکہ انہوں نے کہا کہ سرے سے مَفعَل کا وزن کبھی اَفعَل کا معنی ادا نہیں کرتا اور مولیٰ مَفعَل کے وزن پر ہے اور اولیٰ اَفعَل کے وزن پر ہے اور سوائے ابو زید لغوی کے کسی نے بھی اس کو جائز نہیں رکھا۔ اُس نے قول باری تعالیٰ ھِیَ مولکم کی تفسیر میں ابو عبید کے قول اَولیٰ بکم سے استدلال کرتے ہوئے اس کو جائز رکھا، لیکن یہ قول مردود ہے، کیونکہ اگر یہ صحیح ہو تو پھر فلان اولیٰ من فلان کی جگہ فلان مَولیٰ من فلان درست ہونا چاہیے کیونکہ جب مولیٰ کا معنی موضوع لہ یہی ہے، تو پہلے جملہ کا درست ہونا دوسرے جملہ کی صحت اور درستگی کو مستلزم ہوگا، حالانکہ لازم بالاجماع باطل ہے، یعنی فلاں مولیٰ من فلاں کہنا قطعاً درست نہیں ہے، لہذا ملزوم بھی باطل ہے، یعنی لفظ مولیٰ کا اَولیٰ کے لیے موضوع ہونا بھی باطل ہے اور جب سرے سے اس معنیٰ کے لیے موضوع ہی نہیں تو دعوائے اشتراک بھی لغو ٹھہرا۔

رہا ابو زید کے قول کا سہارا اور دارومدار یعنی ابو عبید کا قول تو اس میں حاصل معنی اور معنی موضوع لہ کے لازم کا بیان ہے، یعنی آگ تمہارا ٹھکانا اور جائے بازگشت ہے اور تمہارے لائق وہی جگہ ہے اور اس قول میں اس پر تنصیص نہیں ہے کہ وہاں مولیٰ کا لفظ اَولیٰ کے معنیٰ میں ہے اور اس کے لیے وضع کیا گیا ہے تاکہ اس قول کو سند بنا کر اشتراک کا دعویٰ کر دیا جائے۔